تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

43

مرتبہ :
مالک رام

وفیات

کم ہے۔ اور افسوس کہ یہ بھی ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اندیشہ ہے کہ اگر جلد توجہ نہ کی گئی، تو یہ ضائع ہو جائیگا۔ بہت پختہ کلام ہے۔ زبان پر قدرت اور بے ساختگی اور شوخی اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

بسمل صاحب کے والد تین بھائی تھے: سب سے بڑے بسمل کے والد سیّد شاہ آل حسن، منجھلے سیّد شاہ مظہر حسن اور چھوٹے سیّد شاہ امیر حسن۔ بسمل کی شادی منجھلے چچا شاہ مظہر حسن کی چھوٹی صاحبزادی حسینہ خاتون سے ہوئی (بڑی ربیعہ خاتون کا نکاح بسمل کے بڑے مرحوم بھائی شاہ نبی حسن سے ہوا تھا۔ یہ ہنوز حیات ہیں) بسمل صاحب کی اولاد میں ماشاءاللہ پانچ بیٹے (سیّد شاہ احمد حسن، سیّد شاہ مہدی حسن، سیّد شاہ ہادی حسن نیم، سیّد شاہ حامد حسن، سیّد شاہ جمال حسن) اور تین بیٹیاں (حمیرہ خاتون، شیمہ خاتون، آمنہ خاتون) ہوئیں۔ بڑی بیٹی حمیرہ خاتون کا انتقال ہو چکا ہے، باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندہ سلامت موجود اور خوش و خرّم ہیں، ان کی والدہ حسینہ خاتون کا سایہ بھی ان کے سر پر قائم ہے۔

صحت عام طور پر تسلّی بخش رہی۔ ۱۹۷۶ء میں فالج میں مبتلا ہو گئے۔ دو برس اسی کشمکش میں گزر گئے۔ آخر میں دماغی صلاحیت بالکل مفقود ہو گئی تھی، نہ صحیح طور پر بات چیت کر سکتے تھے، نہ کسی کو پہچانتے تھے۔ اسی حالت میں منگل ۲۰ جون ۱۹۷۸ء (مطابق ۱۲ رجب ۱۳۹۸ھ) ساڑھے چار بجے اپنے آبائی مکان لودی کٹرہ، پٹنہ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازہ اگلے دن صبح گیارہ بجے اٹھا، اور انھیں ان کی وصیت کے مطابق گاؤ گھاٹ میں ان کی والدہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اِنّا للہ وَاِنّا اِلیہِ رَاجِعُون۔ ان کے عزیز پروفیسر عطا کاکوی نے تاریخ وفات کا یہ طویل قطعہ کہا، جس میں ان کے کردار کی جھلک ملتی ہے:

کیسے روئے نہ مرگ بسمل پر	آج دل کھول کر عظیم آباد
"موت کا ایک دن معین ہے"	اس کی ٹلتی نہیں کبھی میعاد
اٹھتے جاتے ہیں بادہ خوارِ سخن	میکدے پر یہ کیا پڑی افتاد

Printed by Z. A. Abbasi at Jamal Printing Press, Delhi-110006
and Published from "ILMI MAJLIS" OFFICE,
1429, Chatta Nawab Saheb, Farrash Khana, Delhi-110006

رونقِ بزمِ شاعری بسمل — سُن کے اشعار ہوتے تھے سب شاد
موسیقی تحت لفظ پر قربان — شعر پڑھتے تو ملتی داد پہ داد
شاعری میں زبانِ داغ کا لطف — ان کے شعروں میں تھا عجیب سواد
"سرفروشی کی آرزو" والا — ان کا وہ شعر ہے سبھی کو یاد
فکرِ نو ان کی تھی رسا خود ہی — پھر ملا ان کو شاد سا استاد
سونے میں ہو گیا سہاگا یہ — تھوڑے عرصے میں خود ہوئے استاد
جس سے ملتے، خلوص سے ملتے — تھا کسی سے نہ بغض کچھ، نہ عناد
سال دو سال تک علیل رہے — عمر تھی ان کی ہشت بر ہشتاد
میرے بھائی تو رشتے میں تھے ہی — اور اس پہ مزید "ہم استاد"
سالِ رحلت کی تھی عطا کو فکر — لبِ ہاتف سے یہ ہوا ارشاد
حرفِ اول الم کا لے کے کہو — "چپ ہوا بلبلِ ریاضِ شاد"
۱۳۹۷ ، ۱۳۹۸/

شدید لکھنوی، سجّاد حسین، سیّد

لکھنؤ کے دو عظیم الشّان خاندانوں کے نام لیوا تھے۔ میر انیس کی اولاد میں تین بیٹے (میر خورشید علی نفیس، میر عسکری رئیس، میر محمد سلیس) اور تین بیٹیاں تھیں۔ منجھلی بیٹی حسینی مرزا عشق اور حسن مرزا تعشق کے بھائی احمد مرزا صابر سے منسوب تھیں۔ ان کی اولاد میں پانچ بیٹے (سیّد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید، سیّد باقر مرزا حمید، سیّد عابد مرزا سعید، سیّد مہدی مرزا جدید، اور سیّد صادق مرزا مجید (عرف کلّن صاحب) ہوئے۔ ان میں سیّد محمد مصطفیٰ مرزا پیارے صاحب رشید نے بہت شہرت حاصل کی۔ ان کا نکاح میر انیس کے منجھلے صاحبزادے میر عسکری رئیس کی بڑی صاحبزادی مہدی بیگم سے ہوا۔ ان کے صرف پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ سب سے بڑی (انوکھی بیگم) بو محمد جلیس پسر میر محمد سلیس بن میر انیس) سے منسوب تھیں؛ یہ لاولد تھیں۔ منجھلی (عسکری بیگم) سیّد فرزند حسین فردوس (تلمیذ میر نفیس) سے بیاہی گئیں۔ تیسری کے بیٹے احمد آغا سلیم تھے (جن کے بیٹے حسین آغا ہیں) چھوٹی دونوں بیٹیاں بھی لاولد ہیں۔

ماخذ : سیّد علی احمد دانش زیدی، لکھنؤ

تحریر

علمی مجلس دلی کا سہ ماہی رسالہ

(۴۳)

مرتب : مالک رام

جلد ۱۲ | جنوری / مارچ ۱۹۷۸ء | شمارہ ۱

چندہ سالانہ — ہندستان : پندرہ روپے
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ۸ ڈالر (امریکی)
یہ شمارہ پانچ روپے

پرنٹر و پبلشر ظلّ عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپوا کر علمی مجلس، ۱۴۲۹ چھتہ نواب صاحب کھڑا شخانہ، دلّی ۶ سے شائع کیا۔

سیّد سجاد حسین شدید لکھنوی انیس منجھلی بیٹی اور سیّد فرزند حسین فردوس کے صاحبزادے تھے (گویا وہ میر انیس کے نواسے (پیارے صاحب رشید، نیز پوتی کے نواسے ہوئے)۔ دوپہر کے دن ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ (مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۰۲ء) اپنے آبائی مکان مفتی گنج، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم سیّد مبارک حسین لکھنوی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بعد کو اپنے طور پر اس کی تکمیل کی۔

انھوں نے ساری عمر کسی کی شخصی نوکری نہیں کی۔ وقف شاہ نجف اور امامباڑہ میاں داراب میں مرثیہ خوانی ان کے سپرد تھی۔ وہاں سے جو وظیفہ ملتا، اس پر صبر شکر سے بسر اوقات کرتے رہے۔ ادھر چند برس سے اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ڈیڑھ سو ماہانہ اور یوپی حکومت نے سو روپے ماہانہ مقرر کر دیا تھا، جس سے اچھے خرچ کا سامان ہو گیا تھا۔ چونکہ اہل و عیال کی ذمہ داری سے آزاد تھے، اس لیے یہ آمدنی صفائی اور خوش پوشاکی کے لیے بہت کافی تھی۔

ان کی شعر گوئی کا آغاز غزل سے ہوا، اور اس میں وہ اپنے نانا پیارے صاحب رشید سے مشورہ کرنے لگے۔ رشید صاحب کے انتقال (لکھنؤ، ۲ ستمبر ۱۹۱۸ء) کے وقت وہ بمشکل ۱۶ برس کے تھے۔ اس وقت تک زیادہ مزاولت غزل، رباعی اور سلام سے تھی۔ اس کے بعد مرثیے کی طرف توجہ ہوئی۔ انھوں نے ایک مرتبہ دعویٰ کیا تھا کہ میں نے ۷۵ مرثیے کہے ہیں۔ ایک مرثیے میں (جس کا مطلع ہے: میں سالکِ مسالکِ عشق و انیس ہوں) لکھتے ہیں:

شاگرد تھے انیسِ سخنور کے میرے جد — ممّو نے بھی نفیس سے کامل سے لی مدد
والد کے عشقِ آلِ محمد کی تھی نہ حد — مسند ملی رشید کی، کیوں ہوں نہ مستند!
اب ہے مجھی کو زیب وراثت رئیس کی
نانا نواسے، نانی تھیں پوتی انیس کی

انھوں نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں خاصی شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ سے باہر بھی مجلسیں پڑھتے رہے اور ہر جگہ سے کامیاب آئے۔

۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو وہ بازار میں جا رہے تھے کہ رکشا سے ٹکرا گئے۔ شدید چوٹ آئی۔ کافی دن تک بلرام پور اسپتال (گولا گنج لکھنؤ) میں زیرِ علاج رہے۔ بارے طویل علاج معالجے سے کچھ ٹھیک

آگرہ کے کتب خانے میں موجود ہے۔ میں نے اس کی تفصیلات حاصل کیں۔ چند سال ہوئے، لکھنؤ کے ایک کتب فروش کے پاس اسی فارسی نسخے کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوا۔ میں نے اسے جموں یونیورسٹی کے کتب خانے کے لیے حاصل کر لیا۔ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر کے لائبریرین نے خبر دی ہے کہ ان کے وہاں بھی اس نسخے کی ایک جلد ہے۔ اس طرح گویا نذرین کے فارسی چہار درویش کے تین نسخوں کے وجود کا علم ہوتا ہے۔ یہاں جموں یونیورسٹی کے نسخے کا تعارف پیش کرنا مقصود ہے۔

اس نسخے کی ناپ $8\frac{1}{2}$" × $5\frac{1}{4}$" ہے۔ حاشیہ کافی بڑا ہے، جس کی وجہ سے متن کا سائز $5\frac{1}{4}$" × $3\frac{1}{4}$" رہ گیا ہے۔ سطر ۱۴ سطری ہے۔ نسخے پر اوراق کا شمار درج ہے۔ متن ورق ایک (ب) سے شروع ہو کر ۱۱۷ (الف) پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح کُل ۲۳۲ صفحات ہیں۔ کاغذ دیسی، دبیز، لیکن کرم خوردہ ہے۔ کتابت سعادت علی خان کے عہد میں ۲۴ جمادی الاخریٰ ۱۲۲۱ھ کو مکمل ہوئی۔ کاتب کا نام ہیرو لعل ہے۔ تحریر پختہ اور خوشخط ہے۔ کتابت میں وہ تمام خصوصیات ہیں، جو قدیم تحریروں میں عام ہوتی ہیں یعنی

۱ - کاتب یائے مجہول اور یائے معروف میں امتیاز نہیں کرتا؛ دونوں کو ہر جگہ یائے معروف کی شکل میں لکھتا ہے۔

۲ - ک پر صرف ایک مرکز لگاتا ہے۔

۳ - حروف پر نقطے کہیں لگاتا ہے، کہیں من مانے طور پر حذف کر دیتا ہے۔

۴ - الفِ ممدودہ کا مد عام طور سے نہیں لگاتا۔

۵ - آخری نون غنہ میں ہمیشہ نقطہ لگاتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس نے ملازم اور زار و نزار کو ز کی بجائے ذ سے یعنی ملاذم اور ذار و نذار لکھا ہے۔ کتابت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ورق کے آخر میں ترک نہیں دی، بلکہ آخری دو تین الفاظ کو بالالتزام اگلے ورق کی ابتدائی سطر میں مکرر لکھ دیا ہے۔ متن میں کوئی لفظ یا الفاظ کتابت میں چھوٹ جاتے ہیں، تو اس جگہ پر ۱۳ کا ہندسہ لکھ کر حاشیے میں ۱۳ لکھ کر اس کے نیچے محذوف الفاظ لکھ دیتا ہے۔ ۱۳ کا عدد کس لفظ کی رمز ہے، مجھے معلوم نہیں۔ بعض

ہو کر گھر پر آ گئے۔ لیکن یہ عمر اور ایسی شدید چوٹیں اور اتنی لمبی بیماری ـــــ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اسی میں ۳ جولائی ۱۹۷۸ء سہ پہر میں ساڑھے چار بجے جان بحق ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ۴ جولائی ۱۹۷۸ء صبح کے وقت اٹھا اور انھیں کربلائے تالکٹورہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

شدید نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی احمد حسین صاحب آرٹ ماسٹر اسکول بلرام پور (ضلع گونڈہ) کی دختر بتو بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے دو بیٹیاں ہوئیں، جو کمسنی میں انتقال کر گئیں، اور اس کے بعد بیگم بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دوسرا نکاح ماسٹر سید عباس علی رساکی محلہ حیدر گنج (قدیم لکھنؤ) کی صاحبزادی چھوٹی بیگم سے ہوا۔ ان سے بھی دو بچے ہوئے لیکن دونوں ایامِ زچگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اختلافِ مزاج کے باعث بعد کو اس بیگم سے علاحدگی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی حقیقی ہمشیرہ کامنی بیگم اور بھانجے سید سبطِ حسن نقوی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ انتقال بھی انھیں کے مکان پر ہوا۔ لاولد فوت ہوئے۔

شدید مرحوم کے سات مرثیے "ریاضِ شدید" کے تین حصوں (لکھنؤ: ۱۹۶۷ء) میں شامل ہیں۔ ان کا بہت سا کلام غیر مطبوعہ سید سبطِ حسن نقوی کے پاس موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ محفوظ کر دیا جائے۔ انھوں نے کسی زمانے میں اپنے نانا پیارے صاحب رشید کے مرثیوں کی ایک جلد بھی "بوستانِ رشید" کے نام سے مرتب کی تھی؛ یہ چھپ چکی ہے۔

اخگر، وصی احمد

ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے قصبے محمود آباد کے ایک کھاتے پیتے خاندان کے فرد تھے، ان کا سلسلۂ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاری پر منتہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ان کے جدِّ اعلیٰ محمد یوسف انصاری (حضرت ابوایوب انصاریؓ کے پروتے) محمد بن قاسم کے ساتھ ۷۱۲ء میں ہندستان آئے۔ اور خاندان مدتوں سندھ میں مقیم رہا۔ مدتوں بعد ان کی نسل میں حسام الدین (عرف شیخ بڑے) وہاں سے ہجرت کر کے محمود آباد (یوپی) آ گئے۔

ماخذ: قومی آواز ۶ اگست ۱۹۷۸ء؛ جناب ڈاکٹر افضال احمد ایم اے ایل ایل بی پی ایچ ڈی، لکھنؤ (بیسر اخگر مرحوم) بعنوان: مشاہیر سندیلہ از چودھری نبی احمد (مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

کم ہے۔ اور افسوس کہ یہ بھی ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ اندیشہ ہے کہ اگر جلد توجہ نہ کی گئی، تو یہ ضائع ہو جائیگا۔ بہت پختہ کلام ہے۔ زبان پر قدرت اور بے ساختگی اور شوخی اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

بسمل صاحب کے والد تین بھائی تھے؛ سب سے بڑے بسمل کے والد سید شاہ آل حسن، منجھلے سید شاہ مظہر حسن اور چھوٹے سید شاہ امیر حسن۔ بسمل کی شادی منجھلے چچا شاہ مظہر حسن کی چھوٹی صاحبزادی حسینہ خاتون سے ہوئی (بڑی ربیعہ خاتون کا نکاح بسمل کے بڑے مرحوم بھائی شاہ نبی حسن سے ہوا تھا۔ یہ ہنوز حیات ہیں) بسمل صاحب کی اولاد میں ماشاءاللہ پانچ بیٹے (سید شاہ احمد حسن، سید شاہ مہدی حسن، سید شاہ ہادی حسن نسیم، سید شاہ حامد حسن، سید شاہ جمال حسن) اور تین بیٹیاں (حمیرہ خاتون، شمیمہ خاتون، آمنہ خاتون) ہوئیں۔ بڑی بیٹی حمیرہ خاتون کا انتقال ہو چکا ہے، باقی سب بچے بفضلہ تعالیٰ زندہ سلامت موجود اور خوش و خرم ہیں، ان کی والدہ حسینہ خاتون کا سایہ بھی ان کے سر پر قائم ہے۔

صحت عام طور پر تسلی بخش رہی۔ ۱۹۷۶ء میں فالج میں مبتلا ہو گئے۔ دو برس اسی کشمکش میں گزر گئے۔ آخر میں دماغی صلاحیت بالکل مفقود ہو گئی تھی، نہ صحیح طور پر بات چیت کر سکتے تھے، نہ کسی کو پہچانتے تھے۔ اسی حالت میں منگل ۲۰ جون ۱۹۷۸ء (مطابق ۱۲ رجب ۱۳۹۸ھ) ساڑھے چار بجے اپنے آبائی مکان لودی کٹرہ، پٹنہ میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازہ اگلے دن صبح گیارہ بجے اٹھا، اور انھیں ان کی وصیت کے مطابق گاؤ گھاٹ میں ان کی والدہ کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

ان کے عزیز پروفیسر عطا کاکوی نے تاریخ وفات کا یہ طویل قطعہ کہا، جس میں ان کے کردار کی جھلک ملتی ہے:

کیسے رو ئے نہ مرگِ بسمل پر — آج دل کھول کر عظیم آباد
"موت کا ایک دن معین ہے" — اس کی ٹلتی نہیں کبھی میعاد
اٹھتے جاتے ہیں بادہ خوارِ سخن — میکدے پر یہ کیا پڑی افتاد

گھر میں علم و فضل، بلکہ شعر و شاعری کی روایت موجود تھی۔ اخگر کے والد شیخ سخاوت علی اردو کے خوشگو اور صاحب فن شاعر آرزو (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے شاگرد تھے؛ سحر تخلص تھا۔ وہ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے ریاست دسوہ (ضلع فیض آباد) میں ملازم ہوئے اور پھر رامپور چلے گئے۔ انھوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۹ء کو محمود آباد میں رحلت کی؛ اپنے والد مولوی معصوم علی کے پہلو میں مدفون ہیں۔ اخگر کے دادا (یعنی شیخ سخاوت علی کے والد) مولوی معصوم علی، عربی فارسی کے فاضل تھے، اور ان زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ۴ جنوری ۱۹۱۰ء کو محمود آباد میں انتقال ہوا۔

اخگر یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت اپنے دادا ابا کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی انھیں سے پائی، پھر نو بستہ مڈل اسکول، لکھنؤ بھیج دیے گئے، جہاں سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد حسین آباد گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے دسویں کی سند لے کر کیننگ کالج، لکھنؤ گئے۔ بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد یہیں سے حاصل کیں، اور ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی۔ اپنی محنت، دیانتداری اور خوش خلقی کے باعث جلد ہی شہر کے کامیاب وکلا میں شمار ہونے لگے۔

شعر و ادب گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس پر لکھنؤ کا اس دور کا ماحول، جو سراسر شعر و نغمہ سے عبارت تھا۔ رہی سہی کسر آرزو کے پڑوس نے پوری کر دی۔ وہ انھی کے محلے میں رہتے تھے اور چونکہ ان کا ذاتی مکان تنگ تھا، اس لیے خاندانی تعلقات کی بنا پر اپنا خالی وقت بیشتر انھیں کے ہاں گزارتے تھے۔ بلکہ بعد کو وہ مستقلاً ان کے مکان کے باہری کمرے میں اُٹھ آئے تھے۔ آرزو کی وجہ سے روزانہ گھر پر شہر کے سربرآوردہ ادبا و شعرا کا مجمع ہو جاتا۔ علمی و ادبی گفتگو رہتی، اور مشاعرے کا سا سماں رہتا۔ اخگر اپنی نوجوانی سے شعر کہنے لگے تھے اور انھوں نے آرزو ہی کی شاگردی بھی اختیار کر لی تھی۔ لیکن دراصل ان کی شاعری اس زمانے میں پروان چڑھی، جب استاد کی دن رات کی صحبت میسّر آئی۔

وہ استاد کے عاشق تھے۔ آرزو کے دیوان "فغانِ آرزو" کا دیباچہ بھی انھیں کے قلم سے ہے۔ خود آرزو کو ان پر کتنا اعتماد تھا، یہ اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے جملہ کلام کے حقوق نشر و اشاعت ان کو تفویض کر دیے تھے۔ استاد کے انتقال کے بعد اخگر نے "انجمن یادگارِ آرزو" قائم کی تھی، جس کے زیرِ اہتمام مشاعرے اور جلسے ہوا کرتے تھے؛ ان میں لکھنؤ اور باہر کے مشاہیر ادبا و شعرا شریک ہوتے

زرّیں کا فارسی چار درویش

دلِ من سالِ فرّخ فالِ اُو گفت　　　　مبارک قصّہ ہائے چار درویش

مصرعِ تاریخ سے ۱۱۹۸ برآمد ہوتے ہیں۔ اردو ترجمہ ۱۲۱۷ھ میں کیا۔ ترجمہ کیا ہے، تلخیص ہے، جو محض ۷۴ مطبوعہ صفوں کو محیط ہے۔ اردو نسخہ جتنا ناقص ہے، فارسی اصل اسی قدر پختہ اور تشفی بخش ہے۔ انھیں رنگینیِ عبارت کا شوق ہے، جو فارسی میں تو بندھ گئی ہے، لیکن ان کے اردو رنگ میں بے رنگ بلکہ بدرنگ معلوم ہوتی ہے۔ فارسی اور اردو دونوں کے اسالیب میں ایک بات مشترک ہے، اور وہ ہے مصنّف کا شوقِ قافیہ پیمائی۔ اردو میں یہ بالکل مصنوعی معلوم ہوتا ہے، مسجّع فقروں کے ساتھ مرصّع اسلوب کے دوسرے حربے بھی درکار ہوتے ہیں، تبھی ترصیع کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے میں اسلوب کی رنگینی و زرکاری بہ قدرِ بالیست ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو، جو "تاجر زادۂ یمن یعنی پہلے درویش کے گھر کی آراستگی" کے بارے میں ہے۔

آب پاشیدہ اند و جاروب کشیدہ، خلقے انبوہ چوں بلدۂ عام و جمعے باشکوہ در اہتمام۔ من در دل گماں بُردم کہ از بے خودی راہ غلط کردم و چوں نیک دیدم، ہماں خانہ بود۔ مردماں بطریقِ دماں کہ رعایتِ مخدوم می کنند، کوچہ می دادند و از ہر دو طرف استادہ دست بہ سری نہادند۔ غلامِ پری پیکر مغرّق بہ دُر و گوہر از خانہ برآمدند و در دستِ یکے پیالۂ مرصّع و جامِ بلوریں در دست و دیگرے سینیِ نُقرہ پُر از نقلِ نمکیں۔ جُرعہ ازاں نوشیدم و بہ آں جواں گزرانیدم، بہ خانہ در آمدم۔ خانہ بود بہشت بریں و منزلے شاہ نشیں، اسبابِ عیش و نشاط آمادہ و غلاماں چوں سروِ خراماں استادہ۔

در صحنِ باغ آبِ رواں، سبزۂ دواں، فوّارہ ہائے پُر خزینہ بر سرِ سبز پوشانِ چمن بہ گوہر افشانی و مرغانِ شیریں سخن در قفس ہائے مزیّن بہ خوش الحانی۔ فرشِ ملوکانہ گستردہ و جشنِ خسروانہ ترتیب کردہ۔ شمع ہائے کافوری در شمع دان ہائے طلائی بہ عنوانے افروختہ کہ چرخ کوکب بہ نظّارہ اش در آتشِ حسرت سوختہ۔ از شعاعِ قندیل ہا سپیدۂ صبح دمیدہ و از پرتوِ چراغاں شبِ تیرہ

روزِ روشن گردیدہ ۔ شیشہ ہاے بادۂ گلگوں چوں سینۂ عارفاں از کیفیت لبریزہ و پیانہاے بلّوریں بچوں معشوقانِ عشرت انگیز ۔ مطربانِ خوش نوا خیل خیل نشستہ و رقّاصانِ تیز پا از ہر کنار بر جستہ ۔ خراماں خراماں داخلِ مجلس شدیم۔

اس زرّیں کو اردو تلخیص کرتے وقت اس پختگی کا ایک شمّہ ہی نصیب نہیں ہوتا۔ ادیب کے نقطۂ نظر سے زرّیں کا فارسی نسخہ اس کے اردو نسخے اور "باغ و بہار" کے بین بین آتا ہے۔ فارسی نسخے کا ماٰخذ معلوم نہیں۔ انھوں نے جس ژولیدہ متن کا ذکر کیا ہے، وہ تحسین کی "نوطرزِ مرصّع" نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں اور زرّیں کے پلاٹ میں خاصا فرق ہے۔ زرّیں نے کسی فارسی نسخے کو بنیاد بنایا ہوگا۔ فارسی مخطوطات زیادہ نہیں، لیکن یہ کم و بیش یقینی ہے کہ قصۂ چہار درویش اصلاً فارسی میں اور ہندستان میں لکھا گیا۔ مصنّف اور زمانے کے بارے میں علم نہیں لیکن مختلف مخطوطات کے زمانۂ کتابت کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اوائل میں یا سترھویں صدی کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔ راقم الحروف نے اس قصے کی کچھ منازلِ ارتقا قرار دی ہیں، جن کی تفصیل میری کتاب "اردو کی نثری داستانیں" (طبعِ دوم، ۱۹۶۹ء) میں دی ہے۔ قصّے کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں مزید معلومات تب ہو سکتی ہیں، جب اس کے جملہ دستیاب فارسی نسخوں کا مطالعہ اور مقابلہ کیا جائے۔ دِقّت یہ ہے کہ بیشتر مخطوطات بیرونِ ملک ہیں۔ زرّیں کے فارسی نسخے کا بالاستیعاب تجزیہ اسی مطالعے کا ایک جُزو ہے۔ ذیل میں اس کی اور اردو کے تینوں نسخوں کی تفصیلات درج کی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فارسی نسخہ اردو کے تینوں نسخوں سے مختلف واقعہ نگاری کرتا ہے لیکن بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ زرّیں کے فارسی اور اردو نسخے کی جزئیات ایک نہج پر ہیں اور تحسین اور امّن کی کتابوں کی دوسرے نہج پر۔ وہ مقامات خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں، جہاں زرّیں کا اردو نسخہ اپنے فارسی ماٰخذ کی بجاے تحسین یا امّن کے مطابق ہے۔ ویسے فارسی اور اردو نسخے میں بڑا فرق یہ ہے کہ فارسی میں بہت تفصیلات ہیں، جنھیں اردو میں اختصار کی وجہ سے انھوں نے حذف کر دیا۔ مختلف نسخوں کا تقابل درجِ ذیل ہے۔ فارسی نسخے سے مراد زرّیں کا فارسی قصۂ چار درویش ہے

اور اردو نسخوں سے مراد تحسین، امّن اور زرّیں کے نسخے ہیں۔

۱۔ زرّیں نے امّن کی طرح بادشاہ کا نام آزاد بخت دیا ہے، جب کہ "نوطرزِ مرصّع" میں فرخ سیر ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے میں وزیر کا نام روشن رائے ہے، جب کہ اردو کے تینوں نسخوں (زرّیں سمیت) میں اس کا نام خرد مند ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے اور "باغ و بہار" کے مطابق بادشاہ نے کتاب میں پڑھا کہ کسی کو غم والم ہو، تو قبرستان میں جا کر فاتحہ خوانی کیا کرے؛ "نوطرزِ مرصّع" اور زرّیں کے اردو ترجمے میں کتاب کا کوئی ذکر نہیں۔

۲۔ فارسی نسخے میں درویشِ اوّل اپنی سرگزشت سنانے سے قبل زار زار روتا ہے۔ وہ اپنے والد کا نام خواجہ احمد بتاتا ہے۔ بقیہ نسخوں میں نہ رونے کا ذکر ہے، نہ والد کا نام دیا ہے۔

۳۔ فارسی نسخے کے مطابق تاجر زادۂ یمن (درویشِ اوّل) کے والد کے انتقال کے چوتھے دن چار شیطان سیرت آدمی آئے اور اسے راہ بد پر لگا دیا۔ تاجر زادہ تین سال میں ۴۰ ہزار تومان پھونک کر روٹیوں کا محتاج ہو گیا، جس کے بعد تین دن فاقے سے گزرے۔ اردو کے تینوں نسخوں میں یہ اعداد و شمار نہیں۔ عمومی انداز سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ فارسی نسخے میں تاجر زادۂ یمن قلعے سے صندوق اترتا دیکھتا ہے، تو خندق کا پُل پار کر کے صندوق کے پاس پہنچتا ہے۔ اردو کے کسی نسخے میں خندق کا ذکر نہیں۔ زرّیں کے فارسی نسخے اور تحسین و امّن کے مطابق وہ صندوق حاصل کر کے توقف کرتا ہے اور صبح ہونے پر شہر میں جاتا ہے۔ زرّیں کے اردو نسخے میں اس انتظار کا کوئی ذکر نہیں۔ وہ صندوق کو لے کر فوراً شہر میں چلا جاتا ہے۔

۵۔ زرّیں کے دونوں نسخوں کے مطابق وہ صندوق لے کر پہلے کارواں سرائے میں گیا۔ فارسی نسخے کے مطابق ایک سال ایک ماہ کے بعد ایک ہزار تومان میں ایک مکان خرید کر اس میں منتقل ہو گیا۔ اردو ترجمے میں مدت کا ذکر نہیں، اور مکان کی قیمت کئی ہزار اشرفی درج کی ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں تاجر زادہ صندوق کو لے کر شہر میں پہنچتا ہے تو ایک مکان کرایے پر لیتا ہے، خریدتا نہیں۔

۶۔ تحسین اور امن کے نسخوں میں جرّاح کا نام عیسیٰ دیا ہے، جب کہ زرّیں کے نسخوں میں کوئی نام نہیں دیا گیا۔ زرّیں کے دونوں نسخوں میں جرّاح، مجروح خاتون کو دیکھ کر تاجرزادے کے طمانچہ ملتا ہے۔ اس پر تاجرزادہ کچھ حیلہ کر کے اسے اپنی بہن ظاہر کرتا ہے۔ تحسین اور امن کے یہاں طمانچے اور خفگی کا ذکر نہیں۔ تاجرزادہ مجروحہ کو اپنی بیوی بتاتا ہے۔ فارسی نسخے میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ جراح پہلی بار مجروح شہزادی کو دیکھتا ہے، تو تاجرزادہ کہتا ہے کہ تم جو معاوضہ مانگو گے، وہ دوسرے دن پیش کر دیا جائیگا۔ اُدھار کی بات سن کر جرّاح کچھ کہے سُنے بغیر واپس چلا جاتا ہے۔ تاجرزادہ دوبارہ اس کی دکان پر جاتا ہے اور نقد معاوضے کا وعدہ کر کے اسے واپس لاتا ہے۔ اردو کے تینوں نسخوں میں جرّاح پہلی مرتبہ ہی معالجہ کرنے لگتا ہے یعنی اردو میں اسے شریف و ہمدرد دکھایا گیا ہے لیکن فارسی میں اسے حریص بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

۷۔ جب تاجرزادۂ یمن کے پاس روپیہ ختم ہو جاتا ہے، تو فارسی نسخے کے مطابق شہزادی اسے ایک رقعہ دے کر ایک سفید ریش جواہر فروش کی دکان پر بھیجتی ہے۔ تحسین اور امن کے یہاں جواہر فروش بوڑھا نہیں، بلکہ ایک ملیح حبشی جوان ہے۔ اردو کے تینوں نسخوں میں اس کا نام سیدی بہار ہے؛ فارسی نسخے میں کوئی نام نہیں۔ فارسی نسخے میں مزید یہ ہے کہ درویش کو مغالطہ ہوتا ہے کہ جو خوان اس نے بھیجا ہے، وہ طعام کا ہے۔

۸۔ جب تاجرزادہ پہلی بار شہزادی سے بچھڑتا ہے، تو ایک خواجہ سرا کی معرفت شہزادی تک بار پاتا ہے۔ وہ خفا ہو کر اسے بھگا دیتی ہے۔ اردو نسخوں کے مطابق یہ چالیس روز تک فریاد کرتا ہے، جس کے بعد شہزادی اس سے دوبارہ ملتی ہے۔ فارسی نسخے میں وہ چھ ماہ تک آہ و زاری کرتا ہے، اس کے بعد ۴۰ دن بیمار رہتا ہے، تب کہیں جا کر شہزادی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے، اور اس پر مہربان ہو جاتی ہے۔ بیس دن بعد تاجرزادہ شفا پاتا ہے، اور شہزادی سے تمام راز دریافت کرتا ہے۔ وہ بے تکلفی سے سب کچھ اسے بتا دیتی ہے۔ تحسین اور امن کے یہاں بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہاں شہزادی بڑی مشکل سے راز افشا کرتی ہے۔ زرّیں نے اردو ترجمے میں تو شہزادی کا کردار بالکل ہی ستیاناس کر دیا

ہے۔ وہاں شہزادی تاجرزادے کے پاس آتی ہے، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کی محبت کی طلبگار ہی نہیں، کچھ اور بات کی بھی طالب ہے۔ اس پر تاجرزادہ اس سے تمام اسرار دریافت کرتا ہے اور وہ کسی ناراضی کے بغیر سب کچھ بتادیتی ہے۔

۹۔ فارسی نسخے میں ایک اور دلچسپ تفصیل ملتی ہے، جو اردو کے کسی نسخے میں نہیں ہے: شہزادی دمشق بتاتی ہے کہ لڑکپن میں وہ شراب پیا کرتی تھی۔ ذی الحجہ کے مہینے میں شراب پینا نامناسب تھا۔ پرہیز کی وجہ سے خمار نے اسے ستایا، تو اس پر ایک بوڑھے خواجہ سرا نے اسے مشورہ دیا کہ اگر شہزادی کوکنار نوش کرے، تو اس کی طبیعت بشاش ہو جائیگی۔ اس پر کوکنار فروش کی دکان سے لڑکا کوکنار لانے لگا۔ ذی الحجہ گزر گیا، تو شہزادی کوکنار بند کرکے پھر شراب شروع کردی، لیکن لڑکے کی یاد نے ستایا، جس پر وہ پھر سے کوکنار پینے لگی اور چھ ماہ تک اسے جاری رکھا۔ ذی الحجہ کی اس توجیہ کا اردو کے کسی نسخے میں ذکر نہیں۔ واضح رہے کہ تحسین اور امن کے یہاں کوکنار کے بجائے شربتِ ورق الخیال ہے۔

۱۰۔ تحسین اور امن کے یہاں باغ اور کنیز ایک ساتھ خریدے گئے تھے؛ کنیز کو بہت بدصورت بتایا گیا ہے۔ زرّیں کے نسخوں میں یوسف پہلے باغ خریدنے کی فرمائش کرتا ہے، بعد میں کنیز کی جو نہایت حسین ہے۔ فارسی نسخے میں مزید یہ ہے کہ کنیز کی خریداری کے بعد شہزادی اسے دیکھتی ہے، اور زر و زیور انعام میں دیتی ہے۔

۱۱۔ زرّیں کے فارسی نسخے کے مطابق ایک رات یوسف سوداگر شہزادی کے پاس نہیں آتا۔ یہ خود اس کی خوابگاہ میں جاکر دیکھتی ہے، تو اسے کنیز کے ساتھ محوِ اختلاط پاتی ہے۔ پھر چند روز کے بعد وہ انھیں دوبارہ مختلط دیکھتی ہے۔ اس پر کنیز واویلا کرتی ہے اور جوان سے ڈر کر خود کو خنجر سے ہلاک کرنا چاہتی ہے۔ شہزادی کہتی ہے:

چرا تیغ و خنجر بخود می زنی   بزن گردنِ من، منم کشتنی

اس پر جوان اس پر حملہ کرکے اسے زخمی کردیتا ہے۔ زرّیں کے اردو نسخے میں شہزادی پہلے بار باغ میں جاتی ہے، تو جوان اور کنیز کو ہم بستر پاتی ہے۔ وہ کنیز کو پچھاڑ دیتی ہے، اور اس کے کپڑے پھاڑ دیتی ہے، جس پر جوان اسے زخمی کردیتا ہے۔ تحسین اور امن کے یہاں

تفصیلات کسی قدر مختلف ہیں۔ شہزادی ان دونوں کو یکجا دیکھتی ہے، جس پر جوان اوّل تو معافی طلب کرتا ہے، بعد میں موقع دیکھ کر حملہ کر دیتا ہے۔

۱۲ - نوطرزِ مرصع کے اردو نسخے میں جب شہزادی اپنی سرگزشت افشا کرتی ہے، تو درویش سب سے پہلے یہ پوچھتا ہے کہ اس روز دوپہر میں ضیافت کا سامان کہاں سے مہیا ہوا۔ اس کی وضاحت کے بعد شہزادی اپنے معاشقے کی داستان سناتی ہے۔ فارسی نسخے میں پہلے سرگزشت سناتی ہے اور آخر میں ضیافت کے اہتمام پر روشنی ڈالتی ہے۔ اردو نسخے میں وہ سرگزشت سنانے کے بعد دو گھڑی روتی ہے۔ فارسی نسخے میں رونے کا ذکر نہیں ہے۔

۱۳ - پہلا درویش جب خودکشی کا ارادہ کرتا ہے، تو نوطرزِ مرصع کے دونوں نسخوں کے مطابق پہاڑ کی چوٹی پر اسے ایک زاہد سجادہ نشین ملتا ہے، جو اسے قسطنطنیہ کی طرف جانے کی بشارت دیتا ہے۔ تحسین و امن کے یہاں حضرت مشکلکشا ایک سبز پوش سوار کی شکل میں آتے ہیں۔

۱۴ - تحسین و امن کے یہاں دوسرے اور تیسرے درویش کی شخصیت نوطرزِ مرصع نے دونوں نسخوں میں بدلی ہوئی ہے، یعنی نوطرزِ مرصع کے یہاں دوسرا درویش، شہزادۂ عجم ہے۔

۱۵ - نعمان سیاح کے مکان میں جب شہزادۂ عجم شہزادیِ فرنگ کے سامنے جاتا ہے، تو نوطرزِ مرصع اہلِ فرنگ کی رسوم سے واقفیت کا حیرتناک ثبوت دیتا ہے۔ فارسی نسخے میں لکھتا ہے کہ وہ تخت پر وضعِ فرنگ سے پانو لٹکا کر بیٹھی تھی۔ اردو ترجمے میں اسے کرسیِ مرصع پر بیٹھے دکھایا گیا ہے۔ فارسی نسخے میں ایک کمال کا جملہ یہ ہے کہ جب شہزادہ اس شہزادی کے سامنے گیا، تو آئینِ فرنگ کے مطابق سر برہنہ کیا۔

۱۶ - نعمان سیاح اور شہزادیِ فرنگ کی ملاقات کی جتنی تفصیلات نوطرزِ مرصع کے فارسی نسخے میں ملتی ہیں، اتنی اردو کے تینوں نسخوں میں سے کسی میں نہیں۔ فارسی نسخے کے مطابق نعمان جب دوسرے دن شہزادی سے ملتا ہے، تو مال کی قیمت لے کر اٹھنا چاہتا ہے۔ شہزادی کہتی ہے کہ "تو مسلمان ہے۔ تجھے ایک ساعت بیٹھنا چاہیے"۔ پھر اپنا کام بتا کر اسے رائے دیتی ہے کہ اپنے مال و اسباب کو میرے والد کی سرحد سے باہر لے جا۔ نعمان

ایسا ہی کرتا ہے اور اس کے لیے اپنے ساتھیوں سے کوئی بہانہ کرتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے دن شہزادی کے پاس جاکر محبوس شہزادے کے لیے چھٹی لیتا ہے۔ اردو کے نسخوں میں وہ صرف دو بار شہزادیِ فرنگ سے ملتا ہے۔

۱۷۔ نعمان جب قفس نشین شہزادے کو چھٹی دیتا ہے، تو زرّیں کے دونوں نسخوں اور "نوطرز مرصع" میں شہزادہ کچھ زبانی پیغام دیتا ہے۔ "باغ و بہار" میں وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔

۱۸۔ فارسی نسخے کے مطابق محبوس شہزادے کو اس کے فرمانروا چچا نے باغ میں قیدِ قفس میں ڈال دیا، لیکن عوام میں یہ مشہور کیا کہ وہ سیرِ باغ کو گیا ہے۔ اس کے بعد اس کے مزاج کے خلاف دوائیں کھلائیں، لیکن زندگی تھی، وہ بے اثر رہیں۔ اردو کے تینوں نسخوں میں بادشاہ نے اس پر دیوانگی کی تہمت رکھی، اور کئی بار زہر ہلاہل دیا، لیکن وہ ہر مرتبہ بچ نکلا۔

۱۹۔ محبوس شہزادے کی موت کے بارے میں مختلف نسخوں میں فرق ہے۔ زرّیں کے دونوں نسخوں میں وزیر اوّل شہزادے کو قتل کرتا ہے اور اس کے بعد ایک نامعلوم تیر سے مارا جاتا ہے۔ بعد میں کوکا بتاتا ہے کہ وہ تیر اس نے چلایا تھا۔ "نوطرز مرصع" میں وزیر شہزادے کو قتل کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتنے میں کوکے کے تیر سے مارا جاتا ہے۔ بعد میں شہزادہ فطری موت سے مر جاتا ہے۔ "باغ و بہار" میں پہلا وزیر غیبی تیر سے مرتا ہے۔ بعد میں دوسرا وزیر شہزادے کو قتل کرتا ہے۔ یہاں تیر چلانے والے کا کوئی ذکر نہیں؛ یہ غیبی مار تھی۔

۲۰۔ پہاڑیے نعمان کی گزر اوقات کے بارے میں قدرے اختلاف ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے کے مطابق اس نے ایک غلام کو ایک قطارِ شتر مال دے کر تجارت پر لگا دیا۔ وہی سال بسال آکر اُسے آذوقہ دے جاتا تھا۔ اردو نسخے کے مطابق نصف مال غلام کو اور نصف عیال کو دیا۔ تحسین اور امّن کے یہاں سارا مال مختلف غلاموں کو ملا، اور ان کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا کہ نعمان کی خبرگیری کریں۔

۲۱۔ کوکا شہزادے کے تابوت کو بازار سے گزار کر چوک میں رکھ دیتا ہے اور وہاں سب

ماتم کرتے ہیں۔ ماتم سے تابوت کو لیے پھرنے کا جواز ہو جاتا ہے۔ اردو کے کسی نسخے میں ماتم کا ذکر نہیں ہے۔

۲۲۔ زرّیں کے دونوں نسخوں میں شہزادۂ عجم جب کوکا کے تعاقب میں جاتا ہے، تو اسے تلوار نہیں دکھاتا۔ بعد میں دونوں عمارت میں داخل ہو جاتے ہیں، تو کوکا اسے طلب کر کے شمشیر دکھاتا ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں کوکا بار بار ہی میں درویش کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔

۲۳۔ فارسی نسخے میں کوکا شہزادۂ عجم کو اس شرط پر شہزادی سے ملانے کا وعدہ کرتا ہے کہ پہلی بار جب اس کے حضور میں حاضر ہو، تو آہ و اضطراب نہ کرے۔ اگر ذرا بھی خود رفتگی کا اظہار ہوا، تو کوکا اسے تلوار سے ختم کر دیگا۔ اردو کے تینوں نسخوں میں اس شرط کا ذکر نہیں۔

۲۴۔ فارسی نسخے میں ہے کہ بادشاہِ فرنگ نے شہزادی کی تلاش کے لیے چالیس کٹنیاں چھوڑی تھیں۔ اردو کے کسی نسخے میں یہ تعداد نہیں دی ہے۔ ان میں سے ایک کٹنی جب شہزادی کے پاس پہنچی، تو فارسی نسخے کے مطابق شہزادی نے اسے طعام کے علاوہ اپنا جامہ بھی دیا۔ اردو کے تینوں نسخوں میں جامہ کے بجائے انگشتری ہے۔ فارسی نسخے میں بہزاد خان کٹنی کو یہ کہہ کر مکان پر واپس لایا کہ اسے شکار میں سے کچھ حصہ دیگا۔ اردو کے نسخوں میں وہ ایسا کوئی لالچ نہیں دیتا۔ بلکہ براہِ راست اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

۲۵۔ زرّیں کے دونوں نسخوں میں کوکا اور بہزاد خان داروغہ ایک ہی شخص ہیں۔ فارسی نسخے میں یہ شخص اپنی سرگزشت سناتا ہے کہ "میں بہت بہادر تھا، ساری رعایا مجھ سے ڈرتی تھی اور شاہانِ فرنگ مجھ سے تنگ تھے۔ میں اس کی بیٹی کا ملازم تھا۔ جب بادشاہ نے اپنے بھتیجے شہزادے کو قتل کر دیا، تو میں نے ملازمت چھوڑ کر قزاقی اختیار کر لی۔ ایک رات حضرتِ علی کو خواب میں دیکھا۔ انھوں نے مجھے مسلمان کیا۔ تب سے میں نے رہزنی چھوڑ دی۔ جب کبھی بیدماغ ہوتا ہوں، شکار کو چلا جاتا ہوں۔"

زرّیں کے اردو نسخے میں یہ تفصیل نہیں۔ تحسین اور امّن کے یہاں کوکا اور داروغہ مختلف

سید سجاد حسین فرید لکھنوی انیس منجھلی بیٹی اور سید فرزند حسین فردوس کے صاحبزادے تھے (گویا وہ میر انیس کے نواسے (پیارے صاحب رشید) نیز پوتی کے نواسے ہوئے)۔ وہ پیر کے دن ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲۰ھ (مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۰۲ء) اپنے آبائی مکان مفتی گنج، لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم سید مبارک حسین لکھنوی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بعد کو اپنے طور پر اس کی تکمیل کی۔

انھوں نے ساری عمر کسی کی شخصی نوکری نہیں کی۔ وقف شاہ نجف اور امام باڑہ میاں دارآب میں مرثیہ خوانی ان کے سپرد تھی۔ وہاں سے جو وظیفہ ملتا اس پر صبر شکر سے بسر اوقات کرتے رہے۔ ادھر چند برس سے اتر پردیش اردو اکادمی نے ڈیڑھ سو ماہانہ اور یوپی حکومت نے سو روپے ماہانہ مقرر کر دیا تھا، جس سے اچھے خرچ کا سامان ہو گیا تھا۔ چونکہ اہل و عیال کی ذمہ داری سے آزاد تھے اس لیے یہ آمدنی صفائی اور خوش پوشاکی کے لیے بہت کافی تھی۔

ان کی شعر گوئی کا آغاز غزل سے ہوا، اور اس میں وہ اپنے نانا پیارے صاحب رشید سے مشورہ کرنے لگے۔ رشید صاحب کے انتقال (لکھنؤ، ۲ ستمبر ۱۹۱۸ء) کے وقت وہ بمشکل ۱۶ برس کے تھے۔ اس وقت تک زیادہ مزاولت غزل، رباعی اور سلام سے تھی۔ اس کے بعد مرثیے کی طرف توجہ ہوئی۔ انھوں نے ایک مرتبہ دعویٰ کیا تھا کہ میں نے ۷۵ مرثیے کہے ہیں۔ ایک مرثیے میں (جس کا مطلع ہے: میں سالک مسالک عشق و انیس ہوں) لکھتے ہیں:

شاگرد تھے انیسِ سخنور کے میرے جد — ممّو نے بھی نفیسؔ سے کامل سے لی مدد
والد کے عشقِ آلِ محمد کی تھی نہ حد — مسند ملی رشیدؔ کی، کیوں ہوں نہ مستند!
اب ہے مجھی کو زیب وراثت رئیسؔ کی
نانا نواسے، نانی نقیب پوتی، انیسؔ کی

انھوں نے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی میں خاصی شہرت حاصل کی۔ لکھنؤ سے باہر بھی مجلسیں پڑھتے رہے اور ہر جگہ سے کامیاب آئے۔

۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو وہ بازار میں جا رہے تھے کہ رکشا سے ٹکرا گئے۔ شدید چوٹ آئی۔ کافی دن تک بلرام پور اسپتال (گولہ گنج لکھنؤ) میں زیرِ علاج رہے۔ بارے طویل علاج معالجے سے کچھ ٹھیک

۳۳۔ فارسی نسخے میں آذربائیجانی جوان اپنی سرگزشت میں کہتا ہے:

ہندوستان آئے؛ ایک مدت کے بعد زیرباد جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں سے کشتی کے ذریعے فرنگ کے لیے چل دیے۔ ایک ماہ چلتے رہے کہ کشتی شکست ہو گئی۔

اردو نسخے میں زیرباد کی جگہ وزیرآباد لکھا ہے۔ میرا خیال ہے، فارسی اور اردو نسخے میں جہاں کہیں وزیرآباد ہے، وہ زیرباد ہی کی تخریب ہے۔ تحسین کی "نوطرز مرصع" میں آذربائیجانی جوان کی سرگزشت کو خواجہ سگ پرست ہی کی آپ بیتی کا جزو قرار دیا ہے۔ وہاں مقام کا ذکر نہیں۔ "باغ و بہار" میں آذربائیجانی جوان زیرباد سے جہاز کے راستے اپنے وطن کو روانہ ہوتا ہے کہ ایک ماہ بعد جہاز شکست ہو جاتا ہے۔

۳۴۔ آذربائیجانی جوان جس شہر میں پہنچتا ہے، اسے زرّیں اور امّن نے فرنگ قرار دیا ہے۔ تحسین نے اس کا نام نہیں لکھا۔ زرّیں کے فارسی نسخے میں اس کی ایک دلچسپ تفصیل یہ دی ہے کہ دکان پر مرد و زن دونوں بیٹھتے تھے۔ مرد گاہکوں سے اور عورت عورتوں سے لین دین کرتی تھی۔ عورت ہر وقت جام بادۂ گلفام بھر کر شوہر کو دیتی تھی۔ شوہر اس میں سے ایک گھونٹ پی کر باقی عورت کو پلا دیتا تھا۔

یہ تفصیل کسی اردو نسخے میں نہیں ہے۔

۳۵۔ شہزادۂ فارس (زرّیں کا تیسرا اور "باغ و بہار" کا دوسرا درویش) خیرات کے لیے جو عمارت بنواتا ہے، زرّیں کے دونوں نسخوں میں اس کے چار دروازے ہیں، جب تحسین اور امّن کے یہاں چالیس دروازے ہیں۔ تحسین اور امّن نے خیرات مانگنے والے حریص فقیر اور شہزادے کا جو دلچسپ مکالمہ درج کیا ہے، وہ زرّیں کے نسخوں میں غیر حاضر ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں بھی یہ مکالمہ مختلف ہے۔

۳۶۔ بصرے میں درویش کی جو تواضع ہوئی، تحسین اور امّن نے اس میں کھانوں کی ریل پیل کر دی ہے۔ زرّیں کے نسخوں میں یہ بالکل مفقود ہے۔

۳۷۔ شہزادۂ فارس ملکۂ بصرہ کو شادی کا جو پیام بھیجتا ہے، فارسی نسخے میں اس پر

سے یہ اہم ترین نکتہ غیر حاضر ہے کہ وہ ڈوودمانِ شاہی سے ہے۔ اردو کے تینوں نسخوں میں وہ سب سے پہلے یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ وہ ایک شہزادہ ہے۔ تعارف کے اس اہم ترین پہلو کے بغیر شادی کی درخواست بہت کمزور ہو جاتی ہے۔

۳۸۔ شہزادی بصرہ کا جو ملازم نیمروز کی واردات بیان کرتا ہے اس کا نام زرّیں کے نسخوں میں بہروز، تحسین کے یہاں بہرہ ور اور امّن کے یہاں بہرہ ور ہے۔ زرّیں کے دو نسخوں کے مطابق شہزادیِ بصرہ بہروز کے بیان کی تصدیق کے لیے ایک اور غلام کو بھیجتی ہے وہ اس کی تائید میں عریضہ بھیجتا ہے لیکن واپسی سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں دوسرے غلام کو نہیں بھیجا جاتا۔

۳۹۔ شہزادۂ نیمروز باغ میں واپس جا کر پہلے تو بیل کو مارتا ہے اس کے بعد ایک دوسرے حجرے میں داخل ہو کر جلد واپس آ جاتا ہے۔ فارسی نسخے میں لکھا ہے کہ وہ دوسرے حجرے میں جا کر زار نالی کرتا ہے۔ اردو کے تینوں نسخوں میں اس رونے کا ذکر نہیں۔

۴۰۔ جوگی نے کنکھجورے والے جوان کے سر کا جو آپریشن کیا ہے اس کی تفصیل فارسی نسخے میں جتنی اچھی ہے دوسرے نسخوں میں آئی نہیں۔ وہاں شہزادۂ نیمروز کہتا ہے کہ اگر کنکھجورا کو کسی کے مغز سے اٹھانا مقصود ہو، تو زنبور کو نیم گرم رکھنا چاہیے۔ اگر زیادہ گرم ہو تو کنکھجورا جل جائیگا۔ اگر سرد ہوگا، تو کنکھجورا اپنے پانو گوشت میں سے نکالیگا۔ اس لیے نیم گرم ہونا بہترین ہے۔ اس نے جوگی کو ٹوکا کہ استاد زنبور بہت گرم ہے۔ اردو نسخے میں یہی بات اجمالاً کہی گئی ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں جوگی سرد چمٹے سے کنکھجورے کو اٹھانا چاہتا ہے۔ جوان ٹوکتا ہے کہ دستپنا تو گرم کر لو۔

اس اعتراض پر جوگی جب مریض کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے، تو فارسی نسخے کے مطابق کمرے میں داخل ہو کر کنکھجورا اٹھاتا ہے اور دوا لگا کر زخم سیتا ہے۔ اس کے بعد جوگی کی تلاش کرتا ہے۔ زرّیں کے اردو نسخے میں وہ پہلے جوگی کی تلاش میں جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وہ پھانسی سے لٹکا ہوا مر چکا ہے۔ اس پر وہ اسے ایک قبر میں دفن کرتا ہے (ہندو جوگی کو قبر میں دفن کرنا!) خزانوں کی تلاش کرتا ہے، بعد میں آکر آپریشن والے مریض کا علاج کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ترتیبِ معکوس کا کوئی جواز نہیں۔ تحسین اور امّن کے یہاں شہزادہ جوگی کو تلاش کر کے کنجی برآمد کرتا ہے، خزانے کو کھنگالتا ہے۔ لیکن نہ وہ مصنّف مریض کی کوئی خبر لیتے ہیں کہ وہ جہنم واصل ہوا یا بچا!

۴۱۔ شہزادہ نیمروز اپنی محبوبہ کی تلاش میں شاہِ جنات کو بلاتا ہے۔ زرّیں کے نسخوں میں جن کہتا ہے کہ جنوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک سیاہ ایک سفید۔ میں سیاہ قوم کا بادشاہ ہوں، اور میری بیٹی بدہیئت ہے۔ شہزادہ باور نہیں کرتا۔ اس کی بیٹی کو بلا کر دیکھتا ہے، وہ کریہہ المنظر نکلتی ہے۔ اب شاہِ جنات کہتا ہے کہ شاید تو شاہِ عمّان کی بیٹی پر عاشق ہے۔ اس پر شہزادہ شاہِ عمّان کو طلب کرتا ہے اور اپنا مقصد حاصل کرتا ہے۔ تحسین اور امّن کے یہاں دو طرح کے جنوں کا کوئی ذکر نہیں۔ شہزادہ

زرّیں کا فارسی چہار درویش

پہلی بار جس شاہ جنات کو بلاتا ہے، اسی کی دختر اس کی محبوبہ ہے۔

۴۲۔ چوتھے درویش کی سیر کی ابتدا میں غلام مبارک شہزادے کو تہہ خانے میں چالیس بندر دکھاتا ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے میں، نیز تحسین اور امن کے یہاں ان کی تعداد چالیس ہے جب کہ زرّیں کے اردو نسخے میں یہ محض دس ہے۔ زرّیں کے نسخوں اور "نو طرزِ مرصع" میں یہ بندر زبرجد کے ہیں اور "باغ و بہار" میں زمرّد کے۔

۴۳۔ داستان کے آخر میں جب سب کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں، اور ملک صادق سے چوتھے درویش کی محبوبہ لے لی جاتی ہے تو زرّیں کے نسخوں میں تلافی کے طور پر ملک صادق کو بادشاہِ چین کی بیٹی (یعنی چوتھے درویش کے غاصب چچا کی بیٹی) دے دی جاتی ہے۔ تحسین اور امن کے نسخوں میں ملکِ صادق کی مطلب براری کا کوئی ذکر نہیں۔

زرّیں کے فارسی نسخے اور تینوں اردو نسخوں کا مقابلہ ختم ہوا۔

جہاں تک داستان اور اس کے بیان کا تعلق ہے فارسی نسخہ بڑی حد تک معیاری ہے۔ اس کے برعکس زرّیں کا اردو نسخہ اس حد تک ساقط المعیار ہے کہ یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا ہے کہ دونوں کا مؤلف ایک ہی شخص ہے۔ زرّیں نے اردو متن میں جہاں اپنے فارسی نسخے سے جزئیات میں کوئی فرق کیا ہے، وہیں ٹھوکر کھائی ہے۔ ایک اچھے فارسی نسخے کے بعد اردو نسخے کو اتنا سرسری اور سطحی لکھنا ظاہر کرتا ہے کہ مصنف نے بد دلی سے کام کیا ہے۔ کئی مقامات پہ زرّیں کے اردو نسخے کی جزئیات فارسی نسخے سے مختلف اور تحسین و امن کے مطابق ہیں۔ یہ حیرتناک صورتِ حال ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو تلخیص کرتے وقت زرّیں نے اپنے فارسی نسخے کے علاوہ کہیں کہیں کسی دوسرے ماخذ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ جہاں تک قصّے کے ارتقا اور جزئیات کا سوال ہے، وہ تحسین کے یہاں مکمل ہو جاتی ہیں۔ میر امن نے بھی ان پر کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ لیکن اپنے مخصوص جملوں اور فقروں سے اس نے کردار نگاری میں جو نوک پلک پیدا کی ہے، اس کی وجہ سے وہ قصّے کے خالق کا مرتبہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک استاد مصوّر کسی کی بنائی ہوئی تصویر کو اپنے مو قلم سے سنوار کر کس طرح نیا جنم عطا کر سکتا ہے، یہ "باغ و بہار" میں دیکھیے۔ "باغ و بہار" قصّۂ چہار درویش کی معراج اور زرّیں کا اردو نسخہ اس کا عمیق زوال پیش کرتا ہے۔ جہاں تک زرّیں کے فارسی نسخے کا تعلق ہے، اسے فارسی نسخوں میں ہمیشہ اچھا اور اونچا مقام عطا کیا جائیگا۔

ہماری کتابیں

مرقع اقبال
(مکین احسن کلیم)
قیمت: پچاس روپے
علامہ اقبال کی زندگی کے اہم واقعات، شعر و نثر، نادر مطالعات، تصاویر یلند رکے ہیں (البم)

سرسید احمد خاں
(ریاض الرحمٰن شروانی)
قیمت: پانچ روپے
ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی پر سرسید اور ان کے رفقا کے کاموں کا زبردست اثر پڑا ہے۔ پروفیسر شروانی نے بڑے عالمانہ انداز میں ان کی شخصیت اور کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔

ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر
(ڈاکٹر محمد عمر) قیمت: بیس روپے
(ڈاکٹر تارا چند نے اپنی مشہور تصنیف میں ہندوستانی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کو بیان کیا تھا۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اپنی اس محققانہ کاوش میں دکھایا ہے کہ ہندوستانی تہذیب نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں کتنے اثرات چھوڑے ہیں۔)

(عرش ملسیانی)
ایک ملک ایک
قیمت: دس روپے
(ہندوستان مختلف زبانوں، عقیدوں اور طریقوں کا ملک ہے۔ اور جس کا سب سے اہم ادب ... ترتیب اور زینت حاصل ہے۔ ہر رنگ و بو کے پھول ایک گلدستہ میں بندھے ہوئے ہیں اور ہماری قومی زندگی کو تابندگی اور توانائی بخشتے ہیں۔)

ابوالکلام آزاد
(عرش ملسیانی)
قیمت: پانچ روپے
(ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ جدوجہد آزادی کی کوئی بھی تاریخ مولانا آزاد کی خدمات کے اعتراف کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔)

روشنی کے مینار
(شہباز حسین)
قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے
(سماجی مصلحین، مذہبی رہنماؤں اور سماجی قائدین کے سوانحی خاکے جو آسان زبان میں ہائی اسکولوں کے طلبا کے لئے لکھے گئے ہیں)۔

یہ ہندوستان
(شیلا دھر)
قیمت: دس روپے
(اس باتصویر کتاب میں سادہ اور سہل زبان میں بچوں کو ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ تاریخی، معاشی اور سماجی حالات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اور انھیں بڑے دلچسپ انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس ملک کی دنیا میں کیا اہمیت ہے۔
عمدہ کتابت و طباعت اور رنگین تصاویر سے مزین یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے بچوں کے لئے ضرور خریدنا چاہئے۔)

جواہر لال نہرو کی کہانی تصویروں کی زبانی
قیمت: تین روپے پچاس پیسے
(محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو کی زندگی کے دلچسپ واقعات رنگین تصویروں میں۔ بچوں اور طالب علموں کے لئے ایک تحفہ)

پھلوں اور سبزیوں کو محفوظ رکھنے کے طریقے
قیمت: دو روپے پچاس پیسے
(گھریلو نسخوں کے جام، جیلی، مربہ، مارملیڈ، چٹنی اور اچار وغیرہ بنانے کے متعدد طریقے تصویروں کے ذریعے بتائے گئے ہیں جن سے بڑی آسانی سے آپ گھر بیٹھے ہی من پسند چیزیں بنا سکتے ہیں)۔

آج کل کے سالانہ خریداروں کو بیس فیصد کی رعایت۔ محصول ڈاک ہمارے ذمے۔

جاوید وششٹ

برج کے میگھ ملہار

حرفِ آغاز

۱۹۵۰ء میں، دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے، میں نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی نگرانی میں "منشی درگا سہائے سرورجہاں آبادی" پر کام شروع کیا۔ لیکن اسی سال ڈاکٹر صاحب پاکستان چلے گئے۔ میں بہرحال سرورجہاں آبادی پر کام کرتا رہا۔ لیکن تقریباً دو برس کے بعد اچانک مجھے ریسرچ بورڈ کے چیئرمین کا خط ملا، جس میں لکھا تھا کہ سرورجہاں آبادی ریسرچ کے لیے ناکافی ہے لہٰذا دوسرا موضوع لیا جائے۔ دوسرا موضوع طے پایا: "اردو میں گیتوں کا سرمایہ۔" اسی سلسلے میں مجھے لوک گیتوں کے مطالعہ کا موقع ملا۔ لیکن یہ ایک بحرِ ذخار اور دریائے ناپیدا کنار! میں لگا ڈبکیاں کھانے۔ بہرحال میں نے ہمت کر کے اس میں غواصی جو کی، تو ہاتھ لگی یہ موتی کی لڑی: "برج کے میگھ ملہار"

ان میں سے بیشتر گیت میں نے برج منڈل کے دیہات میں گھوم پھر کر ہی جمع کیے ہیں۔ چونکہ اپنے ہمراہ کوئی ٹیپ ریکارڈ نہیں تھا، اس لیے گیت کے بول خود ہی نوٹ کرنے پڑے۔ سب سے بڑی دشواری یہ پیش آئی کہ گاؤں کی گوری، بغیر گائے گیت کی ترتیب یاد نہیں رکھ سکتی۔ درمیان میں کہیں ٹوک دیا، وہ گاتے گاتے رک گئی، تو گیت ہی بھول گئی۔ اب پھر وہ شروع سے گیت گنگناتی تھی۔ ایک گاؤں میں بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اتفاق سے جس برج نار کے دوارے میں گیت کی بھکشا لینے گیا، وہ گاؤں کی "گرام سندری" بھی تھی اور گیت کار بھی۔ لیکن اپنا یہ عالم تھا کہ

تجھ کو دیکھوں کہ تیرے گیت لکھوں؟

بڑی دیر تک وہ لجاتی رہی۔ آخر اس شرط پر گیت لکھانے پر آمادہ ہوئی کہ میں اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھوں، یعنی میں اس کی طرف نہ دیکھوں، وہ گاتی رہے، میں گیت لکھتا رہوں۔ لیکن جیسے ہی مڑ کے دیکھتا، گیت کی تان ٹوٹ جاتی۔ آخر مجھے یہ اعتراف کرنا پڑا:

ہم تو جوگی پریم نگر کے، ملکوں ملکوں گھومے ہیں
تم سا لیکن ایک نہ دیکھا، دیکھے ہیں دلدار بہت

جب اسے معلوم ہوا کہ میں بھی شاعر ہوں تو اس نے فوراً میرا امتحان لینے کی ٹھان لی۔ میری نوٹ بک مجھ سے لے لی۔ اور ایک درد بھرا برہا کا گیت سنایا۔ ٹیپ کا توڑا تھا: "مروں کہ جیوں رے؟" ——— بس یہی مصرع طرح ہوا۔ اور دوسرے دن اس پر گیت کہنے کی فرمائش کی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی تنبیہہ کر دی کہ گیت نہیں کہا، تو کل ہی گاؤں چھوڑنا پڑیگا۔ اس طرح اس نے گیت کہنے پر اُکسایا۔ آخر دوسرے دن جا کر اسے گیت سنایا:

مروں کہ جیوں رے؟
ٹوٹے شیش محل سپنوں کے، ٹوٹی گیت کی تان
رُوٹھ گئی من کے ہونٹوں سے جیون کی مُسکان
ہر چہرہ انجان ! مروں کہ جیوں رے؟
سُونی سیج، سُلگتی دھرتی، اور بھری برسات
نیند کہاں جو سپنے دیکھوں، سپنا مانگے رات
رات پرائی بات ! مروں کہ جیوں رے؟
چھُپکے چھُپکے موسم روئے، نین لُٹائے نیر
اُن کی انکھیاں روٹھی روٹھی، کون بندھائے دھیر
یہ دنیا بے پیر ! مروں کہ جیوں رے؟
اُوشا کی رنگین چُنریا، کومل گات کی یاد
اور دھنک اک سُندر مالا، گُل بیّاں، اُنماد
یادوں کی فریاد ! مروں کہ جیوں رے؟

برہ کے میگھ ملہار

ٹوٹی کس کے پیار کی مالا، کس کے بکھرے کیس؟
سے کے راجا نے کیوں دھارا اک جوگی کا بھیس؟
کون چلا پردیس ؟ مروں کہ جیوں رے ؟

جھوم اُٹھی تھی من کی بگیا ، ناچا تھا اِک مور
پردیسی بن اب آنگن میں کاگ اُڑیں چہوں اور
یہ برہا کی بھور ! مروں کہ جیوں رے ؟

شیشہ ٹوٹا یا دل ٹوٹا ؟ کیا کھویا کیا پائے ؟
تیری دین انوکھی داتا ، درد سے دل بہلائے
یاد جو کوئی آئے ! مروں کہ جیوں رے ؟

دل تڑپے ہے، جان جلے ہے، پیاسی روح پکار !
کیسے جیوں جاؤں پیا بن ؟ گل بھی جیسے خار
تن ہے ایک مزار ! مروں کہ جیوں رے ؟

انیسویں صدی کے مغربی دانشوروں میں بیشپ پیری (BISHOP PAIRIE)، جون برانڈ (JOHN BRAND)، میکس ملر (MAX MUELLER)، سن ہیٹ سمتھ (SUNHET SMITH)، جیمس فریزر (TAMES FRAZER) وغیرہ نے لوک گیتوں پر بڑا کام کیا ہے۔ جی۔ ای۔ گوور (G.E. GOWER) نے ۱۸۷۲ء میں پہلی بار جنوبی ہند کے لوک گیتوں کو جمع کیا۔ اسی زمانے میں جارج۔ اے۔ گریرسن (GEORGE A. GRIERSON) نے "گوپی چند گیت" اور جوگندر راے نے "بائیسوری لوک گیت" شائع کیے۔ گریرسن نے کئی بہاری اور بھوج پوری لوک گیت بھی فراہم کیے۔ ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ سی۔ ایف آسبورن (C.F. OSBORNE) نے پنجابی لوک گیت اور لونگ ورتھ ڈیمس (LONG WORTH DAMES) نے بلوچی عوامی گیت فراہم کیے اور انہیں کتابی صورت میں شائع کیا۔ مغربی محققوں میں سے جن لوگوں نے ہندستان کے عوامی گیتوں پر خصوصی توجہ

دی، ان میں سے چند کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ٹوڈ (TODD)، مارس مین (MORRISMAN)، سرایچ-ایم- ایلیٹ ہارن لے (SIR H-M-ELIOT HORN LEY)، ڈاکٹر ٹرنر (DR. TURNER)، ویریر ایلون (VERRIER ELVIN)، وغیرہ۔ ان لوگوں کی کاوشوں سے متاثر ہو کر ہندی میں رام نریش ترپاٹھی، دیوندر ستیارتھی؛ بنگالی میں لال بہاری دے، آشوتوش چودھری، جسیم الدین؛ گجراتی میں نرمداشنکر، جھبیر چند میگھانی؛ برج بھاشا میں ستیندر، چندر بھانو، سدھیشور ناتھ، واستو پردھان؛ راجستھانی میں سیتارام لالس، گیتی سوامی، مرلی دھر ویاس؛ میتھلی میں شری رام اقبال سنگھ؛ بھوج پوری میں اودے نرائن تیواری، گنیش چوبے؛ اور اڑیا میں کیلیشور ودیا بھوشن نند شرما، نیل منی ودیارتن، منشی شیخ عبدالمجید، چندر شیکھر باہنی پتی، راگھبانند داس، گوپال چندر پرہراج، لکھمی نارائن ساہو، چکر دھر مہاپاتر اور کنج بہاری داس وغیرہ نے لوک گیتوں کو فراہم کرنے کے سلسلے میں بڑا اہم کارنامہ انجام دیا۔ اڑیا لوک گیتوں پر بھی دیوندر ستیارتھی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھیں کی ترغیب پر چکر دھر مہاپاتر نے "گاؤں کی گیت" کے نام سے اڑیا لوک گیتوں پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے اہم کام ڈاکٹر کنج بہاری داس نے کیا ہے، جن کا مقالہ اڑیا لوک گیت کے موضوع پر ہے۔ اڑیا لوک گیتوں پر مشتمل ان کی تالیف "پلی گیتی سنچین" (مطبوعہ ۱۹۵۲ء) غالباً ہندستان کی تمام علاقائی زبانوں میں لوک گیت پر سب سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔ ان کی ایک اور انگریزی تصنیف A STUDY OF ORISSA FOLKLORE، ۱۹۵۳ء میں وشوا بھارتی یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہو کر مغربی ممالک کے دانشوروں سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ (اڑیا لوک گیت از کرامت علی کرامت، آج کل فروری ۱۹۷۵ء) کشمیری لوک گیتوں پر نور محمد روشن، موتی لال ساقی، ناجی منور، پشکر بھان، اختر محی الدین، غلام نبی ناظر، بشیر بھدرواہی، ٹاک زینہ گری، محمد احسن احسن نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ (کشمیر کے لوک گیت از موتی لال ساقی آجکل لوک گیت نمبر جنوری ۱۹۷۵ء) گجرات میں جھویر چند میگھانی مرحوم نے، راجستھان میں سوریہ کرن پاریکھ مرحوم نے

لوک گیتوں کا گہرا مطالعہ کیا اور نہایت محنت و عرق ریزی سے گیتوں کو جمع بھی کیا ہے۔ مراٹھی لوک گیتوں کو سانے گورو جی مرحوم، اور کماری ڈرگا بھاگوت نے مرتب کیا ہے۔ اور اسی طرح رام نریش ترپاٹھی، رام اقبال سنگھ راکیش، کرشن دیو اپادھیائے، رام نرائن اپادھیائے، شیام پرمار، شیاما چرن ڈوبے اور چندر بھان شرما نے بالترتیب اودھی، میتھلی، بھوج پوری، راجستھانی، مالوی، چھتیس گڑھی اور بندیل کھنڈی لوک گیتوں پر اہم کام کیا ہے۔ بہار کے لوک گیتوں کے لیے گنیش چوبے مشہور رہیں۔ کنڑ دیس کے کچھ گیتوں کو جمع کرنے کے بعد راہول سانکرتاین نے "آدی ہندی کی کہانیاں اور لوک گیت" میں مظفر نگر ضلع کے گیت بھی پیش کیے ہیں۔ بنگال میں منصور الدین اور جسیم الدین نے کام کیا ہے۔ آسام میں پدم دھر چلیہا، اڑیسہ میں لکشمی نارائن ساہو، آندھرا میں نیدو نوری گنگا دھرم اور تامل ناڈ میں کے۔ وی۔ جگناتھن نے لوک گیتوں پر بڑا کام کیا ہے۔

کچھ اداروں نے بھی لوک گیتوں کے سلسلے میں قابلِ داد کام کیا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی کا نام سب سے پہلے لینا چاہیے کہ وہاں ڈاکٹر دنیش چندر سین نے بنگلا لوک گیتوں کے کئی مجموعے شائع کرائے۔ بمبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر گووند سدا شو گھورے نے اپنے طلبہ کے ذریعے سماجی نقطۂ نظر سے لوک گیتوں کے مجموعے تیار کرائے ہیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈاکٹر دھیریندر ناتھ مجومدار کی نگرانی میں ایک نئے زاویے سے لوک گیتوں پر کام ہوا ہے۔ ان کی بدولت لکھنؤ میں "لوک سانسکرتی سبھا" بھی قائم ہو گئی ہے، جو عوامی ادب پر کام کر رہی ہے۔ باجت آوے ڈھول (از دیوندر ستیارتھی)۔ دیوندر ستیارتھی نے تو اپنی زندگی ہی لوک گیتوں اور لوک ساہتیہ کے لیے وقف کر دی ہے۔ "دھرتی گاتی ہے"، "دھیرے بہو گنگا!"، "بیلا پھولے آدھی رات"، "MEET MY PEOPLE"، "گائے جا ہندستان" اور "بے لوک" لوک گیتوں کے مجموعے ہیں۔ اُترپردیش میں اظہر علی فاروقی، الہ آباد اور ہریانہ پردیش میں دیوی شنکر پربھاکر نے بھی لوک گیتوں پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ اعظم کریوی، بسم اللہ بیگم، ظفر ادیب وغیرہ نے بھی لوک گیتوں پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ۱۹۳۶ء سے مختلف

برج کے میگھ ملہار

زبانوں اور بولیوں کے گیتوں کو جدید استحصالی اور اشتراکی رنگ میں پیش کرنا شروع کیا تھا۔ مگر وہ سلسلہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔ تاہم کچھ ترقی پسند ادیب و شاعر انفرادی طور پر لوک گیتوں کے موضوع پر لکھتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ مختلف علاقائی بولیوں کا لوک ساہتیہ یا عوامی ادب اہلِ نظر کی توجہ کا مرکز بن چکا ہے۔

برج کے میگھ ملہار" ۱۹۵۸-۱۹۵۹ء میں ماہنامہ "پگڈنڈی" امرتسر میں قسط وار شائع ہوئے تھے۔ ان گیتوں کو ترتیب دے کر جب میں نے مسودہ تیار کیا تو نیازبابا (نیاز جیبہ صاحب) تشریف لائے۔ مسودہ دیکھا، کہیں کہیں سے پڑھا، پسند فرمایا اور باصرار مقدمہ لکھنے کے لیے مسودہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد "نہ بابا آیا نہ گھنٹہ باجا!" خیریت یہ ہوئی کہ "پگڈنڈی" کے تراشے میرے پاس محفوظ تھے۔ از سر نو مسودہ تیار کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ "برج کے میگھ ملہار" دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو گئے۔

"برج کے میگھ ملہار" ہریانہ پردیش کی برج بھاشائی دو تحصیلوں، بلب گڑھ اور پلول میں گائے جاتے ہیں۔ ان دونوں تحصیلوں میں وہی "برج بھاشا" بولی جاتی ہے جسے محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں اردو کی ماں بتایا ہے کیوں کہ یہاں کی برج بھاشا میں "زبانِ دہلوی" کا بھی پٹ ہے۔

غرض میں نے ان گیتوں کے سماجی، تاریخی، ثقافتی، تہذیبی اور فنی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ کسی ایک گیت نے بھی اگر آپ کے دل کو چھو لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ٹھکانے لگی۔

غموں کی آنچ میں تپ کر ہی فن نکھرتا ہے
یہ شمع جلتی ہے، جاوید! چشمِ پُرنم سے

روپ کی پھوار:

دل، جو حیات و کائنات کا مرکز ہے، اس کے کسی گمنام گوشے میں ایک مندر ہے۔ اسی مندر

برج کے میگھ ملہار

میں برج کا جان ہے ایک دیوتا!
جب دل کی نئی نویلی، حسین و معصوم، نرم و نازک دھڑکنیں بناؤ سنگار کر کے، پریت کے دیپ جلا کر، آرتی کا تھال سجا کر، من مندر کے دوار پر مدھر سُروں میں، چنچل من کی چنچل ترنگوں کا کومل راز چھیڑتی ہیں، تو آپ ہی آپ مندر کے پٹ کھل جاتے ہیں۔ دیوتا کی من موہنی منوہر مورتی کی سندر چھب دیکھتے ہی دل کی متوالی دھڑکنیں دیو داسیوں کی طرح جھوم جھوم کر رقص کرتی ہیں، اور لہک لہک کر دیوتا کے گُن گاتی ہوئی، آرتی اُتارتی ہیں۔ آرتی کے جھلملاتے دیپ، تھرک تھرک کر لَو دیتے ہوئے، دیوتا کی بلائیں لیتے ہیں۔ رنگا رنگ پھولوں کی ملائم پنکھڑیاں دیوتا کے قدموں میں رنگین تتلیوں کی طرح تھرکتی ہیں۔ اور جب پائل کے چھنا کے، سم تال کے ساتھ، سنگیت کی گت سے گلے ملتے ہیں، تو دیوتا کے سُرخ سلونے ہونٹوں پر مُسکان کی ریکھا جاگ اٹھتی ہے۔ دیوتا جاگ اٹھتا ہے اور پھر وہ اپنی بانسری میں ایک ایسا نغمہ پھونکتا ہے کہ راگ کی آگ تیز تر ہو جاتی ہے۔ سب مل کر راس رچاتے ہیں، ناچتے ہیں، گاتے ہیں۔ ہر طرف راگ، رنگ اور رس کی پھوار پڑنے لگتی ہے۔
اسی مندر میں لوک گیتوں کا جنم ہوتا ہے۔ یہی دیوتا لوک گیتوں کا جنم داتا ہے۔ اور دل کی یہی نازک دھڑکنیں گیتوں میں ڈھل جاتی ہیں۔
گیت اور سنگیت، شعر اور نغمہ کی تخلیق سے متعلق کسی گیت کار نے کہا ہے:

جب دل پر ٹھیس لگی ہوگی، تخلیق شعر ہوئی ہوگی
جب دل میں درد اٹھا ہوگا، دھڑکن سے گیت اُگا ہوگا

جب دل پر ٹھیس لگتی ہے تو گیت کے بول جنم لیتے ہیں، اور جب دل میں درد اٹھتا ہے تو دل کی ہر دھڑکن گیت میں سنگیت بھر دیتی ہے۔ اس طرح گیت اور سنگیت شاردا اور سرسوتی کا روپ دھارن کر لیتے ہیں اور پھر "جن" اور "مانو" (عوام اور انسان) کے دُکھ سُکھ، پیار پریت، ریت رواج، چال چلن، آچار بچار، تیج تیوہار، غرض روزمرہ، زبان، ادب، تہذیب، کلچر، مذہب، معتقدات اور آرٹ کے آنگن میں بینا کے تاروں کی جھنکار سے، لوک گیت، لوک سنگیت، لوک ناچ اور لوک کتھا کا احساس اُبھرتا ہے،

اور میگھ ملہار گاتا ہوا لوک جیون میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس مغنّی کی آواز میں لوچ ہے، درد ہے، رس ہے اور اس کے گلے میں نور ہے۔ عوام، ہر جگہ کے عوام، ہر خطۂ ارض کے عوام اُس کی لے میں لے ملا کر، اپنی اپنی بولی میں، اپنے اپنے انداز کے ساتھ، موج میں آکر گا اٹھتے ہیں۔ اپنے دُکھ سُکھ کے گیت، دھرتی اور اکاش کے گیت، میگھ اور پپیہے کے گیت، چاند تاروں کے گیت، زندگی اور اُس کے جادو کے گیت، لوک گیت!

گیت جب سنگیت میں ڈھل جاتا ہے اور شعر جب نغمے میں ڈوب جاتا ہے، تو اقلیم دل پر جذبات و احساسات کی شدت کا طوفانی راج ہوتا ہے۔ اُس وقت دل کسی بھی قانون کو خاطر میں نہیں لاتا، بلکہ ایک اور نئی تڑپ کی تمنا میں زور زور سے دھڑک اُٹھتا ہے۔ اینڈریو فلیچر نے خوب کہا ہے کہ "مجھے لوک گیت بنانے دو! پھر مجھے پروا نہ ہوگی کہ دیس کے لیے قانون کون بناتا ہے۔"

لوک گیتوں کا تعلق براہِ راست جذباتِ انسانی سے ہے۔ عین ممکن ہے کہ "پتھر" اور "دھات" کے زمانے سے قبل کا انسان بھی کبھی شدتِ جذبات سے چیخ اُٹھا ہو اور یقیناً اُس کے غم اور مسرت کی چیخوں میں کچھ فرق بھی ہوگا، جیسے رونے اور ہنسنے میں۔ میرا خیال ہے انہی چیخوں سے شاعری اور موسیقی کا آغاز ہُوا۔ ابتدا میں چیخیں جذبات اور اظہارِ جذبات دونوں کو محیط ہونگی اور بعد کو ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی یہی چیخیں بولیوں میں اور بولیاں زبانوں میں تبدیل ہو گئیں۔

ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ نے تعلیمِ بالغاں کے نصاب کے لیے لوک گیتوں پر جو کتابچے شائع کیے ہیں، اُن میں لوک گیت سے متعلق لکھا ہے:

> "لوک گیت اُن گیتوں کو کہتے ہیں جنھیں گانوؤں میں لوگ خوشی میں اور موج میں آکر گاتے ہیں، جنھیں استریاں (عورتیں بیاہ شادیوں کے دنوں میں گاتی ہیں۔ یہ گیت لوگوں کے منہ سے آپ ہی آپ پھوٹ نکلتے ہیں۔ ان میں ان کے من کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں، دُکھ درد، سبھی کچھ ہوتے ہیں۔ یہ گیت لوگوں کی اپنی پیاری بولی میں ہوتے ہیں۔

ان گیتوں میں ایک کوی (شاعر) کے لیے کمال کی کویتا (شاعری) ہے۔ ایک وِچارشیل (مفکر) کے لیے پہیلیوں اور معموں کا شوجھ بوجھ بھری پڑی ہے۔ ایک وِدوان (عالم) کے لیے یہ گیت لوگوں کے پرم پرا (روایات) میں چلے آئے ریتوں اور رواجوں کا خزانہ ہے۔" (بھوج پوری لوک گیت، ۲)

قیاس چاہتا ہے کہ ابتدا میں اَن پڑھ مرد عورتوں ہی نے یہ گیت گڑھے ہونگے۔ اور جہاں تک گیتوں کی قدامت کا تعلق ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ یہ گیت بھی اتنے ہی پرانے ہیں جتنے آدم اور حوّا، شو اور پاربتی۔ اور نئے بھی اتنے ہیں کہ سورج کی پہلی کرن پھوٹی، کلی نے چٹک کر شبنم کے جل ترنگ پر بھیرویں کی الاپ اُڑائی:

ایک ہی نجریا میں جیورا لُبھایا
مورا صنم چِت چور رہے!

نسیمِ صبح نے نوشگفتہ غنچوں کو آغوش میں لے کر بہار کا ترانہ چھیڑا:

بھور بھئی مُسکائیں کلیاں
رُت نے کیا سنگار رے!

پنگھٹ پر کسی الھڑ دوشیزہ نے انگڑائی لے کر چھلکتی ہوئی گاگر سے گیت برسائے:

میں نے پہلے ہی تم سے کہی تھی، سکھی!
بے ایمانوں سے پیت نہ کریے
اپنی گرج کے یار ہیں یہ سب
ایسوں پہ کاہے کو مریے

دُور، کسی گوالے نے الغوزے پر تان اُڑائی:

رات جہاں تھے، پھر وہیں جاؤ!
کاہو اب آئے مورے آنگنوا؟

کھیت کاٹتے ہوئے صحتمند کسان لڑکیوں کے شوخ ہونٹوں سے "پردیسی ڈھولا" کے بول پھوٹ پڑے:

برج کے میگھ ملہار

پردیسی پیت نبھانا رے!
کہیں موہے بھول نہ جانا رے!

دھوبی گھاٹ پر نوخیز دھوبن نے لہرا کر "چھپی اورام" کے قدیم لہرے کو جدید قلمی دھن میں ڈھال دیا:

بھور بھئی، گھر جا رے ساجن!
دیکھ کہیں بدنامی ہوگی
چھپی اورام، چھپی اورام!

مزدوروں نے "ہیّا ہیّا" کے ساز پر پُرعزم گیت چھیڑا:

جنگ نہ ہونے دینگے، ساتھی! جنگ نہ ہونے دینگے
ہیّا ہیّا، ہیّا ہیّا

ساون رُت، زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے، دھنک کے ہنڈولے میں جھولتی، میگھ ملہار گاتی ہوئی آئی:

پہلے ہی سے نینا تھے چنچل
پھر اس پہ غضب ہے یہ کاجل
دکھلادے جھلک تو، ایک پلک
ذرا اور اُٹھا مکھ سے آنچل!

اور پھر: پیم کی چوٹ ہے بالے پن سے
بیکل ہوں میں بہت دنن سے
ڈولی ڈولا کچھ بھی لاؤ
آ جھٹ جا کے ملونگی سجن سے!

پھاگن رُت آئی، اور گُلال اُڑاتی اور چھیڑ دیا ڈفلی پر پھاگ:

کہو شیام! کہاں تھے پھاگن میں؟
ناہیں موں سے اُلجھاؤ باتن میں

برکھا کے میگھ ملہار

رس بھرے نینا کسم رنگ ہو گئے
رات کٹی کہیں جاگن میں!
زرا چترائی سے کھیل ہوری
شیام! آئی ہوں چوری چوری
ساری پہ موری دھبّا نہ آئے
چولی ہی رنگ دے موری!

غرض ہر نئی رت اپنے رنگین آنچل میں نئے نئے گیت لے کر آتی ہے اور پرانے گیتوں کا بھرپور بھنڈار چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

انسانی زندگی کے سارے بھیدلے لوک گیتوں میں جھلمل جھلمل کرتے ہوئے ابھرتے ہیں، اور وقت کے دھارے کے ساتھ کروٹ بدلتے ہوئے بہتے رہتے ہیں۔ سنسکرت کے ایک وِدْوان نے تو اپنی جدید تحقیق میں یہاں تک کہا ہے کہ وید مقدس کے منترا ور شلوک قدیم گڈریوں کے لوک گیت ہیں۔ اس انکشاف سے لوک گیتوں کی قدامت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ "کاہن یا برہمن کال" سے لے کر "ساونت کال"، "مہاجن کال" اور آج کے "مزدور کال" تک یا "ست یگ" سے لے کر "تریتا یگ"، "دواپر یگ" اور "کل یگ" تک لوک گیتوں نے ہر کال اور ہر یگ کی عکاسی بڑی چابکدستی سے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ گیت ہر یگ اور ہر کال میں، ہر رنگ اور ہر حال میں سدا بہار رہے ہیں اور سدا بہار رہیں گے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد کے مقابلے میں عورت نے زیادہ گیت گائے ہیں شاید اس لیے کہ عورت بذاتِ خود ایک نغمہ ہے، ایک گیت ہے۔ عورت فطرت کا بہترین شاہکار ہے۔ اس کی ہر ادا، ہر انداز، غرض اس کی فطرت کا ہر پہلو نغمگی کا مترادف ہے۔ وہ جب سرسوتی کا روپ دھارن کرتی ہے، تو من بینا کے تار اس طرح چھیڑتی ہے کہ ملہار رنگ اور اس کی پھوار پڑنے لگتی ہے! اور جب چنڈی کا روپ دھارتی ہے، تو اس کے "کھپر" سے آگ، خون اور انتقام کا بھیانک راگ پھوٹ پڑتا ہے۔ اور چونکہ عورت

مرد کے مقابلے میں فطرتاً زیادہ حساس اور جذباتی ہے، اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ سب سے پہلے عورت ہی نے اپنے احساسات و جذبات کو گیت میں ڈھالا ہوگا، اس کے بعد مرد بھی اس کا ہمنوا و ہم آواز ہوگیا۔ نروتم داس سوامی لکھتے ہیں :

> "ناری (عورت) نے کتنا گایا ہے... ماں کے منہ سے نکلی لوریوں کی گود میں نوجات شِشو (نوزائیدہ بچّہ) سویا اور جاگا۔ بالک نے جنیؤ (زُنّار) پہنا، گیت گائے گئے؛ وہ پڑھنے بیٹھا، گیت گائے گئے؛ سگائی ہوئی، گیت گائے گئے؛ بیاہ ہوا، ہرش (خوشی) میں پاگل بنی ماتا "بنڑے"، گوانے بیٹھی؛ نو بدھو (نو عروس) گھر آئی، گیتوں نے اس کا سواگت کیا۔ گھر میں اُتسو (تقریب، جشن) ہوا، بنا گیتوں کے کیسے منایا جائے؛ تہوار آئے، گیتوں کا گایا جانا انوار یہ (ناگزیر) ٹھہرا۔ ہمارا سمست (تمام) گرہست جیون (ازدواجی زندگی) ناری کا گان (نغمہ) ہے۔" (ٹبلندھ منجری: ۱۶۸)

اس کے علاوہ بھائی بہن کا پیار، سسرال میں نئی دلہن کی حالت، ساس نند کے مظالم، جیٹھانی کا رعب داب، دیورانی کی ہمدردی، بانجھ عورت کی زندگی اور لوگوں کے طعنے، ازدواجی زندگی، پردیسی پیا کا انتظار، برہا کی راتیں، سُونی سیج، رُوٹھنا، منانا۔ غرض عورت نے زندگی کے ہر موضوع کو گیت کا جامہ پہنایا ہے۔

گانو میں آج بھی دستور ہے کہ فرصت کے لمحوں میں بڑی بوڑھیوں کو گھیرے، نوجوان لڑکیاں نئے نئے گیت سیکھنے اور گانے کی مشق کیا کرتی ہیں۔ بڑی بوڑھیوں کا پھٹا ہوا گلا اور کانپتی ہوئی موٹی آواز چرخے کی گھوں گھوں، اور چھاج کی پھٹ پھٹ، کے ساتھ مل کر اور بھی بھیانک ہو جاتی ہے، لیکن گانو کی الھڑ اور معصوم دوشیزاؤں کے لیے ان کے یہ بول بھی تان سین کی تانی کی مدھر تانوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ اور جب یہ دوشیزائیں بھی بڑی بوڑھیوں کے ساتھ مل کر گانے لگتی ہیں، تو سماں بندھ جاتا ہے۔ مدھم اور پنچم سُر ہم آہنگ ہو کر ایک سحر آفریں کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ اُس وقت بڑی بوڑھیوں کی موٹی اور بھدّی آواز بھی ترنّم ریز ہو جاتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سنگیت کی دیوی

سنگیت کلا سے گلے مل رہی ہو۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس مشق میں کوئی ساز نہیں ہوتا کیونکہ فرصت کے یہ لمحے بھی معروفیت کے ہوتے ہیں۔ کوئی چرخہ کات رہی ہے، کوئی چھاج سے اناج صاف کر رہی ہے، کوئی سینے پرونے میں محو ہے، کوئی گیہوں کی تیلیوں سے پنکھا اور ٹوکری بُن رہی ہے غرض گھریلو دستکاری کا یہ مرکز، "سنگیت کلا کیندر" بن جاتا ہے۔ لیکن کسی خاص تقریب، شادی بیاہ، جنم دن، تیج تہوار وغیرہ پر بھی ان کا آرکیسٹرا بہت مختصر ہوتا ہے۔ ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ سم تال پر تالیاں بجا کر تال دینا، ڈھولک کی گمک سے پاؤں کی دھمک ملا کر بچھوؤں اور جھانجھنوں کی جھنکاریں الاپنا، بس یہی ان کا ساز سنگیت ہوتا ہے۔ بعض تقریبوں پر رقص بھی ہوتا ہے، کبھی "موَن ناچ" (رقصِ خاموش) اور کبھی "گان ناچ" (رقصِ نغمہ)۔

لوک گیتوں میں گاؤں کی بھرپور زندگی اس طرح لہراتی نظر آتی ہے، جیسے گاؤں کے پنگھٹ پر پانی بھرتے ہوئے کسی شوخ پنہاری کی نازک کمر بل کھا رہی ہو، اور اس کا رنگین آنچل ہوا میں اُڑ رہا ہو۔ دور! جیسے کسی گوالے نے اپنے الغوزے میں نغمہ پھونک دیا ہو، اور کھیتوں کی رکھوالی سانولی لڑکی نے انگڑائی لی ہو۔ جوہڑ کے پار گائے بھینسوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اُٹھی ہوں۔ جیسے کھیت کاٹتے ہوئے صحتمند وحسین کلائیوں میں، درانتی کے جھٹکے کے ساتھ گاتی ہوئی چوڑیاں کھنک اُٹھی ہوں اور کھلیانوں میں غلّے کے انباروں سے نئی زندگی کے سوتے پھوٹ پڑے ہوں۔

ان گیتوں کو اگر گاؤں کی "منظوم روایات" کہا جائے، تو زیادہ مناسب ہوگا۔ زمانۂ قدیم میں گاؤں کے اَن پڑھ لوگ اپنی روایتوں کو گیتوں کے ذریعے ہی محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اور آج بھی اس علم و ادب اور سائنس کی ترقی کے دور میں، گاؤں میں روایت پرستی کا قدیم رجحان بدستور باقی ہے۔ ان گیتوں سے گاؤں کی زندگی، گاؤں کا مزاج، گاؤں کے معتقدات، گاؤں کے رسم و رواج اور گاؤں کے سیاسی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی نظریات کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے ان گیتوں میں بڑا تنوع ہے۔ مثلاً شادی بیاہ کے گیت، زچہ بچہ کے گیت، تہواروں کے گیت، فصلوں کے گیت، برہا کے گیت، پنگھٹ کے گیت، جھولے کے گیت، میلوں ٹھیلوں کے گیت، چولھے چکی کے گیت، دودھ بلونے کے گیت، اُپلے پاتھنے کے گیت، اور اس کے علاوہ پیشہ وروں اور دستکاروں کے گیت جیسے دھوبی گھاٹ کے گیت، کولھو کے گیت، دھنیے کے گیت وغیرہ گویا گاؤں والوں کی زندگی گیتوں سے عبارت ہے۔ کیونکہ لوک گیت عوام کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ عوام ہی صحیح معنوں میں گیت کار ہیں۔ میکسم گورکی کا بھی یہ قول ہے کہ "عوام ہی ازلی گیت کار ہیں"۔ اس حقیقت کی تائید اس حد تک اربابِ فکر و نظر نے کی ہے کہ آج یہ ایک کلیہ بن گئی ہے۔ مثلاً روس کا مشہور ادیب اور ناول نگار نکولائی گوگول (۱۸۰۹ء-۱۸۵۲ء) لکھتا ہے:-

> گیت میرا سرچشمۂ مسرت ہے، گیت میری زندگی ہیں۔ مجھے ان سے والہانہ محبت ہے۔ ہر گیت لوک تاریخ کا ٹکڑا ہے — جیتا جاگتا، روشن و تابندہ، رنگ و صداقت سے بھرپور اور عوام کی پوری زندگی کا آئینہ دار — جو ادیب عہدِ پارینہ کی روح کو محسوس کرنے کا خواہشمند ہے، اُس کے لیے گیت ایک بیش بہا چیز ہے۔
>
> (تاراس بلبا: ۵)

۱۔ مدھوبن

ساون کی سہانی رُت ہے۔ نیل گگن میں اُمنڈتی گھنگھور گھٹائیں، اپنے شانوں پر سیاہ زلفیں بکھرائے، کسی بدمست رندِ شرابی کی طرح جھومتی، لہراتی، لڑکھڑاتی، سنبھلتی چلی آ رہی ہیں جیسے راجا اندر کے اکھاڑے کا تمام "سوم رس" چُھپا کر چڑھا آئی ہوں۔ اُن کی نیم وا آنکھوں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی سیاہ پلکوں سے کبھی سرخوشی، کبھی سرمستی، کبھی بدمستی اور کبھی سیہ مستی کے کوندے

برج کے میگھ ملہار

ل اُمڈتے ہیں۔ مور چنگھاڑ رہے ہیں۔ پپیہے "پی، پی" کی رٹ لگا رہے ہیں۔ نرم نرم پھواریں
ز رہی ہیں۔ بندرابن کے ایک کنج میں "رادھا" اور "نند کشور" جھولا جھول رہے ہیں۔ جھڑی
ا رم جھم سے گیت پھوٹ رہے ہیں:

ساون[1] آیو سگھڑ[2] سہاونو[3] جی ! — ۱۔ ساون ۲۔ خوش سلیقہ ۳۔ سہاونا
اے ری کوئی گھٹا اُٹھی گھنگھور !
اِت[4] گھن[5] چمک دامنی[6] جی — ۴۔ ادھر ۵۔ بادل ۶۔ بجلی
اے ری کوئی اِت گھن بولت مور — ساون آیو…
پپیہا پیا پیا رٹ رہے جی
اے ری کوئی مور مچا رہے شور — ساون آیو…
رِم جھم رِم جھم بہنا! میری جھبر لگیو جی
اے ری کوئی من لے رہیو ہلور[7] — ساون آیو… — ۷۔ بہر
جھولا تو جھولے بہنا میری کنج میں جی
اے ری کوئی رادھا، نند کشور — ساون آیو سگھڑ سہاونو جی ! (ہریالی تیجن)

گوپیاں آپس میں باتیں کر رہی ہیں: "سکھی ری! چلو تو درشن کری آئیں۔" "کدم کی ڈار" میں جھولا پڑا ہے۔ ایک طرف "رادھکا" اور دوسری طرف "کرشن مرار" جھولا جھول رہے ہیں۔ سکھی ری! اُن کی مایا اپرم پار (بیکراں) ہے۔ سکھی ری! ساون من بھاون آگیا ہے اور آج "تیجن" کا تیوہار بھی ہے۔ سکھی ری! "برج راج" کے درشن کرو، تو بیڑا پار ہو جائے:

سکھی ری! چلو تو درشن کری آئیں
جھولا ڈارو کدم کی ڈار
سکھی ری! ایک لنگ[8] جھولیں رادھکا — ۸۔ طرف
کوئی ایک لنگ کرشن مرار — سکھی ری…
سکھی ری! پھولن کو جھولن ڈارو
کوئی پھولن کو کیو ہے سنگار — سکھی ری…

برج کے میگھ ملہار

سکھی ری! من موہن من موہتے
جاکی مایا اپرم پار — سکھی ری ...
سکھی ری! ساون من بھاون آیو
اے ری کوئی تیجن کو تیوہار — سکھی ری ...
سکھی ری! درس کرو برج راج کے
کوئی ہے جائے بیڑا پار — سکھی ری! چلو تو درشن کری آئیں! (ہریالی تیجن)

برج بالائیں ملہار گاتی، مدھوبن کی اور چل پڑتی ہیں۔ اُن کے بیر بہوٹی ایسے ہونٹوں پر ملہار کے مدھر بول متحرک رہے ہیں: "چلو سکھی! جھولن چلیں، مدھوبن گڑ صیو ہنڈولنا" "چلو سکھی! جھولا جھولنے چلیں، مدھوبن میں ہنڈولا گڑا ہے۔ ایک سکھی پوچھتی ہے: "ہنڈولنا" کاہے کا ہے اور کاہے کی بگ ڈور ہے؟ دوسری سکھی جواب دیتی ہے: چندن(۱) کا ہنڈولنا ہے، اور ریشم کی بگ، ڈور ہے۔ ایک اور سکھی سوال کرتی ہے: رادھا کا رنگ کیسا ہے اور گھنشیام کا کیسا؟ دوسری جواب دیتی ہے، رادھا گوری ہے اور گھنشیام کالے ہیں۔ ایک اور سکھی پوچھ بیٹھتی ہے: رادھا کہاں کی رہنے والی ہے؟ اور گھنشیام کہاں کے باسی ہیں؟ ایک سکھی بول اُٹھتی ہے: رادھا برسانے کی اور گھنشیام نندگام کے ہیں۔ ایک سکھی جاننا چاہتی ہے کہ رانی رادھکا کس کی پتری ہیں اور گھنشیام کس کے پتر ہیں؟ جواب ملتا ہے: رانی رادھکا برکھ بھان کی بیٹی ہیں، اور گھنشیام نند بابا کے بیٹے ہیں:

چلو سکھی! جھولن چلیں، مدھوبن گڑ صیو ہنڈولنا!
کاہے کوری ہنڈولنا؟ کاہے کی بگ ڈور؟ — مدھوبن...
چندن کوری ہنڈولنا، ریشم کی بگ ڈور! — مدھوبن...
کون برن(۱) رانی رادھکا؟ کیسے برن گھنشیام؟ — مدھوبن... — ۱۔ رنگ
گورے برن رانی رادھکا، شیام برن گھنشیام! — مدھوبن...
کہاں ری رہیں رانی رادھکا؟ کہاں ری رہیں گھنشیام؟ — مدھوبن...
برسانے کی رانی رادھکا، نند گام گھنشیام! — مدھوبن...

کس کی ہیں رانی رادھکا؟ کس کے ہیں گھنشیام! مدھوبن...
برکھبھان کی رانی رادھکا، نند بابا کے گھنشیام! مدھوبن کو ڈھونڈ ھوتا!

(شریمتی پربھاوتی۔ حسن پور)

اِس طرح "رادھے شیام" کا گن گان کرتی، برج بالائیں مدھوبن پہنچ جاتی ہیں، اور اُس نٹ کھٹ گوالے کی بلائیں لینے لگتی ہیں۔ وہ بھی ازراہِ شوخی اپنی بانسری میں ایک ایسا نغمہ پھونک دیتا ہے کہ سب گوپیاں بے سُدھ ہو جاتی ہیں۔ انھیں اب نہ تو لوک لاج کا ڈر ہے اور نہ گھونگھٹ کا پلو ہی کھل جانے کا خوف۔ للتا اور بِساکھا دونوں جُھو دیتی ہیں۔ اور کالی کملی والے، رادھا کے ساتھ بڑے مزے سے جھولا جھول رہے ہیں۔ گوپیاں مور مکٹ پر مٹی جا رہی ہیں:

عجب بہار تیرے مور مُکُٹ کی عجب بہار!
ہنسی میں کانھا نے میرو من ہر لیو
میرے ہردے کھٹکی عجب بہار! مور مُکٹ کی عجب بہار
لاج شرم سب کانھا میں نے تج دی رے
کوئی گھونگھٹ پٹ کی عجب بہار! مور مُکٹ کی عجب بہار
للتا، بِساکھا دوؤ[1] چھب نرکھتی[2] جی ۱۔ دونوں ۲۔ دیکھتی
کوئی جمنا تٹ کی عجب بہار! مور مُکٹ کی عجب بہار
کاری کمریا[1] بھنا نیکی[2] موہے لاگے ۱۔ کالی کملی ۲۔ اچھی
یہاں ناگر نٹ کی عجب بہار! مور مُکٹ کی عجب بہار (پھول للّا تیجن)

ان چھوٹے چھوٹے ملہاروں میں رادھا اور کرشن کے جنم بھوم، رنگ روپ، حسب نسب، پیار پریت، ساون رُت کی رنگینیاں اور رعنائیاں، گوپیوں کا والہانہ عشق، للتا اور بساکھا (رادھا کی پیاری سکھیاں) کا پریم، پھولوں سے لدے ہوئے چندن کے ہنڈولے، ریشم کی ڈور، پھولوں کا سنگار، ہنسی کی مدھر تان، کدم کے جھکتے پیڑ، کرشن کا مور مکٹ، کالی کملی، جمنا تٹ اور مدھوبن کے ہنستے اور گاتے کنج، کنجوں میں ناچتے مور، چہکتے

پپیہے اور ساون من بھاون کی رم جھم میں لہکتے برج بالاؤں کے میگھ ملہار — برج منڈل کا وہ رنگین وحسین اور مست رُومانی ماحول ہے، جہاں بقول امیر مینائی:

لچک ہے شاخوں میں، جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

ایک گیت میں "شرنگار رس" کے ساتھ ساتھ "بھگتی رس" بھی ملتا ہے، جس میں کرشن جی، اوتار کے رُوپ میں اُبھرتے ہیں۔ اُن کی مایا اَپرم پار ہے۔ اُن کی بھید کوئی نہیں جان سکتا۔ اُن کے صرف درشن کر لینے ہی سے انسان کو آواگون کے چکر سے نجات مل جاتی ہے۔ غرض فلسفۂ نجات کے ساتھ ہی جذبۂ عقیدت اور بھگتی کا رنگ بھی صاف جھلکتا ہے۔ برج باسیوں کا دن رات کا وظیفہ ہے، "رادھے رادھے"، "رادھے شیام"۔ کچھ صرف "رادھا" کے پجاری ہیں، کچھ صرف "کرشن" کے، اور بیشتر دونوں کے۔ متھرا اور بندرابن کے مندروں میں آج بھی کتنے ہی مرد عورتوں کے لباس میں "گوپی بھاو" میں کرشن کی اُپاسنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور کتنے ہی "سکھا بھاو" میں گوالے کا بھیس بنائے اپنے ساتھی (کرشن) کی تلاش میں جمنا کنارے، کدم کی چھاؤں میں اور مدھوبن کے کنجوں میں گھومتے ہوئے مل جاتے ہیں۔

بعض بھگت رادھا کے مرتبۂ محبوبیت کو دیکھ کر رشک کرتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں:

رادھا! تو بڑ بھاگنی[1]، کون تپسیا[2] کین[3]
تین لوک تارن ترن[4] سو تیرے آدھین[5]

[1] خوش بخت [2] ریاضت [3] کی [4] تینوں لوکوں کا نجات دہندہ [5] محتاج

غرض ان گیتوں میں مجاز و حقیقت، حسن و عشق، بھگتی اور اُپاسنا کا حسین سنگم ہے۔

۲۔ بانسری کا جادو

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سارا برج منڈل نیند کے آغوش میں تھا۔ مگر ابھی جاگ رہا تھا پپیہا۔ اور جاگ رہی تھی، ساون کی جھڑی پپیہا "پی کہو"، "پی کہو" کی تان اُڑا رہا

تھا، اور جھڑی نے چھیڑا تھا، رِم جھم سنگیت۔ ایسے میں نٹ کھٹ شیام کو شرارت سوجھی، تو کدم کنج میں بیٹھ کر، بانسری میں ایسا نغمہ پھونکا کہ رادھا کی نیند اُچاٹ ہو گئی، اور وہ بستر ناز پر کروٹیں بدلنے لگی۔ آدھی رات، پپیہے کی پکار، ساون کی رِم جھم، بانسری کا نغمہ — فضا میں ایک سحر آفریں کیفیت لہرا اُٹھی۔

بانسری کی مدھر، موہنی تان سُن کر رادھا بے چین ہو گئی۔ اُس کے انگ انگ میں کرشن کے ملکوتی امر پریم کی ترنگ ناچ اُٹھی۔ اُس کا رُواں رُواں، "شیام شیام" پکار اُٹھا۔ اور وہ بنسی والے کے پاس جانے کے لیے بیتاب ہو گئی۔ اُس نے اپنی سکھی سے کہا: بہن! آدھی رات بیت گئی۔ پپیہا "پی کہاں"، "پی کہاں" کی دُھن میں مست ہے۔ شیام کی بنسی بج رہی ہے، میری آنکھوں میں اب نیند کہاں! اب مجھے یہ گھر آنگن کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میں اپنے شیام کے پاس کیسے جاؤں؟ برسات نے الگ دُھوم مچا رکھی ہے، برج میں نند بابا کا انوکھا چھیلا بھی بڑا اوتاری ہے۔ ہر روز نئی نئی شرارتیں کرتا ہے:

اری بہنا! پپیہا تو بولیو آدھی رات!   بجائی بنسی شیام نے!
سو وت سے بہنا! میں تو جگ پڑی،
اری بہنا! گھر انگنا نہ سُہات!   بجائی بنسی شیام نے!
کیسے تو جاؤں جیو رے شیام کے   ۱۔ پاس
اری بہنا! برس رہی ہے برسات!   بجائی بنسی شیام نے!
برج میں انوکھو چھیلا نند کو   ۲۔ انوکھا
اری بہنا! روج کرے اُتپات!   بجائی بنسی شیام نے!

۳۔ روز ۴۔ شرارت   (پھول وتی)

بھلا ساون کی جھڑی رادھا کا راستہ کیا روکتی! بڑے سے بڑا طوفان بھی اب اُسے نہیں روک سکتا تھا۔ وہ چپکے سے گھر سے نکلی، اور رات کی تاریکی میں، بانسری کی دُھن پر لہراتی، جھومتی کدم کنج میں پہنچ گئی۔ شیام کی بنسی نے بُلاوے کی طرز چھوڑ کر ملن کی دُھن بجانی شروع کر دی۔

بن کی دُھن سُن کر گوپیاں بھی جاگ اُٹھیں۔ وہ بھی اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑی ہوئیں، اور ندی کنارے کدم کنج میں آ دھمکیں۔ گھر گھر بلاوا سا لگ گیا: "اری بہن! پاس پڑوس سب گئیں، تم ابھی تک گھر ہی میں براجمان ہو۔"

مُرلی کی دُھن سے بے سُدھ گوپیاں آپس میں باتیں کرتی جا رہی ہیں: "اری بہن! یہ مور مکٹ والا، جس نے اپنی کمر سے پٹکا کھینچ کر باندھ رکھا ہے، بڑا چت چور ہے۔ یہ تو میرے من میں بس گیا ہے۔ ادھر سُہانے ساون نے من میں ہلچل پیدا کر رکھی ہے، اُدھر شیام کی بانسری نے برج منڈل میں دھوم مچا رکھی ہے:

اری بہنا! بجی تو باجی گھنگھور! کانھا کو چل کر دیکھنا!

پاس پڑوسن بہنا! سب گئیں

میری بہنا! جمنا جی کی اور! کانھا کو چل کر دیکھنا!

مور مکٹ، کٹی کا چھنی انکر ۲۔ پٹکا

میری بہنا! من میں بسو ہے چت چور! کانھا کو چل کر دیکھنا!

ساون ماس سُہاونا جی

میری بہنا! من میں اُٹھت ہلور! کانھا کو چل کر دیکھنا!

باجی زری، باجی بجی سب کہیں

میری بہنا! مچ رہیو برج میں سور! کانھا کو چل کر دیکھنا! (نندتی)

بس پھر کیا تھا! "کدم کنج" میں گوپیوں کے جھرمٹ میں شیام کی بانسری کی تان پر رادھا نے میگھ ملہار چھیڑ دیا۔ گوپیوں نے رقص شروع کر دیا۔ ایسا سماں بندھا کہ سیاہ بادلوں کے دَل مستانہ وار کدم کنج پر چھا گئے اور گوپیوں کے رسیلے گیتوں کی دُھن پر رِم جھم برسانے لگے۔ درختوں کو حال آ گیا۔ کدم کی شاخیں جھکنے لگیں)۔ دیر تک سماں لیا رہی۔ پھر شیام نے اپنی پیاری رادھا کو "رتن ہنڈولے" میں جھلانا شروع کیا۔ دوشیزائیں مگن ہو کر ملہار گاتی رہیں اور ساون سُن بھاؤن کی بہار پر نکھار آتا رہا:

شیام بجاتی بہنا! رس بانسری جی!

اے جی کوئی رادھا نے گائی ہے ملہار!

ڈمن ڈمن میگھوا کے دَل چھائے جی! ۱۔ بادل
اے جی کوئی جمنا جی کی پار! شیام بجائی بہنا! رس بانسری جی!
رِم جھم رِم جھم بہنا میری جھڑ[۲] لگو جی! ۲۔ جھڑی
اے جی کوئی جھکی ہے کدم کی ڈار[۳]! شیام بجائی بہنا! رس بانسری جی! ۳۔ ڈالی
رتن ہنڈولے میں رادھا جھولتی جی!
اے جی کوئی جمنا جی کی پار! شیام بجائی بہنا! رس بانسری جی!
ہریالی میں بن مالی کھڑے جی!
اے جی کوئی مگن بھیس برج نار! شیام بجائی بہنا! رس بانسری جی!
آیو ہے ساون من بھاونوں جی!
اے جی کوئی چھائی عجب بہار! شیام بجائی بہنا! رس بانسری جی! (للتا کماری)

رس بانسری بجتی رہی۔ رس برستا رہا۔ رقص ہوتا رہا۔ گھٹائیں اُمنڈتی رہیں۔ رِم جھم رِم جھم ہوتی رہی۔ رتن ہنڈولا جھولتا رہا۔ کدم کی ڈالی لچکتی رہی۔ کدم کنج جھومتا رہا۔ رادھا گاتی رہی۔ گوپیاں مست ہو کر ناچتیں رہیں اور راس لیلا ہوتی رہی۔

یہ تھا بانسری کا جادو! جس کی ڈمن ڈمن کر رادھا باولی ہو جاتی تھی۔ گوپیاں سُدھ بُدھ بِسرا کر گھر سے نکل پڑتی تھیں، جس کی آواز سُن کر گائیں دوڑی آتی تھیں، جس کی تان پر جمنا کی لہریں رقص کرتی تھیں، کدم کی ڈالیاں جھومتی تھیں، گھٹائیں اُٹھتی تھیں اور برستی تھیں، پپیہا "پی پی" کی رٹ لگاتا تھا۔ غرض شیام کی رس بانسری پر سارا برج منڈل سر دھنتا تھا اور بے سُدھ ہو جاتا تھا۔

ان چھوٹے چھوٹے میگھ ملھاروں میں رادھا کرشن کے پریم کی امر کہانی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان گیتوں میں "شرنگار رس" اور "بھگتی رس" کا سنگم ہے۔ ایک طرف حسن و جمال ہے، موسیقی اور رقص ہے، والہانہ عشق ہے، ایک رومانی فضا ہے، جس سے ذوقِ جمالیات آسودہ ہوتا ہے اور جس سے ہر فنِ لطیف کی تخلیق ہوتی ہے، تو دوسری طرف عقیدت ہے، تقدیس ہے، حقیقت ہے، بھگتی ہے، عبادت ہے، وحدت ہے، کثرت ہے،

یوگ ہے، ایسی الوہی فضا ہے، جس میں ایک کرشن بھگت کی اُپاسنا کے سارے اسباب موجود ہیں۔ غرض ان ملہاروں میں مجاز اور حقیقت کا حسین امتزاج جھلکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھارت کی تقریباً تمام علاقائی زبانوں میں، خالص جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی رادھا کرشن کی داستانِ عشق ادبی شہ پارہ بن گئی ہے۔ نیز دیگر ہندستانی فنونِ لطیفہ، مصوری، بُت تراشی، رقص، موسیقی وغیرہ میں بھی رادھا کرشن کے پریم کے غیر فانی شاہکار موجود ہیں۔

آج بھی کدم کنج میں، آدھی رات کے سمے جب ساون کی رم جھم میگھ ملہار چھیڑتی ہے اور پپیہا "پی کہو"، "پی کہو" کی رٹ لگاتا ہے تو شیام کی رس بانسری کی رسیلی تان صاف سنائی دیتی ہے۔

۲۔ ہنڈولا

ساون رُت، گاؤں کی مخمور فضاؤں میں جھومتی ہوئی کالی گھٹائیں، گھنگھور گھٹاؤں کے آغوش میں مچلتی ہوئی شوخ بجلیاں، ٹھنڈی ٹھنڈی، نرم نرم پھواروں سے لدی ہوئی مست ہوائیں، دُور، لہلہاتے کھیتوں سے پرے، آم اور جامنوں کے جھنڈ میں کوئل کی دلسوز کُوک، جوہڑ کے پار پپیہے کی مسلسل پکار، باغوں کی روش پر ناچتے ہوئے موروں کی جھنکار، پیڑوں میں پڑے ہوئے جھولے، آنگن میں گڑے ہوئے ہنڈولے، ہنڈولوں میں جھولتا دیہاتی حسن، حسینوں کے بڑھتے ہوئے پینگ، ہوا میں لہراتے رنگین آنچل، فضاؤں میں بکھرے ہوئے گیت — دیہات کا وہ حسین ماحول ہے، جہاں شاعری جنم لیتی ہے اور موسیقی پروان چڑھتی ہے۔

ساون کا مہینا ہے۔ یہ مہینا ہندستان کا موسمِ بہار ہے۔ پھاگن کے مہینے کی مستیاں مسلّم مگر ساون کی رعنائیاں ہندستانی خصوصیات میں اپنی جگہ پیدا کر چکی ہیں۔ ساون کی اُمنڈتی ہوئی گھٹاؤں نے حسن و شباب کو متوالا بنا دیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بُوندوں میں شرابِ ارغوانی کی روح سمٹ آئی ہے۔ جذبات و احساسات انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ جوانی جوانی کے ساتھ پریم کی پینگ بڑھانے کو بےچین ہے۔ گھر کے آنگن میں حسینوں کا جمگھٹ ہے۔ لیکن

برج کے میگھ ملہار

ابھی تک ہنڈولا نہیں گڑا ہے۔ جھومتا ہوا متوالا حسن جھولے کے لیے بیتاب ہے۔ آخر ایک نئی نویلی دلہن اپنے شوہر سے فرمائش کرتی ہے:

چندن رُوکھ کٹائیے، ہنڈولا گڑھائیے جی مہاراج! ١- درخت

اے جی ریشم ڈور بٹائیے، ہنڈولے بیچ ڈاریے جی مہاراج!

اے جی جھولینگی تہاری برج نار، جھوٹا تو دینگے دھن[٢] کے صاحبا[٣] جی مہاراج! ٢- محبوب، ٣- عاشق

اے جی رِم جھم برسینگے مینہ، چونڈر[٤] دھن کی بھیجتی[٥] جی مہاراج! ٤- چنری ٥- بھیگتی

فرمائش کی دیر تھی کہ آنگن میں چندن کا ہنڈولا گاڑ دیا گیا۔ جب محبوبہ نے اپنی چنری بھیگنے کی شکایت کی، تو "دھن کے صاحبا" نے از رہِ شوخی کالا کمبل اوڑھنے کو کہا:

اے جی چونڈر دھر دو نہ اُتار، اوڑھو ناکاری[٦] کامری[٧] جی مہاراج! ٦- کالی ٧- کملی

"دھن" اور اس کی سہیلیاں جھولا جھول رہی ہیں۔ "دھن کے صاحبا" جھلا رہے ہیں۔ آپس میں چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ اتنے میں "صاحب" کے کچھ دوست آجاتے ہیں۔ جب "دھن" کو دوستوں کے لیے حقہ بھرنے اور آگ لانے کے لیے کہا جاتا ہے، تو وہ جھنجھلا اُٹھتی ہے:

اے جی صاحب کے آئے ہیں یار، ہمیں تو بھیجیں آگ کوں جی مہاراج!

اے جی حکّہ[٨] کے کروں دس ٹوک[٩]، چلم چٹکا ئیے[١٠] جی مہاراج! ٨- حقہ ٩- ٹکڑے ١٠- توڑ دیے

دوستوں کے لیے حقہ بھرا جاتا ہے۔ "دھن" کی خفگی بدستور رہتی ہے۔ مگر وہ بڑی خوبصورتی سے اپنی خفگی کو سوت کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ "دھن" اپنی سوت پر برس پڑتی ہے اور اپنے "صاحب" سے رُوٹھ جاتی ہے:

اے جی کاتو نگی موٹو[١١] موٹو سوت، بٹاؤں جیرا[١٢] جی مہاراج! ١١- موٹا ١٢- رسّا

اے جی کس کس باندھوں لہری[١٣] سوک[١٤]، ڈھیلو[١٥] تو باندھوں صاحبا جی مہاراج!

١٣-١٤- جوان سوت ١٥- ڈھیلا

سوت کو کس کر باندھنا اور صاحب کو ڈھیلا، کتنا حسین خیال ہے۔ دھن اپنی سوت سے نفرت کرتی ہے، اس لیے کہ وہ بھی اپنے صاحبا سے محبت کرتی ہے، بیپناہ محبت۔ وہ جب کبھی اپنے صاحبا سے ناراض ہوتی ہے، تو صاحبا کی اُلفت اس کی ناراضی کو محبت

برج کے میگھ ملہار

آیو ساون ماس سہاونوں جی!

اے کوئی گاؤ گیت ملہار! جھولا کی آئی ہے بہار! (ہریانی تیجن)

جھولوں پر بہار ہے پینگیں بڑھ رہی ہیں۔ لہریے ہوائیں اڑ رہے ہیں۔ ملہاروں کی رِم جھم ہے کیف و سرور کی ترنگیں اٹھ رہی ہیں۔ ہر طرف مسرت و شادمانی کا راج ہے۔ مگر ایک سکھی ان پُر بہار جھولوں سے دور اکیلی اداس بیٹھی ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہے اُس کا بھیس بھی میلا ہے۔ اُس کا کھویا کھویا سا انداز اِس بات کی صاف غمازی کر رہا ہے کہ وہ بیچاری برہا کی ماری ہے۔ پیا بن کیسے ساون جھولے، کیسے ساون گائے! ساون تو اُس کی آنکھوں میں بس گیا ہے۔ اُس کے ہردے میں برہا کی اگنی بھڑک رہی ہے۔ پپیہا کی "پی ہُو" "پی ہُو" تو برہن کے انگ انگ میں نشتر چبھو رہی ہے۔

ایک سکھی اس سے اُداسی کا سبب پوچھتی ہے، تو وہ جواب دیتی ہے: "بہن پیا پردیس گئے ہیں، ابھی تک نہیں لوٹے، نہ کوئی خط پتر ہی آیا ہے اور یہاں ساون بھی آگیا۔ باغ میں پپیہا بول رہا ہے۔ میں بیٹھی یہی سوچ رہی ہوں کہ اب میں خود پیا کو ڈھونڈنے گھر سے نکلوں۔ جوگن کا بھیس دھارن کرونگی۔ گیروے کپڑے پہنونگی اور سر کے بال بکھیر کے گھر گھر الکھ جگاؤنگی۔ دیس بدیس پھرونگی۔ اور اگر اس طرح پیا مل گئے تو "شیش مہیش" کی پوجا کرونگی۔

میری بہنا! پیا گئے ہیں پردیس! پپیہا بولے باگ میں!
اب تو پیا کوں ڈھونڈن جاؤنگی

میری بہنا! دھر جوگن کا بھیس! پپیہا بولے باگ میں!
تن پہ تو پہر دوں بستر گیروا

میری بہنا! سر کے بکھیرونگی کیس! پپیہا بولے باگ میں!
گھر گھر الکھ جاؤنگی جگا

میری بہنا! ڈولونگی دیس بدیس! پپیہا بولے باگ میں!
جو موکوں پیا مل جائینگے

برج کے میگھ ملھار

میری بہنا! پوچھونگی سیس نہیس!   پپیہا بولے باگ میں! (ہریالی تیجن)

ممکن ہے جب یہ برہن، پیا کی کھوج میں جوگن بن کر گھر سے نکلیگی، تو بین اور مرگ چھالا لینا نہیں بھولیگی، تاکہ دنیا والے اُسے جوگن ہی سمجھیں! ابھی وہ محض ارادہ کر رہی ہے کہ جوگن بن کر ہی پیا کی کھوج کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ جوگ سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے؛ کیا اُس کا پردیسی پیا نہیں ملیگا؟ ضرور ملیگا۔ اُس کے دل میں اٹل وشواش ہے۔ تاہم وہ منّت مانتی ہے کہ اگر پیا مل گئے، تو وہ دُھوم دھام سے "شوجی" کی پوجا کریگی۔

برہن کا کردار ایک آدرش کردار ہے۔ اُس کا چرتر بھارت کی آدرش ناری کا چرتر ہے۔ وہ اپنے پیا کی پجارن ہے۔ اُس کے پریم میں "بھگتی" ہے، "شردھا" ہے، "وشواش" ہے، اس میں تقدیس ہے، پاکیزگی ہے، توانائی ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ شوجی کی بھگت بھی ہے۔ اِسی لیے وہ منّت مانتی ہے کہ اگر اُس کے پردیسی پیا مل گئے، تو وہ "شیش مہیش" کی پوجا کریگی۔ یہ اُس کے "گرہست دھرم" کی ایک جھلک ہے۔

اس گیت کا دوسرا پہلو تصوّف سے متعلق ہے۔ "برہن" آتما ہے؛ "پردیسی پیا" پرماتما ہے۔ آتما جوگ کے ذریعے ہی سے پرماتا کو پا سکتی ہے۔ اس قسم کے گیتوں پر سادھو سنت بھی جھومتے ہیں، وجد کرتے ہیں اُن کا "بھگتی بھاو" اُمنڈ پڑتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ جھولوں میں جھولتی، گاتی، جھومتی ہے۔ رنگین تتلیوں کو کیا معلوم کہ اُن کے مدُھر ملھار نے کتنے گھائل دلوں کے زخم ہرے کر دیے ہیں۔ مگر سب اپنے اپنے رنگ میں، اپنے اپنے حال میں مست ہیں۔

"برہن" کے کردار کا ایک اہم پہلو اُس کا "عزم" اور اُس کی "جراٗت رندانہ" ہے۔ وہ اپنے پیا کو دیس بدیس گھوم کر، گھر گھر الکھ جگا کر، ڈھونڈھ ہی لیگی۔ برہن وفا اور ایثار کی مورت ہے۔ جس طرح میرا بائی نے اپنے "گردھر گوپال" کے لیے راج محل تیاگ دیا، زہر کا پیالہ پیا، جوگن بن کر اکتارے پر — "میرے تو گردھر گوپال دُوسرا نا کوئی" — پریم کے گیت گائے۔ سب کچھ گوارا کرتے ہوئے آخر میرا نے اپنے گردھر کو پا لیا۔ اسی طرح یہ برہن بھی اپنے پردیسی پیا کو ڈھونڈ کر ہی دم لیگی۔

جو موکوں پیا ملِ جائینگے
اری بہنا! پُوجونگی سیس نہیں!

۵۔ پنگھٹ

گانوُ کا پنگھٹ رُومانی دنیا کا وہ حسین مقام ہے جہاں رومان جنم لیتا ہے، جہاں حسن نکھرتا ہے، جہاں عشق پروان چڑھتا ہے، جہاں دُور سے آئے ہوئے البیلے راہی، جنم جنم کے پیاسے پنچھی اور بے پروا پردیسی اپنی پیاس بُجھانے آنکلتے ہیں، جہاں گانوُ کی الھڑ اور معصوم دوشیزائیں اپنی گاگر کو انگوٹھی سے بجا کر گاتی ہیں، جہاں چھیل چھبیلی البیلے برج نار سر پر کوڑیوں اور شیشوں سے جڑی ہوئی اینڈوی "کلسا مانٹ" دھرے، پانوُ کے بچھوؤں کی آواز سُناتی، گھوم گھمارے لہنگے کی ہر گھوم پر جھومتی، اندر دھنک کے لہریے ہوا میں اُڑاتی، گنگناتی، قدم قدم پر جادو جگاتی، اندر کے اکھاڑے کی اپسراؤں کو شرماتی، بانکے گھونگھٹ سے ترچھی چتوں کا وار کرتی ہیں، تو کتنے ہی پنچھی گھائل ہو جاتے ہیں، کتنے ہی راہی اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور کتنے ہی پردیسی اپنا دیس بھُول جاتے ہیں۔ "کٹھن ڈگریا ہے پنگھٹ کی"!

پنگھٹ حسن و عشق کا رنگین و حسین سنگم ہے:

رُوپ کا پنگھٹ، رس کا ساگر
پیت کی ڈوری، گیت کی گاگر
سُندر ہے سنسار!

جب یہاں "من کا میت" مل جاتا ہے، تو مدھر ملن کے گیتوں سے پنگھٹ بھی گونج اٹھتا ہے:

گھونگھٹ میں لاج ہنسی
پنگھٹ پہ آج سکھی

برج کے میگھ ملہار

گاگر میں بول اُٹھی ساگر سی پریت سکھی!
من کا ملا میت سکھی!
نینوں سے نین ملے جاگ اُٹھی پریت سکھی!

جب من کا میت مل کر بچھڑ جاتا ہے، تو شونے پنگھٹ پر، کھوئی کھوئی سی برہن، اِک آگ بجھانے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ اُس کے من میں ہوک اُٹھتی ہے، اُس نین کی گاگر چھلک چھلک پڑتی ہے، اور وہ "پردیسی پیا" کے انتظار میں، راہ میں آنکھیں بچھائے، اپنے ہی دل کی دھڑکنوں سے باتیں کرتی ہے:

پریت کا پنگھٹ، دُکھ کا ساگر
تم بِن چھلکے نین کی گاگر
اُو نِرموہی برج بہاری! ساجن بِن سونی پھلواری!

زمن پنگھٹ، ہر دور کی شاعری، موسیقی، مصوری، سنگتراشی اور دیگر فنونِ لطیفہ کا مرغوب موضوع رہا ہے۔ افسوس ہماری فلموں نے پنگھٹ کی مٹی پلید کر دی ہے۔ ہیروین (گاؤں کی گوری) اپنی شوخ سہیلیوں کے ساتھ پنگھٹ پر پانی بھر رہی ہے۔ ہیرو (شہری بابو) ادھر آنکلتا ہے۔ وہ پیا سا ہے۔ ہیروین اُسے پانی پلاتی ہے۔ آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ ہیرو پانی پینا اور ہیروین پانی پلانا بھول جاتی ہے۔ ہیرو سرد آہ بھر کر فوراً بول اٹھتا ہے "میں تم سے پریم کرتا ہوں" — اور دوگانا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ سب لوک گیتوں کی بھونڈی نقالی ہے۔ برج کے پنگھٹ کی رنگینیاں سدا بہار ہیں۔ وہاں آج بھی پنگھٹ پہ کنہیا آتا ہے، رادھا سنگ راس رچاتا ہے۔

کرشن کی بنسی بجتی ہے تو رادھا اور اس کی سکھیاں — "دُھن سُن، ہو گئی باوریا" — "اب نہ بجاؤ بانسریا!" — ایسے گیتوں سے پنگھٹ کی پُر سکون فضا کو مترنم اور متبسم بنادیتی ہیں۔ اور اپنی بھری ہوئی گاگروں کو بھرے چلی جاتی ہیں۔ جب وہ "مور مکٹ" والا، نٹ کھٹ گوالا، رادھا کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، تو رادھا کہتی ہے کہ کوئی دیکھ لیگا۔

برج کے میگھ ملہار

اپنی ڈگر چلو جا رے، برج باسی!
دیکھینگے لوگ، کرینگے میری ہانسی

پھر وہ گوپیوں سے من مانی چھیڑ کرتا ہے۔ کسی کی بھری گاگر پھوڑ دیتا ہے، کسی کے سر سے چنری اُچک لیتا ہے، کسی کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اُڑاتا ہے، کسی کی چولی بھگو دیتا ہے۔ اس نٹ کھٹ نے برج بالاؤں کو بھی چھیڑ چھیڑ کر نٹ کھٹ بنا دیا ہے۔ وہ راہ چلتوں کو خوب خوب بناتی ہیں، اور ایسے ایسے مذاق کرتی ہیں کہ راہگیر چپ چاپ کان دبا کر وہاں سے کھسک جاتے ہیں۔ برج میں آج بھی مردوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ خوش مذاق اور ہنس مکھ ہیں۔

برج کی ایک ہنس مکھ پنہاری، سر پہ "کلسا" اور "مانٹ" دھرے ٹھیک دوپہر کے وقت، پانی بھرنے کے لیے گھر سے نکلتی ہے:

سر پہ رے پنھاری کلسا رے مانٹ[۲]، سِکر[۳] دوپہری پانی نیکری[۴]

۱۔ گاگر ۲۔ مٹکا۔ ۳۔ چوٹی (عین) ۴۔ نکلی۔

دوپہر کے وقت سونے پنگھٹ پر پنھاری کو دیکھ کر دو گھوڑ سوار اُدھر آ نکلے اور پنھاری سے کہا:

اے پنھاری! تھوڑا سا پانی پلا دے، پنچھی پیاسے ہیں اور دور سے چلے آ رہے ہیں؛

ریلن کے بٹیو دو اسوار، دیکھ پنھاری کنواں پہ آ گئے
تھوڑو سو پنھاری نیر پلائے، پیاسے تو آئے پنچھی دُور تے

پنھاری: اے بٹیو! (راہگیر) میرے ہاتھوں کا پانی بڑا زہریلا ہے۔ اس لیے یہ ڈول اُٹھا اور پانی پی لے!

پی لے رے بٹیو! لے لے رے ڈول، ہمرے ہاتھن کو پانی لاگنو!

بٹیو: اے پنھاری! اگر تیرا پانی زہریلا ہے، تو تیرا بالم اب تک کیسے بچ رہا؟

جو تیرو پنھاری! لگنو ہے نیر، گھر کے بلم کیسے بچ رہے!

پنھاری: اے بٹیو! میرا گھر والا بید ہے، وہ پانی پیتے ہی اس کی لہر اُتار دیتا ہے:

گھر کو رے بٹیوٗ ! بید حکیم، پیئت لہر اُتار ییے !

بٹیوٗ : اے پنہاری! تُو بہت خوبصورت ہے۔ اے "گجبن" ایسا جی چاہتا ہے کہ تجھے زلفوں میں ڈال کرلے جاؤں :

تُو توری پنہاری بہت مُوک، ڈار جُلپھن میں گجبن لے چلوں !

پنہاری : اے بٹیوٗ! زلفوں میں صرف تیل سما سکتا ہے۔ اے "گجبی"! پرائی عورت زلفوں میں ڈال کر نہیں لے جائی جا سکتی :

جُلپھن میں بٹیوٗ ! تیل سمائے ، نار پرائی رے گجبی نا چلے !

بٹیوٗ : اے پنہاری! تو بہت حسین ہے۔ تجھے آنکھوں میں بسا کر لے چلوں !

تُو توری پنہاری! بہت مُوک، گھال نینن میں گجبن لے چلوں !

پنہاری : اے گجبی! آنکھوں میں تو سرمہ ہی سما سکتا ہے۔ پرائی نار آنکھوں میں نہیں چل سکتی :

نینن میں بٹیوٗ ! سرمہ سمائے ، نار پرائی گجبی نا چلے !

بٹیوٗ : اے پنہاری! تو بہت سُندر ہے۔ اے گجبن! تجھے گلے میں ڈال کر لے چلوں :

تُو توری پنہاری! بہت مُوک ، ڈار گرے میں گجبن لے چلوں !

پنہاری : عقل کے دشمن ! گلے میں تو سونے کا "توڑا" ہی ڈالا جا سکتا ہے۔ پرائی نار گلے میں نہیں لٹکائی جا سکتی :

گل میں رے بٹیوٗ ! تورا سمائے ، نار پرائی رے گجبی نا چلے !

بٹیوٗ : اے پنہاری! تُو بہت "مُوک" ہے۔ اے گجبن! تجھے اپنی مٹھی میں چھپا کر لے جاؤں :

تُو توری پنہاری! بہت مُوک ، مار مٹھی میں گجبن لے چلوں !

پنہاری : ارے گجبی! مٹھی میں تو "بیت" (بید) ہی سما سکتی ہے، پرائی نار نہیں :

منٹھی میں بٹیوٗ! بیت سمائے، نار پرائی رے گبرو، نا چلے!

پنھاری : اے بٹیوٗ! تو تو بڑا گنوار ہے، یہاں کیوں اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ ارے جا! اپنی راہ لے!

ٹوٗ تو رے بٹیوٗ! اصل گنوار، کیوں تیں نے چھوڑو رستا آپنو!

گیت کے تیور پنھاری کے غیر معمولی حسن، اُس کی خوش مذاقی اور حاضر جوابی کی غمّازی کرتے ہیں۔ وہ اس قدر حسین ہے کہ راہ چلتے اُس کا روپ دیکھ کر نہ صرف ٹھہر جاتے ہیں بلکہ پیاس کا بہانہ کر کے اُسے دیکھنے کے لیے پنگھٹ پر آجاتے ہیں اور پھر رُوپ کے پیاسے نینوں کی پیاس بجھاتے ہیں۔ گھڑ سوار پنھاری سے سلسلۂ کلام شروع کرنے کے لیے صرف اتنا ہی کہتے ہیں کہ "تھوڑو سو پنھاری نیر پلائے، پیاسے تو آئے پنچھی دُور سے" وہ بھی تاڑ جاتی ہے کہ پیاسے پنچھی پنگھٹ پر کیوں آئے ہیں؟ اُن کی پیاس کس نوعیت کی ہے؟ اس لیے وہ بھی اپنی شوخ طبیعت کی مناسبت سے شرارت آمیز انداز میں اُن کو بنانا شروع کر دیتی ہے۔ اور اُن کی پیاس کو اور بھی بھڑکا دیتی ہے۔ کہتی ہے: میرے ہاتھوں کا پانی زہر ہے۔ پیتے ہی پنچھی مر جائیں گے۔ اس لیے خیریت اسی میں ہے کہ پنچھی خود ہی کنوئیں سے پانی کھینچ کر پی لیں۔ یہ رہا ڈول اور یہ رہی رسّی! اتنا سُن کر پنچھی بھی چہکنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں: تیرے ہاتھ کا پانی پینے سے تیرا گھر والا تو مرا نہیں، ہم کیسے مر جائیں گے؟ تو وہ جواب دیتی ہے کہ میرا گھر والا تو حکیم ہے، وہ زہر اتارنا جانتا ہے۔ یہ جواب سُن کر وہ لاجواب ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی جھینپ مٹانے کے لیے "ٹوٗ تو پنھاری بہت ناری ک!" کہہ کر بات کا رُخ بدل دیتے ہیں۔ اُس میں بھی انھیں منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ اور پنھاری کے آخری بول سُن کر— "ٹوٗ تو رے بٹیوٗ! اصل گنوار، کیوں تیں نے چھوڑو رستا آپنو!" پنچھی اپنا سا منھ لے کر اُڑ جاتے ہیں۔ نہ بزدری، نہ بیزاری، نہ بزرمی آیدہ پنگھٹ پہ صبح شام ہی رونق ہوتی ہے۔ پنگھٹ کی صبح، صبحِ بنارس اور پنگھٹ کی شام، شامِ اودھ سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔ لیکن اس ملہار میں پنھاری "سکھر دوپہری" میں پنگھٹ پہ آتی ہے۔ قیاس چاہتا ہے لگھر کے کام کاج میں اُسے دیر ہو گئی ہے۔ ورنہ

اشخاص ہیں اور یہی زیادہ مناسب ہے۔
۲۶۔ "نو طرزِ مرصّع" میں بادشاہ تین درویشوں کے بعد اپنی سرگزشت سناتا ہے۔ بقیہ سب نسخوں میں وہ سب درویشوں کے بعد اپنے حالات سناتا ہے۔
۲۷۔ سگ پرست کو جب اس کے بھائی جہاز سے گراتے ہیں تو فارسی نسخے میں اس مقام کی نشاندہی یوں کی ہے کہ جہاز سراندیپ سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔ اردو نسخوں میں مقام کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔
۲۸۔ خواجہ سگ پرست کو چاہِ سلیمان میں مقید کرنے کے بارے امن اور تحسین کے بیانات میں فرق ہے۔ زرّیں کے دونوں نسخوں میں امن سے مطابقت ہے۔
۲۹۔ تحسین اور امن کے یہاں زیرباد کی شہزادی کا ذکر ہے۔ زرّیں کے نسخوں میں اس شہزادی کا احوال ہے، لیکن اس کی مملکت کا نام نہیں دیا۔ فارسی نسخے میں شہزادی کے محبوب وزیرزادے کا نام بہروز دیا ہے، جب کہ "باغ و بہار" میں بہرہ مند ہے۔ زرّیں کے اردو نسخے اور "نوطرزِ مرصّع" میں اس کا کوئی نام دیا ہی نہیں گیا۔
۳۰۔ "باغ و بہار" کے مطابق خواجہ سگ پرست کی دوسری محبوبہ سراندیپ کی شہزادی ہے۔ زرّیں کے دونوں نسخوں نیز تحسین کی "نوطرزِ مرصّع" میں اس کے دیار کو فرنگ کہا گیا ہے۔ زرّیں کے فارسی نسخے میں شہزادیِ فرنگ سے ملاقات کے قبل کے واقعے کو دیارِ فرنگ کے شہر وزیرآباد میں دکھایا گیا ہے۔ کسی دوسرے نسخے میں شہر کا یہ نام درج نہیں۔ فارسی نسخے میں لکھا ہے کہ جب شہزادیِ فرنگ کے حکم پر جرّاح نے میرے زخموں کا علاج کیا، تو وہ "قاعدۂ فرنگ سے میرے گلے میں بید مُشک و گلاب ٹپکاتا تھا"۔ زرّیں کی یہ اطلاع ناقص ہے کیونکہ علاجِ فرنگ میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں۔
۳۱۔ فارسی نسخے میں خواجہ سگ پرست دایہ کو قتل نہیں کرتا۔ اردو نسخے میں وہ دایہ کو مارتا ہے۔ "باغ و بہار" میں شہزادی اسے زہر دے دیتی ہے۔
۳۲۔ تحسین نے شاہ بندر کے شہر کو نواحِ دیگ میں قرار دیا ہے۔ دوسرے کسی نسخے میں دیگ کا ذکر نہیں۔ دیگ غالباً سرتھور کو کہتے تھے۔ وہاں سمندر کہاں سے آگیا!

بھالی، بڑی بڑی آنکھوں والی دوشیزائیں اُسے "کام دیو" کا اوتار سمجھتیں اور پھر وہ اپنی خاکساری اور اس کی سربلندی کا مُبہم سا موازنہ کرتی ہوئی تمناؤں کی دنیا میں کھو جاتیں۔ وہ شکاری ان ہرنیوں کو تیرِ ہوس کا نشانہ بناتا اور پھر عصمتیں سسک سسک کر دم توڑ دیتیں۔ غرض اس کی شکارگاہ پنگھٹ سے لے کر دھوبی گھاٹ تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایک دھوبی کی لڑکی ندی پر پانی بھرنے کو جاتی ہے۔ اُدھر "راجا" شکار کے لیے گھر سے نکلتے ہیں:

دھوبی راکی پانی راکول جائے
راجا تو نکرائے[1] سکار[2] کوں جی مہاراج!

1- نکلے 2- شکار

شکاری راجا لڑکی سے کہتا ہے: اے دھوبن! ہم پیاسے ہیں ہمیں پانی پلا دے۔

دھوبی راکی پانی را پلا!
ہم تو پسائے[1] بڑی دُور کے جی مہاراج!

1- پیاسے

لڑکی: راجا! میں نیچ ذات ہوں، اچھوت ہوں۔ اس لیے آپ ندی میں پانی پی لیجیے!

پیو راجا سمندر جھکور
میری تو ذات کمین کی جی مہاراج!

راجا: ندی میں تو ڈھور ڈنگر پانی پیتے ہیں۔ ہم تو تمہارے رُوپ کے پیاسے ہیں

سمندر پئیں ڈانگر ڈھور
ہم تو پسائے تہارے رُوپ کے جی مہاراج!

لڑکی: اگر میرے رُوپ کی تمنا ہے تو میرے باپ کے کپڑوں کو دھو دیجیے۔

جے راجا رُوپ کی ساد[2]
کپرے تو دھوؤ میرے باپ کے جی مہاراج!

2- سادھ- خواہش- طلب

اتنا سُنتے ہی راجا نے کپڑوں کی بھاری بھرکم گٹھڑی اپنے سر پر رکھ لی اور ہاتھ میں کپڑے کوٹنے کی موٹی موگری اٹھا لی۔

برج کے میگھ ملہار

سر پہ تو دھر لئی جنگی پوٹ[1] ۱- بھاری گٹھڑی

ہات میں لیو جنگی مونگرا[2] جی مہاراج ! ۲- موٹا موگرا

دھوبی کی لڑکی نے صرف دس پانچ ہی کپڑے دھوئے مگر راجا نے پورے ڈیڑھ سو کپڑے دھو ڈالے۔

دھوبی کی نے دھوئے دس پانچ

راجا جی نے دھوئے ڈیڑھ سو جی مہاراج!

راجا : (لڑکی کو اپنے ہاتھ دکھاتے ہوئے) دیکھو! میرے نرم، نازک ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔

دیکھو ! دھوبی کی میرے ہات

نرم کلائی چھالے پڑ گئے جی مہاراج !

لڑکی : میری کلائی بھی نازک ہے۔ میرے ہاتھوں میں مہندی رچی ہوئی ہے۔

دیکھو ! راجا جی میرے ہات

نرم کلائی مہندی رچ رہی جی مہاراج !

راجا تخت بچھا کر بیٹھ گئے۔ راجا کے من پر اُداسی چھا گئی۔

بیٹھے راجا تکھت[3] بچھائے ۳- تخت

من پہ تو اُداسی چھا رہی جی مہاراج !

لڑکی : راجا ! کیوں اُداس ہو گئے ؟ کیا ماں باپ کی یاد آگئی ؟ کیا دیس کی یاد نے تڑپا دیا ؟

کے سُدّھ[4] آئی مائی باپ ۴- یاد

کے سدھ آیو اپنو دیسوا جی مہاراج !

راجا : (سر ہلا کر) نہیں ! مجھے اپنے دیس کی یا ماں باپ کی یاد نہیں ستا رہی ہے مجھے ایک ہی یاد بےچین کر رہی ہے، اور وہ یاد ہے "برج نار" کی جو رنگ محل میں اکیلی اور رہی ہوگی۔

برج کے میگھ ملہار

نا سُدھ آئے مائی باپ
نا سُدھ آیو اپنو دیس واجی مہاراج!
ایک سُدھ آئی برج نار
رنگ محل سووے ایکلی جی مہاراج!

لڑکی : ارے گنوار! تُو نے پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوچی۔ پانی چھان کر کیوں پیا؟

جب کیوں نہ سوچی، رے گنوار
جب کیوں نہ پیو پانی چھان کر جی مہاراج!

عورت ذات متلون مزاج اور چنچل ہوتی ہے۔ دھوبی کی لڑکی نے راجا سے فوراً بدلہ لے لیا! سارا دن اس سے کپڑے دھلوائے اور اسے گنوار ثابت کر دیا:

تِریا[۸] کی اچپل جات
تُرت[۹] بدلو لیو جی مہاراج!

۸۔ عورت
۹۔ فوراً

اس گیت کے تین اہم کردار ہیں، دھوبی کی جوان اور حسین کنواری لڑکی، رُوپ کا پیاسا راجا اور رنگ محل میں سوئی ہوئی برج نار۔ اتفاق سے دھوبی کی لڑکی اور راجا ایک ہی اپنے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکی پر راجا کی پہلے سے نظر ہو اور اس موقع غنیمت جان کر شکار کے بہانے ندی کا رُخ کیا ہو۔ بہرحال راجا اظہار تشنگی کے بہانے سلسلۂ گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔ لڑکی احساس کمتری کا شکار ہو جاتی ہے اور راجا سے اچھوت ہونے کا اعتراف کرتی ہے اور راجا سے ندی سے پانی پینے کی درخواست کرتی ہے۔ لیکن جب لڑکی کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ راجا اُس کے رُوپ کا پیاسا ہے، تو اس کا احساسِ حسن و شباب جاگ اٹھتا ہے۔ وہ راجا کی پیاس بجھانے کو تیار ہو جاتی ہے مگر اس شرط پر کہ راجا دھوبی گھاٹ پر اس کے باپ کے کپڑوں کی "جنگی پوٹ" دھوئے۔ راجا شرط منظور کر لیتا ہے، اور گھاٹ پر لڑکی کے ہمراہ کپڑے دھونا شروع کر دیتا ہے۔

شرط کے مطابق تمام کپڑے راجا ہی کو دھونا چاہیے تھے مگر پھر بھی لڑکی دس پانچ کپڑے را

کے ساتھ دھوتی ہے کیونکہ راجا کو کپڑے دھونا نہیں آتا۔ اس لیے دس پانچ کپڑے دھو کر لڑکی راجا کو بتاتی ہے کہ کپڑے اس طرح دھوئے جاتے ہیں اور ساتھ ہی راجا کی پیاس بھی بجھاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ راجا اس کے بغیر ایک کپڑا بھی نہیں دھو سکتا تھا۔ مگر وہ اس کے ساتھ پورے ڈیڑھ سو کپڑے دھو ڈالتا ہے۔ اور جب وہ اپنے ہاتھوں کے چھالے لڑکی کو دکھاتا ہے تو لڑکی بھی اُسے اپنی نرم کلائی اور منہدی رچے ہاتھ دکھاتی ہے۔ غرض

مستِ شباب حسن لنڈھاتا رہا شراب   پی لی نگاہِ شوق نے جتنی کہ پی گئی

ادھر دھوبی کے کپڑے دھل جاتے ہیں اور راجا کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ اُدھر سورج بجھ جاتا ہے اور شام ہو جاتی ہے۔ مگر دھوبی (لڑکی کا باپ) سارا دن گھاٹ پر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی سسرال چلا گیا ہو! اور یہ بھی ممکن ہے کہ جب اس نے راجا کو گھاٹ پر دیکھا ہو، تو دبے پاؤں لوٹ گیا ہو۔ کیونکہ راجا کے سامنے پرجا کی کیا مجال کہ دم مار سکے۔ جاگیردارانہ دور میں اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا۔

تشنگی سے گیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جوں جوں گیت آگے بڑھتا ہے تشنگی بھی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ پیاس بجھتے ہی گیت میں بھی بجھی بجھی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ راجا اُداس ہو کر تخت پر بیٹھ جاتا ہے۔ (دھوبی گھاٹ پر بھلا سنگھاسن کہاں! گھاٹ کے جس پتھر پر راجا بیٹھ گیا۔ وہ سنگھاسن بن گیا۔ اور اُسی سنگھاسن پر لڑکی بھی براجمان ہو گئی!)

بظاہر راجا کی اُداسی کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دن بھر کپڑے دھونے کی تھکن، ہاتھوں کے چھالوں کی ٹیس اور پیاس بجھنے کے بعد یہ ملال کہ "وہ تمنا نکل گئی" کا احساس ہے۔ مگر دھوبی کی لڑکی جو حسین ہونے کے ساتھ ساتھ چتر بھی ہے، صاف تاڑ جاتی ہے کہ ہو نہ ہو "کسی کی یاد" نے اُسے بے چین کر دیا ہے۔ وہ احتیاط اور چترائی کے ساتھ راجا سے کہلوا لیتی ہے کہ

ایک   شدھ   آئی   برج   نار
رنگ محل سووے اکیلی جی مہاراج!

یہ بند گیت کا منتہا (CLIMAX) ہے۔ "برج نار" رنگ محل میں اکیلی سو رہی ہے۔

برج کے میگھ ملھار

برج نار کے کردار کے خط و خال اگرچہ گیت کے گھونگھٹ میں چھپے ہوئے ہیں، تاہم اس کے رُوپ کی چاندنی گھونگھٹ سے چھن چھن کر ندی کی لہروں اور دھوبی گھاٹ کے پتھروں پر بکھر جاتی ہے۔ اور راجا کے من پر اس طرح چھا جاتی ہے کہ اس کی نظروں میں دھوبی کی لڑکی کا رنگ رُوپ پھیکا اور اس کا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وہ بیساختہ دھوبی کی لڑکی کے سامنے اس کی رقیب (برج نار) کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔

جب برج نار کی یاد میں اتنی کشش ہے تو اس کے حسن میں کتنی کشش ہوگی۔ قیاس چاہتا ہے کہ برج نار حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت کی بھی مالک ہوگی۔ جبھی تو اس نے سیر و شکار کے شوقین، رُوپ کے رسیا، ہرجائی اور حسن پرست راجا کے دل میں بھی وفا کا جذبہ پھونک دیا تھا۔

راجا کی فطرت دو متضاد جذبوں سے مرکّب ہے، ایک تو وہ اس حد تک "حسن پرست" ہے کہ وہ ایک معمولی دھوبی کی لڑکی کے حسن و شباب سے مسحور ہو جاتا ہے، اور تابِ نظارۂ جمال نہیں لاسکتا تو دوسری طرف اتنا "وفا شعار" بھی ہے۔ وہ اپنی شریکِ حیات (برج نار) کا پرستار ہے اور اس کی یاد کا سہارا لے کر دامِ حسن و شباب کے پھندے سے نکل بھی جاتا ہے یہ تضاد بھی جاگیردارانہ دور کی ایک خصوصیت تھی۔

جب دھوبی کی لڑکی حقیقتِ حال سے آگاہ ہو جاتی ہے، تو اس کا شیش محل چور چور ہو جاتا ہے، جو اس نے گھاٹ پر راجا کے ساتھ کپڑے دھوتے ہوئے دن بھر میں تعمیر کیا تھا۔ وہ جب دیکھتی ہے کہ رُوپ کا لوبھی بھونرا رس چوس کے اُڑا چاہتا ہے، تو نفرت سے منہ پھیر کر اپنے جذبۂ انتقام کی ان الفاظ سے تشفی کرتی ہے:

جب کیوں نہ سوچی رے گنوار!
جب کیوں نہ پیو پانی چھان کے اجی مہاراج!

راجا گنوار کہہ کر لڑکی نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی! اس سے زیادہ وہ کر بھی کیا سکتی تھی! دھوبی کی لڑکی تند و تیز طوفانی ندی کا گدلا پانی ہے۔ برج نار پوتر گنگا جل ہے۔ گھاٹ

برج کے میگھ ملہار

گھاٹ کا پانی پینے والا گنوار راجا یوں تو روز ہی گنگا جل پیتا ہے، مگر کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ندی کا گدلا پانی بھی پی لیتا ہے، بغیر چھانے ہوئے۔

گیت کا اختتامیہ بھی بہت حسین ہے۔ اس میں عورت کی فطرت اور اس کے جذبۂ انتقام کی طرف اشارہ ہے۔ "تریا کی اچپل ذات"۔

ساون میں جب اس ملہار کی تانیں جھولوں میں لہراتی ہیں، تو ایک وجد آفریں کیفیت گھٹاؤں سے برسنے لگتی ہے۔ دھوبی کی لڑکی کا حسن اور نکھر جاتا ہے۔ گنوار راجا کے دھوئے ہوئے کپڑے اور بھی اجلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب ملہار کی مدھر تان "برج نار" کے حسنِ خوابیدہ کو بیدار کرتی ہے تو پپیہے کی پکار اور مور کی چنگھاڑ سے بھی "برج نار" "برج نار" کی صدا بلند ہو جاتی ہے۔

[بشکریہ شریمتی گنگا دیوی]

۷۔ کنور ہنسا مورنی

برسات کی شام ہے، شفق پھوٹ رہی ہے۔ شفق کی لالہ کاریوں میں شام کی زلفیں لہرا رہی ہیں جھیل تالوں میں مینڈک مست ہو کر الاپ رہے ہیں میگھ راگ۔ اور جھاڑیوں کے نیچے جھینگر اور دوسرے برساتی کیڑے بین بجا رہے ہیں میگھ ملہار کی دھن میں۔ تالاب کے کنارے سارسوں کا قافلہ پڑا ہے۔ رنگ برنگ کے بادلوں میں سفید بگلوں کی قطار لنگوا لہریا سی لے رہی ہے۔ باغ میں جھولے پڑے ہیں۔ ملہار کی تانوں سے گاؤں کی مخمور فضائیں گونج رہی ہیں۔ گوالے الغوزے بجاتے ہوئے ڈھوروں کے پیچھے جھومتے چلے آ رہے ہیں۔ شام کا جھٹپٹا ہے۔ شفق زاروں میں آہستہ آہستہ سیاہیاں گھل رہی ہیں۔ سانولی سلونی شام اپنے سیاہ دوپٹے کے آنچل میں شفق کی رنگینیوں کو سمیٹ رہی ہے۔ رنگین اور حسین بادلوں کے خیموں میں تاریکیاں سرک رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک باغ کے سینے سے جھولوں کے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔

برج کے میگھ ملہار

"ہنسا" نے اپنے پریتم سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن شام ہونے کو آئی، اُس کے باپ نے اُسے گھر سے باہر نہ نکلنے دیا۔ شاید اُسے اُن کے پریم کا پتا چل گیا تھا۔ ہنسا نے طرح طرح کے بہانوں کا سہارا لیا، لیکن گھر سے باہر نہ جا سکی۔ آخر اُس نے باغ میں جھولا جھولنے کی اجازت چاہی۔ اس کے باپ نے اس دفعہ بھی اُسے یوں کہہ کر ٹال دیا: ہنسا بیٹی! باغ کے پیڑ ابھی نازک ہیں، جھولے کا بوجھ نہیں سہار سکینگے۔ جھولے کی ڈال اگر ٹوٹ گئی، تو تو مر جائیگی:

بابُل تو برجے[1] ری ہنسا آپنی — ۱۔ روکے
اری ہنسا باگ جھولن مت جائے — کنور ہنسا مورنی!
مڑوے[2] کی ڈاری[3] ہنسا کرکری[4] — ۲۔ پیڑ۔ ۳۔ ڈالی۔ ۴۔ کمزور
اری ہنسا! ٹوٹ پرے مری جائے — کنور ہنسا مورنی!

اتنا سنتے ہی ہنسا لال پیلی ہو گئی۔ اُس نے صاف صاف کہہ دیا: بابُل! آج میں ضرور جاؤنگی۔ تمہارے روکے میں ہرگز نہیں رُکونگی۔ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغ میں جھولا جھولونگی:

تہاری تو نہ برجی[5] رے بابُل نا رہوں! — ۵۔ روکے
ارے بابُل! جھولوں سہیلن سنگ — کنور ہنسا مورنی!

یہ کہہ کر ہنسا گھر سے نکلی۔ بابُل نے اپنا سر جھکا لیا اور خاموش ہو گیا۔ بابُل کی یہ خاموشی معنی خیز ہے۔ ہنسا ابھی باغ میں نہیں پہنچی تھی کہ راستے ہی میں اُس کا پریتم، نیلی گھوڑی پر سوار، اُسے آتا دکھائی دیا:

گیل بٹیو[6] پتمی[7] نیکرے[8] — ۶۔ راہگیر ۷۔ پریتم ۸۔ نکلے
اری ہنسا! لیلی[9] کے اسوار — کنور ہنسا مورنی! — ۹۔ نیلی گھوڑی

راہگیر نے آتے ہی کہا: ہنسا! شام ہو چکی ہے۔ اگر میرے ساتھ چلتی ہے تو چل! آ گھوڑے پر سوار ہو جا۔

سنگ چلے توری ہنسا! لے چلوں

برج کے میگھ ملہار

اری ہنسا! دھر گھوڑلا[10] کی پیٹھ کنور ہنسا موری! ۱۰- گھوڑا

ہنسا گھڑ اسوار کے ساتھ فرار ہو گئی۔ گھڑ اسوار اُسے اپنی محبت کا یقین دلانے لگا۔ ہنسا! تم میرے دل کے سنگھاسن پر براجنا۔ میں تمہاری سیوا کرتا رہونگا۔ تمہارا تابع رہونگا:

پلکا[11] پہ رے بیٹھی رہو ۱۱- پلنگ

اری ہنسا! میں رہوں تیرو تابیلدار[12] کنور ہنسا موری! ۱۲- تابعدار

گھڑ اسوار نے ہنسا کو اپنے باغ میں اُتارا، اور اُس کی گود پھلوں سے بھر دی:

جائے اُتاری ری ہنسا باگ میں

اری ہنسا! بنُوئن[13] بھر دی گود کنور ہنسا موری! ۱۳- پھل

گھڑ اسوار نے کہا: ہنسا! خوب سیر ہو کر پھل کھاؤ! جو بچ جائیں اُنھیں پھینک دو!

کھائے جائیں، توری ہنسا کھائے لے

اری ہنسا! انا، تورے کرو بکھیر کنور ہنسا موری!

گھڑ اسوار ہنسا کو شہر لے گیا اور اس کی گود مٹھائیوں سے بھر دی:

جائے اُتاری ری ہنسا شہر میں

اری ہنسا! لڈوئن[14] بھر دی گود کنور ہنسا موری! ۱۴- لڈو، مٹھائی

مٹھائیاں اُڑاتا ہوا یہ جوڑا ایک رتیلے میدان میں پہنچا۔ نیلی گھوڑی تھک کر چُور ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ دونوں پیدل چلنے لگے۔ (سفر میں ریت کا میدان آنا، پیدل چلنا، عشق کی دشواریوں کو ظاہر کرتا ہے)

ہنسا کے بچھوؤں میں ریت بھر جاتی ہے۔ جانباز عاشق وفا شعاری کے ثبوت میں بچھوؤں کو برش سے نکھارنے اور اپنی پگڑی سے ہنسا کے پانو صاف کرنے کا وعدہ کرتا ہے:

جائے اُتاری ری ہنسا ریت میں

اری ہنسا! بچھوؤں بھر گیو ریت کنور ہنسا موری!

کوچی نکھاروں ری تیرے بچھیا!

اری ہنسا! سوا[15] پے تے پونچھوں تیرے پاؤں کنور ہنسا موری! ۱۵- پگڑی

برج کے میگھ ملہار

جب گھڑ سوار ہنسا کو لے کر اپنے محل میں پہنچا تو اُس کی بیوی کے مان مر گئے (غرور خاک میں مل گیا)۔ اُس نے پُوچھا: "راجا! یہ عورت کون ہے؟ اسے بیاہ کر لائے ہو! یا یہ میری سوت (رقیب) تمہاری محبوبہ ہے؟"

راجا نے کہا: "گوری! نہ میں اسے بیاہ کر لایا ہوں، اور نہ یہ تیری سوت ہے۔ یہ میرے ایک دوست کی بیوی ہے۔ ہمارے یہاں دس پانچ دن مہمان رہیگی۔"

جائے اُتاری ری ہنسا محل میں

اری ہنسا! بیاہی کے مر گئے مان — کنور ہنسا مورنی!

کے تورے لایو راجا بیاہ کے

ارے راجا! کے تو لایو لہری سوت — کنور ہنسا مورنی! — ۱۶۔ چھوٹی

نا میں لایو ری گوری بیاہ کے

اری گوری! نا تیری لایو لہری سوت — کنور ہنسا مورنی!

ہمارے یار کی ری گوری

ارے گوری! دن دس آئی مہمان — کنور ہنسا مورنی!

ہنسا کا پریتم اپنی گوری سے چھٹکارا پا کر ہنسا کے پاس آیا اور اسے حالات کی نزاکت سے آگاہ کیا۔ "ہنسا! تمہیں رات بھر چکّی پیسنی پڑیگی اور دن بھر بچّے کھلانا پڑینگے۔ تب کہیں گزارہ ہو سکیگا۔"

راتوں تو پیسو ری ہنسا پیسنے

اری ہنسا! دیوٹی[17] کھلاؤ نندلال[18] — کنور ہنسا مورنی! — ۱۷۔ دن بھر ۱۸۔ بچّے

ہنسا نے آہ بھر کر کہا: "راجا! میں نے تمہارے کارن گھر چھوڑا، گھر کا پیسنا چھوڑا، گھر کے 'نندلال' چھوڑے" ——— یہ کہتے کہتے ہنسا کا غرور ... پن جاگ اُٹھا۔ وہ برہم ہو کر بولی ——— "تیرے پیسنے کو بگر (آنگن) میں بکھیر دونگی اور تیرے بچّوں کا گلا گھونٹ دونگی۔ مجھے میرے دیس چھوڑ کر آ، جہاں سے تو مجھے بھگا کر کے لایا ہے۔"

گھری[19] کے چھوڑے رے راجا پیسنے — ۱۹۔ گھر ہی

ارے راجا! گھری کے چھوڑے نندلال — کنور ہنسا مورنی!
بگڑ[20] بکھیر دوں رے تیرو پسینو! — ۲۰۔ آنگن
ارے راجا! دم[21] مسکوں نند لال — کنور ہنسا مورنی! — ۲۱۔ گلا ۲۲۔ گھونٹوں
لے چل و[22] اہی رے دیس کوں — ۲۲۔ وہیں۔ اسی
ارے بیری[23]! جہاں تے رے لایو[24] نسائے — کنور ہنسا مورنی! — ۲۳۔ دشمن ۲۴۔ بھگا کر اغوا کرکے

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی، تو راجا سٹپٹا گیا۔ وہ ذہنی الجھن میں پھنس کر رہ گیا کہ اب کیا کرے! بیوی اور محبوبہ، محبوبہ اور بیوی ــــ ایک سماج کی دی ہوئی بھاری آہنی زنجیر، دوسری خدا ے حسن و عشق کا عطا کیا ہوا خوبصورت نازک طلائی ہار! وہ کچھ دیر اسی کشمکش کے ہنڈولے میں جھولتا رہا۔ جب اس نے ہنسا کی طرف دیکھا، تو ہنسا کی بڑی بڑی آنکھوں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی سیاہ پلکیں اس کے احساس میں گڑ کر رہ گئیں۔ وہ بیچین ہوگیا، اور آخر اس نے حسن کے حضور میں سرِ نیاز خم کر دیا:

پلکا پہ رے بیٹھی رہو
اری ہنسا! میں تیرو تابیدار — کنور ہنسا مورنی!

رے، ارے، ری، اری، اے جی ــ گیت کو بحر سے گرنے سے بچاتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ وزن کو پورا کرنے کی غرض سے اس قسم کے الفاظ کی بھرتی کی جاتی ہے۔

اِس گیت میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ جب بابل کو ہنسا کے عشق کا علم تھا، تو وہ خاموش کیوں رہا؟ دوسرے ہنسا نے نیلی گھوڑی کے سوار سے کیوں پریم کیا، جب کہ وہ عمر میں اس سے کافی بڑا تھا اور اس کے محل میں "نندلال" کھیل رہے تھے؟ کیا گانوں میں کوئی نوجوان نہیں تھا، جو ہنسا کی محبت کا دم بھر سکتا؟ جب ہم ان باتوں پر غور کرتے ہیں تو ہمارا ذہن جاگیردارانہ دَور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جب جاگیردار کا غریب کاشتکاروں کی جوان بہو بیٹیوں کو سبز باغ دکھا کر دامِ ہوس میں پھنسانا ہی محبوب مشغلہ تھا۔ روپے، پیسے سے، مکر سے، فریب سے، دھمکی سے، جس طرح بھی بن پڑتا وہ اپنی سیاہ کاریوں کو سنوارنے میں منہمک رہتا تھا۔

نیلی گھوڑی کی سج دھج، باغ کے پھل، شہر کی مٹھائیاں، محل کے اونچے اونچے کلس، جھونپڑی میں رہنے والی دوشیزہ کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی تھے۔ کاشتکار مارپیٹ کے ڈر سے اور اس سے بھی زیادہ زمین چھن جانے اور کھیتوں سے بیدخل ہو جانے کے خوف سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔ وہ اپنی عزت و ناموس کی بیکفن نعش پر خاموش کھڑا آنسو بہا سکتا تھا، مگر چیخ نہیں سکتا تھا۔ اور بعض اوقات اس کی آنکھیں آنسوؤں کے لیے بھی ترس جاتی تھیں۔

یہ ہے ہنسا اور گھوڑا سوار کے معاشقے کا پس منظر جو بیک وقت دردناک بھی ہے اور رُومانی بھی۔ "رُومان" جاگیردارانہ نظام کی ایک خصوصیت تھی۔

مذکورہ بالا بیان کی تصدیق گیت کے عنوان سے بھی ہوتی ہے — کنور ہنسا مورنی —— ظاہر ہے اس دوشیزہ کا نام صرف ہنسا ہو گا۔ اس کے جاگیردار عاشق نے اُسے جاگیردارانہ رُومان کے دربار میں "کنور" اور "مورنی" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ "کنور" اس لیے کہ جاگیردار خود "کنور" کہلاتا ہو گا اور "مورنی" ہنسا کی مدھر چال سے متاثر ہو کر اپنے ذوقِ جمال کے اظہار کے لیے خطاب عطا کیا ہو گا۔

بہر حال ریت بھر جانے پر بھی ہنسا کے بچھوؤں کی دلنواز چھم چھم کی آواز کم نہ ہو سکی۔

[بشکریہ سُرپیتی پربھاوتی]

۸- راجا بھرتری

ایک زمانہ تھا جب ایک طرف بھگتی تحریک اور دوسری طرف تصوّف کی تحریک زوروں پر تھی۔ سادھو، سنت، فقیر، صوفی سبھی "ترکِ دنیا" اور "دنیا ہیچ و ہمہ کارِ دنیا ہیچ" کا درس دے رہے تھے۔ گاؤں کے معصوم اور سادہ لوح نوجوان ان لوگوں کی تعلیم سے بیحد متاثر ہوئے۔ اور ان میں سے اکثر اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی نہ کسی سادھو یا فقیر کے ساتھ ہو لیے۔ گھر میں اُن کی نئی نویلی دُلھن بیوگی کا لباس پہن کر زندگی کے دن پورے کرتیں۔

یاس چاہتا ہے کہ جب اس قسم کی باتیں عام ہونے لگی ہونگی تو کسی شاعرہ نے اس سے تاثر ہو کر یہ گیت گھڑا ہو گا کہ ایک نوجوان نے اپنا گھر بار تیاگ کر جوگ لے لیا۔ جب وہ ایک مدت کے بعد، سادھو کے بھیس میں، بھیک مانگنے اپنے ہی گھر چلا آیا، تو اُسے س کی ماں، بہن، بیوی سب نے پہچان لیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنا دامن جھٹک کر بلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو یہ بھی بتایا کہ اُس نے "پرائے بس" ہو کر شادی کی تھی، ورنہ وہ اسے ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔ گیت اس کی بیوی کی بد دعا پر ختم ہوتا ہے ــــ کسی جٹیل میدان میں تجھ پر بجلی گرے، چلتے میں تجھے کالا ناگ ڈس لے! تیری بیوی تو میکے یں بھٹکتی پھرتی ہے، کنوئیں میں جائے ترا جوگ!

پانچ برس کی رے راجا بیاہ کے چھوڑ گئے پردیس! سمجھ راجا بھرتری!
الکھ جگایو کھیرا[1] آنگنو — ۱۔ گانو
ارے جوگی! پہنچیو ہے میا کے دوار! سمجھ راجا بھرتری!
بھکشا[2] تو ڈارو میا تابلی[3] — ۲۔ بھیک ۳۔ جلدی سے
اری میا! جوگی کھڑو ری تیرے دوار! سمجھ راجا بھرتری!
بھکشا تو ڈارت میا رو پڑی
ارے جوگی! تیری صورت کے میرے لال! سمجھ راجا بھرتری!
تُو تو ری میا میری! باوری[4] — ۴۔ باولی۔ دیوانی
اری میا کب رے ہوئے تیرے لال! سمجھ راجا بھرتری!
اتنی تو کہہ کے جوگی چل دیو
ارے جوگی! پہنچیو ہے بہنا کے دوار۔ سمجھ راجا بھرتری!
بھکشا تو ڈارو ری بہنا! تابلی
اری بہنا! جوگی کھڑو ری تیرے دوار سمجھ راجا بھرتری!
بھکشا تو ڈارت بہنا رو پڑی
ارے جوگی! تیری صورت کے میرے بیر سمجھ راجا بھرتری!

ٹو تو ری بہنا میری! باوری
اری بہنا! کب رے کھلائے بھر گود — سجھ راجا بھرتری!
اتنی تو کہہ کے جوگی چل دیو
ارے جوگی! پہنچیو ہے تریا[5] کے دوار — ۵۔ عورت۔ بیوی
بھکشا تو ڈارو رانی! تابلی
اری رانی! جوگی کھڑیو اے تیرے دوار — سجھ راجا بھرتری!
بھکشا تو ڈارت رانی روئڑی
ارے جوگی! تیری صورت کے بھرتار[6] — سجھ راجا بھرتری! — ۶۔ شوہر
ٹو تو ری رانی! بڑی باوری
اری رانی! کب رے ہویو تیرو بیاہ — سجھ راجا بھرتری!
جھپٹ ڈ پٹا رانی کھینچیو
ارے جوگی! آج لیو پہچان — سجھ راجا بھرتری!
کا ہے کوں باندھیو رے بیری سہرو
ارے بیری! کا ہے کوں دھریو سر پہ مور — سجھ راجا بھرتری!
کا ہے کوں لایو رے بیری بیاہ کے
ارے بیری! پنچن[7] میں پکریو میرو ہات — سجھ راجا بھرتری! — ۷۔ ہاتھ پنچہ
پر بس باندھیو ری گوری سہرو
اری گوری! پربس دھریو سر پہ مور — سجھ راجا بھرتری!
بابل لایو ری گوری بیاہ کے
اری گوری! مصر[8] پکرایو تیرو ہات — سجھ راجا بھرتری! — ۸۔ پنڈت، شادی کی رسم ادا کرنے والا
جھٹک ڈ پٹا رے جوگی چل دیو
ارے جوگی! رومت چھوڑی برج نار — سجھ راجا بھرتری!
پٹ[9] پر میں مارے رے جوگی بیجری[10] — ۹۔ چٹیل میدان ۱۰۔ بجلی۔

کھانا تھا اور لوگوں سے ملنا بھی۔

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا آج کی پہلی نشست میں تشریف لائے تھے۔ میں سب سے پہلے انھی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مختصر علیک سلیک کے بعد میں نے ان سے وقت لیا تاکہ ان کے دفتر میں جا کر مفصل گفتگو کر سکوں۔ (۲) کے بعد ڈاکٹر زرین کوب کے پاس گیا اور کچھ دیر تک ان کے مقالے پر اظہارِ خیال کرتا رہا۔ میں نے دورانِ گفتگو میں ان سے یہ بھی عرض کیا کہ ان کی کتاب "نقدِ ادبی" پڑھ چکا ہوں اور اس سے میں نے کافی استفادہ کیا ہے۔ صاحبِ موصوف بڑے تپاک سے پیش آئے۔ مجھے دوسرے حضرات سے ملنے کی جلدی تھی، اس لیے دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے ان سے رخصت ہوا۔ میں نے تاجیک ادب اور آذری زبان سے متعلق کچھ ترجمے کیے ہیں(۲) اس لیے میں نے اپنے کرم فرما ڈاکٹر حکیم الدین قریشی صاحب سے عرض کیا کہ مجھ کو آذری زبان اور تاجیکی ادب کے ماہرین سے ملا دیں۔ انھوں نے تاجیکی ادب کے سلسلے میں بات چیت کرنے کے لیے ڈاکٹر مائیکل زند سے ملاقات کرا دی جو روما کے رہنے والے اور یروشلم یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں، انھوں نے تاجیکی ادب پر جو کام کیا ہے وہ ایران سے شائع بھی ہو چکا ہے۔ ان سے کافی دیر تک اپنے مسائل کے سلسلے میں گفتگو کرتا رہا۔ یان ریپکا کی کتاب "تاریخِ ادبیاتِ فارسی" کا ایک حصہ تاریخِ ادبیاتِ تاجیکستان (جو بجائے خود ایک تصنیف کا حکم رکھتا ہے) بالخصوص معرضِ گفتگو رہا۔ ڈاکٹر زند نے دریافت فرمایا اسی کتاب میں مسٹر یان مارک نے جو اردو، ہندوستانی فارسی ادبیات پر لکھا ہے وہ کیسا ہے؟ میں نے بلا تامل عرض کیا کہ میرے نزدیک وہ باب انتہائی تشنہ ہے۔ اگر اس باب کو مذکورہ کتاب میں برقرار رکھنا ہے تو یان مارک صاحب کو اسے دوبارہ لکھنا چاہیے۔ آذری زبان کے سلسلے میں گفت و شنید کرنے کے لیے حکیم الدین قریشی صاحب نے اپنے ایک دوست رحیم پایانی اکبری صاحب سے ملاقات کرائی جو تبریز کے رہنے والے ہیں اور ان کے گھر میں آج بھی آذری ہی بولی جاتی ہے۔ چاؤشی صاحب بھی بڑی محبت سے ملے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس مسئلہ پر یہاں گفتگو نہ ہو سکے گی۔ آ

برج کے میگھ ملہار

وہی پھل ہاتھ میں لیے ایک طوائف کھڑی ہے اور بطور نذرانہ اسے پیش کرنا چاہتی۔ پوچھ گچھ پر تو راز کھلا، اسی نے راجا بھرتری کو جوگی بنا دیا۔ معلوم ہوا کہ پنگلا نے وہ پھل اپنے آشنا (داروغۂ اصطبل) کو دے دیا تھا۔ داروغۂ اصطبل نے اپنی محبوبہ (طوائف) کو دیا اور وہ طوائف اُسی پھل کو لے کر راجا کے دربار میں حاضر ہوئی۔ راجا کو پنگلا کی بیوفائی سے زیادہ اپنے بھائی وکرم کو جلاوطن کرنے کا غم تھا! جیسے راجا نے پنگلا کے اشارے پر کہ "وکرم نے مجھے بُری نظر سے دیکھا ہے" اپنے راج سے نکال دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وکرم نے پنگلا کو داروغۂ اصطبل سے باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے پنگلا نے اس پر یہ تہمت لگائی تھی۔

راجا نے وہ امر پھل کھایا اور تخت و تاج کو ٹھکرا کر اس بیوفا دنیا سے منھ موڑ لیا، اور جوگی بن گیا۔

تم نے منھ پھیر لیا، خوب کیا
ہم نے منھ موڑ لیا دنیا سے

اس کے بعد اس نے کبھی پنگلا کی طرف رُخ نہیں کیا۔ (ایک لوک کتھا سے ماخوذ)

سنسکرت ادب میں بھرتری ہری کے تین "شتک" (سو اشلوکوں کا مجموعہ) بہت مشہور ہیں: (۱) شرنگار شتک ؛ (۲) نیتی شتک ؛ اور (۳) ویراگیہ شتک۔ ان میں ویراگیہ شتک ایک زبردست شاہکار ہے۔ اس شتک میں بھرتری ہری نے فلسفۂ ویدانت اور وحدت الوجود کو پیش کیا ہے۔ مختلف زبانوں میں ان شتکوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اقبال نے غالباً نیتی شتک کے کسی اشلوک کا ترجمہ اس شعر میں کیا ہے:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ٹیپ کے بول "سمجھ راجا بھرتری" کے ناصحانہ تیور ہی گیت کے اصلاحی اور افادی پہلو کا اعلان کرتے ہیں۔ گیت سے بچپن کی شادی کی ریت کا بھی پتا چلتا ہے۔ ایک خاص بات قابلِ ذکر ہے۔ گیت کار نے جوگی سے ماں کو "میا"، بہن کو "بہنا" اور

کو "رانی" کہلوایا ہے، حالانکہ جوگی کو توان تینوں ہی کو "میّا" کہنا چاہیے تھا۔ جیسے راجا بھرتری نے جوگ لینے کے بعد پنگلا کو "میّا پنگلا" کہا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نے عمداً اس امتیاز کو قائم رکھا ہے، تاکہ جوگی کی غیرت کو جھنجھوڑ سکے اور آخر میں بد دعا دینے کے بعد رانی سے کہلوا ہی دیا کہ:

ترِیا تو بھٹکے رے تیری ، باپ کے
ارے جوگی ! کنواں میں گیئو تیرو جوگ سمجھ راجا بھرتری !

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گیت ایک خاص مقصد کے لیے کہا گیا تھا۔ اس سے گیت کا افادی پہلو روشن ہوتا ہے۔ ہم اس گانو کی شاعرہ کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے افادیت اور مقصدیت کو اُس وقت قائم رکھا جب شاید ہمارا ادب بھی "ادب برائے ادب" کی رٹ لگا رہا تھا۔ اُس نے گانو کی فضا "ادب برائے زندگی" کے نعروں سے معمور کر دی۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ لوک گیتوں میں "ترقی پسندی" کے عناصر بھی مضمر ہیں۔ کیونکہ یہ گیت خالصتاً گانو کا ماحول، گانو کی زندگی، گانو کا کلچر، گانو کی تہذیب، گانو کی معاشرت، غرض گانو کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں، افادی اور تفریحی پہلوؤں، سب کی عکاسی کرتے ہیں۔

[بشکریہ شریمتی پربھاوتی]

۹۔ چندراولی

آ تجھ کو بتلاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

اقبال نے "تقدیرِ اُمم" کے بننے اور بگڑنے، قوموں کے عروج و زوال کا راز بڑی خوبصورتی سے "شمشیر و سناں" اور "طاؤس و رباب" کے پردے میں منکشف کیا ہے۔ "شمشیر و سناں" کسی قوم کی ترقی، بلند حوصلگی، بلند کرداری، عظمت و وقار کی ضامن

ہیں، تو "طاؤس ورباب" اس کے زوال، کم حوصلگی، پست کرداری، عیش و نشاط اور سرور و مستی اور فراریت کی علامت۔ اس امر کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے "شمشیر و سناں" رزم اور "طاؤس و رباب" بزم کی علامتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ میدانِ جنگ میں قوموں اور سلطنتوں کی قسمتوں کے فیصلے ہوئے ہیں۔ جو قوم بزورِ شمشیر و سناں بامِ عروج پر پہنچی، بعد کو اُسی نے بزمِ نا و نوش اور مجلسِ عیش و نشاط منعقد کی۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی، تو رجز خوانی کی جگہ غزل سرائی نے۔ رزم، مُنتہائے کمال اور بزم ابتدائے زوال کی نقیب بن گئی۔ تاریخ کے اوراق قوموں اور سلطنتوں کے عروج و زوال کی ایسی بیشمار داستانوں سے پُر ہیں۔ اور آخر یہ کلّیہ وجود میں آیا کہ "ہر کمالے را زوال"۔

"چندراولی" میں گیت کار نے غالباً مغلیہ سلطنت کے زوال و انحطاط کے دورِ آخر کی عکّاسی کی ہے۔ اس عہد میں بزمِ شاہی سے

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کی صدائیں صاف سُنائی دیتی تھیں۔ اور جیسا "راجا ویسی پرجا" کے مصداق، اس کے معاشرے اور سماج پر ہر طرف زوال آمادگی اور انحطاطی کیفیت مسلّط تھی۔ اس ملہار میں حسین و لطیف اشاروں اور کنایوں میں اس کی جھلک ملتی ہے:

نند بھاوج پانی کو گئیں
رے گئی ہیں سرَوَر تال لاگیو ہے ساون ماس!
بھاوج اُبچ کے چلی گئی
رے ننذی ہو پلّی پار لاگیو ہے ساون ماس!
ہرا تو پرے ہیں پٹھان کے
رے وے لئی ہو ئی بیچ لاگیو ہے ساون ماس! سنتیوء۔

ساون کا مہینہ لگ گیا تھا۔ چندراولی اپنی بھاوج کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے تالاب پر گئی۔ بھابی تو تالاب سے پانی بھر اور گھڑا اُٹھا کر چلی آئی۔ لیکن چندراولی گھومتی ہو

برج کے میگھ ملہار

تالاب کے دوسرے کنارے کی طرف جا نکلی۔ وہاں پٹھان کے خیمے گڑے تھے۔ پٹھان اُسے پکڑ کر اپنے خیمے میں لے گیا۔

سرگ اُڑنتی چیلیا
ری جیئو بابل کے دیس لاگیو ہے ساون ماس!
ہمرے بابل تے یو کہیو
رے بیٹی تموری ہیچ لاگیو ہے ساون ماس!
ہمرے بیرن تے یو کہیو
رے بینا پری بندھی کھان لاگیو ہے ساون ماس!

وہ آسمان میں اُڑتی ہوئی چیل سے کہتی ہے: "اے چیل! تو میرے بابل کے دیس جا۔ اور اس سے کہہ دے کہ تیری بیٹی خاں کے خیموں میں ہے۔ میرے بھائی سے بھی جا کر کہہ دے کہ تیری جسے تُو پیار سے "مینا" کہتا تھا، وہ پٹھان کے چنگل میں پھنس گئی ہے۔"

بابل سن کے روئے پرے
رے میّا کھانت پچھاڑ لاگیو ہے ساون ماس!
بیرنا سُن کے روئے پرے
رے بھاوج کھانت پچھار لاگیو ہے ساون ماس!

چیل نے جب یہ سندیس جا کر سُنایا تو چندراولی کے بابل اور بھائی رونے لگے اور اس کی ماں اور بھاوج پچھاڑیں کھانے لگیں۔

سرگ اُڑتنے کاگلا!
رے جیئو بیاہے کے دیس، لاگیو ہے ساون ماس!
میرے سسر تے یوں کہو:
رے بہوٹل پری بندی کھان! لاگیو ہے ساون ماس!
ہمارے بیاہے تے یوں کہو:
رے گوری پریں بندی کھان! لاگیو ہے ساون ماس!

برج کے میگھ ملہار

چندرا وِلی آکاش میں اُڑتے ہوئے کوّے سے بھی کہتی ہے ۔ " اے کاگا! اُڑ کر میرے پیا کے دیس جا! میرے سُسر سے کہنا کہ تیری بہو نِل پٹھان کی قید میں پڑی ہے۔ ہمارے پیا سے بھی کہنا کہ تیری گوری خان کے خیمے میں گرفتار ہے"۔

سُسر تو سُن کے روئے پڑے،
رے ساسُل کھانت پچھار، لاگیو ہے ساون ماس!
بیا ہے بیدردی ہنس رہے،
رے ایسی ناؤں دوئے چار، لاگیو ہے ساون ماس!

کوّے کی زبانی جب چندرا کا حال معلوم ہوا، تو اس کا سُسر رونے لگا، اور اس کی ساس پچھاڑیں کھانے لگی۔ لیکن بیدرد بالم ہنس کر کہنے لگے کہ ایسی دو چار اور لے آؤنگا

بابُل ہتھیا کس دئی،
رے بیرن گھوڑلا پلان، لاگیو ہے ساون ماس!
بیا ہے بیدردی پالکی
رے چابیں ناگر پان، لاگیو ہے ساون ماس!

"بابُل" ہاتھی پر سوار ہوا۔ بیرن نے گھوڑا کس لیا۔ لیکن "بیا ہے بیدردی" پالکی میں بیٹھے" ناگر پان" چباتے رہے۔

بابُل اُترے کھیت میں،
رے بیرن بڑ کی چھانو، لاگیو ہے ساون ماس!
بیا ہے بیدردی بجار میں،
رے چابیں ناگر پان لاگیو ہے ساون ماس!

بابُل نے میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ بیرن نے بڑ کی چھانو میں بسرام کیا۔ لیکن بیا ہے بیدردی بازار میں پان کی گلوریاں اُڑاتے رہے۔

ہتھیا تولے لے ڈیڑھ سو،
رے گھوڑلا اور نہ چھور، لاگیو ہے ساون ماس!

بیٹی اے ہماری چھوڑ دے
رے کُل کوں لگ جائےگو داگ، لاگیو ہے ساون ماس!
مینا اے ہماری چھوڑ دے،
رے کُل کو لگ جائےگو داگ لاگیو ہے ساون ماس!

بابُل: (پٹھان سے) "اے خان! تُو ڈیڑھ سو ہاتھی لے لے، جتنے گھوڑے چاہیے، گھوڑے لے لے، لیکن ہماری بیٹی کو چھوڑ دے۔ ہمارے کُل (خاندان) کو داغ لگ جائیگا۔"

بیرن: "اے خان! ہماری "مینا" کو رہا کر دے۔ ہمارے خاندان کو بٹا لگ جائیگا۔"

نا لیوں ہتھیا ڈیڑھ سو،
رے گھوڑلا اَور نہ چھور، لاگیو ہے ساون ماس!
بیٹی اے تمہاری نائیں چھوڑوں،
رے ایسی بلبے کی نائیں، لاگیو ہے ساون ماس!
مینا تمہاری اے نا چھوڑوں،
رے ایسی بلبے کی نائیں! لاگیو ہے ساون ماس!

پٹھان: "نہ میں ڈیڑھ سو ہاتھی لونگا، نہ بیشمار گھوڑے۔ میں تمہاری بیٹی کو نہیں چھوڑونگا۔ میں تمہاری مینا کو رِہا نہیں کرونگا۔ ایسی حسینہ پھر میرے کہاں ہاتھ لگیگی۔"

گئی تو لے لے رے ڈیڑھ سو،
رے روپیہ اَور نہ چھور، لاگیو ہے ساون ماس!
بیاہی تو لے لے رے ڈیڑھ سو،
رے کنواری اَور نہ چھور، لاگیو ہے ساون ماس!
بھوا اے ہماری چھوڑ دے،
رے ایسی بلبے کی نائیں! لاگیو ہے ساون ماس!

برج کے میگھ ملہار

گوری اسے ہماری چھوڑ دے
رے جا کی پتری کمر، لمبے کیس! لاگیو ہے ساون ماس!

سسر: "اے خان! ڈیڑھ سو سونے کی اشرفیاں لے لے، اور روپے جتنے چاہے، لے لے۔ ڈیڑھ سو بیاہی اور ان گنت کنواری لڑکیاں لے لے، لیکن ہماری بہو کو چھوڑ دے۔ ہمیں ایسی بہو نہیں ملیگی۔"

بیاہے: "اے خان! تو ہماری پتلی کمر اور لمبے بالوں والی حسینہ کو چھوڑ دے۔"

نالیوں گنی ڈیڑھ سو،
رے روپیہ اور نہ چھوڑ، لاگیو ہے ساون ماس،
نالیوں بیاہی ڈیڑھ سو،
رے کنواری اور نہ چھوڑ، لاگیو ہے ساون ماس
بہو اسے تہاری نادیوں
رے ایسی ملیے کی نائیں، لاگیو ہے ساون ماس
گوری اسے تہاری نا چھوڑوں،
رے جا کی پتری کمر، لمبے کیس، لاگیو ہے ساون ماس

پٹھان: "مجھے نہیں چاہییں تمھاری کتیاں، اور تمہارے روپے۔ مجھے نہیں چاہییں شادی شدہ عورتیں اور کنواری لڑکیاں میں تمھاری بہو کو نہیں دونگا۔ ایسی مجھے پھر کہاں ملیگی۔ میں تمھاری پتلی کمر لمبے بالوں والی حسینہ کو رہا نہیں کرونگا۔"

جاؤ! بابل گھر آپنے،
رے راکھوں پگڑی کی لاج، لاگیو ہے ساون ماس
جاؤ! بیرن گھر آپنے،
رے راکھوں ٹوپی کی لاج، لاگیو ہے ساون ماس
جاؤ! سسر گھر آپنے،
رے راکھوں دو دُگلی کی لاج، لاگیو ہے ساون ماس

برج کے میگھ ملہار

جاؤ! بیا ہے گھر آپنے،
رے راکھوں سہرا کی لاج، — لاگیو ہے ساون ماس
پانی نہ پیوں پٹھان کو،
رے پیاسن مرجاؤں، — لاگیو ہے ساون ماس
کھانوں نہ کھاؤں پٹھان کو،
رے بھوکن مرجاؤں، — لاگیو ہے ساون ماس
سیج نہ سوؤں پٹھان کی،
رے انیندن ہی مرجاؤں، — لاگیو ہے ساون ماس

چندراولی : "بابُل! اپنے گھر لوٹ جاؤ! میں تمھاری پگڑی کی لاج رکھوں گی۔ بیرن! اپنے گھر جاؤ! میں تمھاری ٹوپی کی لاج رکھوں گی۔ سسر! تم بھی جاؤ! میں دونوں خاندانوں کی لاج رکھوں گی۔ اور پتی دیو! تم بھی لوٹ جاؤ، میں سہرے کی بھی لاج رکھوں گی۔ میں پٹھان کے ہاں کا نہ پانی پیونگی، نہ کھانا کھاؤنگی، چاہے میں بھوکی پیاسی ہی کیوں نہ مرجاؤں۔ (پتی سے) میں پٹھان کی سیج پر پانو بھی نہ دھرونگی، چاہے میری جان ہی چلی جائے، میں نیند سے مرکیوں نہ جاؤں۔

(سب مایوس ہو کر چلے جاتے ہیں)

جارے مغل[۱] کے چھوہرا[۲]
رے پانی بھر لاؤ، — لاگیو ہے ساون ماس
پیاسی مرے چندراولی
رے جاکی مائی نہ باپ، — لاگیو ہے ساون ماس
جارے مغل کے چھوہرا
رے روٹی لے آکے، — لاگیو ہے ساون ماس،
بھوکی مرے چندراولی،
رے جاکی پتری[۳] کمر، لمبے کیس[۴]! — لاگیو ہے ساون ماس

۱- مغل ۲- بیٹا- لڑکا ۳- چپلی ۴- بال

چندراولی: (مغل پسر سے جو اس کی خدمت پر مامور ہے) اے مغل کے لڑکے! جا پانی بھر لا! چندراولی پیاسی ہے۔ اس کی یہاں ماں ہے نہ باپ۔ جا، روٹی لے آ پتلی کمر اور لمبے بالوں والی چندراولی بھوکی ہے۔

مُغل کے سنے بیٹھ جو پھیری اے،
رے تموئں۵ دے لئی آگ، لاگیو ہے سان ماس
ٹھاڈی۶ جرے چندراولی، لاگیو ہے سامن ماس
رے جاکی مائی نہ باپ، لاگیو ہے سامن ماس
ہاڈ۷ جریں جیسے لاکڑی۸، لاگیو ہے سامن ماس
رے کیس ہری ہری دُوب، لاگیو ہے سامن ماس
ہائے ہائے مُغلا کرے، لاگیو ہے سامن ماس
رے توبہ کرت پٹھان، لاگیو ہے سامن ماس
لائی نہ بلسی جوں ای گئی،
رے جاکی پتری کمر، لبے کیس: لاگیو ہے سامن ماس

۵۔ تنبو، خیمہ
۶۔ کھڑی
۷۔ ہڈیاں ۸۔ لکڑی

مغل پسر کی پیٹھ پھرتے ہی چندراولی نے خیموں میں آگ لگا دی۔ آگ کے شعلوں میں کھڑی چندراولی جل رہی تھی۔ وہاں نہ اُس کی ماں تھی اور نہ باپ۔ اُس کی ہڈیاں لکڑی کی طرح اور اس کے لمبے لمبے بال گھاس کی طرح جل رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر مغل پسر ہائے ہائے کرنے لگا اور پٹھان بھی کفِ افسوس ملتا ہوا "توبہ توبہ" کہہ اُٹھا۔

ہائے اُس زُود پشیماں کا پشیماں ہونا

اور اس طرح وہ پتلی کمر اور لمبے بالوں والی چندراولی نہ تو خود ہی اپنے جیون کا سُکھ بھوگ سکی، اور نہ پٹھان ہی کے ارمان پورے ہوئے۔

تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ یہ گیت راجستھان، بندیل کھنڈ، پوُربی اتر پردیش، کورو پردیش اور بہار میں بھی گایا جاتا ہے۔

اگرچہ گیت کار نے گیت میں چندراولی کا سراپا پیش نہیں کیا ہے۔ تاہم گیت کے

تیور اس کے غیر معمولی حسن وجمال کی صاف غمازی کرتے ہیں۔ مثلاً پٹھان چندراولی کو ہاتھی، گھوڑوں، اشرفیوں، روپوں، بیاہی عورتوں اور کنواری لڑکیوں کے عوض بھی نہیں چھوڑتا، بلکہ صاف کہہ دیتا ہے کہ "رے ایسی ملے کی نائیں"۔ اگرچہ "بیاہے بیدردی" یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ "رے ایسی لاؤں دوے چار"۔ اس سے "بیاہے" کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ بزدل ہے، بیغیرت ہے اور بیحیا ہے۔ وہ اپنی بزدلی کی وجہ سے ہنس کر ٹال دیتا ہے کہ اگر چندراولی کو پٹھان نے پکڑ بھی لیا، تو کیا ہوا! میں ایسی اور چندراولی لے آؤنگا۔ بیاہے کے اس جملے سے چندراولی کے حسن وجمال میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حال آنکہ پھر وہ بھی پٹھان سے کہتا ہے:

"گوری اے ہماری چھوڑ دے
رے جا کی پتلی کمر، لمبے کیس"

چندراولی حسنِ صورت اور حسنِ سیرت میں اپنے وقت کی "پدمنی" تھی۔ جب اس کے بابل، بیرن، سسر اور "بیاہے" اس کی رہائی کے لیے پٹھان کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، تو اس کا احساسِ خودی مجروح ہو جاتا ہے۔ وہ ان سب کو گھر لوٹ جانے کے لیے کہتی ہے اور انھیں یقین دلاتی ہے کہ وہ جان دے دیگی، مگر اپنی عصمت وعفت پر آنچ نہ آنے دیگی۔ آخر جیسا وہ کہتی ہے، کر بھی دکھاتی ہے۔ وہ خیموں میں آگ لگا کر جلتی اور خاک ہو جاتی ہے۔ یہی گیت کا منتہا ہے اور چندراولی کے کردار کی معراج بھی۔ اس کا کردار ایک آدرش بھارتیہ عورت کا کردار ہے۔ وہ بھی پدمنی کی طرح اپنی لاج، اپنی آن رکھنے کے لیے، اپنے حسن وجمال کو لپکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کر دیتی ہے۔

گیت میں جتنا بلند کردار چندراولی کا ہے اتنا ہی پست کردار اس کے "بیاہے" کا ہے۔ دونوں بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میری رائے میں گیت کا کمزور ترین بلکہ بدترین کردار بیاہے کا ہے۔ پٹھان کو اس کی ذلیل حرکت پر ایک لمحے کے لیے معاف کیا جا سکتا ہے، مگر بیاہے کو نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ کوئی ہیجڑا

ہے۔ چندراولی جب پٹھان کے چنگل میں پھنس جاتی ہے، تو وہ بیغیرت ہنس کر کہتا ہے کہ کوئی بات نہیں، میں ایسی دو چار اور لے آؤں گا۔ چندراولی کو چھڑانے کے لیے کوئی ہاتھی پر سوار ہوتا ہے، کوئی گھوڑے پر، مگر وہ "جنت کی چڑیا" پالکی میں سوار پان کی گلوریاں کھاتا ہے۔ اس کا باپ، سسر اور سالا پٹھان سے ملنے اور چندراولی کو رہا کرانے کی تدبیریں سوچتے ہیں، مگر وہ بازار کی سیر کو نکل جاتا ہے اور وہاں پان کے بیڑے اُڑاتا ہے۔ وہ بیچارہ پٹھان سے کہتا ہے کہ میری پتلی کمر اور لمبے بالوں والی حسینہ کو چھوڑ دے۔

اسی طرح بابل، بیرن اور سسرے کے کردار بھی کھوکھلے اور بیجان ہیں۔ اُن کے ہاتھی، گھوڑے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کوئی چھوٹے موٹے جاگیردار یا تعلق دار ہیں۔ وہ سب ہاتھ باندھے، ڈرتے ڈرتے پٹھان کے خیمے میں داخل ہوتے ہیں، اور بڑی ذلت کے ساتھ پٹھان سے سودا کرنے لگتے ہیں کہ وہ ہاتھی، گھوڑے، سونا چاندی لے کر چندراولی کو چھوڑ دے۔ چندراولی کا سسر یعنی بیاہے کا باپ تو سب سے دو قدم آگے ہے۔ وہ چندراولی کے بدلے میں ڈیڑھ سو شادی شدہ اور بیشمار کنواری لڑکیاں دینے کو تیار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی پٹھان سے کچھ کم سیاہ کار نہیں۔

اور پٹھان اس زوال پذیر مغل سامراج کا ایک عیّاش اور لذت پرست نمونے کا کردار ہے۔ وہ سلطنت کا کوئی بڑا امیر یا عہدہ دار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے چھوٹے موٹے تعلق دار ڈرتے ہیں۔ وہ جس کسی حسینہ کو چاہتا ہے، اپنے حرم میں ڈال لیتا ہے۔ وہ دادِ عیش دینے کے لیے ہی تالاب کے کنارے خیموں کا رنگ محل بناتا ہے اور وہاں کتنی ہی مظلوم و مجبور، معصوم و حسین دوشیزاؤں کی آبروریزی سے شیطان کے نام کو زندہ کر دیتا ہے۔

چندراولی کے بابل، بیرن، سسر اور بالم سبھی عیش پرستی اور لذت کوشی کے شکار معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح سلطنت کے بڑے امیران کی بہو بیٹیوں کی آبروریزی

کرتے تھے، اسی طرح وہ بھی اپنے سے کمزور مزارعوں اور کسانوں کی عورتوں کی عزت
و ناموس کو لوٹنے سے گریز نہیں کرتے تھے:

بیاہی تو سے لے ڈیڑھ سو
رے کنواری اور نہ چھوڑ

ظاہر ہے کہ یہ بیاہی اور کنواری، غریب کسانوں کی ہی بہو بیٹیاں ہی تو ہونگی۔
ہر دَور کے مورّخ پر تھوڑا بہت جانبداری اور مبالغے کا الزام عائد ہوتا ہے کیونکہ وہ
شاہِ وقت یا حکومتِ وقت کے فرمان پر اس دَور کی تاریخ لکھتا ہے۔ مجبوراً اسے اس
حکومت کی خوبیوں کو اُجاگر کرنے میں مبالغہ آرائی سے کام لینا پڑتا ہے، اور خامیوں
پر پردہ بھی ڈالنا پڑتا ہے۔ اس امر کی تصدیق مختلف ادوار کی تاریخوں کے موازنہ سے
ہو سکتی ہے۔ لیکن کسی حکومت کے زرخرید و خانہ زاد مورّخ کے مقابلے میں ایک آزاد
اور من موجی گیت کار، غیر جانبداری، سیدھے سادے اور سچے انداز میں اپنے زمانے
کے جیتے جاگتے حسین و کریہہ، شیریں و تلخ واقعات و حالات کو اپنے گیتوں میں اس
طرح ڈھال دیتا ہے کہ کئی بار خود مورّخ کو تاریخ مرتب کرتے وقت حقیقت، صداقت
اور واقعیت کی تلاش میں ان گیتوں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ گیت کار سچی بات کہنے سے
نہیں جھجکتا، کیونکہ حق گوئی اور بیباکی اس کی فطرت کا خاصہ ہے: وہ شاہِ وقت یا حکومت
کے عتاب سے نہیں ڈرتا۔ بقول اینڈریو فلیچر، وہ صاف کہہ دیتا ہے:

مجھے لوک گیت بنانے دو! پھر مجھے پروا نہ ہوگی کہ دیس کے لیے
قانون کون بناتا ہے!

چندراوالی جب پٹھان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتی ہے، تو آسمان میں
اُڑتی ہوئی چیل اور کوّے کو اپنے "بندی کھان" ہونے کا سندیس دے کر اپنے
بابل اور بیا ہے کے دیس بھیجتی ہے:

سرگ اُڑنتی چلیا!
رے جیئو بابل کے دیس

برج کے میگھ ملہار

سرگ اُڑنتے کاگا!
رے جیئو پیا ہے کے دیس!

لتنا حسین شاعرانہ انداز ہے۔ ظاہر ہے ایسی منحوس خبر سنانے کے لیے زاغ وزغن سے بہتر پیغامبر کون ہو سکتا ہے! بھارت کے لوک گیتوں میں "برہن" کے "کاگ" کو قاصد بنایا ہے مثلاً:

"جارے کاگا دیس پیا گے" یا
کاگا نین نکاس دوں، جو پیا پاس لے جائے
پہلے درس دکھائے کے پاچھے بیجو کھائے

غرض اس گیت سے جہاں اس زمانے کی عیش کوشی، لذت پروری، ہوس پرستی اور سیاہ کاری پر روشنی پڑتی ہے، وہیں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ "پدمنی" کی آتما "چندراولی" کے روپ میں ایک بار پھر انسانیت کے رخ پر چھائے ہوئے گہرے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے۔ آگ کے شعلوں میں کود پڑتی ہے، اور بقول سرور جہاں آبادی۔

آفریں ہے تری جانبازی و ہمت کے لیے
آفریں ہے تری عفت، تری عصمت کے لیے
کیا مٹائیگا زمانہ، تری شہرت کے لیے
کہ چلی آتی ہے اک خلق زیارت کے لیے

نقش اب تک تری عظمت کا ہے بیٹھا دل میں
تُو وہ دیوی ہے نرالگتا ہے میلا دل میں

اور آج بھی زمانہ اُس کی تقدیس کا قائل ہے۔

(یہ گیت شری موہن سروپ بھاٹیا کے مضمون "چندراولی" مطبوعہ ہفتہ وار ہندستان (ہندی) ۷ ستمبر ۱۹۵۸ء سے ماخوذ ہے۔)

۱۰۔ نتھیا

نتھیا تالاب کے اونچے گھاٹ پر کھڑی پانی بھر رہی ہے — مگر یہ کیا؟ وہ اپنی گاگر بھرتی ہے اور اُلٹ دیتی ہے؛ پھر بھرتی ہے اور خالی کر دیتی ہے۔ پانی بھرنے کا یہ انوکھا انداز ہے! انجانے میں ایسا کر رہی ہے یا جان بُوجھ کر؛ کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہاں! کچھ کھوئی کھوئی سی تو معلوم ہوتی ہے۔ اس انوکھی پنہارن کو دیکھ کر راہ چلتے مسافر بھی ایک لمحے کے لیے رُک جاتے ہیں؛ اور حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا، تو سر کھُجاتے ہوئے اپنی راہ لگتے ہیں۔

آیئے! چل کر نتھیا ہی سے پُوچھیں کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے؛ مگر نہیں! اُس کی یہ گم شدگی، خود فراموشی، محویت کا عالم — یہ طلسم ٹوٹ جائیگا۔ ابھی کچھ دیر اور اسی طرح رہنے دیجیے! کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے احساس کے کسی نرم و نازک آبگینے کو ٹھیس لگ جائے۔ ایسی مجذوبیت کی حالت میں کسی کو چونکانا اچھا نہیں بس، دور ہی سے تماشا دیکھیے!

ذرا اُس راہگیر کو دیکھیے! راستے میں کھڑا نتھیا کو گھُور رہا ہے۔ ارے! یہ تو بڑا اناڑی ہے' گھاٹ ہی پر پہنچ گیا، مگر ہے کوئی منچلا۔ لو! اُس نے تو نتھیا سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔ آیئے! اُس پیڑ کی آڑ سے ان کی باتیں سُنیں۔

نتھیا : اے راہی! یا تو تُو راستہ بھٹک گیا ہے، یا پھر تیری گھر والی اپنے میکے ساون جھُولنے گئی ہے۔

راہی : نتھیا نہ تو میں راستہ بھُولا ہوں، اور نہ ہی میری گھر والی اپنے میکے ساون جھُولنے گئی ہے۔ میں تو، نتھیا! تیرا رُوپ دیکھ کر سب کچھ بھُول گیا ہوں۔ اے گجبن! (غضب کی حسینہ) تو اگر تیار ہو تو میں تجھے ساتھ لے چلوں۔

نتھیا : اے مسافر! میں تیرے ساتھ چل تو پڑتی، مگر چاروں گُلا (خاندان) کی لاج چلی جائیگی۔

مسافر : ننھیا ! کُل تو دو ہوتے ہیں ، یہ چاروں کُل کی للج ! یہ کیا بلا ہے ؟
ننھیا : میرا باپ ریاست کا راؤ ہے۔ میرا سسر مہوبا کا چودھری ہے، میرا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے اور میرا جیٹھ بلوچ کی خدمت پر مامور ہے۔ بس، ویسے کل دو ہی ہوتے ہیں ! اس طرح یہ چاروں کُل کی لاج کا سوال ہے ؟

اس پر "بٹیوُرا" جار ہے ہیں اپنا سا منھ لے کر۔ یہ منھ اور مسُور کی دال !
اب ملہار ملاحظہ کیجیے :

اونچی رے سرابر¹ تیری پاڑ² ، جا پہ ٹھاڈی³ رے ننھیا جل بھرے !
۱۔ سرو ور۔ تالاب ۲۔ کنارا ۳۔ کھڑی

بھر بھر رے ننھیا دِیُو⁴ ڈھر کائے⁵ — ۴۔ دیا ۵۔ ڈھلکائے
چلتے بٹیوُ⁶ رے ٹھاڈے⁷ ہو گئے — ۶۔ راہگیر۔ مسافر ۷۔ کھڑے
کے تو رے بٹیوُرا بھُو لیو گیل⁸ — ۸۔ رستہ
کے تیری بیاہی⁹ جھُولے باپ کے — ۹۔ بیوی
نا میں ننھیا بھُولیو اون گیل
نا میری بیاہی جھُولے باپ کے
بھولو رے ننھیا تیرو رُوپ
سنگ چلتے توری گجبن لے چلوں !
چلتی رے بٹیوُرا تیرے سنگ
چالوں تو چاروں کُل لاجی¹⁰ اے ! — ۱۰۔ بیعزتی۔ کلنک
کیسے ری ننھیا دو وُ کُل ہوئیں !
کیسے وہ چاروں کُل لاجی اے ؟
بابُل رے بٹیوُ ! ریاست کو راؤ
سسر مہوبے کے چودھری !
بیرن رے بٹیوُ پڑھے¹¹ چٹ سال¹² — ۱۱۔ پڑھے۔ ۱۲۔ پاٹھشالا۔ مدرسہ

جیٹھ بلوچ کی کریں ہیں چاکری!
ایسے رے بٹیو! دونوں کل ہوئیں
ایسے ای چاروں کل لاجی اے!

یا، دراصل، نہ تو کسی ریاست کے راؤ کی بیٹی ہے، نہ وہ مہو باکے چودھری کی بہو ہے، وہ ایک معمولی گانوَ کی عورت ہے مگر خوبصورت ہے۔ تالاب پر پانی بھرتے ہوئے وہ کچھ اس قسم کے سپنے دیکھ رہی ہے کہ اُس کا باپ ریاست کا راؤ ہے، اس کا سسر مہو با کا چودھری ہے، اُس کا بھائی اسکول میں پڑھتا ہے، اور اس کا جیٹھ بلوچ کی فوج میں نوکر ہے۔ اس ''آرزو خیالی'' کے عالم میں اپنی گاگر بھرتی ہے اور پھر خالی کر دیتی ہے۔ وہ واقعی اپنے آپ کو مہو با کی چودھری کی بہو سمجھ رہی ہے۔ اُس اجنبی کے ساتھ جانے سے اِسی لیے انکار کر دیتی ہے کہ اتنے بڑے گھرانے کی بیٹی! اتنے بڑے خاندان کی بہو ـــ اگر اس نے ایسی حرکت کی، تو ناک کٹ جائیگی کُل کو کلنک لگ جائیگا۔

جب راہی نتھیا سے کہتا ہے کہ تیرے رُوپ نے مجھے پاگل بنا دیا ہے، تو نتھیا پر اس جملے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ وہ شرماتی ہے، نہ لجاتی ہے، نہ اس کے کان کی لویں گرم ہوتی ہیں، نہ اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو جاتا ہے، بلکہ وہ بڑی گمبھیرتا سے اُسی کھوئے کھوئے انداز میں کہتی چلی جاتی ہے کہ ریاست کے راؤ کی بیٹی، مہوبے کی چودھری کی بہو، کسی پردیسی کے ساتھ بھاگ گئی، تو دنیا کیا کہیگی۔ راؤ اور چودھری کہیں منھ دکھانے کے قابل نہیں رہینگے۔

نتھیا کا یہ کہنا کہ ''چلتی رے بٹیورا تیرے سنگ'' اُس کی ''آرزو خیالی'' کی صاف غمازی کرتا ہے۔ وہ اب گانوَ کی ایک معمولی پنہارن نتھیا نہیں، بلکہ ایک راؤ کی بیٹی اور ایک چودھری کی بہو ہے! کُل کی لاج کے بندھن میں بندھی ہے۔ وہ اب کُل کی مریادا، خاندان کی روایت اور لوک لاج کی بیڑیوں کو نہیں توڑ سکتی۔ ہاں اگر وہ صرف نتھیا ہوتی، تو ضرور اس راہی کے ساتھ بھاگ جاتی۔ مگر وہ مجبور ہے۔ اسی لیے راہی کو مایوس ہوکر پنگھٹ سے لوٹنا پڑتا ہے۔

برج کے میگھ ملہار

راہی جب پنگھٹ پر پہنچتا ہے تو سمجھتا ہے کہ شاید وہ راستہ بھول گیا ہے یا پھر اُس کی "بیاہی" ساون کے جھُولے جھُولنے کو اپنے میکے چلی گئی ہے۔ اس لیے وہ دل بہلانے کو آ نکلا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ساون کے مہینے میں اس قسم کے پیاسے پنچھی بھی رُوپ کے پنگھٹ کا چکر لگاتے ہونگے۔ اس آس میں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بُوند مل جائے۔

یہ ملہار بھی جاگیردارانہ دَور کا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے یہ پتا بھی چلتا ہے کہ راؤ اور چودھریوں کے گھرانے کی بہو بیٹیوں کو لوک لاج اور اپنے گھرانے کی عزّت کا بہت پاس رہتا تھا؛ اُن کا کردار بلند ہوتا تھا۔

[بشکریہ شریمتی راج دُلاری]

۱۱۔ چمپا

ساون رُت کی آمد آمد ہے۔ باغ میں پپیہا بول رہا ہے۔ گانو کے پنگھٹ پر نئی نویلی دلہنیں لمبے لمبے گھونگھٹوں کی آڑ سے، میکے کی گھٹاؤں کی یاد میں کھوئی، گاگروں کو بھر رہی ہیں۔ جھُومتی ہوئی گھٹا کے گھونگھٹ میں چنچل بجلی کی مُسکان اور پپیہے کی مدھر تان پنگھٹ کے دھڑکتے ہوئے بےچین دل پر تیر چلا رہی ہے، اور چھلک رہی ہے نینوں کی گاگر۔ آپ سمجھتے ہونگے کہ پنگھٹ "پردیسی پیا" کے انتظار میں بیقرار ہے۔ مگر نہیں! آج وہ "میّا جائے بیر" کے لیے بےچین ہے۔ اس رُت میں اُمنڈتی ہوئی گھنگھور گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ بہن بھائی کا پیار بھی اُمنڈ پڑتا ہے۔

گانو میں آج بھی یہ دستور ہے کہ شادی شدہ لڑکیاں سُسرال سے اپنے میکے میں ساون جھُولنے کے لیے آتی ہیں۔ بھائی، بہن کی سُسرال جاتا ہے اور بہن کو ساون جھُلانے کے لیے اپنے گانو لے آتا ہے۔

جب باغ میں پپیہا بولتا ہے، تو ادھر چمپا اپنی سُسرال کے پنگھٹ پر اپنے بھائی کا

برج کے میگھ ملہار

انتظار کرتی ہے، ادھر چمپا کا بھائی اپنی ماں سے کہتا ہے کہ ماں میٹھی پوریاں تل دے میں چمپا کے دیس جا رہا ہوں۔ باغ میں پپیہا بول رہا ہے۔ پپیہے کے بول ساون رُت کی آمد کا سندیش دے رہے ہیں:

میٹھی تو کر دے اماں کوتھری

اری اماں! جاؤں بہنا کے دیس، پپیہا ری بولیو باگ میں!

چمپا کی سسرال دلّی میں ہے۔ چمپا کا بھائی رات ڈھلے دلّی پہنچتا ہے۔ شہر پناہ کے دروازے بند ہیں۔ وہ چمپا کی ساس کو پکارتا ہے کہ موسی! دلّی دروازہ کھول دے۔ میں اپنی بہن سے ملنے آیا ہوں:

دلّی دروا جوری موسی کھول دے!

اری موسی! بہن ملن بھیّا آ یو! پپیہا ری بولیو باگ میں!

چمپا دو دن ہوئے مر چکی ہے۔ اس کی ساس پریشان ہے کہ چمپا کے بھائی کو کیسے بتائے کہ چمپا مر چکی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ لالا! دلّی دروازہ تو اس وقت نہیں کھلیگا۔ تیری بہن باغوں میں جھولا جھول رہی ہے۔ وہ چمپا کی تلاش میں باغوں میں جاتا ہے، مگر چمپا نہیں ملتی۔ وہ پھر آکر موسی سے پوچھتا ہے کہ چمپا باغوں میں نہیں ہے، وہ کہاں ہے؟ وہ کہتی ہے کہ وہ تالاب کے کنارے بیٹھی ہوگی۔ اب وہ جاکر اسے تالاب کے کنارے ڈھونڈتا ہے مگر چمپا وہاں بھی نہیں ملتی:

دلّی دروا جو رے لالا نا کھلے،

اری لالا! تیری بہن باگن بیچ! پپیہا ری بولیو باگ میں

باگن باگن ری موسی پھریو،

ری موسی! کہیں نہ پائی چمپا بہن! پپیہا ری بولیو باگ میں

دلّی دروا جو رے لالا نا کھلے،

ارے لالا! تیری بہن تالن بیچ! پپیہا ری بولیو باگ میں

تالن تالن ری موسی ہے پھریو،

گھر میں علم وفضل، بلکہ شعر وشاعری کی روایت موجود تھی۔ اخگر کے والد شیخ سخاوت علی اردو کے خوشگو اور صاحب فن شاعر آرزو (ف: اپریل ۱۹۵۱ء) کے شاگرد تھے؛ سحر تخلص تھا۔ وہ ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد پہلے ریاست دھور (ضلع فیض آباد) میں ملازم ہوئے اور پھر رامپور چلے گئے۔ انھوں نے ۲۸ جولائی ۱۹۳۷ء کو محمود آباد میں رحلت کی؛ اپنے والد مولوی معصوم علی کے پہلو میں مدفون ہیں۔ اخگر کے دادا (یعنی شیخ سخاوت علی کے والد) مولوی معصوم علی عربی فارسی کے فاضل تھے، اور ان زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کا ۴ جنوری ۱۹۱۰ء کو محمود آباد میں انتقال ہوا۔

اخگر یکم اکتوبر ۱۸۹۵ء کو محمود آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت اپنے دادا کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی انھیں سے پائی؛ پھر نو بستہ مڈل اسکول، لکھنؤ بھیج دیے گئے؛ جہاں سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد حسین آباد گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہاں سے دسویں کی سند لے کر کیننگ کالج، لکھنؤ گئے۔ بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد یہیں سے حاصل کیں اور ۱۹۲۵ء میں لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کردی۔ اپنی محنت، دیانتداری اور خوش خلقی کے باعث جلد ہی شہر کے کامیاب وکلا میں شمار ہونے لگے۔

شعر و ادب گویا ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس پر لکھنؤ کا اس دور کا ماحول، جو سراسر شعر و نغمہ سے عبارت تھا۔ رہی سہی کسر آرزو کے پڑوس نے پوری کردی۔ وہ انھی کے محلّے میں رہتے تھے اور چونکہ ان کا ذاتی مکان تنگ تھا، اس لیے خاندانی تعلّقات کی بنا پر اپنا خالی وقت بیشتر انھیں کے ہاں گزارتے تھے۔ بلکہ بعد کو وہ مستقلاً ان کے مکان کے باہری کمرے میں اُٹھ آئے تھے۔ آرزو کی وجہ سے روزانہ گھر پر شہر کے سربرآوردہ ادبا و شعرا کا مجمع ہوجاتا۔ علمی ادبی گفتگو رہتی، اور مشاعرے کا سا سماں رہتا۔ اخگر اپنی نوجوانی سے شعر کہنے لگے تھے اور انھوں نے آرزو ہی کی شاگردی بھی اختیار کرلی تھی۔ لیکن دراصل ان کی شاعری اس زمانے میں پروان چڑھی، جب استاد کی دن رات کی صحبت میسّر آئی۔

وہ استاد کے عاشق تھے۔ آرزو کے دیوان "فغانِ آرزو" کا دیباچہ بھی انھیں کے قلم سے ہے۔ خود آرزو کو ان پر کتنا اعتماد تھا، یہ اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنے جملہ کلام کے حقوقِ نشر و اشاعت ان کو تفویض کر دیے تھے۔ استاد کے انتقال کے بعد اخگر نے "انجمن یادگارِ آرزو" قائم کی تھی، جس کے زیرِ اہتمام مشاعرے اور جلسے ہوا کرتے تھے؛ ان میں لکھنؤ اور باہر کے مشاہیر ادبا و شعرا شریک ہوتے

برج کے میگھ ملھار

بہنیں ہیں کہ اگر وہ انھیں ساون میں میکے نہیں بلائے تو وہ بھی چمپا کی طرح ایک "مٹھی راکھ" ہو کر رہ جائینگی۔ ان کے انتظار میں اپنی جان دے دینگی۔ اور پھر انھیں بھی چمپا کے بھائی کی طرح نراش ہو کر لوٹنا پڑیگا۔ اس لیے ساون شروع ہوتے ہی جب باغ میں پپیہا بول اُٹھے تو وہ "میٹھی کوتھری" لے کر فوراً ان کی سسرال آجائیں۔

غرض بہن بھائی کا یہ امر پریم ہندوستانی خصوصیات کا حامل ہے۔

[بشکریہ شرمتی پربھاوتی]

۱۲- لہریا

ساون رُت اُمنگوں کی رُت ہے۔ اس رُت میں گھنگھور گھٹائیں مستانہ وار جھوم کر اُٹھتی ہیں۔ لہراتی، گنگناتی، مست، مدہوش ہوائیں اِٹھلا اِٹھلا کے چلتی ہیں۔ ننھی ننھی بوندوں کی کومل کومل پریاں اِندر دھنک کے لہریے اوڑھے، نئے اُمنگ بھرے جیون کا سندیسہ لیے، دھیرے دھیرے آکاش سے دھرتی پر اُترتی ہیں۔ سندر سندر چنچل برج بالائیں، جھولوں میں جھوم جھوم کر میگھ ملھار کی دھن میں رُت کا سواگت راگ چھیڑ دیتی ہیں۔ امرتیوں میں کوئل کوک اُٹھتی ہے۔ پپیہا چہکنے لگتا ہے۔ مندر کے آنگنوں میں مور ناچتے ہیں۔ ٹھنڈی ٹھنڈی بوندوں کی رِم جھم رِم جھم میں، نئی اُمنگیں جنم لیتی ہیں، اور سنسار پر چھا جاتی ہیں۔ رنگ برنگے لہریے ہوا میں اُڑتے ہیں۔ رسیلے میگھ ملھار دلوں سے فضا گونج اُٹھتی ہے۔ غرض اس رُت میں دھرتی سے آکاش تک مستی اور اُمنگوں کا راج ہوتا ہے۔

لوک گیت سادہ اور معصوم عوام کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ حقیقت اور واقعیت لوک گیتوں کے قصرِ عالیشان کا سنگ بنیاد ہے۔ اس لیے گیت کار ان گیتوں میں حقیقت کے رُخ سے نقاب اُٹھانے کے بجائے حقیقت کو نیم برہنہ اور کبھی کبھی بالکل عریاں کر دیتے ہیں۔ اور جن گیتوں میں جنسی جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے، وہاں تو

حقیقت نگاری، عریانی اور فحاشی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی طرح ان گیتوں میں طنز و مزاح، چھیڑ چھاڑ اور خوش طبعی کی باتیں بھی کھل کر کی جاتی ہیں۔

"لہریا" کی "نایکا" کا آشنا ندی پار کا ایک دھوبی ہے۔ نایکا ایک شادی شدہ جوان عورت ہے۔ اس کا "بھنور" (شوہر) غالباً پردیس میں ہے۔ وہ لہریا اوڑھ کر اپنے آشنا سے ملنے ندی پر جاتی ہے۔ اور کنارے پر کھڑی ہو کر باآواز بلند اسے پکارتی ہے: او! ندی پار کے دھوبی، جلدی میری بات سن امگر گھر کے گھٹائیں آئی ہیں۔ مینھ برسنے والا ہے۔ بارش میں میرا لہریا بھیگ جائیگا:

پلی پار کے دھوبیا! لہریا میرو بھیجے گو!

وہ دھوبی سے اس انداز سے گفتگو کرتی ہے کہ اگر کوئی اُن کی باتیں سُن بھی لے، تو اُن پر کسی قسم کا شک و شبہہ نہ کرے۔ وہ دھوبی سے کہتی ہے: اے دھوبی! تُو میری چندری اور میرے بھنور کی سُرخ پگڑی دھولا۔

میری تو دھو لا دھوبی! چُوندری

ارے ہاں رے دھوبی! دھولا بھنور سُوئی پاگ، لہریا میرو بھیجے گو!

دھوبی: اے گوری! تو مجھے اپنی "چُوندری" اور "بھنور کی سُوئی پاگ" کی دھلائی کیا دیگی؟

کہا رے دھوئی دیگی چوُندری؟

ارے ہاں ری گوری! کہا رے دھوائی سوئی پاگ؟ لہریا میرو بھیجے گو! ا سُرخ

نایکا: اپنے ہاتھ کی انگوٹھی اور اپنے گلے کا ہار۔

ہاتھ کی دونگی تو ہے مُوندرا[2] ۲۔ مندری۔ انگوٹھی

ارے ہاں رے دھوبی! دیونگی گلے کو ہار۔ لہریا میرو بھیجے گو!

دھوبی: چٹیل میدان میں تیری انگوٹھی کو پھوڑ دونگا اور تیرے گلے کے ہار کو ندی میں بہا دونگا۔ گوری! میں تو دُھلائی میں تیرا آدھا جوبن اور پورے "شکھ سیج" لونگا۔

برج کے میگھ ملہار

پٹ پر میں پھوڑوں تیرو مونڈرا
ارے ہاں ری گوری! سمندر بہاؤں تیرو ہار۔ لہریا میر د بھیجے گو!
آدھو تو لوں گو تیرو جوبنا
ارے ہاں ری گوری! سگری تو لوں گو شکھ سیج۔ لہریا میر د بھیجے گو!

نائیکا : میرا بوڑھا سسر ڈیوڑھی میں سوتا ہے اور رات بھر چوکیدار گشت میں پھرتے ہیں۔

پوری میں سووے میرو ڈوکرا[۳]   ۳۔ سسر
ارے ہاں رے دھوبی! رات بھریں گستی مان[۴]۔ لہریا میرو بھیجے گو!   ۴۔ گشت چوکیدار

نائیکا اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ جب رات ہو جاتی ہے اور سارا گانو سو جاتا ہے، تو دھوبی پرنالا پکڑ کر نائیکا کے کوٹھے پر چڑھ جاتا ہے، اور اس کی شکھ سیج کو جا کر ہلا دیتا ہے۔

پکر پنارو[۵] دھوبی چڑھ گیو   ۵۔ پرنالا
ارے ہاں رے دھوبی! جائے ہلائی شکھ سیج۔ لہریا میرو بھیجے گو!

دھوبی فاتحانہ انداز میں نائیکا سے کہتا ہے: "اب کہاں ہے تیرا "ڈوکرا"! اور کہاں ہے وہ چوکیدار؟"

کہاں رے گیو ہے تیرو ڈوکرا
ارے ہاں ری گوری! کہاں رے گئے ہیں گستی مان؟ لہریا میرو بھیجے گو!

نائیکا : "ڈوکرا" سو گیا ہے اور چوکیدار گشت میں چلے گئے ہیں۔

سوئے گیو میرو ڈوکرا
ارے ہاں رے دھوبی! گست گئے ہیں گستی مان۔ لہریا میرو بھیجے گو!

گیت کا آخری بند ہی گیت کی جان ہے۔ یوں تو اس گیت میں قدم قدم پر لذت کوشی کا احساس ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی گیت کار نے اشارہ و کنایہ کے لطیف پردے ڈال کر، بڑی احتیاط اور چابکدستی سے شبِ وصل کی عکاسی کی ہے۔ اور گیت کو عریانی سے بال بال بچا لیا ہے۔ نائیکا کی "خود سپردگی" کا یہ عالم ہے کہ وہ پہلو

تک نہیں بدلتی اور شاید اس بات کی بھی گنجایش نہیں چھوڑتی کہ دھوبی اس سے
سکے کہ:

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا   کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا (حالیؔ)

اس گیت میں افلاطونی عشق کے بجائے دھوبی اور نائیکا کا سیدھا سادہ عشق ہے
دونوں حسن و شباب کی اس منزل پر ہیں، جہاں جوانیوں کی لغزشیں حسین گناہ
سہارا لے کر سنبھلنے کی کوشش کرتی ہیں۔ نائیکا اپنے پریتم کو رجھانے کے لیے لہر
اوڑھ کر گھر سے نکلتی ہے۔ اور ندی پار کے دھوبی کو اپنی چُوندری، اور "بھ
کی سُوہی پاگ" کی دُھلائی کے بہانے انگوٹھی اور ہار پیار کی نشانی کے طور پر
دینا چاہتی ہے۔ لیکن جب دھوبی رقیب (بھنور) کی سُرخ پگڑی کو دیکھتا ہے
تو جل بھُن کر رہ جاتا ہے۔ اور انگوٹھی کو توڑنے اور ہار کو ندی میں پھینکنے کی
دھمکی دے کر دُھلائی میں نائیکا کا آدھا جوبن (شاید بھنور پر ترس کھا کر آدھا جوبن
اس کے لیے چھوڑ دیتا ہے) اور پوُری سُکھ سیج کا مطالبہ کرتا ہے۔ نائیکا راضی
ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی چوُندری، دُھلوانے آئی ہے، نہ "بھنور کی سُوہی پاگ" وہ تو "کام" سے
بیاکُل ہو کر برسات کی بھڑکائی ہوئی برہا کی آگ کو بُجھانے کا جتن کرتی پھر رہی
ہے۔ اور آخر وہ دھوبی کو "سُکھ سیج" کی دعوت دے ہی دیتی ہے اور چلتے
چلتے دھوبی کو حالات کی نزاکت سے بھی خبردار کر دیتی ہے کہ گھر کی ڈیوڑھی میں
بوڑھا سوتا ہے، اس راستے سے نہ آنا؛ اور پھر رات بھر چوکیدار گشت کرتے
ہیں، ان کا بھی خیال رکھنا، ورنہ دونوں کی رسوائی ہوگی۔

ساون بھادوں کی اندھیری رات میں دھوبی چوکیداروں کی نظروں سے چھپتا چھپاتا
نائیکا کے گھر کے پچھواڑے پہنچ جاتا ہے اور موقع پا کر پرنالے کو پکڑ کر چھت پر
چڑھ جاتا ہے اور دھم سے نائیکا کے گھر میں کُود پڑتا ہے، اور اس کی سُکھ سیج کو
جا کر ہلا دیتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں نیند کہاں! وہ تو چُپ چاپ اس کے انتظار

میں دم سادھے پڑی ہے۔ دھوبی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے :

کوڈا یوں تیرے گھر میں کوئی دم سے نہ ہوگا
جو کام کیا ہم نے وہ رستم سے نہ ہوگا

اب کہاں ہے تیرا بوڑھا کھوسٹ سسر؟ اور کدھر ہیں وہ "گستی مان"؟ نائیکا اس کے منھ پر ہاتھ رکھ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ بوڑھا سوگیا ہے اور "گستی مان" گشت پر چلے گئے ہیں۔ اتنا کہہ کر نائیکا دیا بجھا دیتی ہے۔ اور پھر بادل گرجتا ہے، بجلی کڑکتی ہے اور دھواں دھار بارش شروع ہو جاتی ہے۔

نائیکا کا چھوٹا سا کچا گھروندا اس قدر نیچا ہے کہ پرنالہ پکڑ کر اس کی چھت پر چڑھا جاسکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ نائیکا برہا کی ماری، محبت کے نشے میں چور، جوانی میں بھرپور، گاؤں کے کسی غریب گھرانے کی پیاسی بہو ہے۔ اس کا آشنا بھی ایک معمولی دھوبی ہے۔ یہاں کسی آدرش یا اخلاق کی بحث چھیڑنا گویا گیت کے حسن کو پامال کرنا ہے۔ گیت کار نے عمداً دو ایسے کردار پیش کیے ہیں، جو گاؤں کے جیتے جاگتے سادہ، معصوم اور ان پڑھ انسان ہیں، جو ہر فلسفہ و اخلاق سے بیگانہ، رُت اور فطرت انسانی کے تقاضے کو پورا کر رہے ہیں۔ وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ چوری کے بیر میٹھے ہوتے ہیں اور پھر گاؤں کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں اور کچے گھروندوں میں آدم و حوّا کی وہ پہلی پہلی آنکھ مچولی آج تک کھیلی جاتی رہی ہے۔ تسخیرِ ماہتاب کے اس دور میں بھی آدم و حوّا کی اولاد اس گناہ اوّلیں کی تکرار سے انسان ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کھیل سے اُکتا جانے کے بعد ہی آدم نے فلسفہ، اخلاق اور آدرش کی تخلیق کی ہوگی!

خدا نخواستہ، قارئین اس کا یہ مطلب نہ سمجھیں کہ میں ہوس پرستی اور جنسی بے راہ روی کا پرچار کر رہا ہوں، یا میں تہذیب و اخلاق سے منکر ہوں، بلکہ یہاں گیت کی فضا، اس کا ماحول کھجوراہو کی عریاں پتھر کی مورتی کی طرح ہے۔ اس کی داد و تحسین کے لیے یقیناً ہمیں وقتی طور پر عریانی سے سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ اگر ہم ناک بھوں چڑھائیں گے

تو گیت کا سارا حسن ملیامیٹ ہو کر رہ جائیگا۔
قیاس چاہتا ہے کہ دھوبی صبح ہونے سے پہلے ہی پرنالے کے راستے سے لوٹ گیا ہوگا۔ اور اس وقت عین ممکن ہے نائیکا پر بقول نظیر اکبر آبادی۔

صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی یار بغل سے اُٹھ گیا دل ہی کا داغ رہ گیا

کچھ اس طرح کی کیفیت طاری ہوگئی ہو، اور رخصت ہوتے وقت دھوبی نائیکا کا شکریہ ادا کرنا نہ بھولا ہو۔ بقول اکبر الہ آبادی:

میں ہوا اُن سے رخصت اے اکبر! وصل کے بعد تھینک یُو کہہ کر

بہر حال نائیکا کا لہریا بھیگ جانے پر بھی بیداغ رہا۔
[بشکریہ شریمتی گنگا دیوی]

۱۳۔ چوڑا

"چوڑا" برج کا بہت مشہور ملہار ہے۔ ٹیپ کے بول ہیں: "چوڑا تو میری جان، چوڑا تو ہاتھی دانت کو"۔
سیندور بھری مانگ کی طرح ہاتھی دانت کا چوڑا بھی سہاگ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پنجاب کی دلھنیں سُرخ رنگ کا چوڑا پہنتی ہیں۔ راجستھان میں سفید رنگ کے چوڑے کا رواج ہے۔ جے پور، جودھ پور، اور بیکانیر میں ہاتھی دانت کا چوڑا سہاگ اور سنگار کا اہم اور مبارک زیور خیال کیا جاتا ہے۔ گجرات میں بھی سُہاگ چوڑے کی بڑی اہمیت ہے۔ بیکانیر اور جے پور میں ہاتھی دانت کے چوڑوں کی مشہور صنعت آج بھی قائم ہے۔ بیکانیر کی مارواڑی عورتیں لاکھ کا چوڑا بھی پہنتی ہیں۔ چونکہ یہ سرمایہ دار طبقے کی عورتیں ہیں، اس لیے اکثر و بیشتر عورتیں لاکھ کے چوڑے پر سونے کے باریک پترے منڈھوا کر انھیں پہنتی ہیں۔ لیکن جب سے کانچ کی چوڑیوں کا رواج عام ہوا ہے، ہاتھی دانت کے چوڑے کی

اہمیت کم ہوگئی ہے۔ پنجاب میں اس کا رواج خاصہ کم ہوگیا ہے۔ راجستھان کی عورتیں کلائیوں سے لے کر کہنیوں تک چوڑا پہنتی ہیں۔ بیشتر چوڑے نقلی ہوتے ہیں، جو کسی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں، مگر سفید رنگ کی وجہ سے ہاتھی دانت کے معلوم ہوتے ہیں۔

برج میں چوڑے کا رواج نہیں ہے۔ ممکن ہے، زمانۂ قدیم میں کبھی اس کا رواج رہا ہو، لیکن یہ تحقیق طلب ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب برج میں اس کا رواج نہیں، تو برج کے گیتوں میں یہ چوڑا کہاں سے آگیا؟

برج سے متعلق ایک مشہور دوہا ہے۔

برج چوراسی کوس میں چار گام نج دھام ‏ ‏ ‏ بندرابن اور مدھ پوری، برسانہ، نندگام

بندرابن، متھرا، برسانہ اور نندگاؤں برج کے چار بڑے دھام (تیرتھ) ہیں۔ متھرا اور بندرابن میں ہر سال ساون کے مہینے میں "جھولوں" کے میلے لگتے ہیں، جو ایک مہینے تک جاری رہتے ہیں۔ برسانہ اور نندگاؤں میں پھاگن کے مہینے میں "رنگیلی ہولی" کی رنگین تقریبوں کی دھوم دھام رہتی ہے۔ یہاں ہندستان کے ہر حصے سے یاتری آتے ہیں۔ راجستھان پنجاب اور گجرات کی عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ ان میلوں میں چوڑا پہنے دکھائی دیتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ برج کے گیتوں میں یہ "چوڑا" ان ہی میلوں ٹھیلوں اور مندروں کی مذہبی تقریبوں کے ذریعے سے آیا ہوگا۔

"سہاگ چوڑی" کی اہمیت کسی سہاگن سے پوچھیے! جیسے ایک گیت کے بول سے ظاہر ہے:

میری چوڑیوں کی لاج رکھنا میرے پیا! ‏ ‏ ‏ یہ تو پہن لئیں اب اُترت نا

گویا ایک بار چوڑیاں پہننے کے بعد سہاگن بڑھاپے تک انھیں پہنے رہتی ہے۔ لیکن بیوہ ہونے پر وہ چوڑیاں پھوڑ دی جاتی ہیں۔ لیکن جب کسی بیوہ کا "پُنر بیاہ" ہو جاتا ہے، تو وہ پھر سے سہاگ کی چوڑیاں پہن لیتی ہے۔ "چوڑی پہننا" محاورہ آج

برج کے میگھ ملہار

بھی گانوؤں میں بولا جاتا ہے۔ یہ دوسری شادی کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
اب گیت ملاحظہ کیجیے:

گلی گلی منزا[1] پھرے ۱۔ منہار
، ری بہنا! منزا کو لانا بلائیے! چُوڑلا تو میری جان، چوڑا تو ہاتھی دانت کو!
ہری بنگا[2]لی رے منزا نا پہر[3]وں ۲۔ چوڑی ۳۔ پہنوں
ارے منزا. ہرے میرے راجاجی کے باگ! چُوڑا تو میری جان...
کالی جنگالی رے منزا نا پہروں
ارے منزا! کالے میرے راجاجی کے کیس! چُوڑا تو میری جان...
لال جنگالی رے منزا نا پہروں
ارے منزا! لال میرے راجاجی کے گال! چُوڑا تو میری جان...
دھوری[4] جنگالی رے منزا نا پہروں ۴۔ سفید
ارے منزا! دھورے میرے راجاجی کے کاپڑے[5]! چُوڑا تو میری جان... ۵۔ کپڑے
نیلی[6] جنگالی رے منزا نا پہروں ۶۔ نیلی
ارے منزا! نیلی میرے راجاجی کی گھوڑی! چُوڑا تو میری جان...
ایسی جنگالی رے منزا پہرائیو!
ارے منزا! جھنش[7] مل کرے جو سریر! چُوڑا تو میری جان... ۷۔ جسم
پہر اوڑھ ٹھاڈی[8] ہوئی ۸۔ کھڑی
ارے منزا نے ماری ہے سین[9]! چُوڑا تو میری جان... ۹۔ اشارت
نند نے ما[10]لیے سکا ئیے ۱۰۔ ماں کو سکھایا (ماں کے کان بھرے)
اری اماں تیری بہو منزا کے جائے! چُوڑا تو میری جان...
ساسو نے سسر بلا ئیے
ارے راجا! تیری بہو منزا کے جائے! چُوڑا تو میری جان...
سسر نے بیٹا سکا ئیے

...

ارے بٹیا! تیری بہو مزا کے جائے! چوڑا تو میری جان ...
پہلی کٹاری رے راجا مار یہے
ارے راجا! گھونگھٹ کی لے لئ اوٹ! چوڑا تو میری جان ...
دُوجی[11] کٹاری رے راجا مار یہے
ارے راجا! چھتیاں[12] کی لے لئ اوٹ! چوڑا تو میری جان ...
تیجی[13] کٹاری رے راجا مار یہے
ارے راجا! تیجی میں تجے پران! چوڑا تو میری جان! چوڑا تو ہاتھی دانت کو!

۱۱- دوسری
۱۲- چھاتی-سینہ
۱۳- تیسری

"چوڑا" جاگیر دارانہ دور کا گیت ہے۔ 'چوڑا' کی نائیکا کے 'راجاجی' ایک سفید پوش جاگیر دار یا تعلقہ دار ہیں۔ ان کے ہرے بھرے باغات ہیں۔ ان کے پاس سواری کے لیے 'نیلی گھوڑی' ہے۔ ان کے لمبے لمبے سیاہ کیس ہیں۔ بھرے بھرے لال لال گال ہیں۔ کٹار اُن کی کمر سے بندھی رہتی ہے۔

برج کا ایک مشہور رسیا ہے، جس کے بول ہیں: "بن گئے کرشن چند للہاری کریلا گدوانو پیاری"۔ اس رسیا میں کرشن جی، رادھا جی سے ملنے کے لیے "للہاری" کا بھیس دھارن کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ اپنی محبوبہ سے ملنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح 'چوڑا'، کا "منزا" (سنار) ہے۔ وہ اصل میں نائیکا کا پریمی ہے۔ نائیکا کا حسن و شباب اسے 'راجاجی' کے رنگ محل میں کھینچ لایا ہے۔ اور اس طرح "حسن" "عشق" سے جدا کر دیا گیا ہے۔ آخر "عشق"، "حسن" سے ملاقات کے لیے "منزا" کا بھیس اختیار کرتا ہے۔ اور نائیکا کے محل کے نیچے صدا لگاتا ہے:

چوڑا تو میری جان! چوڑا تو ہاتھی دانت کو

نائیکا اپنے پریمی کی آواز کو پہچان لیتی ہے۔ بقول میر۔

میں جو بولا، کہا کہ یہ آواز — اُسی خانہ خراب کی سی ہے

اور اُسے اپنے محل میں بُلوا لیتی ہے۔ نائیکا ملاقات کی گھڑیوں کو طول دینے اور

محل کی مشتبہ نظروں سے بچنے کے لیے بار بار، دوران ملاقات میں، اپنے 'راجاجی' کا ذکر کرتی ہے کہ میں ہرے رنگ کی جنگالی نہیں پہنونگی کیونکہ ہرے رنگ کے تو میرے راجاجی کے باغ ہیں۔ میں کالی چوڑی نہیں پہنونگی، کالے رنگ کے تو میرے راجاجی کے گیسو ہیں۔ میں لال جنگالی بھی نہیں پہنونگی، لال رنگ کے تو میرے راجاجی کے رخسار ہیں۔ میں سفید چوڑی بھی نہیں پہنونگی، سفید رنگ کے تو میرے راجاجی کے کپڑے ہیں۔ میں نیلی جنگالی بھی نہیں پہنونگی، نیلے رنگ کی میرے راجاجی کی گھوڑی ہے۔ اور اس طرح ظاہر ہے کہ نائیکا کی اس گفتگو کو سن کر کوئی بھی اس کے "چیز تر" پر شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن حقیقت میں وہ اپنے پریمی کو ناز و ادا دکھا کر اس ملاقات کو حسین تر اور طویل تر بنا رہی ہے۔ "منزا" اس کی نرم و نازک کلائی کو اپنے ہاتھ میں تھامے کبھی کسی رنگ کی جنگالی اٹھاتا ہے، اور کبھی کسی رنگ کی۔ وہ ہر رنگ کی چوڑی کو ایک ادائے خاص اور اندازِ دلبرانہ کے ساتھ رد کر دیتی ہے۔ نائیکا کا یہ انکار لذتِ ملاقات میں اضافہ کرتا ہے۔ "منزا" کی پیاسی آنکھیں روپ کے ساگر میں ڈوب ڈوب کر خوب جی بھر کر رس پیتی ہیں۔

گیت کا یہ حصہ ڈرامائی ہے۔ آخر نائیکا "منزا" سے کہتی ہے کہ مجھے ایسی چوڑیاں پہنا دے، جن سے میرے حسن کو چار چاند لگ جائیں۔ میرا شباب تکمیل کر اٹھے۔ منھار اسے رنگ برنگ چوڑیوں سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر گیت میں ایک ایسا موڑ آتا ہے، جو گیت میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر کے اسے حزنیہ میں تبدیل کر دیتا ہے۔

"منزا" نائیکا کی طرف "سَیَن" مار دیتا ہے۔ وہ چشم ابرو سے کچھ اس قسم کے اشارے کرتا ہے، جو شہوانی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ اس کی یہ حرکت معنی خیز ہے۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوتا ہے، جب نائیکا چوڑیاں پہن چکی ہے اور ان کی ملاقات اختتام کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ "منزا" ابرو کے اشارے سے اسے کچھ کہتا ہے، نہیں معلوم فرار ہونے کی بات کہتا ہے،

برج کے میگھ ملہار

یا دوبارہ ملنے کی بات کرتا ہے۔ یہی گیت کا منتہا ہے۔
نائیکا کی نند "منزا" کے اشارے کو کہیں سے دیکھ لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ "راجاجی" ہی نے اپنی چھوٹی بہن کو نائیکا کی خفیہ حرکتوں پر نظر رکھنے کے لیے مامور کر رکھا ہو کیونکہ اس کے تحت شعور میں یہ خیال رہا ہوگا کہ نائیکا کا عاشق ضرور اس سے ملنے کو آئیگا۔
آخر نند آگ کی طرح اس خبر کو سارے گھر میں پھیلا دیتی ہے کہ بھابی منزا کے ساتھ بھاگنے والی ہے۔ پھر تو محل کا کونا کونا سازشوں کا مرکز بن جاتا ہے۔ نند اپنی ماں یعنی نائیکا کی ساس سے، ساس سسر سے، سسرا اپنے بیٹے یعنی راجاجی سے نائیکا کے خلاف زہر اگلتا ہے۔ گھر کی لاج اور خاندان کی ناک خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ رانی، منھار کے بھیس میں آئے ہوئے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ رہی ہے، اتنا سنتے ہی راجا آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ اور اپنی کٹار سے نائیکا کا کام تمام کر دیتا ہے۔
اس سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ راجا درپردہ پہلے ہی سے نائیکا سے بدظن رہا ہوگا کیونکہ وہ نائیکا کا جسم حاصل کرنے کے بعد بھی اس کی محبت کو نہیں جیت سکا۔ بصورت دیگر وہ آکر تمام حالات کا جائزہ لیتا اور پھر کوئی فیصلہ کرتا۔ اسے ضرور پہلے ہی سے اس کا علم ہوگا کہ نائیکا کا عاشق کسی نہ کسی دن بھیس بدل کر اس سے ملنے کو محل میں ضرور آئیگا۔
اس گیت سے جاگیردار کے مظالم اور اس کی بوالہوسی پر روشنی پڑتی ہے۔ جاگیردار اپنے تعلقہ یا ریاست میں زبردستی کسی بھی گھرانے کی بہو بیٹی کو اپنے رنگ محل کی زینت بنا لیتا تھا۔ "چوڑا" کی نائیکا بھی اسی قسم کے مظالم کا شکار تھی۔
گیت کا خاتمہ نائیکا کی موت پر ہوتا ہے۔ وہ کٹار کے پہلے وار کو اپنے گھونگھٹ پر روکتی ہے۔ دوسرا وار اپنے سینے پر اور تیسرے وار میں جام شہادت پی کر، ہاتھی دانت کا چوڑا پہنے پریم نگر کو سدھار جاتی ہے۔

قریب ہے یارو! روز محشر، چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہیگی زبانِ خنجر، لہو پکاریگا آستیں کا

[بشکریہ خیق کلادتی]

۱۴۔ نٹ ملہار

نٹ، بھارت کی ایک خانہ بدوش قوم ہے۔ اس کے افراد بڑے محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش، عام طور پر، ناچنا، گانا، شعبدہ بازی، قلابازی اور جسمانی کسرت کے کرتب دکھا کر اور کھیل تماشا ہوتا ہے۔ ایک نٹ ڈھول بجا کر مجمع کرتا ہے۔ پھر اس کے ساتھی، جن میں بچے، بوڑھے، جوان، مرد، عورت سبھی ہوتے ہیں، ایک لمبے بانس پر جو مجمع کے درمیان گاڑ دیا جاتا ہے، باری باری اپنا کمال دکھاتے ہیں، اور ڈھول بجانے والا نٹ ہر بار، "کسر رہ گئی"، "ابھی کسر رہ گئی" کہہ کر مزید کرتب دکھانے کا مطالبہ کرتا رہتا ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ جدید سرکس، نٹوں کے کرتبوں ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

نٹ، گانو گانو، بستی بستی اپنے کرتب دکھاتے، اناج، روٹی، پیسے، کپڑے وغیرہ معاوضے کے طور پر وصول کرتے، گھومتے رہتے ہیں۔ آبادی سے باہر سرکیاں تان کر اپنا ڈیرا ڈال دیتے ہیں۔ نوجوان نٹ بڑے منچلے اور رومان پسند ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی دیہات میں اغوا کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں نٹ فلاں دوشیزہ کو اڑا لے گیا۔ لوک گیتوں میں بھی نٹ کا کردار بڑا جاندار ہے۔ "نٹ ملہار" میں راجا خوش ہو کر اپنی رانی "پھولندے" انعام کے طور پر نٹ کو بخش دیتا ہے۔

نٹ ہندوستان کے تقریباً ہر حصے میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ برج میں میلوں ٹھیلوں میں نٹ کے ڈھول کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ ساون کے مہینے میں، "ہریالی تیج" اور "رکشابندھن" کے تہواروں پر گانو گانو میں نٹوں کے کھیل تماشے منورنجن (تفریح) کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس خانہ بدوش، قوم کا وطن، اس کی معاشرت، اس کے رسم و رواج، معتقدات وغیرہ ابھی تحقیق

طلب ہیں۔
نٹ ملہار بھی جاگیر دارانہ دَور کا گیت معلوم ہوتا ہے۔ نند بھاوج دونوں مل کر پانی بھرنے کے لیے گئیں۔ گاگر اُتار کر پنگھٹ پر رکھ دی اور اینڈوی آم کی ڈالی میں لٹکادی۔ بھاوج نے کُل کُل کر اپنے پانو دھوئے اور رگڑ رگڑ کر دانت صاف کیے، منھ ہاتھ دھوئے، آنکھیں دھوئیں اور پھر سورج کو جل چڑھا کر، استتی کی۔ اس کے بعد بھاوج اکیلی ہی باغ کی روش روش پر گھومتی ہوئی، سیر گُل کرتی رہی:

نند بھاوج کو ہے سات، جُر مِل پانی ورے چلیں جی مہاراج!
گگری تو دھری اے اُتار، اینڈھی ٹانگی اے انبے کی ڈار جی مہاراج! ۱۔ اینڈوی
کُل کُل دھوئے بھاوج نے پانو، رگڑ رگڑ کے داتُن کری جی مہاراج! ۲۔ پانو
کُلّا کو کرے ایں پچاس، سورج سوئیں اے چپ کیو جی مہاراج!
چمن چمن دیکھیو بھاوج باگ، روسن ڈولے اے بھاوج میری اکلی جی مہاراج!

باغ سے نکل کر نند بھاوج نے نٹ کا تماشا دیکھا۔ دونوں میں یہ گفتگو ہوئی:

بھاوج: اے نندی! تم نے نٹ کا تماشا دیکھا؟ نٹ، تمھارے بھائی سے زیادہ خوبرو ہے۔

نند: میرا بھائی راجا اُمراؤ ہے۔ نٹ سے کہیں زیادہ حسین ہے اور وہ حقیر نٹ کا چھوکرا، بجلی گرے اُس پر، وہ میرے بھائی کا کیا مقابلہ کر سکتا ہے!

بھاوج: (نند کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر) بہن! میں تیرے پانو پڑتی ہوں۔ (میں نے تو ہنسی میں ایسا کہہ دیا تھا) اے نند! گھر جاکر اپنی ماں سے یہ باتیں مت کہنا!

دیکھو نندی نٹ کو سانگ، تمھارے بیرن نے ۲ دو تِل اگرو ۳ جی مہاراج!

۱۔ تماشا ۲۔ سے ۳۔ آگے۔ بڑھ کر

میرو بھیّا راجا اُمراؤ، ادھک ملوک ۴، یُو نچ ۵ مارو نٹوا کو چھورا، جی مہاراج!

۴۔ نازک۔ خوبصورت ۵۔ بجلی ۶۔ لڑکا۔

۷۔ پانو

ہا ہا بی بی! پنیاں پر جاؤں اگھرمت کہیو! اے نند اپنی مائے تے، جی مہاراج!

اس کے بعد، دونوں چپ چاپ، اپنی اپنی گاگر سر پہ اٹھائے، گھر کی طرف روانہ ہوگئیں۔ رستے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ نند اپنی بھاوج سے خفا تھی۔ جب گھر پہنچی، تو اُس نے برہم ہوکر اپنی ماں سے کہا کہ ماں! میرے سر سے جھٹ پٹ گاگر اُتار لے، نہیں تو میں اسے چوک میں پھوڑ دونگی۔ ماں بھانپ گئی کہ ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔ اُس نے لپک کر گاگر اُتاری اور بڑے پیار سے پوچھا: اے بیٹی! کس نے تجھے بُرا بھلا کہا ہے؟ کیا کسی نے طعنے مارے ہیں؟ بیٹی نے کہا: ماں! نہ مجھے کسی نے بُرا بھلا کہا، نہ کسی نے طعنے مارے ہیں۔ تیری بہو بڑی گنوار ہے۔ یہ نٹ کے چھوکرے پر ریجھ گئی ہے۔

جھٹ پٹ گگری اُتار، نا توریے پھوڑوں چورے چوک میں جی مہاراج!

کن نے توتے بولے بیٹی بول؟ کن نے تو ہے دینے تاہنے؟ جی مہاراج! ۸۔ طعنے

ناسیا بولے موتے بول، نا مو ہے دینے مائل تاہنے جی مہاراج!

تیری بہو اصل گنوار، یو توری ریجھی اے نٹوا کو چھوہرا! جی مہاراج!

نند کا اتنا کہنا تھا کہ راج محل سے راج دربار تک، یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجا بھی محل میں آگئے۔ فوراً حکم ہوا کہ اُس نٹ کو حاضر کیا جائے۔ نٹ آیا اور اس نے راجا جی کے چوک میں اپنا بانس گاڑ دیا۔ راجا کا اشارہ پاتے ہی نٹ نے اپنے کمالات کا مظاہرہ شروع کر دیا۔ اُس نے طرح طرح کے کرتب دکھائے، خوب ڈھولک بجائی۔ نٹ کا کمال دیکھ کر تماشائی بہت خوش ہوئے۔ جہاں اوروں نے نٹ کو انعام کے طور پر ہتھیار بخشے، راجا جی نے جھروکے میں بیٹھی ہوئی اپنی رانی کو نٹ کے حوالے کر دیا۔ یہ رانی وہی بھاوج ہے، جس نے اپنی نند سے نٹ کی تعریف کی تھی:

لیو نٹ حال بُلائے، بانس گڑھا یو اے راجا جی کے چوک میں، جی مہاراج!

ناچے نٹ انی انی بھانت، ادھک بجاوے اے نٹوا کو ڈھولکی، جی مہاراج!

اورن نے بکسٹے ہتھیار، راجا جی نے بکسی اے جھروکا بیٹھی گوری، جی مہاراج!

۹۔ بخشے۔ بخشی۔

نٹ نے اپنا ڈیرا اکھاڑ لیا اور پھولندے رانی کو بھینسے پر سوار کر کے، وہاں سے چلا گیا۔ کسی دوسری بستی میں جب نٹ نے سرکی تان کر، اپنا خیمہ گاڑا، تو رانی کو راجاجی کے محل کی یاد آئی۔ جب نٹ بستی سے ٹکڑے مانگ کر لایا، تو رانی پھولندے کو راجاجی کے تھال یاد آئے۔ جب نٹ نے سونے کے لیے اپنی گدڑی بچھائی، تو رانی کو راجا کی سیج یاد آئی:

چلو نٹ ڈیرا اُکھار، بھینسا یہ دھر لئی اے پھولندے گوری، جی مہاراج!
بیٹھو نٹ سرکی تان، جب سُدھ آئی اے راجاجی کے محل کی، جی مہاراج!
لایو نٹ ٹکڑے رے مانگ، جب سُدھ آئی اے راجاجی کے تھار کی جی مہاراج! ۱۔ تھال
سویو نٹ گدڑی بچھائے، جب سُدھ آئی اے راجاجی کی سیج کی، جی مہاراج!

ایک دن راجا شکار کو نکلے۔ راستے میں نٹ کا ڈیرا ملا۔ راجا رانی کو دیکھنے کے لیے جونہی وہاں پہنچا، پھولندے رونے لگی۔ راجا نے کہا: اے گنوار عورت! اب کیا روتی ہے! نٹ کے چھوکرے پر ریجھنے سے پہلے کیوں نہ سوچا؟ پھر نٹ سے کہا کہ میں تجھے پچاس اشرفیاں دوں گا، پھولندے رانی کو کوئی تکلیف نہ ہو:

راجا تو نکرے سکار، نین بھر روئی اے پھولندے گوری، جی مہاراج!
اب کیا روئے اب گنوار، جب کیوں ریجھی اے نٹوا کے چھوہرا، جی مہاراج!
دوگو نٹ مُہر پچاس، دُکھ مت دیجوا اے پھولندے گوری، جی مہاراج!

گیت اس مقام پر پہنچ کر، المیہ میں ختم ہو جاتا ہے۔

گیت کے ابتدائیہ میں پھولندے کے کردار سے متعلق صاف پتا چلتا ہے کہ وہ بڑی صفائی پسند اور مذہب پرست خاتون ہے۔ وہ ہنس مکھ اور شگفتہ مزاج بھی ہے۔ وہ ازراہِ شوخی اپنی نند کو چھیڑنے کے لیے کہتی ہے کہ "دیکھو نندی نٹ کو سانگ، تہارے بھیّا تے دو تل آگرو، جی مہاراج!" — اس جملے سے رانی کے کردار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ محض قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ رانی کے بدمزاج نند نے ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا ڈالا۔ اور وہ رانی سے بھکارن بن کر رہ گئی۔ راجا بھی اپنی بہن سے کم بدمزاج

نہیں، بلکہ وہ کچھ سنکی سا معلوم ہوتا ہے۔ وہ بالکل ایک غیر متوازن کردار کا مالک ہے۔ گیت سے رانی اور نٹ کا کوئی رُومان نہیں ظاہر ہوتا۔ پھُولندے بالکل معصوم اور بیگناہ ہے۔ مگر وہ شومیِ قسمت سے جاگیردار کی دیوانگی کا شکار ہو جاتی ہے۔ نٹ فاقہ مست، مگر اپنے فن میں طاق ہے۔ گیت سے ایسا بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ نٹ پھُولندے کو انعام میں پا کر بہت خوش ہُوا ہو، بلکہ اقتصادی طور پر اس کی اُلجھنیں کچھ اور بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ وہ احساس کمتری میں مُبتلا ہو جاتا ہے۔ جب وہ سر کی تان کر پھُولندے کے لیے گھر بناتا ہے، جب وہ ٹکڑے مانگ کر اس کے کھانے کا انتظام کرتا ہے اور جب وہ سونے کے لیے اپنی گُدڑی بچھاتا ہے، تو یقیناً اُسے اپنی بیمائیگی کا احساس ہوتا ہے اور بڑی شدّت سے ہوتا ہے۔ اگرچہ اس احساسِ کمتری کا اظہار گیت سے نہیں ہوتا۔ ادھر رانی، راجا کے محل، راجا کے لذیذ کھانوں سے بھرے تھال اور راجا کی سیج کے تصوّر میں کھو جاتی ہے۔ وہ نٹ کی خانہ بدوش زندگی سے راج محل کی زندگی کا موازنہ کرتی ہے اور اپنی بیگناہی اور قسمت کے ہیر پھیر پر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے۔

راجا شکار کے بہانے پھُولندے کے دیکھنے کو پہنچتا ہے، تو اُس پر ایک اور بھرپُور طنز کرتا ہے۔ جب وہ نٹ سے کہتا ہے کہ رانی کو دُکھ مت دینا، میں پچاس اشرفیاں اور انعام دونگا اور یہ کہہ کر وہاں سے چلا آتا ہے۔ گویا راجا وہاں رانی کے زخموں پر نمک پاشی کرنے کے لیے ہی جاتا ہے۔

اس گیت میں دو باتیں خلافِ معمول معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ راجا کی بہن اور رانی باغ میں پانی بھرنے کے لیے جاتی ہیں، سر پر گاگر اُٹھائے۔ ممکن ہے، وہ کوئی چھوٹا موٹا تعلقہ دار ہی ہو، اور اس کے محل میں پردے کا رواج نہ ہو۔ مگر جب نٹ کا تماشا ہوتا ہے تو رانی جھروکے سے دیکھتی ہے۔ اس سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پردہ کا بھی کچھ چلن تھا۔ دوسری بات راجا کی وہ مجنونانہ سخاوت ہے کہ انعام میں رانی ہی کو دے ڈالتا ہے۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے، تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شاعرہ نے اس گیت میں

برج کے میگھ ملہار

افادیت اور مقصدیت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ گیت کہا ہے۔ عین ممکن ہے، شاعرہ ان تمام اغوا کی وارداتوں سے متاثر ہوئی ہو، جو آئے دن ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے اس نے شعوری طور پر گیت کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے، جس سے گاؤں کی الھڑ، جذباتی اور رومانی دوشیزائیں عبرت حاصل کر سکیں۔ پھولندے کے ذرا سے مذاق پر اسے کتنی بڑی سزا بھگتنی پڑی۔ اور پھر خانہ بدوش نٹ کی زندگی کی تلخیاں اس طرح اجاگر کی ہیں کہ محبت کا سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق (سعدی)

جب ہم گیت کی افادیت کو دیکھتے ہیں، تو مذکورۂ بالا اخلافِ معمول باتیں پھر نہیں ابھرتیں۔ بلکہ اس وقت ہمیں گیت کار کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے کس طرح گیت کے کمزور پہلوؤں کو زبردست آلۂ کار بنایا ہے، گیت کے تاثر میں شدت پیدا کرنے اور ایک عبرتناک سبق دینے کے لیے۔ میرا خیال ہے کہ اس کا حربہ بڑا کامیاب رہا ہے۔ جہاں پھولندے رانی کی حالت پر رحم آتا ہے، وہیں خوف سے رونگٹے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جاگیردار کا کیا ہے اس کے لیے پھول کلیوں کی کیا کمی ہے۔ اس نے ایک پھول کو اگر مسل بھی ڈالا تو کیا ہوا، کتنی ہی کلیاں چٹکنے کے لیے بیقرار ہو جاتی ہیں

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں   وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

غرض نٹ ملہار میں ایک ایسی تلخ حقیقت پیش کی گئی ہے کہ اس کے بعد گمراہ اور تن کام، الھڑ اور بے سمجھ دوشیزاؤں کو اس پند و نصیحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی پرائے مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی مت دیکھو، غیر مرد کی تعریف مت کرو۔ مبادا بھی حال پھولندے رانی کا سا ہو جائے۔

گیت کے اختتامیہ میں جہاں طنز اور تلخی پوری شدت سے ابھرتی ہے، وہیں گیت افادی پہلو بھی اجاگر ہو کر ابھرتا ہے۔ گیت کا سارا حسن اسی میں ہے کہ وہ براہِ راست کوئی اخلاقی درس نہیں دیتا، حالانکہ درس وہاں موجود ہے۔

[بشکریہ شرمتی پربھاوتی

۱۵- ڈھولا

چھم چھم مینھ برس رہا ہے۔ پپیہا "پی کہاں"، "پی کہاں" کی دُھن میں کھویا ہُوا ہے۔ لہلہاتے کھیتوں میں ہریالی مچل رہی ہے ہوا کے جھونکے اٹکھیلیاں کر رہے ہیں۔ جوہڑ کے کنارے برگد کے پیڑ میں جھولے پڑے ہیں۔ جھولوں میں نوخیز شباب جھوم رہا ہے۔ گیتوں میں مستیاں لہرا رہی ہیں۔ درختوں کو حال آ رہا ہے۔ دوشیزگی اور نغمگی گلے مل رہی ہیں۔

"بہورانی" اپنی سات سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی ہے۔ سہیلیوں کے چہرے گلاب کی طرح شگفتہ نظر آتے ہیں، مگر "بہورانی" کا معصوم اور پسند مکھڑا اداس ہے۔ سہیلیوں نے رنگا رنگ چُنریاں اور لہریے اوڑھ رکھے ہیں! ان کے رنگین آنچل ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے دھنک کے ہنڈولے میں راجا اندر کی اپسرائیں جھول رہی ہیں۔ لیکن "بہورانی" کا "میلا بھیس"، اور "ملین مکھ" اِس بات کی صاف غمّازی کرتا ہے کہ اُس کا "ڈھولا" پردیس میں ہے۔ اور سہیلیوں کی تازگی، شگفتگی اور رنگارنگی سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کے "ڈھولا" اُن کے پاس ہیں۔

اتنے میں ایک پردیسی اُدھر آ نکلتا ہے۔ وہ "بہورانی" کو چھیڑتا ہے: "اگر تمھارا "ڈھولا"، پردیس میں ہے، تو ہمارے ساتھ چلو! ہم تمھیں سُنہری زیورات اس قدر پہنا دینگے کہ تم ٹیسو کا پھول بن جاؤ گی۔ ہم تمھاری سیج پر بیلا اور موتیا کی کلیوں کی جگہ چاندی کے پھول بچھا دینگے۔

یہی پردیسی دراصل "بہورانی" کا ڈھولا ہے، لیکن بہورانی اُسے پہچان نہیں سکی۔ اس لیے وہ پردیسی پر برس پڑتی ہے: "تیرے سونے چاندی کو آگ لگا دونگی۔ تیرے باپ کی ڈاڑھی اُکھاڑ لونگی اور اس کی مونچھوں میں دہکتے ہوئے انگارے رکھ دونگی۔"

جب پردیسی یہ رنگ دیکھتا ہے، تو چُپ چاپ وہاں سے کان دبا کر چلا جاتا ہے۔

بہورانی اپنی ساس کو جاکر سارا واقعہ سُناتی ہے۔

ساس : "بہو پردیسی کا کیا حلیہ تھا؟"

بہورانی : "میری سائِل رانی! وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھا اور اس کی شکل دیور سے ملتی جُلتی تھی۔"

سائِل رانی : "بہورانی! وہ تو تیرا ہی ڈھولا تھا۔ تُو نے بڑھ کر اس کا ہاتھ کیوں نہ پکڑ لیا؟"

بہورانی : (حیران پریشان) "اب تو وہ بہت دُور نکل گئے۔ اگر دوڑ کر بھی انہیں پکڑنا چاہوں، تو اُن تک نہیں پہنچ سکوں گی۔ انھیں اگر بُلند آواز سے پکارتی ہوں تو لاج آتی ہے۔ اب تو رستے پر بھی اُن کے نقشِ پا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ نقشِ پا کو بھی چھُوتی ہوں، تو سوائے ریت کے کچھ حاصل نہیں۔ ہائے اب میں کیا کروں؟"

بَر[1] کے تو ڈاگے[2] جھُولتی میری سائِل[3] رانی! سات سہیلن بیچ! ۱۔برگد ۲۔ڈال ۳۔ساس
ساتوں کے مُکھ اُوجرے[4]، میری بہو[5] رانی! تہار[6] کیوں میلو[7] بھیس[8]؟

۴۔ اُجلے ۵۔ بہو ۶۔ تمھارا ۷۔ میلا ۸۔ کپڑے

ساتوں کے ڈھولا گھر رہے، میری سائِل رانی! ہمارے گئے پردیس!
ایک بٹیؤ[9] ڈھولا یوں کہے، میری سائِل رانی! چلو نا ہمارے سنگ[10]! ۹۔راہگیر ۱۰۔ساتھ
جو تھیں ڈھولا کی ساد[11] ہے، میری بہوئل رانی! چلو نا ہمارے سات! ۱۱۔خواہش
سونے میں کر دلوں تو پیری[12]، میری بہوئل رانی! چاندی میں سیج شپید! ۱۲۔پیلی۔زرد
آگ لگاؤں تیری پیری، بٹیؤ ڈھولا! جر بجھ[13] سیج شپید! ۱۳۔جل بجھے۔
ڈاڑھی تو جھاڑوں تیرے باپ کی بٹیؤ ڈھولا! مُونچھن دھروں انگار!
کیسے تو اُن کے کاپرے[14]، میری بہول رانی! کون برن[15] اُنہار[16]!

۱۴۔کپڑے ۱۵۔ رنگ ۱۶۔شکل صورت

دھوڑے[17] تو اُن کے کاپرے، میری سائِل رانی! چھوٹے دیور اُنہار! ۱۷۔سفید
وہ ای اے تیرے صاحبا! میری بہوئل رانی! اگہ کیوں[18] دیکھ یو ہات! ۱۸۔بڑھ کر

کھو جن کی مُٹھی بھروں، میری ساشِل رانی! کھولوں تو بارُو ریت! ۱۹۔ خلک پا بیت
بھاگوں تو پونچھوں نہیں، میری ساشل رانی! بولوں تو آوے موہے لاج!

گیت کے آخری حصّے سے اس کلیے کی تصدیق ہوتی ہے کہ دنیا کی شاعری کا آغاز لوک گیتوں سے ہوا ہے اور لوک گیت ہی شاعری کا سرچشمہ ہیں۔ گیت کا اختتامیہ کس قدر شاعرانہ ہے:۔

کھوجن کی مُٹھی بھروں، میری ساشل رانی!
کھولوں تو بارُو ریت!
بھاگوں تو پونچھوں نہیں، میری ساشل رانی!
بولوں تو آوے موہے لاج!

اس ڈرامائی کیفیت کے فوراً بعد "ساشل رانی"، "بھوئل رانی" کو بتاتی ہے کہ وہ "بیٹھو ڈھولا" ہی اس کا "صاجبا" تھا، تو بھوئل رانی کے ذہن پر بیک وقت حیرت اور استعجاب، خوشی اور انبساط، عقیدت اور محبّت کے شدید جذبات طاری ہو جاتے ہیں۔ جب وہ ڈھولا کے کھوج (نقشِ قدم) دیکھتی ہے:

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرَم دیکھتے ہیں (غالب)

تو اُس پر جبین نیاز جُھکا دیتی ہے۔ اور "چرن رج" کو اپنے مستک پر چڑھاتی ہے۔ اپنے سُہاگ کی مانگ بھرتی ہے۔ لیکن جونہی یہ تصوراتی کیفیت ختم ہوتی ہے۔ اُس کی مُٹھی سے بالُو ریت گرنے لگتی ہے۔ اُسے ڈھولا کے چلے جانے کا افسوس ہوتا ہے، وہ دوڑ کر اُسے پکڑ لینا چاہتی ہے۔ مگر وہ تو دور جا چکا ہے اُسے آواز دینا چاہتی ہے مگر

بولت آوے موہے لاج!

لاج، حیا، شرم اُس کے لب سی دیتی ہے۔

پنگھٹ کے قریب ہی گاؤں کی چوپال ہے۔ چوپال پر گاؤں کے بڑے بوڑھے حقّہ پی رہے ہیں۔ اور راستے میں بھی تو چھوٹے بڑے آ، جا رہے ہیں۔ ایسے میں وہ کیسے پکارے

اپنے ڈھولا کو! وہ من ہی من اپنی لاج کو کوستی ہے۔

جو میں جانتی بچھڑت ہیں سیّاں
گھونگھٹا میں آگ لگا دیتی

اِس گیت میں بھوئل رانی اپنے ڈھولا کو نہیں پہچانتی، یہ بات بڑی عجیب اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ایک تلخ حقیقت مضمر ہے۔ دیہات میں آج بھی بچپن کی شادی کا عام رواج ہے۔ سُنتے ہیں، اگلے وقتوں میں دودھ پیتے بچّوں کی شادیاں ہو جاتی تھیں۔ یہ گیت اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے بھوئل رانی کی شادی اُس وقت ہوئی ہوگی، جب وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ شادی کہتے کسے ہیں؟ ڈھولا کون ہوتا ہے؟ لیکن جب وہ جوان ہونے پر سسرال لائی گئی ہوگی، اس کا ڈھولا کھانے کمانے پردیس چلا گیا ہوگا۔

بھوئل رانی کا انجانے میں ڈھولا کو دھمکانا، اور بُری بھلی سُنانا، گیت کے اخلاقی پہلو کو اُجاگر کرتا ہے۔ ممکن ہے، ڈھولا نے جان بُوجھ کر بھوئل رانی کا امتحان لینا چاہا ہو۔ بہر حال وہ کامیاب رہی۔ یہ گیت حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے۔

[بشکریہ شریمتی کلاوتی]

۱۶۔ سپہیا

ایک بانکا سپاہی، جو غالباً چھٹّی لے کر اپنے گھر جا رہا ہے، رستے میں کھڑا کچھ سوچ رہا ہے اتنے میں وہاں ایک ہنس مکھ، چنچل برج نار آجاتی ہے۔ وہ اپنی شوخ و شنگ فطرت سے مجبور ہو کر، اُسے چھیڑنا شروع کر دیتی ہے۔

برج نار: اے سپہیا! تو راستے میں کیوں کھڑا ہے؟ ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چل:

ارے ہاں سپہیا! تو کیوں ٹھاڈ[1] یو رستہ کے بیچ؟
ہمیں تو سنگ لے چلو جی مہاراج!

۱۔ کھڑا ہے

سپہیا : اے ڈابر نینی! میں ضرور ساتھ لے چلتا مگر گھر میری بوڑھی ماں ہے اُسے کیسے چھوڑوں۔

ارے ہاں ڈابر نینی[1]! گھر میرے بوڑھی ماں اے مائے، ۱۔آنکھوں ۲۔جھیل جیسی (بڑی گہری)
واؤ[3] اے چھوڑے نا بنے جی مہاراج! ۳۔اسے بھی

ڈابر نینی : میں تیری ماں کی سیوا کرونگی۔ اُس کے پانوٗ دباؤنگی۔ ہمیں اپنے ساتھ لے چ

ارے ہاں سپہیا! تیری مائی[4] کے دابوٗنگی پام[5] ۴۔ماں ۵۔پانوٗ
ہمیں تو سنگ لے چلو جی مہاراج!

سپہیا : اے ڈابر نینی! میرے گھر رتھ کے بیلوں کی جوڑی ہے، اُسے کیسے چھوڑ دوں؟

ارے ہاں ڈابر نینی! گھر میرے رتھ کے ہیں بیل،
اُنہیں بی چھوڑے نا بنیں جی مہاراج!

ڈابر نینی : میں تیرے بیلوں کو چارہ کھلاؤنگی۔ اُن کی سانی کرونگی۔ ہمیں ساتھ لے چ

ارے ہاں سپہیا! تیرے بیلن کی کر دیونگی سانی،
ہمیں تو سنگ لے چلو جی مہاراج!

سپہیا : ارے ڈابر نینی! میرے گھر کوتل گھوڑی ہے، میں اُسے بھی تو نہیں چھوڑ سکتا

ارے ہاں ڈابر نینی! میرے گھر اے کوتل گھوڑی،
واؤ اے چھوڑے نا بنے جی مہاراج!

ڈابر نینی : تیری کوتل گھوڑی کے لیے گھاس کھود لایا کرونگی:

ارے ہاں سپہیا! تیری کوتل کوں کھودونگی گھاس،
ہمیں تو سنگ لے چلو جی مہاراج!

سپہیا : میرے گھر بھوری بھینس ہے اُسے بھی نہیں چھوڑتا:

ارے ہاں ڈابر نینی! گھر میرے بھوری اے بھینس،
واؤ اے چھوڑے نا بنے جی مہاراج!

برج کے میگھ ملہار

ڈابرنینی : تیری بھینس کا دودھ دُوھونگی۔ ہمیں اپنے ساتھ لے چلو:

ارے ہاں سپہیّا! تیری بھینس کی کاڑھونگی دھار

ہمیں تو سنگ لے چلو جی مہاراج!

سپہیّا : اے ڈابرنینی! تجھے لے جا کر کیا کرونگا۔ میرے گھر میری نئی نویلی دُلھن ہے، جسے ابھی گونا کرا کے لایا ہوں۔

ارے ہاں ڈابرنینی! گھر میرے آئی گونے نار

توئے تو لے کے کاہ کریں جی مہاراج!

ڈابرنینی : اے سپہیّا! تیری "گونیائی" کو کالا ناگ ڈسے اور تجھ پر بجلی گرے۔

ارے ہاں سپہیّا! تیری گونیائی اے کھیّو کارو ناگ — ۶۔ کھائے ۷۔ کالا۔

توئے تو پٹ پر مارے بھجری جی مہاراج! — ۸۔ میدان ۹۔ بجلی۔

اور اس کے بعد سپہیّا اور ڈابرنینی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

اس ملہار میں برج کی ہنس مکھ عورتوں کی شوخی، روزمرّہ کی چھیڑ چھاڑ، ہنسی ٹھٹھول، راہ چلتے پردیسیوں کو بنانا، ان کے ساتھ ہنسی دل لگی کرنا، اور اسی قسم کی خوش طبعی کی باتوں کی عکاسی کی گئی ہے۔

ڈابرنینی سپہیّا کے ساتھ بھاگ جانے کو تیار ہے۔ مگر سپہیّا بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ چنچل نار اسی طرح راہگیروں کو بناتی ہیں کیونکہ سپہیّا بھی کسی پڑوسی گاؤں ہی کا باسی ہے۔ اسی لیے وہ اُلٹا اُسے بنانے لگتا ہے۔

ڈابرنینی بھی اچھی طرح سمجھتی ہے کہ سپہیّا اُسے بنا رہا ہے۔ اُس کے گھر میں "چوہے گیاس" کرتے ہوں مگر یہاں وہ رتھ کے بیلوں کی جوڑی، کوتل گھوڑی اور بھوری بھینس کی ڈینگیں مار رہا ہے۔ اگر یہ سب ساز و سامان اُس کے ہاں ہوتا، تو وہ نوکری

۵۔ "چوہے گیاس کرتے ہیں" ٹھیٹ گاؤں کا محاورہ ہے۔ گیاس (چاند کی گیارھویں) کو برت رکھتے ہیں۔ یہ "نرجلا ایکادشی" کا برت کہلاتا ہے، جس میں پانی تک نہیں پیتے۔ بھوکوں مرنے کے معنوں میں یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ اُس زمانے میں کھیتی ہی "اُتم" (افضل) سمجھی جاتی تھی اور نوکری کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مشہور کہاوت ہے: "اُتم کھیتی، مدھم بان، نکھد چاکری بھیک ندان"۔ (یعنی کھیتی اعلیٰ پیشہ ہے، بیوپار دوم درجے کا اور نوکری بھیک مانگنے کے برابر ہے۔) گیت میں سپہیا نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے ہی میں ممکن ہو سکتی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ سپہیا چھیڑ چھاڑ کے پردے میں غیر شعوری طور پر اپنی اُن آرزوؤں کا اظہار کر رہا ہو، جن کے تصوّر میں اُس نے نہ جانے کتنے دن اور کتنی راتیں ذہنی عیّاشی کی نظر کی ہیں۔ اس نے نہ جانے تمنّا میں کتنے حسین شیش محل تعمیر کیے ہوں گے! کتنی بار رتھ کے بیلوں کی جوڑی کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی دلنواز آواز سُنی ہو گی۔ کوتل گھوڑی کی مدھر ہنہناہٹ سُنی ہو گی۔ بھوری بھینس کے میٹھے دُودھ کی دھار، کتنی بار اُس کے ہونٹوں پر بکھر کر مدھر مُسکان بن گئی ہو گی! اور جب اُس کی "آرزو خیالی" کا نقطۂ عروج اسے "گو نیانی نار" کی نکہتوں میں ڈوبی ہوئی سیج پر لے گیا ہوگا، تو اُس کا انگ انگ راگ، رنگ اور رس کا سنگم بن گیا ہوگا!

سپہیا کے یہ رنگین اور حسین خواب خواہ کبھی شرمندۂ تعبیر ہوں، یا نہ ہوں، تاہم ایک تشنہ کام دل و دماغ کی آسودگی کا ذریعہ تو بن سکتے ہیں، خواہ وہ ایک لمحے ہی کے لیے کیوں نہ ہو! ادب بھی اُس وقت تک ادب نہیں بنتا، جب تک "حقیقت" میں "خواب" کی آمیزش نہیں ہوتی۔

ڈابرنیی کی بددعا بھی بڑی پُر لطف ہے کہ تیری "گو نیانی نار" کو کالا ناگ ڈس لے، اور تجھ پر کسی چٹیل میدان میں بجلی گرے۔ یہ بددعا اُس چھیڑ چھاڑ کا نقطۂ عروج ہے، جس کا آغاز خود ڈابرنیی کرتی ہے کہ ——

ہمیں بھی سنگ لے چلو جی مہاراج!

ظاہر ہے وہ ایک اجنبی سپاہی کے ساتھ یکایک بھاگ جانے کو کیسے تیار ہو سکتی ہے؛ وہ خوب سمجھتی ہے کہ سپہیا اُسے دیکھ کر راستے میں کھڑا ہو گیا ہے، اس لیے پیشتر

س کے کہ سپاہیا چھیڑ چھاڑ میں پہل کرے، وہ اُسے بنانا شروع کر دیتی ہے۔
[بشکریہ شرمتی پربھاوتی]

۱۷۔ رنڈوا تو روے آدھی رات

زمانۂ قدیم سے "عورت" مرد کے مظالم کا شکار رہی ہے۔
مرد نے عورت کو سونے چاندی کی زنجیروں میں جکڑ کر گھر کی چار دیواری میں اس طرح قید کر دیا کہ وہ اُف تک نہ کر سکی۔ وہ سُہاگ کا رنگین و معطر جوڑا پہنے، سولہ سنگار کیے، مانگ میں سُہاگ کا سیندور بھرے، گہنوں سے لدی ہوئی، "روتے گھونگھٹ" اور "ہنستے من" سے ڈولی سے اُتری اور اپنی سُسرال کے سُہاگ محل میں داخل ہوئی کہ پھر وہاں سے اس کا جنازہ ہی اُٹھا۔
عورت قدرت کا بہترین شاہکار ہے۔ وہ مرد کے مقابلے میں فطرتاً لطیف تر اور نازک تر ہے۔ مگر مرد کی ہوس پرستی اور عورت کی اقتصادی غلامی نے اس کی لطافت اور نزاکت پامال کر دی۔ عورت، مرد کا جنسی کھلونا بن کر رہ گئی۔ مرد نے اُسے اپنے "پیر کی جوتی" بنا دیا۔
اُس کا شوہر اگر اُس سے پہلے چل بسا، تو وہ "وفا و ایثار کی دیوی" اُس کی چتا میں اس کے ساتھ جل کر بھسم ہو گئی یا اُسے جبراً ستی کر دیا گیا۔ ستی کی مذموم رسم بند ہوئی تو سماج نے اُسے بیوگی کا ماتمی لباس پہنا دیا، اور اس پر کڑی پابندیاں لگا دیں کہ وہ نہ دوسری شادی کر سکتی، نہ ہنس بول سکتی۔ یا پھر اُس کا سر مُنڈا کر اسے کسی تیرتھ استھان پر جا کر چھوڑ دیا۔ کاشی (بنارس) سے متعلق ایک مشہور کہاوت ہے کہ

رانڈ، سانڈ، سیڑھی، سنیاسی
اِن سے بچے تو، سیوے کاسی

اُس کی حالت پر رحم کھا کر حالی نے "مناجاتِ بیوہ" لکھی۔ اور بیوہ کے سپنر بیاہ"

(دوسری شادی) کے لیے سماج سے پُرزور اپیل کی۔ "بیوہ" نے "خداوندوں کے خداوند" کے حضور میں رو رو کر اور گڑگڑا کر کہا:

کیجو، جو کچھ تیری خوشی ہو رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو

. . . .

سائیں بِن جو چیز ہے گھر میں، خاک ہے سب عورت کی نظر میں

. . . .

جس دُکھیا پر پڑے یہ بپتا، کر اُسے تو پیوند زمین کا
یا عورت کو پہلے مُبلا لے، یا دونوں کو ساتھ اُٹھا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی، جس سے گئی پرتیت یہاں کی
جس سے ہوئے دل سیکڑوں بسمل جس نے ہزاروں کیے ہیں گھائل

. . . .

قوم کی جس بِن آن ہے جاتی، دیش کی جس پر جان ہے جاتی
جس نے کیے دل رحم سے خالی، ریت ہے جو دنیا کی نرالی
قوم سے تُو یہ ریت چھڑا دے
بندیوں کی بیڑی یہ تُڑا دے (مناجاتِ بیوہ)

مذہبی اور سماجی اداروں میں "آریہ سماج" نے خاص طور پر اس "ریت" کو مٹانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان تمام مساعی کے باوجود، آج بھی گانو میں اونچی ذات کی کتنی ہی بیوائیں اپنی لغزشوں کے نتائج سے چھٹکارا حاصل کرنے میں لگی رہتی ہیں۔

اور اگر وہ اپنے شوہر سے پہلے چل بسی، تو اس کی کریاکرم ہوتے ہی، چٹ منگنی پٹ بیاہ رچا لیا گیا۔ کبھی کبھی اس کی زندگی میں بھی اس پر سَوت لائی گئی۔ چونکہ سماج کی باگ ڈور مرد کے ہاتھ میں تھی، رنڈوے پر سماج نے کوئی پابندی نہیں لگائے۔ رنڈووں کی دوسری شادی نے بھی مظلوم اور بیکس عورت پر ظلم توڑے۔ ساٹھ سال

آدھی رات کا سمے ہے۔ رنڈوا سو رہا ہے۔ اُس کے سپنے میں آجاتی ہے ایک سُندر کامنی (سدا بچھائے بوریا، سپنے آئی کھاٹ) کامنی کو دیکھ کر وہ پھولا نہیں سماتا۔ اپنے بھاگ پر اِتراتا ہے کہ اتنے میں اس کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اب وہاں نہ کامنی ہے، نہ اس کی دلفریب ادائیں۔ رنڈوا کامنی کو یاد کرتا ہے اور روتا ہے۔ روتے روتے سحر ہو جاتی ہے۔ پَو پھٹتی ہے مگر اُس کا رونا بند نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ دن بھر سسکیاں بھرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی بے کیف زندگی کا جائزہ بھی لیتا جاتا ہے اور روتا بھی جاتا ہے۔

ہر روز اندھیرے اُسے چکّی چلانی پڑتی ہے کیونکہ کوئی عورت اس کا آٹا نہیں پیستی، نہ کوئی اُس کی بات ہی پُوچھتی ہے۔ روزانہ چُولھا جھونکنا پڑتا ہے، کوئی اُسے روٹے پکا کر نہیں دیتی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی دال بھات پکاتی ہے۔ نہ اس سے کوئی پیار سے بولتی ہے، نہ کوئی اس کا حال دل پُوچھتی ہے۔ اڑوسنیں پڑوسنیں بھی منھ پھیر کر نکل جاتی ہیں۔ بھائی بھتیجے ہیں؛ وہ بھی اس کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ رہے پڑوسی ـــــ تو وہ ہر وقت چوکس رہتے ہیں کیونکہ رنڈوے کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس لیے وہ بھی گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔

آخر گھبرا کر وہ ان تلخیوں سے کہیں دُور بھاگ جانا چاہتا ہے اور کسی سنت مہاتما کی کٹیا میں پناہ لینے کی سوچتا ہے:

کبیرا کھڑا بزار میں، مانگے سب کی خیر
نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بَیر

تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنے آپ کو کبیر کے رُوپ میں دیکھتا ہے۔ لیکن جونہی سپنے کی کامنی کا خیال آتا ہے، وہ پھر ڈاڑھیں مار کر رونے لگتا ہے، اور در و دیوار سے سر ٹکرا کر مر جانا چاہتا ہے۔ وہ اتنا روتا ہے کہ اس کا جسم تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ یونہی روتے روتے پَو پھٹ جاتی ہے۔ صبح ہو جاتی ہے، مگر اس کا رونا بند نہیں ہوتا۔ وہ دن بھر سسکیاں لیتا رہتا ہے۔

برج کے میگھ ملہار

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ — گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

ساون آتا ہے، تو ان نئی نویلیوں کی بن آتی ہے، جو سارا سال رنڈوے کی نگاہوں کا مرکز بنی رہتی ہیں۔ گلیوں میں، پنگھٹ پر، مندر میں، شوالے میں، کھیتوں کی بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر، غرض گھر اور باہر سب جگہ رنڈوا حضرت جن کے گرد پروانہ وار طواف کرتے رہے ہیں، انھوں نے بھی رنڈوے کو نشانا بنالیا ہے، اور طنز و مزاح کے سارے ترکش خالی کر دیے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

اری بہنا! رنڈوا تو روو ے آدھی رات، سپنے میں دیکھی کامنی!
کوئی نہ پیسے واکو پیسنو،
اری بہنا! کوئی نہ پوچھے واکی بات، سپنے میں دیکھی کامنی!
کوئی نہ روٹی کر کے دے اُسے،
اری بہنا! کوئی نہ راندھے واکو بھات، سپنے میں دیکھی کامنی!
کوئی نہ بولے واتے پیار تے،
اری بہنا! کوئی نہ پوچھے واکی بات، سپنے میں دیکھی کامنی!
بھیّا بھتیجے دشمن ہو گئے،
اری بہنا! نگر پروسی کرتے گھات، سپنے میں دیکھی کامنی!
نا کائی تے واکی دوستی،
اری بہنا! نا ہے کائی تے واکو بیر، سپنے میں دیکھی کامنی!
روئے کے رنڈوا گھر میں یوں کہے،
اری بہنا! اِکلو مردوں گو سرمار، سپنے میں دیکھی کامنی!
اِکلو جب رووے رنڈوا محل میں،
اری بہنا! تھر تھر تو کانپے واکو گات، سپنے میں دیکھی کامنی!
روتے ہی روتے پیری پھوٹ گئی،
اری بہنا! دن میں بی شبکت جات، سپنے میں دیکھی کامنی!

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ، داغوں کی بہار
اس چراغاں کا، کروں کیا، کارفرما جل گیا

(چراغاں: بہت سے چراغ، جشنِ روشنی ۔ کارفرما: حکم دینے والا، کسی کام کا چلانے والا یعنی دماغ)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سوزِ دروں کا حال کس طرح ظاہر ہو سکتا ہے کیونکہ جلنے سے دل میں داغ نمایاں ہوتے ہیں اور ان کی روشنی چراغوں کی طرح دور پھیلتی ہے۔ اب تو یہ عالم ہے، حضرت دل ہی جڑ سے ندارد ہیں۔ جب کوئی جشن ہوتا ہے، تو رات بھر روشنی کی جاتی ہے۔ چراغ افروزی کا بادشاہی حکم کوبکو منادی کرتا ہے اور سو بسو روشنی کراتا ہے۔ تو ہمارے سینے کی اقلیم میں داغوں کے ذریعہ سے چراغاں کیوں کر ہو سکتا ہے، یہاں تو حضرتِ بادشاہ ہی فی النّار ہو چکے۔

ماحصل: دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہ تھی
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو، غالب! کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

(افسردگی: ٹھٹھر جانا ۔ تپاک: گرمیِ دل (جوش کے ساتھ ملنا)

فرماتے ہیں کہ کثرت کی خوب بہار دیکھی۔ اب وحدت کی ٹھہری۔ جلوت کے خوب گل چھرّے اڑائے، اب خلوت کا زمانہ بھی بجھے ہوئے چراغ کی طرح ایک گوشۂ ظلمت میں سب سے جدا اپنی افسردگی اور پژمردگی کو لیے ہوئے بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ کیوں کہ شگفتہ دلی بدونِ جلسۂ احباب، صحبتِ دوستاں ناممکن ہے اور دنیا اور اہلِ دنیا کے تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ "السلامۃ بین الوحدۃ والآفات بین الاثنین" سلامتی اکیلے رہنے میں ہے اور دو کے ساتھ آفتیں لگی ہوئی ہیں۔ لیکن تنہائی باعثِ افسردگی ہے اور جلسۂ احباب باعثِ شگفتگی۔ مگر تنہائی سے افسردگی کے سوا کچھ اور نقصان نہیں۔ دنیا کی ناقابلِ اطمینان ملاقاتوں سے سخت اذیتیں پہنچتی ہیں، جن سے زندگی وبالِ جان اور دوبھر ہو جاتی ہے۔ جب آدمی دو بلاؤں میں پھنس جاتا ہے۔ مثل ہے "بگریز گرتابہ تہ نافی شود"

برج کے میگھ ملہار

اس طرح برج نار سال بھر کی چھیڑ چھاڑ کا بدلہ ساون میں لیتی ہے۔ وہ جی بھر کے رنڈوے کو دق کرتی ہے، منھ بناتی ہے، انگوٹھا دکھاتی ہے، ناک بھوں چڑھاتی ہے اور پھر جھولوں کے بڑھتے ہوئے پینگوں میں ہنستی ہنستی لوٹن کبوتر بن جاتی ہے۔ رنڈوا مہاشہ کھٹتے ہیں، جلتے ہیں، کڑھتے ہیں۔ پھر اچانک اس خیال سے لطف اندوز بھی ہوتے ہیں کہ نہ جانے، ان میں سے کسی کامنی کے دل میں دیا آجائے، تو پھاگن کے مہینے میں اس تحقیر و تضحیک کا کفارہ ہوجائے۔

اس گیت کے تیور صاف بتاتے ہیں کہ اس گیت کا اصلی مقصد تفریح طبع کا سامان پیدا کرنا ہے۔ اسے طنز و مزاح کی چاشنی میں سان کر حسین چھیڑ چھاڑ کے لیے گایا جاتا ہے۔ تاہم اگر غور سے اس گیت کا جائزہ لیا جائے تو اس سے ایک اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے — رنڈوا جو سماج میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، اس کے جذبات کو برانگیختہ کرکے اور اسے اشتعال دلاکر، دوسری شادی کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے، تاکہ وہ پرائی عورتوں کو گھورنا، چھیڑنا، اور ستانا ترک کردے اور ایک کھونٹے سے بندھ جائے۔ کسی کا مشہور قول ہے:

"رانڈ خطرہ میں ہوتی ہے اور رنڈوا خطرناک!"

[بشکریہ شریمتی رام پیاری]

۱۔ تحریر، ماہی: مارچ، جون، ستمبر، دسمبر

۲۔ اڈیٹر، مالک رام؛ (۲) قومیت: ہندستانی

(۳) پتا: سی ۴۰۵، ڈیفنس کالونی، نئی دلی ۲۴

۳۔ پرنٹر و پبلشر، ظل عباس عباسی (۲) قومیت: ہندستانی

(۳) پتا: ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶

۴۔ نام و پتا مالک: علمی مجلس، ۱۴۲۹، چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی

میں ظل عباس عباسی تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں، وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔ (دستخط) ظل عباس عباسی

مالک رام

وفیات

نجی، نرندر ناتھ (ڈاکٹر)

۲۸ نومبر ۱۹۳۳ء کو ڈیرہ اسمٰعیل خان (حال پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شری جمنا داس گروور ماشاءاللہ زندہ ہیں اور پیشے کے لحاظ سے ساہوکارہ کرتے ہیں۔

نرندر ناتھ کا تعلیمی دور بہت شاندار رہا۔ میٹرک (۱۹۴۸ء)، انٹر (۱۹۵۰ء)، بی اے (۱۹۵۲ء) کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے پھر اسی یونیورسٹی سے ایم اے کی دو مضامین میں سند حاصل کی: انتظامِ عامہ ۱۹۶۴ء میں اور انگریزی ۱۹۶۷ء میں۔ اسی اثنا میں ایم ایڈ اور ایم ایس سی کی اسناد بھی حاصل کیں۔ پی ایچ ڈی کی سند موت سے چند ماہ پہلے ۱۹۷۷ء میں پائی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ کافی نہ ہو، نجی مطالعے سے ہومیوپیتھی میں ڈاکٹر آف میڈیسن کی سند ۱۹۵۵ء میں درجۂ اول میں حاصل کی تھی۔

ملازمت اینگلو ویدک مڈل اسکول ہوشیارپور کی ہیڈ ماسٹری سے شروع کی۔ یہاں وہ ۱۹۵۴ء–۱۹۵۵ء دو سال رہے۔ اس کے بعد ہوشیارپور، حاجی پور، امرتسر، بلّہ (ضلع کرنال، ہریانہ) کوروکشیتر کے مختلف اداروں سے وابستہ رہے۔ سب سے آخر ۱۹۶۸ء میں کوروکشیتر کے سروسز ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہوئے۔ موت کے وقت اسی عہدے پر متمکن تھے۔

۲۶ جولائی ۱۹۷۷ء چنڈی گڑھ کے اسپتال میں بعارضۂ التہابِ جگر رحلت ہوئی۔ اولاد میں ایک بیٹی چھوڑی۔

ماخذ: پروفیسر وشوا ناتھ دتّا، صدر شعبۂ تاریخ، کوروکشیتر یونیورسٹی، کوروکشیتر (ہریانہ)

انھوں نے ایک کتاب انگریزی میں "انتظامِ عامہ" بھی لکھی تھی۔ اردو شعر کا ایک مختصر مجموعہ "جامِ صد رنگ" کے عنوان سے چھپ چکا ہے (ہوشیارپور ۱۹۶۶ء)؛ شعر میں جناب ساحر ہوشیارپوری سے اصلاح لیتے تھے۔

سفیر بجنوری، عبداللطیف

لکھنؤ سے بارہ کیلومیٹر کی دوری پر بجنور ایک قدیم قصبہ ہے، جہاں کے خاندانِ شیوخ میں علمی قدر و منزلت اور دنیوی جاہ و مال کے متعدد نمایندے پیدا ہوئے ہیں۔ اس خاندان کے کئی افراد تعلیم کی آسانی اور روزگار کی سہولتوں کے باعث بجنور کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کے محلہ دوگانواں میں منتقل ہو گئے۔ اسی سبب اس محلے کا وہ حصہ جہاں یہ حضرات مقیم ہوئے تھے، آج تک "احاطۂ شیخاں" کہلاتا ہے (اردو فارسی کا رواج نہ رہنے کا نتیجہ ہے کہ میونسپل کمیٹی نے بعض جگہ احاطے کا نام "احاطۂ شیر خان" لکھ دیا ہے)۔

مولوی عبداللطیف ۱۹ مارچ ۱۸۹۸ء کو بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالرحیم صدیقی اپنی مختصر زمینداری کے علاوہ لکھنؤ کچہری میں بحیثیت مختار بھی کام کرتے تھے۔ ان کا ۱۹۱۸ء میں انتقال ہوا۔ اپنے خاندانی قبرستان (بجنور) میں مدفون ہیں۔

سفیر کی ابتدائی تعلیم حسبِ دستورِ زمانہ گھر پر ہوئی۔ اس طرح عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں سے خاصی واقفیت پیدا ہو گئی۔ بعد کو ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے دسویں کا امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کیا۔ چونکہ اردو فارسی کی قابلیت معیاری تھی، انھیں منشی (فارسی)، فاضلِ ادب اور دبیر کامل (اردو) کے امتحان پاس کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ بہت دن بعد ۱۹۵۱ء میں منبع الطب کالج لکھنؤ سے پرائیویٹ طور پر طب کی سند بھی حاصل کی تھی۔ لیکن یہ محض شوقیہ اقدام تھا کیونکہ انھوں نے کبھی مطب نہیں کیا۔

وہ سب سے پہلے ۱۹۲۲ء میں سینٹ جوزف ہائی اسکول، لکھنؤ میں فارسی کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں یہ اسکول سینٹ جوزف انٹرمیڈیٹ کالج بنا دیا گیا۔ چونکہ کالج میں فارسی کا شعبہ بند کر دیا گیا تھا، اس لیے ان کی ملازمت خطرے میں تھی۔ اس پر انھوں نے ۱۹۵۴ء میں

لکھنؤ یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اور کالج میں تاریخ پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ چونکہ اسکول کی عمارت بہت پرانی اور بوسیدہ ہوگئی تھی اور خدشہ تھا کہ اگر کسی وقت بیٹھ جائے، تو اس سے جانی نقصان کا قوی اندیشہ ہے، لہٰذا اصحاب مجاز نے ۱۹۶۳ء میں کالج توڑ دیا اور اسٹاف کو مناسب معاوضہ دے کر الگ کر دیا۔ اسی میں مولوی عبداللطیف بھی ریٹائر ہو گئے۔ پنشن کا سوال ہی نہیں تھا، صرف ایک سال کی تنخواہ (پانچ ہزار روپے) بطور معاوضہ ملی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کہیں نوکری نہیں کی۔

شعر میں سید محمد حسین افقر موہانی (ف: نومبر ۱۹۷۱ء) سے مشورہ رہا۔ افسوس کہ زندگی میں کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ چونکہ طبیعت پر تصوف کا غلبہ تھا اور ساری عمر صوم وصلوٰۃ بلکہ اوراد و اشغال کے سختی سے پابند رہے، لہٰذا غزل کے علاوہ نعت گوئی سے خاص شغف رہا۔

ان کا نکاح ۱۹۳۲ء میں فتح پور (ضلع بارہ بنکی) کے مشہور صوفی بزرگ مولانا عابد حسین مرحوم کے حقیقی بھانجے مولوی عبدالصمد کی صاحبزادی راضیہ خاتون سے ہوا تھا۔ ان سے تین اولادیں ہوئیں: (۱) عبدالحفیظ صدیقی ایم ایس سی (علیگ)۔ پہلے شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ میں پڑھاتے رہے، آج کل نیشنل ڈیفنس اکاڈمی، کھڑک واسلا (مہاراشٹر) میں مدرس ہیں۔ ادبی ذوق ورثے میں پایا ہے۔ علی گڈھ میگزین کا "مجاز نمبر" (۱۹۵۶ء) انھیں کی ادارت میں شائع ہوا تھا۔ (۲) طاہرہ خاتون۔ ان کا نکاح مولانا محمد میاں فاروقی سابق رکن پارلیمنٹ کے صاحبزادے محمد اسمٰعیل فاروقی سے ہوا۔ آج کل بمبئی میں قیام ہے۔ (۳) عبدالحسیب صدیقی بی اے ٹاٹا آئل کمپنی کی شاخ کانپور سے وابستہ ہیں؛ قیام لکھنؤ میں ہے۔

کبر سنی کے ساتھ حافظہ بالکل جواب دے گیا تھا۔ نسیان کے غلبے کا یہ عالم تھا کہ لکھنؤ میں جہاں ساری عمر بیتی تھی اور جس کے چپے چپے سے وہ واقف تھے، اپریل ۱۹۷۶ء میں ایک مرتبہ راستہ بھول گئے، اور میلوں دور نکل گئے۔ جب دیر تک گھر نہ لوٹے، تو قدرتاً اعزّہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ تلاش میں ہر طرف آدمی دوڑائے گئے، لیکن بے سود۔ وہ تو خدا کو خیر منظور تھی، ایک

؎ یہ حالات بھی انھیں نے فراہم کیے۔

رکشا والے نے پہچان لیا، اور انھیں سوار کرکے مکان پر پہنچا گیا۔
وہ آخری ایام میں اپنے بڑے صاحبزادے عبدالحفیظ صدیقی کے پاس کھڑک واسلا چلے گئے تھے۔ یہیں وفات ہوئی۔ معمولی تکلیف موت کا بہانہ بن گئی۔ کوئی خاص شکایت نہیں تھی۔ شدید زکام لاحق ہو گیا۔ علاج سے بظاہر ٹھیک ہو رہے تھے، لیکن اچانک ۱۲ اگست ۱۹۷۷ء صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے سوتے میں جان بحق ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی دن نماز مغرب کے بعد مقامی مسجد کے احاطے میں تدفین عمل میں آئی۔ جس شخص نے حتی الوسع کبھی نماز باجماعت ناغہ نہ کی ہو، اس کے لیے خواب ابدی کی اس سے زیادہ موزوں جگہ تصور میں نہیں آسکتی۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ۔

بیدار، کرپال سنگھ

تحصیل ننکانہ صاحب (ضلع شیخوپورہ، حال پاکستان) کے ایک مختصر گاؤں کھنگراں والا میں ۲۰ دسمبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان گِل جاٹوں کا تھا، جو اپنی قوم میں ممتاز طبقہ خیال کیا جاتا ہے۔ ان کے والد سردار خوشحال سنگھ خاصے بڑے زمیندار تھے، اور یہ گاؤں اور اس کے ارد گرد کی ساری اراضی انھیں کی ملکیت تھی۔ اس رئیسانہ ماحول میں کرپال سنگھ کا بچپن بڑے لاڈ چاؤ اور آرام و آسایش میں گزرا، اور انھیں کبھی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔
ان کے خاندان میں علم و ادب کی کوئی روایت نہیں تھی۔ ان کے والد سردار خوشحال بھی غالباً پڑھنے لکھنے سے عاری تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے فیصلہ کیا کہ کرپال سنگھ کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔ چنانچہ انھیں لاہور بھیج دیا گیا۔ یہاں انھوں نے سنٹرل ماڈل اسکول سے دسویں کی سند لی۔ اس کے بعد بی اے تک دیال سنگھ کالج، لاہور کے طالب علم رہے۔ اور بالآخر ۱۹۳۹ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے ایم اے (فارسی) کا امتحان پاس کیا۔ وہ اس سال کے جملہ طلبہ میں اوّل آئے تھے اور سند بھی درجۂ اوّل کی تھی۔

ماخذ: انگریزی ماہنامہ اڈوانس چنڈی گڑھ (ستمبر ۱۹۷۰ء)؛ دیباچہ "صفیۂ خیال"
مکتوب رام لعل نابھوی۔

وفیات

۱۹۳۹ء ہی میں وہ سکھ نیشنل کالج لاہور میں فارسی اور اردو کے مدرس مقرر ہو گئے۔ یہ کالج سردار بلدیو سنگھ نے قائم کیا تھا، جو آزادی کے بعد مرکزی حکومتِ ہند میں وزیر دفاع رہے۔ ۱۹۴۳ء میں کسی دوست نے بیدار کو مشورہ دیا کہ حکومتِ وقت کی ملازمت میں شامل ہو جائیں۔ بیدار نے یہ مشورہ رد کرتے ہوئے اپنی مشہور نظم "پیامِ خودداری" کہی جس کے آخری دو شعر ہیں۔

مرا ایمان ہرگز کفر کا دم بھر نہیں سکتا — خدا کو چھوڑ کر بندے کو سجدہ کر نہیں سکتا
سرِ تسلیم کیونکر خم کروں انگریز کے آگے — کبھی فرہاد جھک سکتا نہیں پرویز کے آگے

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا، اور تقسیمِ وطن اس کے ساتھ آئی۔ بیدار کو بھی لاہور سے نقلِ مکان کرنا پڑا۔ یہاں انھوں نے پٹیالے میں رختِ سفر کھول دیا۔ شروع میں بہت پریشانی اور تنگی ترشی کا دور رہا، لیکن وہ اسے صبر و شکر سے جھیل گئے۔ مدتوں بعد، ۱۹۵۰ء میں پیپسو سرکار نے انھیں مہاجرین کی جائداد کا نائب نگران مقرر کر دیا۔ بدقسمتی سے دو برس بعد ۱۹۵۲ء میں اعصاب نے جواب دے دیا اور سخت بیمار پڑ گئے۔ بیماری نے طول کھینچا، تو اس کے باعث نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ بہت دن بیکار رہے۔ پھر ۱۹۵۷ء میں مالیرکوٹلہ میونسپل کمیٹی کے ایگزیکٹو افسر مقرر ہوئے۔ لیکن ایک تو انھیں انتظامی امور کا تجربہ کم تھا، اس پر مالیرکوٹلہ کا ماحول بھی مزاج کے مخالف! لہٰذا ۱۹۶۰ء میں اس جگہ سے بھی دست بردار ہو گئے۔ اگرچہ اس کے بعد ۱۹۶۲ء سے مئی ۱۹۶۶ء تک ضلع پریشد، پٹیالہ کے سکتر بھی رہے، لیکن ہے یہ کہ بیشتر زمانہ عُسرت اور بے اطمینانی میں گزرا۔ کثیر العیال آدمی تھے، ہوشربا گرانی اس پر مستزاد۔ بارے، اگست ۱۹۶۷ء میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کے شعبۂ فارسی میں جگہ مل گئی، اور یوں قدرے عافیت کی سانس لینے کا سامان ہو گیا۔ ان کی شروع سے تمنا رہی تھی کہ انھیں کہیں فارسی کی جگہ مل جائے، لیکن اس کا موقع انھیں بہت دیر سے ملا۔ عید ہوئی ذوق، و لے شام کو۔ وفات کے وقت وہ اسی اسامی پر فائز تھے۔ آخری ایام زیادہ تر علالت میں گزرے۔ اسی میں پنجشنبہ ۱۸ اگست ۱۹۷۷ء کو حرکتِ قلب بند ہو جانے سے رحلت ہو گئی۔

شادی کے بارے میں ان سے پوچھا تک نہیں گیا۔ یوں بھی اس زمانے میں والدین بالعموم اولاد سے ان باتوں میں مشورہ غیرضروری بلکہ معیوب سمجھتے تھے۔ اور یوں ان کی ایک نہیں، دو دو شادیاں ہوئیں، جو اس عہد کے زمینداروں کے ہاں تموّل و تعیش اور ریاست کا نشان خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۲۷ء میں ان کے والد نے موضع کاٹھا کاچھا (ضلع لاہور) کے نمبردار سردار خوشحال سنگھ کی صاحبزادی اقبال کور سے کی۔ اس بیوی سے ان کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ دوسری شادی ۱۹۴۵ء میں موضع ڈیہنو (تحصیل قصور۔ ضلع لاہور) کے رئیس سردار گجن سنگھ کی دختر نیک اختر جسونت کور سے ہوئی۔ ماشااللہ اس سے بھی چار لڑکے اور ایک لڑکی ہے۔

شعرگوئی انھوں نے دیال سنگھ کالج کی طالب علمی کے زمانے میں شروع کی۔ ابتدائی مشق کے زمانے میں کلام پر نند کشور اخگر فیروزپوری (ف: اپریل ۱۹۶۷ء) سے بذریعۂ خط و کتابت اصلاح لی۔ بعد کو پنڈت میلارام وفا اور پنڈت بھورام جوش ملسیانی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) سے بھی کچھ مشورہ رہا۔ لیکن بالآخر (شمس العلماء) مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کی شاگردی اختیار کرلی۔ تاجور مرحوم نے پنجاب میں اردو کی ترقی و ترویج کے سلسلے میں جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں۔ بیدار نے ان سے بہت استفادہ کیا اور وہ آخر تک اس کے معترف اور احسان مند رہے۔ ایک فارسی غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

بیدار! حق گواہ کہ در دینِ شاعری
جز تاجور نبود کسے پیشوائے ما

استاد کی وفات پر ایک نظم کہی تھی، اس کا آخری شعر ہے:

اب محفلِ سخن میں کوئی سحر گر کہاں — شاعر تو سینکڑوں ہیں، مگر تاجور کہاں!

مولانا تاجور کو بھی اپنے اس شاگرد پر ناز تھا۔ ایک مرتبہ ان کے بارے میں لکھا:

اس صوبے کے تمام مشہور و غیر مشہور شعرا میں صرف بیدار کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کا کلام فن کی تمام لغزشوں سے پاک ہے۔ وہ عمر کے لحاظ سے تو نوجوان،

لیکن پختہ مشقی کے اعتبار سے پیرِ ہفتاد سالہ ہے۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۵ء کو پنجاب سرکار کے محکمۂ السنہ نے اپنی سالانہ ادبی تقریب میں بیدار کو "ادیبِ اعلیٰ" کے اعزاز و خلعت سے سرفراز کیا۔ اس موقع پر جو ایڈریس انھیں پیش ہوا، اس میں انھیں "شاعرِ اعظم" کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اسی سال نومبر میں معززین پٹیالہ نے ان کے اعزاز میں بھاری جلسہ کیا۔ پنجاب سرکار نے دوبارہ ایک جلسہ ۱۹۷۳ء کے یومِ جمہوریہ (۲۶ جنوری) پر چنڈی گڑھ میں کیا۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ افسوس کہ انھیں اپنا مجموعۂ کلام "صفیرِ خیال" کتابی شکل میں دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ زندگی کے آخری زمانے میں انھوں نے اسے بڑے چاؤ سے مرتب کیا، پھر ایک نامور خوشنویس سے اس کی کتابت کرائی اور بڑے اہتمام سے اسے آفسٹ میں چھپوانا شروع کیا۔ لیکن وہ اس کی طباعت کی تکمیل سے قبل خود عالمِ جاودانی کو رحلت کر گئے۔ اللہ بس، باقی ہوس۔

جے کرشن چودھری حبیب

۱۹۰۴ء میں ٹانک ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان، حال پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں اگرچہ ان سے پہلے کوئی ادیب نہیں ملتا لیکن اس دور کے طرزِ تعلیم کے طفیل اردو فارسی کا مذاق اور وہ بھی اعلیٰ درجے کا ناپید نہیں تھا۔ خود ان کے والد (رائے صاحب) کیول کرشن چودھری، جو پشتینی زمیندار اور پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے، صاحبِ ذوق بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے ذاتی مطالعے کے لیے گھر پر ایک معقول کتب خانہ جمع کر رکھا تھا۔ جے کرشن کی ابتدائی تربیت اسی ماحول میں ہوئی، اور غیر شعوری طور پر ان کے دل میں ادب سے شغف پیدا ہوتا گیا۔

انھوں نے پنجاب یونیورسٹی، لاہور سے تاریخ میں بی اے (آنرز) کی سند لینے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، اور یہاں سے ایم اے (تاریخ) اور ایل ایل بی

ماخذ: مقدمہ نغمۂ زندگی از کوثر چاند پوری؛

آگیا۔ اس عہد میں تین بزرگوں نے اپنی روحانی اور مادی فتوحات کے باعث خاص شہرت حاصل کی: سالار ساہوؒ، سالار مسعود غازیؒ، سالار داؤدؒ۔ احمد علی شاب حضرت سالار داؤد کی نسل سے تھے۔ اس خاندان میں علم و ادب، تصوف و عرفان، بزم و رزم کا عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے۔ مثلاً منشی خادم علی سخا، جو عہدِ واجد علی شاہ میں دارالانشا کے میر منشی رہے، شاب صاحب کے پردادا تھے۔ جب سلطنتِ اودھ کا شیرازہ بکھرا، تو ان میں سے کچھ اصحاب نے حیدرآباد (دکن) کی راہ لی۔ ان میں سخا کے بیٹے (یعنی شاب کے دادا) منشی عبدالغفور حسّان بھی تھے۔ انھوں نے ریاست کے محکمۂ بندوبست میں ملازمت اختیار کی۔ شاب کے والد منشی منصور علی پیشے کے لحاظ سے تحصیلدار رہے اور اسی عہدے سے انھوں نے پنشن پائی، لیکن وہ اپنے عہد کے مشہور خطاط اور خوشنویس بھی تھے، ان کے اتقا اور زہد و ورع کا بھی دُور دُور شہرہ تھا۔ وہ حضرت وارث علی شاہؒ (دیوہ) کے متوسلین میں سے تھے۔ ان کا نکاح بھٹولی کلاں، ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے زمیندار کبیر احمد کی صاحبزادی وحید النسا بیگم سے ہوا۔ کبیر احمد صاحب بھی سالار داؤدؒ ہی کے نام لیوا تھے اور دونوں کا سلسلۂ نسب اوپر جا کر مل جاتا ہے۔ اسی خانوادے میں احمد علی شاب شبِ دوشنبہ ۲۲ نومبر ۱۹۰۳ء (۲ رمضان ۱۳۲۱ھ) اپنے آبائی مکان محلہ رنست پورہ (اورنگ آباد) میں پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ دو بھائی اور تھے، محمود علی اور ناصر علی۔ سنِ شعور کو پہنچے، تو والدہ نے، جو خود تعلیم یافتہ، نیک دل اور صاحبِ استعداد خاتون تھیں، ان کی تعلیم و تربیت اپنے ہاتھ میں لی۔ نجی تعلیم کے بعد فوقانیہ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا۔ ۱۸ سال کی عمر میں دسویں کی سند پائی (۱۹۱۷ء)؛ اور ریاست کی ملازمت میں بطور کلرک داخل ہو گئے (۱۹۱۸ء) لیکن اپنے طور پر تعلیم کا سلسلہ اب بھی جاری رکھا۔ اسی طرح عربی، فارسی، کنڑی تین تین زبانوں میں قابلِ اعتماد مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ساتھ قانون کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ جب اطمینان ہو گیا، تو قانونِ مال اور مجابی کے امتحانات پاس کیے، جس کے نتیجے میں سررشتۂ مالگزاری میں ملازمت مل گئی۔ ترقی کرتے کرتے تحصیلداری کے عہدے تک پہنچے۔ مختلف اضلاع میں تعلینات

رہے۔ ۲۷ سال کا پورا زمانہ نیکنامی سے بسر ہوا۔ آخری تعیناتی ضلع ناندیڑ میں تھی چونکہ اب صحت خراب رہنے لگی تھی، اس لیے طبّی مشورے پر قبل از وقت نومبر ۱۹۴۵ء میں وظیفۂ حسنِ خدمت کی درخواست پیش کی، جو منظور ہوئی۔

تقریباً سال بھر کے علاج کے بعد جب صحت بحال ہو گئی، تو مئی ۱۹۴۶ء میں پائگاہ خورشید جاہی میں مجلسِ انتظامی کے منتظم مقرر ہوئے۔ وہ اس عہدے پر چار سال تک کام کرتے رہے۔ جب پائگاہ کا سیاست میں انضمام ہو گیا، تو ان کا عہدہ تخفیف میں آگیا۔ اس کے بعد پانچ برس بیکاری میں گزرے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں وہ آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں مرحوم (ف: فروری ۱۹۶۷ء) کی ذاتی جاگیر میں لے لیے گئے۔ یہاں بھی ۱۲ سال تک ملازم رہے۔ اس کے بعد کہیں نوکری نہیں کی، گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ نوے روپے ماہانہ پنشن مقرر ہوئی تھی، اسی پر قناعت کی اور صبر و شکر سے بسر کر دی۔

اس دوران میں والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ والد منشی منصور علی نے پنجشنبہ یکم ستمبر ۱۹۴۹ء (۷ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) کو بھٹوی کلاں میں رحلت کی، اور وہیں دفن ہوئے۔ شاب نے ان کی تاریخ وفات کہی:

روحِ اقدس کو کیا جب حق نے یاد — کہہ دیا دنیائے دوں کو خیر باد
شاب نے تاریخ ہجری عرض کی — "رحلتِ منصور علی قدسی نہاد"
(۱۳۶۸)

والدہ وحید النساء بیگم آٹھ برس بعد اللہ کو پیاری ہوئیں۔ وہ سہ شنبہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۵۶ء (۲۵ ربیع اول ۱۳۷۶ھ) کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئیں۔ ان کا انتقال بھی بھٹوی کلاں میں ہوا، اور وہیں مدفون ہیں۔ شاب نے ان کی تاریخ وفات کہی:

بفضلِ خدا، بہرِ خیر البشر — ہوا خاتمہ دینِ اسلام پر
کہا سالِ ہجری بھی یہ شاب نے — "وفاتِ وحید النسا عمدہ تر"
(۱۳۷۶)

دوسری تاریخ بھی ہجری میں ہے:

احمد و محمود و نامر نوحہ خواں — بر وفاتِ مادرِ خود از غمش
سالِ فوتِ آں وحید العصر شاب! — "یکہزار و سہ صد و ہفتاد و شش"
(۱۳۷۶)

وفیات

جناب مرحوم نے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی (اولیا بیگم) قاضی فضل حسین انصاری رجسٹرار بارہ بنکی (ضلع سیتاپور) کی صاحبزادی تھیں۔ ان سے جون ۱۹۲۱ء میں اورنگ آباد میں نکاح ہوا۔ ان سے ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ ان کا ۱۲ اگست ۱۹۴۴ء کو ناندیڑ میں انتقال ہوا۔ چونکہ پہلی بیگم بعض دماغی امراض میں مبتلا ہو گئی تھیں، اس لیے انھوں نے دوسرا نکاح اپریل ۱۹۲۵ء میں اپنی سگی خالہ کی بیٹی نیاز النسا سے کیا۔ خدا کی شان، اس کے بعد اولیا بیگم بھی بالکل صحتیاب ہو گئیں۔ شاب مرحوم کہا کرتے تھے کہ دونوں کا آپس میں ایسا اتحاد و اتفاق تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اسی باعث شاب نے انھیں "شیر و شکر" کا لقب عطا کیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں دوسری بیگم (نیاز النسا) کا اچانک انتقال ہو گیا؛ اس زمانے میں شاب پربھنی میں تعینات تھے۔ ان سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی یادگار ہیں۔ جب ۱۹۴۴ء میں پہلی بیگم بھی داعیِ اجل کو پیاری ہو گئیں، تو انھوں نے تیسری شادی کی۔ یہ محمد احمد ٹھیکدار تعمیرات آرمور (ضلع نظام آباد) کی صاحبزادی کنیز فاطمہ تھیں، اور بفضلہٖ حیات ہیں۔ ان سے بھی چھ اولادیں ہوئیں: دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔

شاب کی زندگی کے آخری دس برس مختلف امراض کی تکلیف میں گزرے۔ ضیق النفس (دمہ) کا عارضہ عمر بھر شوہانِ روح رہا۔ پھر بواسیر اور گٹھیا (وجع المفاصل) نے آدبوچا۔ اس سے نقل و حرکت بہت محدود ہو گئی؛ بیشتر وقت گھر ہی پر گزرنے لگا۔ اور آخری دو برس تو تقریباً بستر پر بسر ہوئے۔ غرض جب بحد کمزور ہو گئے، تو عارضۂ قلب لاحق ہو گیا۔ اسی میں شنبہ ۲۰ اگست ۱۹۷۷ء داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ حیدرآباد کے محلہ سید علی چبوترہ میں تکیہ یٰسین شاہ کی مٹی قسمت میں لکھی تھی۔ ان کے استاد بھائی اور استاد زادے جناب علی احمد جلیلی نے ایک طویل قطعۂ تاریخ رحلت کہا۔ اس کے چند شعر ہیں:

آہ تلمیذِ جلیلِ نامور — نام نامی جن کا تھا احمد علی
شاب کہتے تھے جنھیں اہلِ سخن — کر گئے اہلِ سخن کو ماتمی
خلد میں، یارب! ملے ان کو جگہ — سایہ افگن ان پہ رحمت ہو تری
سالِ رحلت ہے، علیؔ! یہ انجواب (۱۲) — "ہو گئی خاموش شمعِ شاعری"
(۱۹۷۷ = ۱۲-۱۹۸۹)

وفات

موت کے وقت تیسری بیگم، کنیز فاطمہ کے علاوہ، دو بیٹے (احمد ہادی اور احمد مہدی) اور سات بیٹیاں اپنے سوگواروں میں چھوڑے۔

چونکہ خاندان میں علم وادب کا چرچا تھا اس لیے بچپن ہی میں مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا۔ حافظہ اچھا تھا، سینکڑوں شعر یاد ہو گئے۔ اس سے خود شعر کہنے کی ترغیب ہوئی۔ آغاز میں انھوں نے علامہ اقبال کی شاگردی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اقبال کسی کو شاگرد قبول نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے عدیم الفرستی کا عذر کیا۔ اس کے بعد شاب نے فصاحت جنگ جلیل مانکپوری (ف: جنوری ۱۹۴۶ء) سے رجوع کیا اور کلام پر ان سے اصلاح لینے لگے۔

تلامذۂ جلیل میں انھیں ممتاز مقام حاصل تھا۔ غزل میں ان کی حیثیت مستند تھی۔ اس کے علاوہ دوسری اصنافِ سخن میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ قطعہ، رباعی، مثنوی، حمد، نعت، مرثیہ ـــــ غرض کسی صنف میں بند نہیں تھے۔ ان کی مندرجۂ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں: (۱) تخئیلِ شاب۔ ابتدائی کلام (اورنگ آباد ۱۹۲۴ء)؛ (۲) توشۂ آخرت۔ مسائلِ فقہ (بجنور ۱۹۲۴ء)؛ (۳) تابِ شکیب۔ اخلاقی مثنوی (بجنور ۱۹۳۱ء)؛ (۴) کائناتِ شاب۔ دیوانِ اوّل (حیدر آباد ۱۹۴۹ء)؛ (۵) اوامر (جلد اوّل)۔ تعلیماتِ قرآنی عام فہم زبان میں (حیدر آباد ۱۹۵۹ء)؛ (۶) ژالہ برلالہ۔ مجموعۂ رباعیات و قطعات۔ (حیدر آباد۔ ۱۹۶۹ء)؛ (۷) آدم تا ایں دم۔ تاریخِ اسلام۔ یہ بالاقساط ماہنامہ "ارشاد" حیدر آباد میں جون ۱۹۶۵ء سے فروری ۱۹۶۹ء تک چار سال شائع ہوتی رہی تھی۔ کل ۴۴ قسطیں شائع ہوئی تھیں۔ غالباً کتابی شکل میں نہیں چھپی۔ (۸) اوامر (جلد دوم) (حیدر آباد ۱۹۷۱ء)؛ (۹) درود وسلام۔ (حیدر آباد ۱۹۷۴ء)؛ (۱۰) اوامر (جلد سوم) (حیدر آباد ۱۹۷۶ء)۔ بہت کچھ غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اس میں دو دیوان غزلیات کے اور ایک دیوانِ نعت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اپنی سوانح عمری بھی "شاب بیتی" کے عنوان سے لکھی تھی؛ یہ بھی نہیں چھپی۔

غرض ان کے اٹھ جانے سے ایک قادر الکلام شاعر اور نیک انسان ہم سے جدا ہو گیا۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ۔

بسمل سعیدی ٹونکی، سیّد عیسیٰ

اہلِ دل کے حلقوں میں کون نویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ سیّد جلال الدین مخدوم جہانیاں جہانگشت کے نام سے واقف نہیں ہوگا! وہ سیّد الشہدا حضرت حسین علیہ السلام سے سترھویں پشت میں تھے، اور سیّد عیسیٰ بسمل سعیدی انھیں مخدوم موصوف کی سولھویں پشت میں تھے۔

مخدوم جہانیاں جہانگشت کی اولاد کی ایک شاخ ہندستان آکر دلّی میں مقیم ہوگئی تھی۔ ان میں سے غالباً سیّد عنایت علی (بن مفتی سیّد فضل علی) دلّی سے رامپور منتقل ہوگئے۔ وہاں ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی، والیِ عہد نے بھی ان کے اعزاز و اکرام میں کمی نہیں کی۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: سیّد حیدر علی، سیّد حسن علی، سیّد محمد علی۔

سیّد حیدر علی اور سیّد محمد علی دونوں بھائیوں کا حضرت سیّد احمد بریلویؒ کے اصحاب کی حیثیت سے تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے۔ سیّد حیدر علی ان کی تحریکِ جہاد کے رکن تھے۔ حضرت سیّد احمدؒ ان کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے معترف تھے؛ اور انھوں نے سیّد حیدر علی کو اپنی طرف سے بیعتِ جہاد لینے کی اجازت دی تھی۔ جب بالاکوٹ کا سانحۂ الیمہ پیش آیا، تو سیّد حیدر علی نے اس کے بعد ٹونک میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب وزیر الدولہ وزیر محمد خان، جن کا نام غالب کی سوانح عمری میں آتا ہے، حضرت بریلوی کی تحریک سے متاثر تھے۔ انھوں نے معرکۂ بالاکوٹ کے بقیۃ السیف قافلے کو ٹونک میں پناہ دی۔ ٹونک کا بازار "قافلہ" انھیں حضرات کا مسکنِ اول تھا۔ مولانا سیّد حیدر علی کے ٹونک آجانے کے بعد نواب وزیر الدولہ بھی ان کے مریدوں میں شامل ہوگئے اور انھیں اپنا دیوان مقرر کر دیا۔ مولانا حیدر علی نے دو سال بعد دیوانی کے عہدے پر درس و تدریس کو ترجیح دی اور مدار المہامیِ ریاست سے دست بردار ہو کر شہر سے باہر ایک مسجد میں جا بیٹھے، جہاں تشنگانِ علم دور دور سے شدِّ رحال کر کے آتے، اور ان کے

مآخذ: بسمل سعیدی: شخص اور شاعر (مخمور سعیدی) اسما سعیدی۔

سرچشمۂ فضل سے سیراب ہوکر واپس جاتے۔ ان کا دوشنبہ ۱۸ اگست ۱۸۵۶ء (۱۶ ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ) انتقال ہوا۔ اپنے مدرسے کے جوار ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔

چھوٹے بھائی بھی سید محمد علی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح حضرت بریلویؒ کی تحریک جہاد کے حامی اور موید تھے۔ انھوں نے اس تحریک کی ترویج میں اپنی جادو بیانی سے نئی روح پھونک دی تھی۔ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی ایک کتاب "بارانِ رحمت" چھپ چکی ہے۔ ان کا بعمر ۵۰ برس ۱۸۴۲ء (۱۲۵۸ھ) میں الہ آباد میں انتقال ہوا۔ مولوی محمد علی کے بڑے صاحبزادے محمد علی سیماب ٹونکی (ف: یکم اکتوبر ۱۹۰۰ء) تھے۔ ان کے دو بیٹے ہوئے: سید احمد اور عبد العلی۔ چھوٹے عبد العلی عین جوانی میں والدین کو داغِ مفارقت دے گئے۔ بڑے سید احمد شعر بھی کہتے تھے، اسعد تخلص تھا۔ حاذق طبیب بھی تھے؛ ٹونک اور قرب وجوار میں ان کی شہرت طبیب ہی کی حیثیت سے ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں رحلت کی؛ "قضائے حذاقت" مادۂ تاریخ وفات سنہ ہجری میں ہے (۱۳۵۰ھ) یہی بسمل سعیدی کے والد بزرگوار تھے؛ ان کے تخلص کے ساتھ "سعیدی" کا لاحقہ انہی کے نام کی نسبت سے ہے۔ اسے ان کے بعض شاگردوں نے بھی اختیار کرلیا ہے۔

مولوی سعید احمد نے دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم اپنے خاندان ہی سے، مولوی سید زکریا (ابن مولانا سیّد حیدر علی) کی صاحبزادی محمدی بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ دوسری بیوی صدیقہ بیگم (دخترِ سیّد عاشق علی رامپوری) تھیں۔ ان سے تین بیٹے ہوئے: سیّد یحییٰ، سیّد عیسیٰ، سیّد احمد علی۔ سیّد یحییٰ ٹونک میں اپنے والد کی مسندِ طبابت پر متمکن ہیں۔ سب سے چھوٹے سیّد احمد علی آج کل لاہور (پاکستان) میں مقیم ہیں۔ منجھلے سیّد عیسیٰ کو دنیائے ادب؛ شعر بسمل سعیدی ٹونکی کے نام سے جانتی تھی، جن کا شب ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء جمعہ کو انتقال ہوگیا۔

بسمل مرحوم ۱۳۱۹ھ میں ٹونک میں پیدا ہوئے۔ "فضلِ تواب" ان کا تاریخی نام تھا جس سے ہجری سال کے عدد (۱۳۱۹) برآمد ہوتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کسی کے پوچھنے پر بتایا تھا کہ اگرچہ ٹھیک مہینا اور دن خود انھیں معلوم نہیں تھا، لیکن کسی مرحلے پر انھوں نے

گھر میں کسی کو یہ کہتے سنا تھا کہ رمضان شریف کا مہینا، آخری عشرہ تھا، پیر کے دن صبح صادق کے وقت پیدا ہوا تھا۔" جنتری میں رمضان ۱۳۱۹ھ کے ۳۰ دن درج ہیں۔ ۱۲ رمضان کو یکم جنوری ۱۹۰۲ء تھی، اور بدھ کا دن تھا۔ ۳۰ رمضان جمعہ کی اور ۱۰ جنوری تھی۔ اتفاق سے پورے عشرے میں صرف ایک پیر پڑتا ہے یعنی ۲۶ رمضان مطابق ۶ جنوری کو۔ پس اگر بسمل مرحوم نے اپنی ولادت سے متعلق جو کچھ سنا تھا، وہ درست ہے، تو ان کی ولادت پیر ۶ جنوری ۱۹۰۲ء (مطابق ۲۶ رمضان ۱۳۱۹ھ) کو ہوئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سن شعور کو پہنچے، تو والد نے خود پڑھانا شروع کیا اور ساتھ ہی سید اصغر علی ابرو مؤلف تاریخ ٹونک (ف:) سے بھی پڑھنے کی ہدایت کی۔ اگرچہ ان دونوں سے انھوں نے فارسی کی تکمیل کی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے استفادہ بیشتر اپنے والد ہی سے کیا۔ اس کے بعد دربار ہائی اسکول، ٹونک میں چھٹے درجے تک پڑھا۔ خدا معلوم کیا بات پیش آگئی کہ اس کے بعد اسکول کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان کے بہنوئی مولانا محمد سورتی کا ریاست رامپور سے تعلق تھا۔ مولانا سورتی انھیں ساتھ لے کر رامپور پہنچے اور انھیں مولانا شجاعت علی کے حوالے کر کے، خود حیدر آباد سدھارے۔ مولانا شجاعت علی نے انھیں مدرسۂ عالیہ میں داخل کرا دیا۔ یہاں عربی پڑھتے رہے۔ کچھ فارسی بھی پڑھی، لیکن یہ نصاب وہ پہلے ہی ٹونک میں مکمل کر کے آئے تھے، اس لیے فارسی میں قیام رامپور کے زمانے میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کا علی گڑھ میں افتتاح ہوا۔ مولانا محمد سورتی وہاں عربی پڑھانے پر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۲ء میں بسمل صاحب ان کے پاس علی گڑھ چلے گئے۔ یہاں انھوں نے انگریزی میں بھی کچھ شد بد حاصل کی، اور مولانا اسلم جیراج پوری (ف: دسمبر ۱۹۵۵ء) سے فارسی کی بعض کتابیں، جن میں شاہنامۂ فردوسی اور مثنوی مولانا روم زیادہ اہم تھیں، پڑھیں۔

دو سال بعد ۱۹۲۴ء میں بسمل صاحب گوالیار چلے گئے، جہاں ان کے بھانجے حکیم سید احمد ریاست کی ملازمت میں تھے، اور مطب بھی کرتے تھے۔ بسمل صاحب نے یہاں

طب کی کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور اتنی استعداد پیدا کرلی کہ خود مطب کرنے اور مریضوں کو دیکھنے لگے۔ سید احمد جب دفتری کام کے لیے جاتے تو ان کی غیر حاضری میں ان کے مریضوں کو بھی دیکھتے۔ غرض بحیثیت طبیب ان کی خاصی شہرت ہوگئی۔

گوالیار ہی میں والد کی طرف سے حکمنامہ پہنچا کہ ٹونک واپس آجاؤ۔ ۱۹۲۶ء میں شادی ہوگئی۔ ان کا نام سیدہ ذاکرہ بی (عرف بنو بی) تھا اور یہ مولوی سید شریف الاسلام قاضی شہر ثانی کی صاحبزادی ہیں؛ یہ بسمل صاحب کی حقیقی خالہ سیدہ ذاکیہ بی کی بیٹی بھی ہیں۔ ان کے بطن سے ماشاء اللہ کئی بچے ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ بعض کمسنی میں والدین کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان میں سے پانچ سن رشد کو پہنچے: ڈاکٹر اسماء سعیدی، ثریا عندلیب، رعنا پروین، تین لڑکیاں، اور مسعود الرحمٰن حبیب سعیدی اور محمد علی محبوب سعیدی۔ ثریا بیں جل مری جس نے بسمل صاحب کی زندگی تلخ کردی تھی۔ باقی بچے بفضلہٖ زندہ سلامت موجود ہیں۔ بڑے بیٹے لاہور میں مطب کرتے ہیں؛ دوسرے بچے یہیں ہندوستان میں ہیں۔

اس شادی پر دس بارہ برس بیت گئے۔ ماشاء اللہ اولاد بھی تھی ـــ لڑکے، لڑکیاں، کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن ہونی بلوان ہے، اسے کون ٹال سکتا ہے۔ ۱۹۳۸ء۔ ۱۹۳۹ء میں یہ اپنے خالو سید عابد حسین شاہ رامپوری کے وہاں معمول سے زیادہ جانے آنے لگے۔ خالو کی جوان بیٹی سلمیٰ سے ملاقات لابد تھی، لیکن اس سے زیادہ کوئی بات نہیں تھی کہ دونوں میں بے لوث سی محبت تھی، جیسی قریبی رشتے داروں میں عام طور پر ہو جاتی ہے۔ مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے؛ جتنے منھ، اتنی باتیں۔ اندیشہ پیدا ہوگیا کہ خدانخواستہ کہیں لڑکی کی زندگی دشوار نہ ہو جائے۔ اس پر طرفین کی رضامندی سے دونوں کا نکاح ہوگیا۔ اس بیگم سے چار بچے پیدا ہوئے: تین بیٹیاں (نجمہ، عائشہ، فاطمہ) اور ایک لڑکا جو کمسنی میں داغِ جدائی دے گیا۔ یہ بیگم آج کل پاکستان میں مقیم ہیں۔

۱۹۳۹ء یا ۱۹۴۰ء میں جے پور گئے۔ یہاں ممتاز الدولہ نواب مکرم علی خان رئیس پہاسو کے وہاں حاضری کا موقع ملا۔ مراسم کچھ ایسے بڑھے کہ بسمل ان کے مصاحب بن گئے۔ یہاں چھ سات برس قیام رہا؛ یہ زمانہ کاملاً آرام و آسایش اور بےفکری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

وفات

بسمل صاحب کا دلی آنا جانا اپنے والد کی زندگی سے تھا، لیکن یہی تھوڑی مدت رہے اور واپس چلے گئے۔ ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سلور جوبلی منائی گئی۔ اس موقع پر بڑے پیمانے پر مشاعرے کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ بسمل صاحب ٹونک سے اس مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے۔ اس موقع پر ان کا یہاں کے اہلِ ادب سے تعارف ہوا اور یہی ان کے دلی میں مستقل قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تین برس بعد (۱۹۴۹ء میں) وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے عرس کے مشاعرے میں شریک ہوئے اور پھر واپس نہیں گئے۔ دلی میں بھی اچھی گزری، اگرچہ مادی پہلو سے حسبِ دلخواہ فارغ البالی کبھی حاصل نہ ہوئی۔ مختلف موقت الشیوع رسائل و جرائد سے وابستہ رہے۔ شاگرد اور دوست احباب بھی خدمت کرتے رہے۔

عمر کے ساتھ قویٰ مضمحل ہوتے چلے گئے۔ ادھر آمدنی کے سارے سوتے خشک ہو گئے۔ اکثر بیمار رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ جسم میں نمی کی کمی کے باعث استسقاء کا شکار ہو گئے۔ اسی میں جمعہ ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء مغرب کے بعد ساڑھے نو بجے یہیں دلی میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ جنازہ اگلے دن اٹھا اور انھیں چہلیوں کے قبرستان (نزد پرانی عیدگاہ) میں سپردِ خاک کیا گیا۔

پورا گھرانا مذہبی اور علمی روایات کا حامل تھا۔ اوپر کی پشتوں میں کسی شاعر کا نام نہیں ملتا، لیکن ان کے دادا احمد علی سیماب اور والد مولوی سعید احمد اسعد کا شاعر ہونا ثابت ہے۔ اس صورت میں کہا جا سکتا ہے کہ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ پہلا شعر گیارہ بارہ برس کی عمر میں کہا۔ اس کے بعد کبھی کبھی کہنے لگے؛ اس میں مشورہ اپنے والد مولوی سعید احمد اسعد سے رہا۔ جب علی گڑھ گئے، تو کلام مولانا اسلم جیراج پوری کو دکھاتے رہے۔ پھر واپس ٹونک پہنچے، تو حافظ محمد عمر خاں جامؔ سے مشورہ کرتے رہے۔ بعض لوگوں نے (بلکہ خود سیماب اکبرآبادی نے بھی) انھیں سیماب مرحوم کا شاگرد کہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بسمل دو تین برس تک اپنا کلام سیمابؔ کے پاس بھیجتے رہے۔ بسمل کا دعویٰ تھا کہ باہمی قرارداد تھی کہ "اگر مجھے آپ کی اصلاحیں پسند آئیں۔ تو میں انھیں ضرور قبول کروں گا اور آیندہ یہ سلسلہ رہیگا۔ برس دو برس تک میں نے

جو کچھ بھیجا اور وہ اصلاح کے بعد واپس آیا میری طبیعت نے اسے پسند و قبول نہ کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ مشورہ ضرور رہا۔
ان کے کلام کے چار مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے: نشاطِ غم (دلی، ۱۹۵۱ء) کیفِ الم (دلی، ۱۹۵۳ء)؛ مشاہدات (دلی، ۱۹۶۰ء)، اوراقِ زندگی (نئی دلی، ۱۹۷۱ء) یقیناً بہت کچھ غیر مطبوعہ بھی رہ گیا ہے۔ یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ قدرتِ زبان، مہارتِ فن، گہرائی اور گیرائی میں وہ کسی استادِ سلف سے کم نہیں تھے۔ خدا چاہے، تو ان کا مقام تاریخِ ادبِ اردو میں محفوظ ہے۔

آصف بنارسی، عبدالرحمٰن

بنارس میں ۳۰ ستمبر ۱۹۰۱م کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالشکور کم قیمت دھاتوں کے زیورات کا کاروبار کرتے تھے۔ خود بھی بناتے تھے اور فروخت بھی کرتے تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے: اور عبدالرحمٰن ان میں سب سے بڑے تھے۔ خدا کی شان، سب بیٹے شاعر ہوئے۔ ان کے نام ہیں: محمد سلیمان واصف (غالباً ۱۹۵۶ء میں ڈھاکے میں انتقال ہوا)؛ عارف (کلکتے میں مقیم ہیں)؛ محمد یٰسین کاشف (آج کل کراچی میں رہتے ہیں)؛ شاکر الدین شاکر (یہ بھی کلکتے میں ہیں)۔
عبدالرحمٰن چھ سال کے تھے کہ ان کے والد عبدالشکور صاحب نے ۱۹۰۷ء میں اپنا کاروبار کلکتے منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ دونوں بڑے بیٹے، عبدالرحمٰن اور محمد سلیمان ان کے ساتھ تھے۔ جب ان کے پانو یہاں جم گئے، تو خاندان کے باقی افراد بھی کلکتے آ گئے۔ عبدالرحمٰن نے دسویں تک تعلیم کلکتے ہی میں پائی۔ اس زمانے میں کلکتے کی فضا شعر و نغمہ سے معمور تھی۔ نوجوان عبدالرحمٰن کو بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ شہر میں واقف بہاری کا شہرہ تھا۔ عبدالرحمٰن نے ان سے رابطہ قائم کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ انھیں اپنی شاگردی میں قبول کر لیں۔ اس کے بعد واقف انھیں کے مکان پر رہنے لگے اور اس طرح سے عبدالرحمٰن

ماخذ: مغربی بنگال میں اردو از سید اقبال عظیم؛ خطوط شعیب عظیم۔

کے اتالیق بن گئے۔ آصف تخلص بھی انہیں نے عطا کیا تھا۔ اب نوجوان عبدالرحمٰن کو شعرو سخن کے سوا اور کسی چیز سے سروکار نہ رہا۔ والد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے، تو انہیں اپنے ساتھ دکان پر بٹھالیا؛ اس طرح میٹرک سے آگے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔

تھوڑے دن بعد واقف اپنے وطن بہار تشریف لے گئے، اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

آصف استاد کے ساتھ دو ایک مرتبہ مشہور استاد رضا علی وحشت (ف: جولائی ۱۹۵۶ء) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، جو اس زمانے میں کلکتے ہی میں رہتے تھے۔ واقف کی وفات کے بعد آصف کو کسی اور سے مشورۂ سخن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پر انھوں نے وحشت کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ جوہر قابل تھا، اور وہ مبتدی بھی نہیں تھے۔ استاد نے بھی خاص توجہ سے نوازا۔ بہت جلد فارغ الاصلاح ہو گئے؛ اور استاد بن گئے اور مبتدی شاگرد ان کے حوالے کر دیے۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور تقسیم ملک کے باعث وحشت مشرقی بنگال چلے گئے۔ کلکتے کے ادبی اور شعری حلقوں نے آصف کو غنیمت جانا اور ان سے بھرپور استفادہ کیا۔ لیکن شہر کی فضا رفتہ رفتہ مسموم ہوتی چلی گئی اور بالآخر آصف نے بھی ہجرت کا عزم کر لیا۔ چنانچہ وہ وسط مارچ ۱۹۵۰ء میں اہل و عیال سمیت ڈھاکے چلے گئے۔ لیکن وہ کسی پر بار نہیں بنے۔ یہاں ایک مختصر دکان کر لی اور کسبِ حلال سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کا انتظام کر لیا۔

ان کی پہلی شادی ۱۹۲۰ء میں ہاجرہ خاتون سے ہوئی تھی۔ ان سے چار لڑکے (ضیاء الرحمٰن، ذکاء الرحمٰن ماہی، رضاء الرحمٰن، ثناء الرحمٰن) اور دو لڑکیاں (سراج اللیل اور اشرف النسا) ہوئیں۔ اس بیگم کا ۱۹۳۷ء میں کلکتے میں انتقال ہوگیا، تو آصف نے دوسری شادی کر لی۔ اتفاق سے اس بیگم کا نام بھی ہاجرہ خاتون ہی تھی، ان کا ۱۰ دسمبر ۱۹۷۶ء کو ڈھاکے میں انتقال ہوا؛ وہیں عظیم پور قبرستان میں مدفون ہیں۔ دوسری بیگم سے بھی چھ بچے ہوئے: چار لڑکے (بقاء الرحمٰن، ارشد الرحمٰن، احسن الرحمٰن، الرحمٰن) اور دو لڑکیاں (نسرین اور غزالہ پروین) ماشاءاللہ سب بچے برسرِ روزگار اور خوشحال ہیں؛ بعض ڈھاکے میں مقیم ہیں اور بعض کراچی میں

ر کے ساتھ صحت جواب دے گئی۔ اسی میں ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے رحلت کی۔ اپنی دوسری بیگم کے قریب عظیم پور قبرستان، ڈھاکہ میں دفن ہوئے۔ سید محمد حسن رضا دائروی (لائبریرین رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگلا دیش) نے تاریخ کہی:

بر فراق حضرتِ آصف مرا گفت شخصے "از جہاں مخدوم رفت"

با "دعا" گفتم، رضا! سالِ وصال "جانشینِ حشمتِ مرحوم رفت"

(۱۹۰۲ - ۱۹۷۷ء)

افسوس کہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ آج تک شائع نہیں ہوا۔ سخت پابند صوم و صلوٰۃ تھے؛ اپنے زہد و ورع کے لیے مشہور تھے۔ اسی عزلت گزینی اور استغنا کے باعث انھوں نے کبھی کلام کی اشاعت کی طرف بھی توجہ نہ کی۔

ابراہیم جلیس، ابراہیم حسین

ان کا خاندان دراصل ریاست حیدرآباد کے شہر عثمان آباد کا رہنے والا تھا۔ لیکن ابراہیم حسین اپنی ننھیال بنگلور میں ۱۱ اگست ۱۹۲۴ء کو پیدا ہوئے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کے فرد تھے۔ ان کے والد احمد حسین صاحب صحیح معنوں میں خود ساختہ آدمی تھے۔ ان کے والد محمد حسین (یعنی ابراہیم حسین کے دادا) عثمان آباد تحصیل میں معمولی مشاہرے پر اہلمد تھے۔ آمدنی اتنی نہیں تھی کہ وہ بچوں کو معقول تعلیم دلا سکتے۔ احمد حسین اور ان سے بڑے بھائی محمد اسحاق دونوں کے دل میں ولولہ تھا کہ کسی طرح تعلیم مزید حاصل کی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ عثمان آباد میں رہ کر یہ ارمان پورا نہیں ہونے کا۔ اس پر دونوں بھائیوں نے حیدرآباد کی راہ لی، اور محنت و مشقت سے تعلیم حاصل کی۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم کے دائمی اصول کے تحت، خدا نے بھی مدد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ کچھ قابل ہوئے، تو محمد اسحاق نے واپس آکر عثمان آباد میں وکالت شروع کر دی۔ احمد حسین شروع میں پیشکار ثانی مقرر ہوئے، اور رفتہ رفتہ ترقی کر کے تحصیلدار کے عہدے تک پہنچے۔ وہ

ماخذ: مجتبیٰ حسین (برادرِ مرحوم)؛ حیدرآباد کے ادیب (زینت ساجدہ)؛ جان پہچان (نریش کمار شاد)؛ روزنامہ سیاست، حیدرآباد۔

لمبے عرصے تک گلبرگہ میں تعینات رہے۔ ان کی اولاد میں ماشاءاللہ نو لڑکے اور ایک لڑکی ہوئی۔ سب سے بڑے بیٹے محبوب حسین جگر آج کل روزنامہ سیاست، حیدرآباد میں جائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ ان سے چھوٹے عابد حسین نے مہاراشٹر گورنمنٹ کے کوآپریٹو ڈپارٹمنٹ سے پنشن پائی ہے۔ اکلوتی بہن (صندلی بیگم) انھیں سے چھوٹی تھی؛ اس کا ۱۹۷۵ء میں انتقال ہوا۔ ابراہیم حسین بھائیوں میں تیسرے تھے۔ ایک بھائی یوسف حسین کراچی میں ملازم ہیں۔ اقبال حسین کا ۱۹۷۰ء میں انتقال ہوگیا۔ اردو کے مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین انھیں ابراہیم حسین مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں (ولادت: ۱۵ جولائی ۱۹۳۶ء)۔ ان سے چھوٹے تین بھائی اور ہیں: خورشید حسین، محمود حسین، سرتاج حسین۔

احمد حسین صاحب ۱۹۴۰ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد نواب ظلیانی کی جاگیر میں تعلقدار مقرر ہوگئے؛ تین سال بعد وہ واپس گلبرگہ چلے آئے۔ طویل عرصے تک گلبرگہ میں رہنے کے باعث وہ گویا وہیں کے باشندے ہوگئے تھے۔ انھوں نے وہاں خاصی جائداد پیدا کرلی اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہاں کی سکونت ترک نہیں کی۔ پھر ۱۹۴۶ء میں نہ جانے کیا خیال آیا کہ گلبرگہ کی ساری جائداد فروخت کرکے اپنی جنم بھومی عثمان آباد چلے گئے۔ زندگی کے بقیہ ایام وطن ہی میں گزارے۔ انھوں نے تقریباً سو برس کی عمر میں ۱۰ مئی ۱۹۷۳ء کو رحلت کی۔

احمد حسین مرحوم نے خود جس شوق اور محنت سے تعلیم حاصل کی تھی، اور اس کا جو شیریں پھل پایا تھا، اس نے انھیں اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی ترغیب دلائی۔ ان کا دوسرا اصرار یہ تھا کہ دوران تعلیم میں بچے اسکول یا کالج کی اقامت گاہوں (ہوسٹل) میں رہیں، تاکہ انھیں سوسائٹی میں رہنے کا سلیقہ آئے اور وہ اچھے شہری بن سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بچوں نے عام طور پر اقامت گاہوں میں رہ کر تعلیم حاصل کی۔ ابراہیم اپنے والد کے چہیتے تھے۔ والد چاہتے تھے کہ یہ ریاست کی سول سروس میں شامل ہوں۔ چنانچہ پہلے انھوں نے ۱۹۴۰ء میں گورنمنٹ انٹر کالج، گلبرگہ سے انٹر کی سند لی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ملک بھر میں شہرہ تھا۔ اس کے بعد والد نے انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا، جہاں سے یہ دو سال بعد ۱۹۴۲ء میں

بی اے پاس کر کے واپس آئے۔ اب یہاں انھوں نے وکالت (ایل ایل بی) میں داخلہ لے لیا، لیکن اسے مکمل نہ کر سکے۔

سب سے پہلی ملازمت سول سپلائی کے محکمے میں کی، جو اس زمانے میں کمرشل کارپوریشن کہلاتا تھا۔ لیکن یہاں انھوں نے سال بھر بھی نہیں گزارا، دس گیارہ مہینے ہی میں کسی دفتر چپقلش پر استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بنیادی طور پر ان کا مزاج ادبی تھا اور وہ نزاکت طبع کے باعث دفتری پابندیوں کی گوں کے آدمی نہیں تھے۔ اسی لیے جہاں کوئی معمولی سی بات بھی ناپسندِ خاطر ہوتی، وہ بھڑ جاتے اور سمجھوتا کرنے پہ تیار نہ ہو سکتے۔ وہ طالب علمی کے زمانے ہی میں مقامی اخباروں، رسالوں میں لکھنے اور ریڈیو پر تقریریں کرنے لگے تھے۔ لیکن انھیں عام شہرت ۱۹۴۱ء میں ملی، جب ان کا افسانہ "رشتہ" ساقی، دلی میں شائع ہوا، جس کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی تھے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۹۴۲ء میں ان کے دوست مسلم ضیائی نے اپنا اشاعتی ادارہ "اردو محل" قائم کیا۔ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں ابراہیم کے افسانوں کا مجموعہ "زرد چہرے" شائع کیا۔ اس سے ان کی افسانہ نویس اور طنز نگار کی حیثیت سے ملک گیر شہرت ہوئی۔ اس کے بعد تابڑتوڑ ان کی چار کتابیں شائع ہوئیں: چالیس کروڑ بھکاری (ناول)، تکونا دیس (افسانے)، چور بازار (ناول)، کچھ غم جاناں، کچھ غم دوراں (افسانے) ایک اور کتاب "بھوکا ہے بنگال" بھی تھی؛ اس میں دوسرے افسانہ نگاروں کی تخلیقات جمع کی تھیں۔

۱۹۴۴ء ہی میں وہ فلم کے میدان میں قسمت آزمائی کرنے کو بمبئی گئے۔ یہاں ان کے دوست عبدالحی ساحر لدھیانوی پہلے سے موجود تھے۔ قیام بمبئی کے زمانے میں ابراہیم انھیں کے ساتھ رہے۔ لیکن مزاج کے تلوّن نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، اور سال بھر بعد وہ حیدرآباد واپس آ گئے۔ یہاں ان دنوں ترقی پسند تحریک کا دور دورہ تھا، اور ہر طرف اس کے جلسے اور اجتماع ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ ۱۹۴۶ء میں اس تحریک سے وابستہ مصنفین کی کانفرنس کا کل ہند اجلاس حیدرآباد میں ہوا تھا، ابراہیم نے اسے کامیاب بنانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

۱۹۴۶ء میں ان کی گلبرگہ کے مشہور اور متمول تاجر جناب حاجی حیدر کی صاحبزادی کنیز فاطمہ سے شادی ہوئی۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی آئی اور ملک تقسیم ہوگیا۔ ابراہیم کی سیاسی۔۔۔ نے پھر کروٹ لی؛ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں وہ پاکستان چلے گئے۔ وہ اکیلے گئے تھے، بیوی بچے یہیں حیدرآباد میں رہے۔ اس سفر میں اور پاکستان پہنچنے کے بعد انھیں جن ٹکالیف کا سامنا کرنا پڑا، اس سے انھیں احساس ہوا کہ بہر زمین کہ رسیدیم، آسماں پیداست۔ ان کا رپورتاژ "دو ملک، ایک کہانی" اسی سفر کی داستان ہے، جو انھوں نے چند دن میں قلمبند کر دی تھی اور جو لاہور سے اوائل ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی۔

لاہور میں ان کی ملازمت کا آغاز بچوں کے رسالے "ساتھی" کے ادارۂ تحریر سے وابستگی سے ہوا۔ اس کے بعد وہ روزنامہ "امروز" میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے چلے گئے۔ ان ایام میں احمد ندیم قاسمی اور ابن انشا بھی اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔ امروز میں وہ دو برس تک رہے۔ انھیں ایام میں حکومت پاکستان نے پبلک سیفٹی ایکٹ نافذ کر دیا۔ ابراہیم جلیس نے اس پر ایک طنزیہ افسانہ لکھا: پبلک سیفٹی ریزر۔ فوجی حکمرانوں کی ادب و مزاح کی حس بہت کمزور ہوتی ہے۔ جلیس بیچارے کی طنز کی داد وہ کیا دیتے؛ اسی سیفٹی ایکٹ کے تحت انھیں گرفتار کر لیا؛ اور نہ مقدمہ، نہ صفائی کا موقع، بس جیل میں ٹھونس دیا۔ بارے، وہ زیادہ دن جیل میں نہیں رہے؛ بعض دوستوں کے بیچ بچاؤ کرنے پر تین چار مہینے بعد رہا ہو گئے۔ اسی نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے "جیل کے دن جیل کی راتیں" لکھی تھی۔

۱۹۵۰ء میں پاکستانی صحافیوں کا ایک وفد چین گیا تھا؛ میاں افتخار الدین (ف: جون ۱۹۶۲ء) اس کے قائد تھے۔ ابراہیم جلیس بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔ اسی سفر سے واپسی پر انھوں نے اپنی مشہور کتاب "دیوارِ چین کے سایے میں" شائع کی۔ لیکن اب ان کے پاس مستقل کام کوئی نہیں تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت افسانے اور طنزیہ مضامین لکھے اور اسی پہلو سے ان کی خاصی شہرت ہوئی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کے چھوٹے بھائی یوسف حسین بھی یہاں سے پاکستان چلے گئے؛ کراچی ہوائی اڈے پر کاؤنٹر میں ان کا تقرر

ہوگیا۔ ان کے اصرار پر جلیس بھی لاہور سے کراچی چلے گئے۔ ہاتھ کچھ کھلا تو دو سال بعد ۱۹۵۵ء میں جلیس کے بیوی بچے بھی کراچی پہنچ گئے۔

کراچی میں اولاً مدتوں ریڈیو اور ٹیلی ویژن معاش کا سہارا رہا۔ فلموں کے لیے مکالمے وغیرہ بھی لکھے ایک ڈراما "آنچل سے پہلے" بھی لکھا تھا؛ اس کی غالباً فلم بھی بنائی گئی تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب عارضی کام تھے اور اطمینان کا فقدان تھا۔ مجید لاہوری مشہور مزاح نگار روزنامہ "جنگ"، کراچی میں مزاحیہ کالم "وغیرہ وغیرہ" لکھا کرتے تھے۔ شوکت تھانوی (ف: مئی ۱۹۶۳ء) بھی اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ابراہیم جلیس کا ان دونوں کے وہاں جانا آنا تھا، بلکہ ان سے گہرے مراسم تھے۔ کارِ قضا ۲۶ جون ۱۹۵۷ء کو مجید لاہوری اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب اخبار کے اصحابِ حل و عقد کو ان کا فکاہیہ کالم جاری رکھنے کے لیے کسی موزوں شخص کی تلاش ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے قرعۂ فال ابراہیم جلیس کے نام پڑا، اور یہ "جنگ" کا کالم "وغیرہ وغیرہ" لکھنے پر مقرر ہو گئے۔ جن لوگوں کا خیال تھا کہ مجید لاہوری کے بعد ان کی روایت قائم رکھنا دشوار ہوگا، وہ بھی ابراہیم جلیس کے زورِ قلم اور شوخیِ تحریر کے قائل ہو گئے۔ اس سے نہ صرف پرچے کی مقبولیت میں کوئی فرق نہ آیا، بلکہ خود جلیس کی شہرت میں بھی چار چاند لگ گئے۔

جنگ کی ملازمت ترک کرنے کے بعد ان کی تین کتابیں شائع ہوئیں: (۱) "نیکی کر تھانے جا" اور (۲) "اوپر شیروانی اندر پریشانی"۔ یہ ان کے کالمی شذرات کے مجموعے ہیں۔ تیسری کتاب "شگفتہ شگفتہ" ہے، اس میں طنزیہ مضامین ہیں۔

روزنامہ "جنگ" سے الگ ہو کر وہ روزنامہ انجام، کراچی کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ یہاں بھی چندے بعد کسی بات پر اخبار کے مالکوں سے جھگڑا ہو گیا، اور انھوں نے حسبِ عادت استعفیٰ داغ دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنا ذاتی ہفتہ وار "عوامی عدالت" جاری کیا۔ لیکن ایک تو روپے کی کمی، دوسرے انتظامی صلاحیت کا فقدان، اس پرچے سے انھیں کوئی مالی یافت ہوئی نہ ذہنی سکون۔ اس کے باوجود انھوں نے اسے لشتم پشتم چار سال تک چلایا اور بالآخر مجبوراً بند کرنا پڑا۔ نومبر ۱۹۷۶ء میں وہ حکمران "پاکستان پیپلز پارٹی" کے

نفیس نالطقر روزنامہ "مساوات" کے مدیر اعلیٰ بنادیے گئے۔ لیکن یہ عروج دولت مستعجل ثابت ہوا۔ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو حکومت کا تختہ الٹ گیا، اور ملک میں مارشل لا (جرنیلی تماشا) نافذ ہوگیا۔ "مساوات" بھی اسی کا شکار ہوا اور اس کی اشاعت بند کردی گئی۔ جب پابندی رفع ہوئی، تو مطبع نے جس میں یہ اخبار چھپتا تھا، اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ نفیس نے اصحاب مجاز سے رجوع کیا کہ اخبار کو کسی دوسرے مطبع میں چھاپنے کی اجازت دی جائے۔ انھیں زیادہ فکران سیکڑوں ملازموں کی تھی، جو اخبار کے بند ہو جانے سے بیروزگاری کا شکار ہو گئے تھے، اور قدرتاً بےحد پریشان تھے۔ جلیس جا کے خود متعلقہ افسروں سے ملے اور انھیں قائل معقول کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کی یہ مساعی بارآور ثابت نہ ہوئیں۔ حکام نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ جلیس دل کے عارضے کے مریض تھے، وہ اس لیت ولعل کی تاب نہ لاسکے۔ گھر پہنچے اور اچانک بیمار ہوگئے۔ صورتِ حال کی نزاکت کے پیشِ نظر انھیں فوراً جناح اسپتال میں داخل کیا گیا، جہاں اگلے دن بدھ وار ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۷ء علی الصبح چار بجے دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ جنازہ جمعرات ۲۷ اکتوبر (۱۹۷۷ء) کی سہ پہر میں اٹھا، اور انھیں کراچی کے قبرستان "گلشنِ اقبال" میں دفن کر دیا گیا۔

رئیس امروہوی نے ہجری میں تاریخ کہی:

ہمنشیں مجلسِ صحافت کا — آج یارانِ محفل کا ہے جلیس
وہ ادیب و صحافی وطنا ز — بہ طرازِ جمیل و طرزِ نفیس
اس کی تقریر دلکش و سادہ — اس کی تحریر، دلنشین و سلیس
مل کے اہلِ قلم و داع کریں — "آج رخصت جلیس" کی ہے، رئیس!
(۱۳۹۷ھ)

جسمانی اولاد میں آٹھ بچے اپنی یادگار چھوڑے: تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے۔

بسمل سندیلوی، امیر حسین، چودھری

لکھنؤ سے ۴۵ کیلومیٹر کی دوری پر یوپی کے ضلع ہردوئی میں قصبہ سندیلہ بہت قدیم ہے، اور اپنی بعض خصوصیات کے باعث اہم بھی۔ یہاں کی خاک سے کئی اصحابِ علم و فضل اٹھے۔ بسمل یہیں محلہ چودھرانہ میں ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب سید تاج الدین فاریابی سے ملتا ہے، جو اپنے وطن فاریاب سے نقل مکان کر کے ہندوستان آئے اور سندیلہ میں مقیم ہو گئے۔

بسمل کے والد چودھری علی حسن اور دادا چودھری حسن رضا کا بڑے زمینداروں اور قصبے کے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کے نانا چودھری علی رضا ان کے دادا کے برادرِ خورد تھے۔ غرض دادھیال اور ننھیال، دونوں طرف عزت و آبرو کا ماحول تھا، بلکہ روپے کی فراوانی تھی۔ جب تعلیم کا زمانہ آیا، تو فارسی پڑھانے کا نجی انتظام کیا گیا۔ چند برس بعد مقامی اسکول میں بھیج دیے گئے۔ لیکن یہاں لاڈ چاؤ تعلیمی ترقی میں روک ثابت ہوا۔ اس زمانے میں بالعموم رؤسا بھی بچوں کی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے؛ ان کے خیال میں یہ ان کی شان سے فروتر بات تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر حسن آٹھویں درجے سے آگے نہ بڑھ سکے۔

جب سنِ شعور کو پہنچے، تو خاندانی اثر ورسوخ سے کورٹ آف وارڈس کے محکمے میں معقول ملازمت مل گئی۔ لیکن رئیسانہ ماحول کا پلا ہوا نوجوان نوکری کی کھکھیڑ برداشت نہ کر سکا۔ جلد ہی مستعفی ہو کر گھر چلے آئے۔ اس کے بعد کہیں ملازمت نہیں کی۔ گھر کی زمینداری کی دیکھ بھال میں وقت گزرا۔ لیکن یہ زمینداری بھی جلد ختم ہو گئی۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ جہاں دن عید، رات شب برات کا سماں تھا، وہاں بحد تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ بارے، یوپی کی حکومت نے ساٹھ روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا، جس سے کچھ اشک شوئی کا انتظام ہو گیا۔

ماخذ: چودھری محمد نعیم ایم اے، سندیلہ؛ تذکرۂ مشاہیر سندیلہ (از چودھری نبی احمد، مرتبہ نورالحسن ہاشمی)

وفیات

اس زمانے میں روٴسا کے گھرانوں میں بچوں کی شادی جلد کر دینے کا رواج عام تھا۔ امیر حسن بھی بمشکل نوجوانی کی حد سے متجاوز ہوئے تھے کہ ۱۹۱۲ء میں قصبہ دیوہا کے ملک کرم حسین کی پوتی سے شادی ہو گئی۔ اس کا نتیجہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھے۔ خدا کی شان، دونوں بچے یکے بعد دیگرے ماں کی گود خالی کر گئے۔ غریب ماں کے لیے یہ صدمہ جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ روز بروز گھلنے لگی اور بالآخر تپ دق میں مبتلا ہو گئی اور اسی میں جنت سدھاری۔ امیر حسن ان پے در پے صدمات سے بوکھلا اٹھے اور اندوہ و غم کا شکار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ گھر والوں نے بہت چاہا کہ ان کا دوسرا نکاح کر دیا جائے تاکہ ان کا غم غلط ہو سکے لیکن امیر حسن اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ بالآخر بزرگوں کے متواتر اصرار اور سمجھانے بجھانے سے دس برس بعد ۱۹۲۳ء میں دوسری شادی پر رضامند ہوئے۔ دوسری بیوی سندیلہ ہی کے اشراف محلہ کے چودھری کلو کی پوتی تھیں۔ چودھری کلو متمول اور صاحب حیثیت آدمی تھے۔ وہ یہاں چکلے دار تھے۔ ان کا شاہی تعزیہ، مسجد، امام چوک اور بارہ دری، مقبرہ وغیرہ آج بھی یادگار ہیں۔ امیر حسن صاحب کے اس بیگم سے ایک بیٹے (چودھری) محمد نصیر ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کی سند حاصل کی۔ آج کل روزنامہ قومی آواز کے چیف رپورٹر کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں؛ نصیر تخلص کرتے ہیں۔

امیر حسن کو شعر گوئی کا شوق ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوا۔ دراصل یہ مختلف اہلِ ذوق اصحاب کی صحبت کا نتیجہ تھا۔ ان کا بچپن اور یہ عنفوانِ شباب کا کافی زمانہ لکھنؤ میں بسر ہوا۔ یہاں انھیں اپنے خاندانی تعلقات کے باعث اس عہد کے بعض مشاہیر مثلاً سراج لکھنوی، شمس لکھنوی، منظر لکھنوی، قدیر لکھنوی، حسرت لکھنوی وغیرہ سے ملنے کے مواقع ملے ناممکن تھا کہ اتنے سارے قادر الکلام شعرا سے دن رات کا اٹھنا بیٹھنا اپنا رنگ نہ دکھاتا۔ امیر حسن بھی شعر کہنے لگے۔ سب سے پہلے مشورے کے لیے ان کی نظر اپنے ہم وطن میر منصب علی ہنر سندیلوی (شاگرد آفتاب الدولہ قلق لکھنوی) پر پڑی۔

میر منصب علی ہنر اپنے عہد کے مشہور اور مشاق شاعر تھے۔ وہ اردو ہی میں نہیں، فارسی میں بھی کہتے تھے، اردو اس میں کاظم علی سندیلوی کے شاگرد تھے۔ سول کورٹ ہردوئی سے پنشن پائی، جہاں وہ سررشتہ دار کے عہدے پر فائز تھے۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن میں مقیم ہو گئے۔ سندیلہ کے رئیس سید التفات رسول ہاشمی تعلقدار سخنور اور سخن شناس بزرگ تھے۔ وہ اپنی عمر بھر شعر و سخن کے سرپرست رہے۔ ان کے منعقدہ سالانہ مشاعرے بڑی دھوم دھام سے ہوتے تھے۔ ان میں دور دور سے اساتذۂ سخن بلائے جاتے تھے۔ ان مشاعروں کا اہتمام و انصرام میر منصب علی ہی کیا کرتے تھے۔ افسوس، ان کا دیوان آج تک شائع نہیں ہوا۔ بعمر ۸۴ سال ۲ ستمبر ۱۹۱۹ء کو انتقال ہوا۔
سید التفات رسول ہاشمی کے ۱۹۱۱ء کے مشاعرے میں سید انور حسین آرزو لکھنوی بھی مدعو تھے۔ ہاشمی کو ان

کا کلام کچھ ایسا پسند آیا کہ انھوں نے آرزو مرحوم (ف : اپریل ۱۹۵۱ء) سے سندیلہ میں قیام کرنے کی درخواست کی اور ان سے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ آرزو صاحب ہاشمی کی وفات یعنی ۱۹۲۱ء تک سندیلہ میں مقیم رہے۔ ہنر کی وفات کے بعد بسمل بھی آرزو سے مشورہ کرنے لگے اور جب آرزو واپس لکھنؤ چلے گئے، تو بسمل وہاں بھی ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے تاآں کہ آرزو بعض فلم سازوں کی دعوت پر اوّل کلکتے اور پھر وہاں سے بمبئی تشریف لے گئے۔ استاد نے اس سے پہلے ہی بسمل کو فارغ الاصلاح قرار دے دیا تھا۔

بسمل نے اگرچہ جملہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن ان کا اصلی میدان غزل تھا۔ ۱۹۶۴ء میں ان کے کلام کا مختصر انتخاب "فکر و نظر" کے عنوان سے لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بہت کلام غیر مطبوعہ رہ گیا۔ اس سلسلے میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ شانتارام کی مشہور فلم "صبح کا تارا" کی مرکزی غزل، جس کا مطلع درج ذیل ہے، بسمل ہی کی لکھی ہوئی ہے۔

ذرا، او جانے والے رخ سے آنچل کو ہٹا دینا
تجھے اپنی جوانی کی قسم، صورت دکھا دینا

یہ غزل بسمل نے اپنے محبوب کی بیوقت وفات پر کہی تھی۔ مرحوم کہتے تھے کہ فلم ساز نے نہ غزل کے استعمال کی ان سے اجازت لی تھی، نہ انھیں کوئی معاوضہ دیا تھا۔

مرورِ زمانہ اور کبر سنی کے ساتھ صحت خراب رہنے لگی تھی۔ رہی سہی کسر چچازاد بھائی چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی کی وفات (۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء) نے پوری کر دی۔ بسمل کو نشتر سے محبت نہیں عشق تھا! ان کی وفات نے بسمل کی دنیا تاریک کر دی۔ پھر اچانک حبسِ بول کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ ان کے صاحبزادے محمد نصیر انھیں لکھنؤ لے گئے۔ مثانہ میں پتھری تشخیص ہوئی۔ طوعاً و کرہاً عمل جراحی پر راضی ہو گئے۔ آپریشن کامیاب رہا۔ لیکن نقاہت اس بلا کی ہو گئی کہ اس کے بعد مستقلاً بالکل بستر سے لگ گئے۔ اسی حالت میں ہفتہ ۱۷ دسمبر ۷۷ء کی سہ پہر میں چار بجے سندیلہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اور اسی دن بعدِ مغرب اپنے آبائی قبرستان (نزد آئی۔ آر کالج) سپردِ خاک کر دیے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

تحریر

علمی مجلس دِلّی کا تماہی رسالہ

۴۴

مرتب : مالک رام

جلد ۱۲ | اپریل/جون ۱۹۷۸ء | شمارہ ۲

چندہ سالانہ — ہندستان : پندرہ روپے — فی شمارہ پانچ روپے
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ۸ ڈالر (امریکی)

پرنٹر و پبلشر ظلّ عبّاس عبّاسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلی میں چھپوا کر علمی مجلس، ۲۹۴۲ اچھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلّی ۶ سے شائع کیا۔

ملاحظات

۱۹۷۸ء کا دوسرا شمارہ (۴۴) حاضرِ خدمت ہے۔ بہت کرم ہو، اگر احباب اپنا سالِ رواں کا چندہ جلد عنایت فرمادیں۔

اگلا شمارہ (۴۵) خاص نمبر ہوگا؛ اور یہ انشاء اللہ اگست میں شائع ہو جائیگا۔

مالک رام

مشفق خواجہ

پروانہ کے دو مخطوطات

[مشفق خواجہ اردو کے مشہور محقق ہیں۔ انھوں نے ایک بڑا منصوبہ اپنے ہاتھ میں لیا ہے، جس کی تفصیل انھوں نے مجھے یوں لکھی ہے :

ایک عرصے سے میرا خیال تھا کہ اردو کے مخطوطات کی ایک ایسی وضاحتی فہرست ہونی چاہیے، جس میں ہر طرح کا سوانحی و کتابیاتی مواد موجود ہو، تاکہ اردو ادب پر کام کرنے والوں کو کنواں کھودنے کی مشقت سے بچایا جا سکے۔ اس سے آپ کام کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ کام صرف پاکستان کے اردو مخطوطات تک محدود ہے، لیکن ضمنی طور پر دنیا بھر کے مخطوطات کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ مثلاً کلیات ناسخ پر جو نوٹ میں نے لکھا ہے، اس میں ڈیڑھ سو سے زائد قلمی نسخوں کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ پہلی جلد ۱۹۷۶ء کے آخر میں پریس چلی گئی تھی لیکن ناشر کے حسنِ التفات کی وجہ سے ابھی تک پریس میں ہے۔ توقع ہے کہ یہ جلد آیندہ تین ماہ تک طبع ہو جائے گی۔ یہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں دو سو مخطوطات پر توضیحی حواشی ہیں اور آٹھ سو مخطوطات کے بارے میں ضمنی طور پر اطلاعات فراہم کی گئی ہیں۔ دوسری اور تیسری جلدیں میں مکمل کر چکا ہوں، چوتھی پر کام کر رہا ہوں۔ یہ منصوبہ ہزار ہزار صفحے کی دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ گیارھویں جلد اشاریے کی ہوگی۔ اس کام کے

دوران بہت سے نادر نسخے نظر سے گزرے ہیں۔ یہ منصوبہ میرا ذاتی ہے۔ کسی ادارے کا کسی قسم کا کوئی تعاون حاصل نہیں ہے۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور اس کا ناشر ہے۔ میں نے جو نمونے کے دو نوٹ بھیجے ہیں، اگر آپ چاہیں تو انھیں اپنے ہاں کسی رسالے میں چھپوا دیں تاکہ اردو والوں کو اس کام کی اطلاع ہو جائے۔

وضاحتی فہرست کے یہ دونوں اقتباسات تحریر کے قارئین کے لیے پیش کیے جا رہے ہیں۔

[گیان چند]

۷۸۔ کلیات پروانہ

جسونت سنگھ پروانہ

کتب خانہ: انجمن ترقی اردو، کراچی۔ نمبر: قا ۳/۱۰۸۔ سائز: ۲۴ ۱/۸ × سوم۔ اوراق: ۲۳۳۔ سطور: ۱۱۔

کاتب: نام درج نہیں۔ لیکن بعض حصے خود مصنف کے قلم سے ہیں، جن کی تفصیل آگے آتی ہیں۔

سالِ کتابت: اس میں پروانہ کے پسر کوچک کا قطعۂ تاریخ وفات ۱۲۲۵ھ شامل ہے۔ اس لیے کتابت کا زمانہ ۱۲۲۵ھ سے ۱۲۰۹ھ (سالِ وفاتِ پروانہ) متعین کیا جا سکتا ہے۔

خط: نستعلیق اوسط۔ مصنف کے اضافے خطِ شکستہ میں ہیں۔

مہریں: شرف الدین احمد خاں کی ۱۲۴۳ھ کی مہر ورق ۱۔الف پر۔ بے اقتدار الدولہ محتشم الملک مہدی علی خاں بہادر ضیغم جنگ کی ۱۲۶۶ھ کی مہر ورق ۱۔الف، ۶۔الف اور ۴۴۔الف پر ہے۔

کیفیت :

مخطوطہ اچھی حالت میں ہے۔ ماضی قریب میں اس کی جلد بندی ہوئی ہے۔ تمام اوراق کے گرد نئے کاغذ کا حاشیہ لگایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلد بندی سے پہلے یہ نسخہ خاصی خستہ حالت میں تھا۔ تاہم بعض اوراق اب بھی دریدہ اور آب رسیدہ ہیں، جس کی وجہ سے بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے۔ ہر صفحے پر نیلی اور سرخ جدولیں ہیں۔ آمنے سامنے لکھے ہوئے مصرعوں کی درمیانی جگہ اور ہر صفحے پر اوپر سے نیچے دو طرفہ سرخ لکیریں ہیں۔ غزلوں کے مقطعے، جن کے مصرع صفحے کے درمیان اوپر نیچے لکھے گئے ہیں، دو سرخ لکیروں کے درمیان ہیں۔ تخلص اور عنوانات سرخ روشنائی سے ہیں۔ کاغذ باریک، چکنا اور زردی مائل ہے۔

آغاز :

میں نے کل عرض یہ کی پیرِ خرد سے جا کر ۔۔۔ کہ غم و درد سے اب تنگ ہے عرصہ دل پر
[ناخوانا] ... موے میاں کے ہم دست ۔۔۔ زلف معشوق ۔۔ (ناخوانا) ... حال ابتر
اخگرِ سرخ ہے ہر قطرۂ خونناب سرشک ۔۔۔ سینۂ تفتہ دہکتا ہے برنگِ مجمر
بادِ جاراں سے نہ ہو نفع، جو بے موسم ہو ۔۔۔ شود یوں گریہ و نالے سے نہیں غیرِ ضرر
روزِ روشن ہے شبِ مرگ کی مانند سیاہ ۔۔۔ شامِ غم دیکھیے، تو وہ بھی ہے صبحِ محشر

اختتام :

ناز کے وقت دیکھ کر غمزے ۔۔۔ لاکھوں کرنے لگی نئے نخرے
گر لگوں اور عیب بتلانے ۔۔۔ جی نکلیگا ہر اک کا منانے
اس سے کرتا ہوں ہجو اب موقوف ۔۔۔ جوڑے کا جوڑا ہے غرض معروف
جی جلایا تھا اس نے 'پروانہ'! ۔۔۔ تب یہ لکھا گیا ہے افسانہ
یہ زباں نے کیا ہے سب مذکور ۔۔۔ ہجو یہ ہاتھ سے ہے اب مسطور

مندرجات: قصاید ورق ۱۔ب تا ۴۲ب (ورق ۱۔الف سادہ ہے)

غزلیات ورق ۴۴- ب تا ۲۱۹ - ب (ورق ۴۴- الف سادہ ہے)

قطعاتِ تاریخ ورق ۲۲۰- الف و ب

رباعیات ورق ۲۲۱- الف تا ۲۲۵- ب

ہجویات ورق ۲۲۶- الف تا ۲۳۲- ب

قصیدے تعداد میں دس ہیں جو حضرت علی، امام مہدی، اور آصف الدولہ وغیرہ کی مدح میں ہیں۔ غزلیات تعداد میں ۳۲۱ ہیں۔ قطعاتِ تاریخ تین ہیں جو پروانہ کے والد مہاراجہ بینی بہادر (۱۲۱۰ھ) پروانہ کے ایک بچے (۱۲۲۵ھ) اور جرأت (۱۲۲۴ھ) کی وفات پر لکھے گئے ہیں۔ ۱۳ رباعیاں ہیں۔ مثنویات دو ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "ہجو مسمّٰی بطائر نامہ حسب الفرمایش در بنارس گفتہ" اور دوسری ہجو کوڑا مل نامی ایک شخص اور اس کی بیوی کی ہے۔ اسی ہجو کے آخری اشعار اوپر اختتام کی مثال کے طور پر درج کیے گئے ہیں۔

خصوصیات:

یہ مصنّف کا ذاتی نسخہ ہے۔ اس میں نہ صرف جابجا اصلاحیں پائی جاتی ہیں، بلکہ تمام اصنافِ سخن میں اضافے بھی ہیں، جو مصنّف کے قلم سے ہیں۔ یہ نسخہ مصنّف نے اس انداز سے کتابت کرایا تھا، کہ ہر صنفِ سخن کے چند صفحات خالی چھوڑ دیے گئے تھے؛ نیز ہر ردیف کی غزلیات کے آخر میں بھی یہی اہتمام کیا گیا تھا۔ مصنّف نے اس پر نظرِ ثانی کی۔ بہت سے اشعار حذف کر دیے، بہت سے اضافے کیے اور بہت سوں میں ترمیم کی۔ یہ اضافے عام طور پر حاشیے میں ہیں، لیکن اس مخطوطے کی کتابت کے بعد جو کلام تصنیف ہوا تھا، اسے مصنّف نے سادہ اوراق پر لکھا ہے جو اسی مقصد کے لیے خالی رکھے گئے تھے۔ اصلاحوں اور ان آخرالذکر اضافوں کا قلم ایک ہی ہے، لہٰذا یہ یقینی ہے کہ اصلاحیں اور اضافے خود مصنّف کے قلم سے ہیں۔ اگر اس مخطوطے میں صرف اصلاحیں ہوتیں تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ یہ اصلاحیں خود مصنّف کے قلم سے ہیں، یا اس کے استاد مصحفی کے قلم سے

کیوں کہ ہمارے پاس پروانہ یا مصحفی کے خط کا کوئی نمونہ نہیں ہے۔ اس مخطوطے میں اصلاحوں کی نوعیت ذیل کی چند مثالوں سے واضح ہوگی:

اصلی مصرع : اخگرِ سرخ ہے ہر پارہ دلِ سوزاں کا
اصلاح : اخگرِ سرخ ہے ہر قطرۂ خونناب سرشک
اصل : خوانِ سیمینِ سحر کا ہے پُرانہ خاکستر
اصلاح : طاسِ سیمینِ سحر میں ہے بھری خاکستر
اصل : جامِ جمشید کو کرتا ہے گدا کا کچکول
سنگِ ماتم سے سدا عیش کا توڑے ساغر
اصلاح : تاجِ ادہم کو بناتا ہے گدا کا کچکول
سنگِ ماتم سے یہ جمشید کا توڑے ساغر
اصل : جوں خطِ موج ہو پھر بحرِ جہاں سے زائل
اصلاح : خطِ امواج سے ہو ... جہاں سے زائل

چند اصلاحیں مخطوطے کے پہلے ورقوں سے لی گئی ہیں۔ مخطوطے کا کوئی ورق ایسا نہیں جس ... قسم کے اصلاحیں موجود نہ ہوں۔ اور بعض مقامات پر تو ... توں میں بھی ترمیم کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجموعۂ کلام اکثر مصنف کے زیرِ نظر رہا تھا اور وہ اسے بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ اضافوں کی صورت یہ ہے کہ نواں قصیدہ جو کسی امیر کی مدح میں ہے، اور دسواں جو حضرت علی کی مدح میں ہے، بعد میں اضافہ کیے گئے ہیں۔ یہ اصلی کاتب کے قلم سے نہیں، بلکہ اس قلم سے ہیں جس میں اصلاحیں ملتی ہیں۔ اسی طرح متعدد غزلیں بھی اضافہ کی گئی ہیں، مثلاً ردیف ی کی غزلوں کے آخر میں تیرہ غزلیں مصنف کے قلم سے ہیں۔ ہجویات میں سے دوسری بھی بعد کا اضافہ ہے۔

دیگر نسخے :

۔ نسخۂ کلکتہ: یہ نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ کی لائبریری میں ہے۔

لائبریری نمبر ۶۲/۱ جیسا کہ اس کے ورق ۱۔ب پر درج ہے، یہ نسخہ فورٹ ولیم کالج کی ملکیت تھا۔ وہاں سے ایشیاٹک سوسائٹی کی لائبریری میں پہنچا۔ سائز نسخۂ انجمن ترقی اردو، کراچی کے مطابق ہے۔ اوراق ۱۵۲۔ فی صفحہ ۱۳ سطریں۔ اس کے مندرجات کی تفصیل یہ ہے:

فوائد : ورق ۱۔ب تا ۲۸۔الف

غزلیات : ورق ۲۹۔ب تا ۱۴۷۔الف

مطلع ہائے متفرقہ : ورق ۱۴۷۔الف تا ۱۵۱۔ب

ہجو مسمی بطائرنامہ : ورق ۱۴۸۔الف تا ۱۵۲۔الف

رباعیات : ۱۵۲۔الف تا ۱۵۳۔الف

ترقیمہ : "تمام شد۔ ختم گردید دیوان پروانہ بروز سہ شنبہ بتاریخ بستم اپریل ۱۸۱۲ عیسوی مطابق ہیزدہم ربیع الثانی ۱۲۲۸ ہجری بخط ناچیز جھمن لال کایستھ ساکن بلدۂ لکھنؤ بپیرایۂ تمام یافت۔"

اس نسخے میں جو کلام شامل ہے، وہ نسخۂ انجمن ترقی اردو، کراچی کے غیر اصلاحی متن کے مطابق ہے۔ نیز اس میں وہ تمام کلام بھی نہیں ہے، جو مصنف نے نسخۂ کراچی میں اضافہ کیا ہے۔۲ اس سے یہ نتیجہ نکالنا بیجا نہ ہوگا کہ پروانہ نے جب اپنا دیوان ۱۲۱۸ھ کے لگ بھگ مرتب کیا، تو اس کی ایک نقل اور بھی تیار ہوئی۔ یہ نقل وہ ہے جس کا ذکر "شاہانِ اودھ" میں ملتا ہے۔ (اس کی تفصیل سطورِ ذیل میں آئیگی) کیوں کہ اس میں بھی ہر صنف کے کلام کے بعد سادہ صفحات ملتے ہیں۔ گر

۱۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی فہرست میں اس کا اندراج نمبر ۵۳ پر ہے۔ راقم الحروف کے پیش نظر اس نسخے کا مائیکروفلم ہے۔

۲۔ نسخۂ کلکتہ میں جو متفرق مطلعے ہیں، وہ نسخۂ کراچی میں نہیں ملتے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، نسخۂ کراچی پہلے خراب حالت میں تھا، ماضی قریب میں اس کی جلد سازی ہوئی۔ ممکن ہے جلد سازی کے دوران میں اس سے پہلے متفرق مطلعوں والا ورق ضائع ہو گیا ہو۔

غالب ہے کہ ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کا نسخہ شاہانِ اودھ کے نسخے کی نقل ہے۔

۲۔ نسخۂ لکھنؤ :۔ شاہانِ اودھ کے کتب خانوں میں بھی دیوانِ پروانہ کا ایک نسخہ تھا۔ اشپرنگر نے اس کے متعلق یہ اطلاعات فراہم کی ہیں :

> اس میں صرف غزلیات ہیں، ابجد ردیف وار مرتب کی گئی ہیں
>
> آغاز : میں نے کل عرض یہ کی پیرِ خرد میں جا کر
>
> کہ غم و درد سے اب تنگ ہے عرصۂ دل پر
>
> ... صفحات تقریباً ۵۰۰۔ ۱۳ سطور فی صفحہ۔ کتابت عمدہ۔ ہر ردیف کی غزلوں کے آخر میں ایک یا دو صفحے سادہ چھوڑے گئے ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ مصنف نے خود یا اس کے لیے لکھا گیا ہوگا۔" (شاہانِ اودھ، فہرست نمبر ۶۸۹، ص ۶۳۱)

اشپرنگر کا یہ بیان درست نہیں ہے کہ اس مخطوطے میں صرف غزلیات ہیں۔ اوپر آغاز کی مثال میں جو شعر دیا گیا ہے وہ ایک طویل قصیدے کا پہلا شعر ہے جو حضرت علی کی مدح میں ہے۔ اشپرنگر نے مخطوطے کے صفحات کی جو تعداد بتائی ہے اس کے پیشِ نظر یقین ہے کہ اس میں دیگر اصناف بھی ہوں گی۔

۳۔ انتخابِ غزلیاتِ پروانہ :۔ تفصیل کے لیے رک: مخطوطہ نمبر ۶۹ ج ۲

مصنف :

پروانہ، شجاع الدولہ کے مدار المہام راجہ بینی بہادر کا بیٹا تھا۔ ولادت لکھنؤ میں ۱۱۷۴ھ ۱۷۶۱۔۱۷۶۰ء کے لگ بھگ ہوئی۔ پروانہ کی تعلیم عمدہ طریقے سے ہوئی تھی اور اس نے چھوٹی سی عمر میں بقولِ مصحفی، اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی سو پروانہ نے

۳۔ پروانہ کے ایک دیوان کا ذکر کریم الدین نے بھی کیا ہے: "اس کا ایک دیوان شاہ عالم ثانی کے چوبیسویں سال جلوس میں یعنی ۱۷۸۵ء میں لکھنؤ میں تھا۔" (شعرائے ہند: ۲۸۹)۔ کریم الدین کا ماخذ گارسین دتاسی کی "تاریخ" ہے۔ گارسین دتاسی نے علی ابراہیم خلیل کی تقلید میں لکھا ہے کہ پروانہ شاہ عالم ثانی کے ۲۴ ویں سال جلوس میں لکھنؤ میں تھے (۲: ۲۹۳) کریم الدین نے یہی بات پروانہ کی بجائے اس کے دیوان کے بارے میں لکھ دی ہے۔

کلیات پروانہ

ابتدا فارسی گوئی سے کی اور سرب سکھ دیوانہ کی شاگردی اختیار کی۔ دیوان فارسی اب نایاب ہے۔ تذکروں میں فارسی کے چند اشعار ملتے ہیں۔ ۱۱۹۷ھ کے لگ بھگ پروانہ نے اردو گوئی کی طرف توجہ کی اور مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ پروانہ نے "حملۂ حیدری" کو اردو میں نظم کیا تھا۔ لیکن یہ مثنوی بھی دیوان فارسی کی طرح ناپید ہے۔ پروانہ کا انتقال ۱۲۲۸ھ [۱۸۱۳ء] میں ہوا۔ دیوان ناسخ (مکمل حوالہ ذیل میں) میں قطعۂ تاریخِ وفات موجود ہے (ماخوذ از مقالہ "جسونت سنگھ پروانہ" از راقم الحروف، مکمل حوالہ ذیل میں)

[ماخذ: (۱) گلزار: ۵۱ (۲) گلشن سخن: ۷۰ (۳) عقد: ۱۵ (۴) ہندی: ۴۲ (۵) دستور: ۱۱۰ (۶) عیار: ۹۸ (۷) حیدری، ۴۳ (۸) عشقی، ج دوم (ضمیمہ): ۱۳ (۹) عمدہ: ۱۵۴ (۱۰) مجمع: ۶۹ (۱۱) مجموعہ، اول: ۱۴۳ (۱۲) دیوان: ۵۳ (۱۳) آزردہ: ۳۸ (۱۴) مرقع: ۱۰ (۱۵) بیجگر: در ردیف پ (۱۶) گلشن: ۳۲ (۱۷) گارسین دتاسی ۳/۲: ۲۹۲ (۱۸) بہار: ۸۳ (۱۹) گلستان: ۴۸ (۲۰) خوش معرکہ ۱: ۹۲ (۲۱) شعرائے ہند: ۱۴۷ (۲۲) سراپا: ۱۲۷ (۲۳) یادگار: ۴۶ (۲۴) قطعہ ۱: ۷ (۲۵) سخن: ۸۷ (۲۶) شمیم ۱: ۱۰۴ (۲۷) دلکشا ۱: ۵۸ (۲۸) روز: ۳۸ (۲۹) شعرائے ہنود ۲: ۲۸ (۳۰) خم خانہ ۲: ۶ (۳۱) بہار سخن: ۸۹ (۳۲) ہندو شعرا: ۲۶ (۳۳) ہندو ادیب: ۳۵ (۳۴) دیوان ناسخ (دوم)، نول کشور لکھنؤ ۱۸۹۳ء: ۲۱۸ (۳۵) شاہانِ اودھ: ۶۳۱ (۳۶) بیل: ۲۱۶ (۳۷) قاموس ۱: ۱۵۱ (۳۸) لکھنؤ: ۲۳۸ (۳۹) میر حسن: ۳۲۱ (۴۰) تلامذۂ میر: ۲۴ (۴۱) "اردو ادب" علی گڑھ، جون ۱۹۵۶ء (مقالہ: مصحفی اور ان کے تلامذہ از نسیم احمد فریدی) (۴۲) "معاصر" پٹنہ، شمارہ (۲) (مقالہ: تعیین زمانہ از قاضی عبدالودود) (۴۳) دلی کالج میگزین، میر نمبر ۱۹۶۲ء

ص ۹۴ - ۹۷ (۴۴) ، نگار پاکستان، کراچی، شمارۂ اول، ۱۹۷۵ء، ۱۹۷۶ء (مقالہ: جسونت سنگھ پروانہ، از مشفق خواجہ)]

۶۹- انتخاب غزلیات پروانہ

جسونت سنگھ پروانہ

کتب خانہ : ڈاکٹر قاضی فضل عظیم ۱۲۱-۱۲۳/ سی-۵، ناظم آباد، کراچی

سائز : ۲۳×۱۵ س م- اوراق : ۸

سالِ کتابت : ۱۲۲۴ھ (سالِ وفات جرأت) اور ۱۲۲۸ھ (سالِ وفات پروانہ) کے مابین۔ ترقیمے سے مترشح ہے کہ مخطوطہ پروانہ کی زندگی میں لکھا گیا تھا

خط : نستعلیق، شکستہ مائل۔

کیفیت : مخطوطہ مجلد اچھی حالت میں ہے۔ جلد ساز کی غلطی سے ورق ۳ اور ۴ کے درمیان ورق ۵ لگ گیا ہے۔ تمام مقطعوں میں تخلص کی جگہ خالی ہے

کاغذ دبیز، مٹیالا۔

آغاز :

جس باغ میں ہو سروِ گل اندام ہمارا — اے پیکِ صبا! کہیو تو پیغام ہمارا
اپنی ہی ہمیں آٹھ پہر یاد ہے ... تو — یعنی کہ وہ محبوب ہے ہمنام ہمارا
جو دیکھے ہے ... کتابی سو پڑھے ہے — آغازِ خطِ سبز سے انجام ہمارا
جس مشرقِ کوچے سے نکلتا ہے وہ خورشید — واں نت ہے گزر صبح سے تا شام ہمارا
اب نیند کہاں آنکھوں میں آتی ہے کہ ہمدم — سب ساتھ گیا یار کے آرام ہمارا
کیفیتِ چشم اس کی سمائی رہی دل میں — خالی نہ رہا مے سے کبھو جام ہمارا

اختتام : [قطعۂ تاریخِ وفاتِ جرأت]

جو کہ کرتا ہے فکرِ شعر و سخن — اس زمانے میں وہ غنیمت ہے
کہ نہ اگلے سے لوگ ہیں باقی — نہ وہ مجلس ہے اور نہ صحبت ہے

اک سخنگو کہ تھا قلندر بخش — نام جرأت سے جس کی شہرت ہے
کر گیا کوچ اس مقام سے حیف — آج منزل نشین حسرت ہے
ہے یہ تاریخ اوّل، اور ثانی — کو: جنت نصیب جرأت ہے
۱۲۲۴ھ / ۱۲۲۴ھ

ترقیمہ : "چند غزلیات شمعِ انجمنِ زمانہ، کنور جسونت سنگھ بہادر متخلص بہ پروانہ بطریقِ انتخاب قلمی شد"۔

مندرجات : اس میں ۷ اغزلیں ہیں - پھر مذکورہ ترقیمہ - اور آخر میں پروانہ کے پسر کوچک اور جرأت کے قطعاتِ تاریخ وفات۔

خصوصیات : اس مخطوطے کا متن کلیاتِ پروانہ، نسخۂ کلکتہ کے مطابق ہے دیگر تفصیلات کے لیے رک: مخطوطہ نمبر ۸۷۔

اوم پرکاش بجاج

سمترانندن پنت

کماؤں کی پہاڑیوں میں الموڑہ سے بتّیس میل دُور شمال میں سطحِ سمندر سے ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کوسانی نام۔ انیسویں صدی کا اختتام تھا، اور بیسویں صدی کا آغاز کہ اتوار ۲۰ مئی ۱۹۰۰ء یہاں کے پنڈت گنگا دتّ پنت کے گھر میں آٹھویں بچّے نے جنم لیا۔ بچّے کی پیدائش کے چھ گھنٹے بعد اُس کی والدہ سرسوتی (جسے سب پیار سے سرولی کہتے تھے) اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ اس کے بعد بچے کو اس کی پھوپھی نے پالا۔ اس کا نام گوسائیں دت رکھا گیا۔ یہی بچّہ بعد کو ہندی کے ادبی حلقوں میں سمترانندن پنت کے نام سے موسوم ہوا۔ کسی زمانے میں گھر میں روپے کی ریل پیل تھی۔ ان کے بزرگوں کو ساٹھ گاؤں جاگیر میں ملے تھے۔ رئیسانہ ٹھاٹ تھے۔ لیکن سمترانندن پنت تک آتے آتے ساری جائداد خالصے لگ چکی تھی، اور جو باقی رہ گئی تھی، اسے بھی ان کے بڑے بھائیوں کی عیاشی کے باعث گھن لگ چکا تھا۔ اسی لیے سمترانندن پنت کی زندگی روزِ اوّل سے بیدرد اور تکلیف کی زندگی رہی۔ پنت جی کی نانی کا خیال تھا کہ جب بچے کی ماں ہی نہیں رہی، تو یہ کیسے بچیگا! لیکن جسے اللہ رکھے، اسے کون چکھے۔ قادرِ مطلق نے جس انسان کو جتنی زندگی لکھ دی ہے، وہ اسے ہر حال میں ملیگی۔

جیسا کہ ذکر ہوا، پنت اپنے ماں باپ کی آٹھویں اولاد تھے۔ ان سے بڑے تین بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ ان کی ماں سرسوتی کو گھر کے لوگ لکشمی کا اوتار سمجھتے تھے کیونکہ جس دن وہ پنت خاندان میں بطور بہو آئی ہیں، اسی دن سے اس گھر میں

ہُن برسنے لگا۔ ان دنوں کاغذی نوٹوں کا رواج نہیں تھا۔ گھر میں مٹکے روپیوں سے بھرے رہنے لگے۔ بیوی کی موت کے بعد پنڈت گنگادت کا دل بجھ گیا۔ وہ گھر گرہستی کو مطلق بھول گئے ہر وقت بیوی کی باتیں کرتے رہتے۔ وہ اس کے علم اور بردباری، خوش مزاجی اور ہردل عزیزی کو یاد کر کر کے آہیں بھرتے رہتے۔ نوزائدہ بچے کے پریم نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ اس کی دیکھ بھال میں دلچسپی لیں۔ ساڑھے دس برس تک یہ بچہ ان سے ایک گھڑی جدا نہیں ہوا۔ وہ باپ کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا، کھیلتا، سوتا۔ پنڈت گنگادت چاے کے باغات میں کام کرتے تھے۔ ان باغات کے مالک کے چھوٹے بھائی کی بیوی مسز ٹروپ ننھے پنت سے بہت پیار کرتی تھی۔ جب پنڈت گنگادت کام پر جاتے تو مسز ٹروپ سارا سارا دن طرح طرح کے کھلونوں سے اور کھانے کی چیزوں سے بچے کو بہلاتی اور کھلاتی رہتی۔

گنگادت کا رہنے کا مکان بہت بڑا تھا۔ اس میں بلا مبالغہ بیسیوں کمرے تھے، جن میں کنبے کے افراد کے علاوہ اس میں ہر وقت مہمان ٹھہرے رہتے تھے۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ ان مہمانوں کی خدمت کے لیے کئی نوکر تھے۔

گنگادت خدا ترس اور دھرماتما آدمی تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ اپنے فرائضِ منصبی سے وقت نکال کر وہ ہمیشہ پوجا پاٹ اور عبادت میں لگے رہتے۔ گیتا، بھاگوت، رامائن اور پورانک گرنتھوں کا مطالعہ ان کی زندگی کا جزبن گیا تھا۔ ننھے سمترانندن نے یہ سب عادتیں اپنے باپ سے ورثے میں پائیں۔ ان کی خوبصورتی اور حسن بھی اپنے والد کی دین تھا۔ سمترانندن سے باپ کی یہ غیر معمولی محبت اکثر دوسرے بہن بھائیوں کے لیے حسد کا باعث بھی بن جاتی تھی۔ ایک دن کیا ہوا کہ ان کے والد انھیں کسی شادی کی تقریب میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ حسد سے جل کر بڑے بھائی نے ان کے سارے نئے کپڑے گندے کپڑوں کے ڈھیر میں چھپا دیے، جس سے سارا دن ہنگامہ سا مچا رہا۔ شام کو جب

شادی میں جانے کا وقت آیا، تو اس سے تھوڑی دیر پہلے یہ کپڑے ملے۔ غرض بچپن میں پنت اپنے والد، دادی اور پھوپھی کے لاڈلے تھے۔ ہر ایک ان پر جان چھڑکتا تھا۔ بیشک، وہ والدہ کی محبت سے محروم ہو گئے تھے۔ لیکن ماں کے پیار کی جو کمی رہ گئی تھی، قدرت نے اس کی دوسرے ذرائع سے بہت حد تک تلافی کر دی۔ اس پیار میں پہاڑوں کی خوشگوار ہوا بھی تھی، جنگلوں کے درختوں کی ہریالی بھی، پتھریلی پگڈنڈیوں کی لہریا فضا بھی۔ کالے اور سفید بادلوں کے اڑتے ٹکڑے کوسانی کے راج محل سے ٹکراتے اور قدرت کے متوالے نوجوان پنت دروازوں اور کھڑکیوں سے یہ مناظر دیکھتے، للچاتے اور پھر ان کے حسن میں کھو جاتے۔ وہ ان مناظر کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے۔ ان کے من سے اٹھنے والے جذبات اور احساسات نغمے بن کر گونجنے کے لیے بیتاب ہو جاتے۔

اپنی کمسنی ہی میں انھوں نے گھر کے صحن میں دوب اور گلاب کے پودوں کا باغیچہ لگایا۔ برسات میں جب یہ پودے بڑھ کر گھر کی رونق بڑھاتے، تو وہ ان پودوں اور پھولوں کو دیکھ دیکھ، مسرت سے جھوم جھوم اٹھتے۔ اس طرح قدرت نے نہ صرف اس بچے کے دل کو بہلایا بلکہ اس کے دل کے ویرانے میں بے پناہ مسرت کے پھول کھلا کر اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کی تربیت کی۔ بقول ورڈزورتھ کھلنے والا ایک معمولی گلاب بھی اس کے لیے انگنت خیالات کا سرچشمہ بن جاتا۔ وہ لہلہاتی پہاڑیوں اور قوسِ قزح کے نظاروں میں کھو جاتا۔

پنت جی نے سب سے پہلی نظم اس وقت کہی، جب وہ ساتویں درجے کے طالب علم تھے۔ کالج چھوڑنے کے بعد وہ الٰہ آباد یونیورسٹی کے انگریزی ادبیات کے پروفیسر شوآدھار پانڈے کے قریب آئے انھیں سے پنت جی نے انگریزی اور انگریزی ادبیات کے بیش بہا اور بیکراں علمی خزانے کی محبت پائی۔ یہ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۴ء تک کا زمانہ ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ان کی توجہ فلسفہ کی جانب مبذول ہوئی۔ ان کی نظم "پری ورتن" (انقلاب) میں اس رجحان کے نشانات نمایاں ہیں۔ ان

کی تخلیق "پلو" کی نظمیں ۱۹۱۸ء سے ۲۴ء کے زمانے کی ہیں یہ سب الٰہ آباد میں لکھی گئیں۔ پنت جی کی بچپن سے ایک خصوصیت تھی کہ وہ جس کام کے سیکھنے کا ارادہ کرتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کے دم لیتے۔ وہ ابھی چھٹے یا ساتویں درجے میں پڑھتے تھے کہ ان کے شہر الموڑہ میں ایک جادوگر آیا۔ اُس سے انھوں نے جادو کے کھیل سیکھے۔ ان کھیلوں کو وہ ہاتھ کی صفائی کہا کرتے تھے مثلاً روپیا پیدا کر کے غائب کر دینا ہنا گیے کے ٹکڑوں کو نگل کر ایک لمبا تاگا نکالنا ٹونا ٹوٹکا کھول کر کسی دیکھنے والے کے سر اوپر انڈیل کر اس کے سر سے پھولوں کی پنکھڑیاں نکال لینا وغیرہ لیکن آٹھویں درجے تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے یہ کھیل چھوڑ دیے۔ اب انھیں ہندی کے جادو نے گھیر لیا۔ یہاں انھوں نے ایک دن نپولین بونا پارٹ کی جوانی کے دنوں کی تصویر دیکھی۔ یہ تصویر دیکھ کر انھوں نے بھی اپنے لمبے لمبے گھنگھریالے بال بڑھا لیے۔ ان بالوں کے بنانے سنوارنے کے لیے انھیں کوئی خاص کوشش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ریشم سے ملائم چکنے بالوں کو وہ کنگھی یا ہاتھ کی انگلیوں سے مخصوص صورت میں ڈھال لیتے۔ اس میں نہ حجام کی ضرورت تھی، نہ تیل کی شیشی کے ٹوٹنے کا ڈر۔ اگر کبھی بال بڑھے ہوئے معلوم ہوئے، تو نہانے کے بعد بالوں کو بائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے، اور دائیں ہاتھ میں قینچی لے کر انھیں کاٹ دیتے۔ لوگ بال کٹوانے کے بعد نہاتے ہیں، وہ نہانے کے بعد بال کاٹتے۔ قینچی چلتے ہی فاضل بال کٹ کر بائیں ہاتھ میں آجاتے، نہ کوئی گندگی، نہ جھنجھٹ، نہ کپڑوں اور گردن اور زمین پر چھوٹے چھوٹے بالوں کے گر کر چپکنے کا اندیشہ۔ ان کے بال اتنے چکنے تھے کہاں پر خواہ کتنا صابون رگڑ دو، رکھائی کا نام ونشان نہیں نظر آتا تھا، ہمیشہ چکنے اور چمکدار اور نرم ہی نظر آتے۔

۱۹۱۴ء میں ایک لمبے تڑنگے گھنگھریالے بالوں والے پنجابی سادھو الموڑہ آئے۔ انھوں نے پنت جی کے گھر کے قریب کے مندر میں ڈیرہ ڈال دیا۔ ان کی چکنی چپڑی باتیں سن کر کمسن پنت نے بھی سادھو بننے کی ٹھان لی۔ دن رات سادھو کی صحبت

اور پوجا پاٹ اور ایشور کی اُپاسنا۔ اس میں اتنے محو ہوئے کہ دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب یہ خبر بڑے بھائی رگھوبر دت نے سنی، تو وہ سادھو کے پاس پہنچے اور ان سے چھوٹے بھائی کے سادھو بن کر گھر سے نکل جانے کی بات کی، اور ان سے درخواست کی کہ وہ کسی طرح خاندان کو تباہ ہونے سے بچانے میں مدد دیں۔ اس گفتگو کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس سے بیشتر کہ پنت سادھو بن کر گھر سے نکلتے، وہ سادھو ہی کہیں دوسری جگہ چلے گئے۔ اور یوں پنت جی ہرزہ گردی اور بھیک مانگنے سے بچ گئے۔ یہ مارچ ۱۹۱۵ء کی بات ہے۔

سال بھر اس سادھو کی صحبت میں رہنے کا ایک اور ناخوشگوار نتیجہ یہ نکلا کہ اس برس وہ آٹھویں کا امتحان نہ دے سکے۔ لیکن ان کا ہندی پریمی بننے کا جو منصوبہ تھا، اسے تقویت ملی۔ ان دو برس میں انھوں نے اپنی ادبی صلاحیت میں بہت اضافہ کر لیا۔ نصاب کی کتابوں کی جگہ انھوں نے ہندی لائبریری کی تمام کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان میں چھتر سال، پرتبھا، پھولوں کا گچھا، کوتیا کلاپ، گلپ گچھ، بھارت بھارتی، جیدر تھ بدھ، رنگ میں بھنگ، بنکم بابو کے ناولوں کے ہندی ترجمے اور بہت کچھ الابلا تھا! یہ سب انھوں نے پڑھ ڈالے۔ نظم پر بھی توجہ رہی۔ چھند پربھاکر، کاویہ پربھاکر، النکارو منگل، اور ہندی شعرا کا کلام بھی انہی دنوں پڑھا تھا۔ یہ گویا ان کی ادبی زندگی کا آغاز تھا۔

ہندی شاعروں کے علاوہ ان کے دھارمک رجحان کی وجہ سے ان پر شری رام کرشن پرم ہنس، اور سوامی رام تیرتھ، اور سوامی وویکانند کا بھی گہرا اثر ہوا۔ اس سے متعلق انھوں نے اپنی ایک نظم میں یوں لکھا ہے:

رام کرشن اور رام تیرتھ کے
وچن امرت سے تھی بھو پلوت
پُنر جاگرن کا یُگ تھا وہ
گرج رہے تھے انتر اُمدَر
دیپت وویکانند وچن گھن

سمترانندن پنت

[رام کرشن (پرم ہنس) اور (سوامی) رام تیرتھ کے اقوال کے آبِ حیات
سے زمین ہری بھری ہو گئی تھی۔ وہ از سرِ نو بیداری (اور زندگی) کا دور تھا۔
ہر طرف دلوں میں جذبات کا طوفان تھا۔ رہی سہی کسر نورانی (سوامی) وویکا
نند نے پوری کر دی۔ ان کے پند و نصائح گھنگھور گھٹا سے کم نہیں تھے]

یہ چنگاری سلگتی رہی اور آہستہ آہستہ شعلۂ جوالا بن گئی۔ الموڑہ ہی میں ان کا تعلق مشہور ڈراما نگار گووند بلبھ پنت کے بھائی شیاما چرن پنت سے ہوا۔ وہ ان کے ہم جماعت تھے، اور ادبی ذوق میں ان کے شریک بھی۔ ان کے ساتھ وہ ادبی جلسوں میں جانے لگے۔ اب انہوں نے دنیا بھر کی ہندی کتابوں سے گھر بھر لیا۔ جو کتاب ملی، اسے چاٹ گئے۔ کوئی کسی کتاب کا ذکر کرتا، معلوم ہوتا کہ پنت جی اسے پڑھ چکے ہیں۔

ایلا چندر جوشی اور شیاما چرن پنت نے مل کر دستی لکھا ہوا ماہنامہ سدھاکر جاری کیا۔ سمترانندن پنت کا کلام بھی اس مجلّے میں شائع ہونے لگا۔ ادبی حلقوں نے داد و تحسین سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن ان کی یہ شہرت ان کے چند لوگوں میں اختلاف اور دشمنی کا باعث بھی بن گئی۔ ان ہی دنوں شیاما چرن پنت اور ایلا چندر جوشی نے کچھ دوستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ گروہ سمترانندن کی نظمیں بھی چھاپتا، اور اس پر بڑی مخالفانہ تنقید بھی کرتا۔ لیکن پنت جی نے اس کا برا منایا، نہ اس کا اثر لیا۔ وہ لوگوں کی ستائش اور صلے سے بے نیاز رہ کر بدستور لکھتے رہے۔

اس سلسلے میں ایلا چندر جوشی خود رقمطراز ہیں:

> میں نے پنت کی نظم جس صورت میں وہ مجھے موصول ہوئی تھی، چھاپ دی۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نظم کی ایک کڑی تنقید بھی اسی شمارے میں شائع کی۔ لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی جب میں نے دیکھا کہ پنت جی اس کے بعد بھی مجھ سے اسی خلوص و محبت اور سلیقے سے ملے، جس طرح پہلے ملتے تھے۔ ان کے برتاؤ میں رتی برابر بھی فرق نہیں تھا ——— وہی مستانہ انداز، وہی ہنستا ہوا چہرہ ——— میں اپنے دل میں شرمسار ہو رہا تھا کہ کتنے بڑے دل

کے مالک ہیں پنت جی۔ انکساری ان کے مزاج کا اہم جُز تھا۔

پنت دسویں کے امتحان میں فیل ہو گئے اس پر وہ الموڑہ سے بنارس چلے گئے یہاں انھوں نے جے نارائن ہائی اسکول سے ۱۹۲۰ء میں میٹرک پاس کیا اور جولائی ۱۹۲۰ء میں میور سنٹرل کالج میں داخلہ لے لیا۔ وہ ہندو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں عدم تعاون کی تحریک کے سلسلے میں مہاتما گاندھی الہ آباد آئے؛ انند بھون میں ان کا قیام تھا۔ سمترانندن جی کو سیاست سے کوئی دلچسپی یا لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنے دوسرے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ اس طوفان میں کود پڑے۔ بس ان کی تعلیم یہیں ختم ہو گئی۔

گھریلو زندگی :

پنت جی نے ساری عمر تجرّد میں گزاری۔ ایک مرتبہ کسی دوست نے پوچھا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی، تو فرمایا کہ میں اپنی شریکِ حیات کو بطریق احسن نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ میرے پاس ان دنوں کافی پیسا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے شادی نہیں کی۔ بعد کو جب وہ ریڈیو میں نوکر ہو گئے، تو اسی دوست نے پھر ان سے کہا کہ اب تو آپ اس قابل ہیں کہ شادی کر سکتے ہیں۔ ان دنوں تو بڑے بڑے لیڈروں نے، ادیبوں نے شادیاں کی ہیں۔ لیکن پنت جی نے ہنس کر ٹال دیا کہ صاحب، کیا اب میری شادی کرنے کی عمر ہے؟

تجرّد کے باوجود وہ زندگی بھر کسی نہ کسی کے ساتھ رہے۔ یہ ان کے ہر طرح کے ماحول سے نباہ کر لینے والے مزاج کا کرشمہ تھا کہ وہ بھانت بھانت کے بلکہ متضاد افتاد تک کے لوگوں سے نباہ لیتے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے رباعیاتِ خیام کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ ایک دوپہر وہ گھر سے نکلے، تو لُو لگ جانے سے بیمار پڑ گئے۔ مشہور سرجن نیلامبر جوشی ان دنوں بھرت پور میں تھے۔ انھوں نے معاینہ کر کے بتایا کہ پلوریسی کے آثار ہیں، جو آسانی سے تپ دق میں بھی تبدیل ہو سکتی ہے۔ تین مہینے ان کے ساتھ رہے۔

سمترانندن پنت

۱۹۳۰ء میں وہ پہاڑ سے لوٹ رہے تھے کہ نینی تال میں کالاکنکر کے راجا اودیش سنگھ بھی وہاں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی۔ ان کے بھائی سوریش سنگھ ہندی ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، اسی موقع پر ان سے بھی ملاقات ہوگئی۔ رفتہ رفتہ یہ معمولی جان پہچان دوستی میں بدل گئی۔ ان کی دعوت پر سمترانندن جی ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک تین سال کالاکنکر میں رہے۔ کنور سوریش سنگھ کی بیوی پرکاش وتی (جو پنّا کے دیوان کی بیٹی تھیں) ان کی بڑی قدر داں تھیں۔ انھیں کے اتھاہ ادبی شوق اور خلوص کی وجہ سے پران کی کوٹھی "نکشتر" میں کالاکنکر رہے، جو ان کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ اس جگہ کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ اور قدرت اپنی تمام رعنائیوں سے جلوہ نما تھا۔ اسی سہانی فضا میں "گونجن" اور "جیوتسنا" کی تخلیق ہوئی۔ انھوں نے اپنا مجموعۂ کلام "پلو نی" ان ہی سے منسوب کیا ہے۔

۱۹۳۸ء میں "رُوپابھ" کی اشاعت پر نریندر شرما سے دوستی ہوئی۔ اس کے بعد جب بھی بمبئی جانا ہوتا، وہ انھیں کے وہاں ٹھہرتے۔ نریندر کی بیوی مصور بھی ہے اور افسانہ نگار بھی۔

۱۹۴۰ء میں ہروونش بچن کے ساتھ بیلا روڈ الٰہ آباد میں رہے۔ بچن کی کوٹھی کا نام بسودھا رکھا (بچن سمترانندن دھام)۔ جہاں نریندر شرما جذباتی آدمی تھے، بچن بیحد سمجھدار، سلیقہ شعار اور مخلص۔ بچن کی پتنی تیجی بھی بیحد خوش خلق اور محبت کا بھنڈار تھیں۔ بچن کے مزاج نے گھر جنت بنا رکھا تھا۔ کالاکنکر سے جب وہ الٰہ آباد آئے تو ان کے اور دوست تھے رام چندر ٹنڈن۔ سب سے پہلے وہ ان کے یہاں ہی قیام پذیر ہوئے۔ کالج میں وہ، دھریندر ورما، بابو رام سکسینہ، رام چندر ٹنڈن، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری آگے پیچھے ایک ہی ساتھ تھے۔

۱۹۴۱ء-۴۲ ۱۹ء میں مشہور رقاص اودے شنکر سے تعلق پیدا ہوا۔ وہ بیحد نفیس، مہذب اور مخلص دوست تھے۔ ان کے ساتھ جنوبی ہندستان کا دورہ بھی کیا۔ انھوں نے اودے شنکر کے طائفے کے لیے گیت بھی لکھے۔ ۱۹۴۱ء-۴۲ ۱۹

میں شری آربند وگھوش کے سکتہ شری اے پی پورانی کی لڑکی اودے شنکر کے مرکزِ رقاصی میں رقص کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آئی تھیں۔ وہ اکثر آربند وگھوش کے فلسفے کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ اس سے ان کی توجہ شری آربند وگھوش کے فلسفے اور ادب کی طرف مبذول ہوئی۔ المونڑہ میں آربند وگھوش کے مشہور چیلے بروسٹر ایک امریکن تھے، وہ خود مصور ہونے کے علاوہ آربندو کے فلسفے کے بیحد ماہر اور مداح تھے۔ انھوں نے آربند وگھوش کے شاہکار دی لائف ڈیوائن کا ایک نسخہ پنت جی کی نذر کیا۔ پنت جی اس کے مطالعے سے اتنا متاثر ہوئے کہ ۱۹۴۶ء میں وہ پانڈیچری آربندو آشرم میں شری آربند وگھوش کے نیاز حاصل کرنے کے لیے گئے۔

پنت جی کی بھانجی سوما شانتی نکیتن میں پڑھتی تھی۔ اسے چھٹیوں وغیرہ کے بعد شانتی نکیتن پہنچانے کے لیے جانا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں پنت جی کئی بار وہاں گئے۔ ان سفروں میں بالعموم ہندی کے مشہور ادیب ہزاری پرشاد دویدی بھی ان کے ساتھ ہو جاتے۔ وہاں گورودیو رابندرناتھ ٹیگور سے ملاقات ہوئی۔ ایک دن باتوں باتوں میں پنت جی نے اپنے دلی جذبات کا یوں اظہار کیا: "گورودیو جی! مہاتما گاندھی جیسے کی میں دل سے عزت کرتا ہوں، لیکن محبت مجھے آپ سے ہے کیونکہ آپ سا فنکار اور گیت کار مجھے آج تک کہیں نہیں ملا۔"

ہندی شاعروں میں ان سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے میتھلی شرن گپت تھے۔ گپت جی کا قول تھا کہ پنت ہندی کے مستقبل کے شاعر ہیں۔ آنے والی نسلیں ان پر فخر کرینگی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، ہری ونش رائے بچن ان کے بیحد قریبی دوست تھے۔ جب بچن نے پنت کے دو سو خط چھاپ دیے، تو پنت جی کو بہت قلق ہوا۔ ان خطوں میں ان کے کئی معاصرین کا ذکر تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ خطوط اس صورت میں شائع ہوں؛ وہ ان میں بعض جگہ کچھ ترمیم کرنا چاہتے تھے۔ پنت جی نے ناشر کو

بھی نوٹس دیا، بچن کو بھی لکھا اور انھیں وہ ترمیمیں بھی لکھ بھیجیں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ خطوط اصلی شکل میں چھپ گئے، تو کچہری میں مقدمہ دائر کر دیا۔ جب ناشر نے سمجھوتے کی درخواست کی، تو انھوں نے سمجھوتا کر لیا۔ لیکن دوستوں نے مقدمہ واپس لینے پر ان سے ناراضی کا اظہار کیا۔ پنت جی نے ہنس کر جواب دیا: "بھئی، میرا مقصد تو پورا ہو گیا۔ مجھے اپنی ناراضی اور ناپسندیدگی اظہار کرنا تھا، وہ کر دیا، اب کیا ہے؟ میرے دوست تو ناراض نہ ہوں گے۔ یہ بچن تو میرا سگا تریت بھائی ہے۔ میرے دل میں تو اُس کے لیے محبت کے سوائے کچھ نہیں۔"

عمر بھر پنت جی کے مزاج کا بھولپن نہیں گیا۔ کوئی ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا، وہ فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے۔ ایک دن ایک اجنبی آیا، کہنے لگا: "پنت جی آج میں آپ کو گانا سناؤں گا۔" پنت جی نے کہا: "بھیا، میں بیمار ہوں، معافی چاہتا ہوں۔" "نہیں نہیں، میں شام کو ضرور حاضر ہوں گا، اور گانا گاؤں گا۔ کیونکہ مجھے اپنی بیمار بیوی کے علاج کے لیے ڈھائی سو روپے کی ضرورت ہے۔" اس پر پنت جی نے سو کا نوٹ نکالا اور اس کی نذر کر دیا۔

صبح سے لے کر شام تک اپنی کتابوں پر دیباچے، تعارف اور تقریظیں لکھوانے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ ہر ایک منت سماجت کرتا کہ آپ کے دو لفظ لکھ دینے سے میری کتاب بک جائے گی۔ میرے بیوی بچوں کا پیٹ پل جائیگا۔ دعا دوں گا اس پر لاکھ نہ چاہنے پر بھی وہ کچھ نہ کچھ لکھ دیتے۔ ان کی بھانجی ناراض ہوتی، کہتی: "د یہ کیا کرتے ہیں آپ؟ کیوں؟ یہ ٹھیک نہیں۔ آپ بھارت کے سب سے بڑے کو اور یہ کام!"

"اس کا کام بن جائیگا۔ بیچارا غریب، ہندوستانی۔"

مشہور ہندی افسانہ نویس پریمدا نے ایک بار پوچھا: "پنت جی آپ کون تیل استعمال کرتے ہیں؟" "میں تو کوئی تیل بھی بالوں پر نہیں لگاتا۔" "دیکھیے میں آپ کا پسندیدہ تیل لائی ہوں، سر پر لگانے کے لیے۔ پریمدا نے تیل"

دکھایا اور اُس کا اشتہار بھی۔ پنت جی بغیر دیکھے بھالے لوگوں کو سرٹیفکیٹ دیتے رہتے تھے۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا۔

ایک مرتبہ ایک دوست نے ان کو لکھا کہ ہندوستان میں سب سے بڑا تانترک کون ہے؟۔ پنت جی نے جواب دیا: مجھے کیا علم! اس دوست نے پنت جی کا تصدیق نامہ انھیں بھیج دیا۔ ہوا یہ کہ ایک بار گاڑی میں سفر کرتے انھوں نے کسی تانترک کو سرٹیفکیٹ دے دیا تھا کہ وہ بہت اچھا ماہر فن ہے۔

پنت جی کو جانوروں سے بےحد پریم تھا۔ ۱۲ اگست ۱۹۶۴ء کو ان کی بھانجی شریمتی شانتی جوشی ایک ڈیڑھ مہینے کے بلّی کے بچے کو گھر پر لے آئیں۔ اس کا نام تھا راجو۔ پنت جی اس بلّی کے بچے پر اتنا فریفتہ ہوئے کہ شانتی نے ان کی ایک نظم کی پیروڈی لکھی:

تمھاری آنکھوں میں ہی پران[1]	۱۔	زندگی
ہردے بستا نیرو[2] اُنجان	۲۔	خاموش
باندھ میرے پریم اُر[3] کو	۳۔	دل
چمکتی گول پر پنچ[4] بھری	۴۔	ڈھونگ
تمھاری آنکھوں کی ست جیوتی[5]	۵	سچ کی شمع
ورہ[6] میں کلپ، تڑپتا مَن	۶۔	جدائی
ہاتھ یہ ویتھا[7] پونچھ میں بندھی	۷۔	بیکار
مجھے پاگل کرتی دن رات		

پنت جی نے اس بلّی کے بچے پر ایک مضمون بھی لکھا تھا، جو ان کی کتاب 'ساٹھ ورش، اور انیہ بندھ' میں شامل ہے۔ ایک نظم بھی ان کے مجموعۂ کلام 'شنکھ دھونی' میں شامل ہے۔ ۱۹۶۷ء میں یہ بلّی کا بچہ مر گیا۔ اس کی موت پر وہ بہت اداس ہوئے تھے۔ کئی دن تک اچھی طرح سے کھانا تک نہیں کھایا۔

گھر کی اداس تنہائی میں کچھ چہل پہل کی فضا پیدا کرنے کے لیے ان کی بھانجی ایک

بچہ گود لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ ۲۸ جون ۱۹۷۱ء کو ایک بچی گھر لائی گئی۔ بچی کو دیکھتے ہی پنت جی اس پر فریفتہ ہو گئے۔ اور اسے گود میں اٹھایا۔ اُس کا نام سُمتا رکھا گیا۔ اس کی تاریخ ولادت کے مطابق سب لوگوں سے اس کا زائچہ بنوایا۔ انھیں ہر وقت اس بچی کا خیال رہتا تھا۔ اس پر ایک نظم بھی لکھی تھی۔

وہ سُمتا کے رونے کی آواز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اگر کبھی اس کے رونے کی آواز آتی، تو جو بھی اُس کی دیکھ بھال کر رہا ہوتا، اس پر برس پڑتے، گھر میں طوفان مچا دیتے۔ سُمتا سے کوئی ذرا سختی سے بولا، تو وہ بگڑ جاتے۔ سب کہتے: "آپ اسے ابھی سے بگاڑنے لگے ہیں، ذرا بڑی ہوگی، تو کسی کی کوئی بات نہیں مانیگی"۔ انھیں بس دو باتوں کی فکر تھی: ایک بھارت کے مستقبل کی، دوسری سُمتا کے مستقبل کی۔ پنت جی نے اپنے دل کی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے سمتا کے بارے میں لکھا ہے:

جب سے تم مرے گھر آئی
جیون کے تئیں ۱۔ متعلق
بدل گئی میری ساری
دھارنا^۲ ، بھاونا^۳ ۲۔ سوچ ۳۔ خواہش۔ تمنا
گھر کا جی جیون
مان چترا^۴ ہی سنور گیا ہو ۴۔ نقشا

آخری ایام:

۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو ان پر دل کا پہلا دورہ پڑا۔ اس کے ساتھ ہی یرقان کی شکایت بھی ہو گئی۔ اس کے بعد ہمیشہ کوئی نہ کوئی علالت ان کے درپے رہی۔ ۱۹۷۰ء سے انھیں بی کولی کا عارضہ بھی سخت پریشان کیے ہوئے تھا، جو رانی کھیت میں قیام اور وہاں کے پانی کا ثمرہ تھا۔ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک کے درمیانی تین برس انھوں نے بی۔ کولی کی ناقابلِ برداشت تکلیف میں گزارے تھے۔ مسلسل

علاج معالجے کے بعد دو چار مہینے سے اس میں کچھ افاقے آثار نظر آتے تھے کہ اب اس دل کی بیماری نے آگھیرا۔ ابھی ان پریشانیوں سے نجات نہیں ملی تھی کہ جنوری ۱۹۷۷ء میں ہرپیز (جنیو) کی شکایت ہوگئی۔ درد اور تکلیف سے تڑپنے لگے۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں انھیں کار سے لکھنؤ لے گئے۔ گھر والوں نے خیال کیا کہ ۱۹۷۲ء سے مسلسل یہاں الٰہ آباد میں ہیں، اس سے کچھ ماحول بدل جائیگا۔ لکھنؤ میں ان کے پیٹ اور چھاتی میں شدید درد ہوا، ہلکا سا بخار اور قے بھی ہوئی۔ اس کے باوجود وہ سُمتا کی وجہ سے اسپتال نہیں جانا چاہتے تھے۔ لیکن درد سے بھی بیحال تھے۔ اخیر انھیں اسپتال منتقل کرنا پڑا۔ معائنہ ہوا تو پتا چلا کہ ان کے پتّے میں پتھری ہے۔ گھر واپس آئے اور ہومیوپیتھک علاج شروع کیا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس پر انھیں دلّی لایا گیا اور ۱۵ جولائی ۱۹۷۵ء کو وہ بغرضِ علاج یہاں آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں داخل ہوئے۔ آپریشن ہوا جس سے انھوں نے پتّے کی پتھریوں سے نجات پائی۔ ۱۵ جولائی کو وزیراعظم اندرا گاندھی ان کی مزاج پرسی کو اسپتال آئیں۔ لیکن ڈاکٹر نے ۸ اگست ۱۹۷۵ء کو انھیں واپس الٰہ آباد جانے کی اجازت دے دی۔

اب وہ مستقل بیمار رہنے لگے۔ پندرہ دن ٹھیک، تو پندرہ دن کوئی علالت۔ کبرسنی کے باعث کمزور بھی بہت ہوگئے تھے۔ اسی میں ۲۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کی رات وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے، جس کا انھیں ہر لمحہ خیال رہتا تھا۔

روزگار :

بڑے بھائیوں کی شراب نوشی اور فضول خرچی نے گھر کا گھروا کر دیا تھا اور وہ کھیتی سے کنگال ہوگئے۔ ایسے میں حسّاس مزاج پنت جی کا کہاں گزارا تھا! چنانچہ ہوش سنبھالا، تو وہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ انھوں نے اپنے قلم کے زور سے اپنی روزی پیدا کی۔ خود اچھی طرح بسر کی، اور دوسروں کے اچھی طرح بسر کرنے کا انتظام کیا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ اپنے ایک گیت کی ریکارڈنگ کے لیے دلّی آئے۔ یہاں ان کو

ریڈیو میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی، جسے انھوں نے فوراً منظور کرلیا۔ کام کا کام دام کے دام۔اس نوکری سے کئی لوگوں کو فائدہ پہنچا۔ مثلاً ان کے ایک دوست کا لڑکا تپ دق کا مریض تھا۔ پنت جی متواتر دو برس تک اسے دو سو روپے مہینا لڑکے کے علاج کے لیے دیتے رہے۔ ان کے دونوں بڑے بھائی ہردت اور دیوی دت تو کسی نہ کسی صورت اپنی اپنی گھر گرہستی چلاتے رہے، لیکن اور دور نزدیک کے سب رشتے دار دلی میں ان کے مکان پر ڈیرے ڈالے پڑے رہتے! اور ان سے کچھ نہ کچھ ہتھیا کر ہی پنڈ چھوڑتے۔ کسی کا خط آتا کہ فوراً ایک ہزار بھیجیے ورنہ میں آپ کے پول کھول دونگا۔ ڈر اور بیخوف ہونے کے باوجود اسے ۵۰۰ بھیج دیتے۔

ایک مرتبہ کسی دوست نے ان سے مشورہ کیا کہ کیا اسے شادی کرنی چاہیے، یا نہیں۔ پنت جی نے کہا: شادی ضرور کرنی چاہیے۔ مجرد شخص یا دیوتا ہوسکتا ہے یا شیطان، انسان بننے کے لیے شادی ضروری ہے۔ اس نے شادی کرلی۔ لیکن اب اس نے اپنے گھریلو اخراجات کے لیے تین سو روپے ماہانہ کا تقاضا شروع کر دیا کیونکہ اس نے شادی پنت جی کے کہنے پر کی تھی۔ پنت جی نے تین سو روپے ماہانہ دینے سے انکار کر دیا، تو اس دوست نے لکھا کہ اب میں آپ کے گھر اسی دن آؤنگا، جب خود میری مالی حالت آپ کے برابر ہوجائیگی۔

پنت جی زندگی بھر کماتے رہے۔ ریڈیو کی تنخواہ کے علاوہ انھیں اپنی کتابوں کی رائلٹی کے چیک بھی سارا سال موصول ہوتے رہتے۔ لیکن پیسا ان کے پاس ٹھہرتا نہیں تھا۔ ادھر آیا، ادھر خرچ ہوگیا۔

ادبی اعزاز :

۲۰ مئی ۱۹۶۰ء کو دلی میں ان کی ساٹھویں سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ اس کے روح رواں جگدیش چندر ماتھر مرحوم تھے۔ اور ان کے معاون تھے، میتھلی شرن گپت، بھگوتی چرن ورما، بچن جی، تیجی بچن، نریندر شرما، رام چندر ٹنڈن اور نگیندر جی۔ اس موقع پر ناشر راج کمل، دلی نے تین کتابیں شائع کیں:

سمترا نندن پنت

شاٹھ ورش: ایک ریکھاکن"، "سمرتی چتر" اور "ابھشیکتا"۔ "سمرتی چتر" ڈاکٹر نگیندر نے مرتب کی تھی اور "ابھشیکتا" نریندر شرما نے۔ موخرالذکر کتاب ہندوستان کی متعدد دوسری زبانوں میں بھی ترجمہ کی گئی۔

یہ تقریب دلی کے سپرو ہاؤس میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کی عظیم الشان کامیابی ان احباب کی بدولت تھی جنھوں نے خلوصِ دل سے اس کا بیڑا اٹھایا تھا۔ تقریب کے اختتام پر جب وہ گھر لوٹے، تو پنت جی نے کہا کتنی محبت کا اظہار کیا ہے لوگوں نے، دوستوں نے، معاصرین نے لیکن میں اتنی عزت کے لائق نہیں ہوں۔ ۱۹۶۰ء میں انھیں ان کے نظموں کے مجموعے "کلا اور بوڑھا چاند" پر ساہتیہ اکاڈمی نے پانچ ہزار کا انعام دیا۔ ۱۹۶۱ء میں وہ یہ انعام لینے دلی آئے، واپس جاکر انھیں بیحد قلق ہوا۔ جلسۂ تقسیمِ انعامات کے صدر سمترا نندن پنت کے نام کا صحیح تلفظ بھی نہیں کر سکے تھے۔ اس پر پنت جی نے کہا کہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ میرے دیش کے لوگ میری زبان بھی ٹھیک طور پر نہیں بول سکتے۔ ۱۹۶۱ء میں پنت کو پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ لیکن پنت جی نے اسے ۱۹۶۷ء میں واپس کر دیا کیونکہ جس زبان کی خدمت کے لیے انھیں یہ اعزاز بخشا گیا تھا، وہ اس کی بےعزتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

۲۶ مارچ ۱۹۶۵ء کو یو پی حکومت نے ادبی خدمات کے لیے انھیں دس ہزار کا انعام دیا۔ اسی سال ۱۵ نومبر ۱۹۶۵ء کو سوویت لینڈ انعام بھی عطا کیا گیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کے مجموعۂ کلام "چدمبرا" پر گیان پیٹھ کا ایک لاکھ روپے کا انعام ملا۔ اس کی تقریب وگیان بھون، نئی دلی میں ۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء کو تزک و احتشام سے منعقد ہوئی۔ اس موقع پر شریمتی املا شنکر نے پنت کی نظموں پر مبنی ایک رقص کیا، جس سے حاضرین بیحد مسرور ہوئے۔ اسی سال یعنی ۱۹۶۹ء میں ساہتیہ اکاڈمی نے پنت کو اکاڈمی کا فیلو منتخب کیا۔ اس کی خوشی میں ان کے اعزاز میں کئی جگہوں پر تقریبیں منعقد ہوئیں اور ہر ایک نے اکاڈمی کے اس انتخاب

کی تائید کی۔
پنت کو ہندستان سے باہر جانے کا بہت اشتیاق تھا۔ یہ موقع انھیں ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو ملا، جب وہ سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ ملنے کے بعد تاشقند گئے۔ وہ ہوائی جہاز سے گئے تھے۔ اس میں انھیں خاص لطف آیا۔ دل میں سوچنے لگے کہ جس ہمالیہ کے قدموں میں انھیں بیٹھنے گھومنے کا موقع ملا تھا، اب وہ اس کی چوٹیوں سے اوپر اڑان کر رہے ہیں۔ اس منظر نے انھیں بہت متاثر کیا۔ فرینک فورٹ (مغربی جرمنی) میں انھوں نے کتابوں کی نمائش دیکھی، جس میں تیس ملکوں کے نمائندوں نے اپنے وہاں چھپنے والی کتابیں پیش کی تھیں۔ کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ، علم کا خزانہ، یہ انھیں بہت اچھا لگا۔ ان کے دل میں خواہش پیدا ہوئی، کاش کہ میں یہ سب کتابیں پڑھ سکتا۔ روس سے وہ یورپ گئے۔ ۸ سے ۲۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک مغربی جرمنی میں رہے۔ ۲۲ اکتوبر کی شام پیرس پہنچے۔ جیب خالی تھی، اس پر پیرس شہر بامہنگائی۔ اپنی ناسمجھی پر انھیں ہنسی بھی آئی، اور رونا بھی۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو وہ لندن پہنچے۔ لندن بی بی سی سے انھوں نے ایک دو تقریریں کیں جس سے کچھ یافت ہوئی۔ دوست مل گئے؛ ان سے کچھ قرض لیا اور یوں دن بسر کیے۔ ۲ نومبر کو واپس روس پہنچے، جہاں وہ سرکاری مہمان تھے اور انھیں اپنی گرہ سے ایک پیسا نہیں صرف کرنا پڑا۔ اور جب بیرونی دنیا کے سیر سپاٹے سے ہندستان لوٹے، تو وہ دنیا کو بھول گئے، اور "اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" کا نغمہ الاپنے لگے۔

۴ فروری ۱۹۶۷ء کو وکرم یونیورسٹی نے پنت جی کو ڈی لٹ کی اعزازی سند پیش کی۔ پنت جی اس تقریب پر تشریف نہیں لے گئے تھے۔ وہاں کے وائس چانسلر آچاریہ نند دلارے اور ان کے ساتھی ڈاکٹر شومنگل سنگھ سمن نے ۱۹ مارچ ۱۹۶۷ء کو الہ آباد یونیورسٹی میں ایک خاص تقریب کا اہتمام کیا جس میں یہ سند انھیں بڑے اعزاز و اکرام سے پیش کی گئی۔

اسی طرح گورکھپور یونیورسٹی نے ۱۹۷۱ء میں، کانپور یونیورسٹی نے ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو، راجستھان یونیورسٹی نے ۱۵ مارچ ۱۹۷۷ء کو، ڈاکٹر آف لیٹرز کی اعزازی ڈگریوں سے نوازا۔

چھایاواد :

دورِ جدید مختلف وادوں کا دور ہے۔ ہندی میں تنقید بھی انہیں سوالوں کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہے۔ لیکن جو اصلی فنکار ہیں وہ ان چیزوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتے۔ سمترا نندن پنت نے بھی یہی کیا۔ وہ مختلف اوقات میں ہیئت اور اسلوب کے تجربوں کے لیے رنگا رنگ شعر کہتے رہے۔ جب انھوں نے چھایا واد کی طرف توجہ کی، تو وہ اس تحریک کے رہنما بن گئے۔ اصل میں جدید ہندی شاعری کے نئے دور کے امام تھے بھارتیندو ہریش چندر۔ وہ جدید اور قدیم کا سنگم تھے۔ ان پر ہندی شاعری کے روایتی دور کا خاتمہ ہوگیا، اور جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ انھوں نے جدید ہندی شاعری کے پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچا۔ ان کی ہندی شاعری نے سیاست، دھرم، سائنس اور زندگی کے دیگر شعبوں میں ہلچل مچا دی تھی۔

لیکن سمترا نندن پنت نے چھایا واد کو صحیح معنوں میں ہندی شاعری میں پیش کیا۔ جدید ہندی شاعری میں چھایا واد کی اصطلاح سب سے زیادہ مشہور ہے۔ لیکن تعجب اس بات کا ہے کہ سب سے زیادہ لاعلمی بھی لوگوں کو اسی سے متعلق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر کسی نے اپنی فکر کے مطابق اس کی تفسیر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض ہندی نقّادوں کے نزدیک چھایا واد اور رہسیہ واد ایک ہی چیز ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے پہلے رام کرشن شکل نے وضاحت کی کہ چھایا واد فطرت میں انسانی زندگی کے عکس کا نام ہے، اور رہسیہ واد ساری کائنات میں خدا کے جلووں کی جھلک ہے۔ جس کا کوئی روپ نہ ہو، اس کا عکس نہیں ہو سکتا۔

سمترانندن پنت

ہندی میں سمترانندن پنت کے علاوہ سوریہ کانت ترپاٹھی، نرالا، مہادیوی ورما، اور جے شنکر پرساد چھایا واد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں پرساد نے اپنی نظم 'آنسو' سے ہندی ادب کو حیران و ششدر کیا، وہیں سوریہ کانت ترپاٹھی اور نرالا بھی اپنے باغیانہ انداز سے ہندی شاعری میں بھونچال لا رہے تھے۔ لیکن پنت اپنی نرم نرم مدھری شاعری سے لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنے رہے۔

مہادیوی ورما نے اپنی درد بھری آواز میں چھایا واد کے اسلوب میں ایسی ایسی معرکہ آرا نظمیں لکھیں کہ ہندی شاعری میں قیامت برپا ہو گئی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پرانے لکھنے والوں نے اس جدید رنگ سے سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا اور اسے کبھی نہیں سراہا۔ لیکن عام قاری نئے اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے قدیم رنگ کے شعرا کو نظر انداز کر کے اپنا رشتہ نئے اسلوب سے جوڑ لیا۔

چھایا واد کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے تین چیزیں ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے:

(۱) چھایا واد کا تعلق صرف قدرت سے ہے۔

(۲) اس میں قدرت باہوش اور ذی حیات تصور کی گئی ہے۔

(۳) قدرت میں سارے وہ احساسات جلوہ نما ہیں، جو انسان میں ہوتے ہیں۔

پہلے پرساد، مہادیوی ورما اور نرالا کی نظموں کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں تاکہ اس پس منظر میں پنت کی شاعری کی برتری اچھی طرح سمجھ میں آ سکے۔ پرساد کے مجموعۂ کلام "جھرنا" کی ایک نظم کا عنوان ہے: پریچے (جان پہچان) اس میں ان قدرتی چیزوں کی اس دلکشی کا بیان ہے، جو مرد اور عورت میں ہوتی ہے۔ اس دلکشی کی قدر و قیمت مزید بڑھ گئی ہے کیونکہ جن چیزوں کے درمیان یہ دلکشی ہے، وہ ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں۔

رجنی کے رنجک اُپ کرن بکھر گئے
گھونگھٹ کھول اوشا نے جھانکا پھر

ارُن اپانگوں سے دیکھا کچھ ہنس پڑی
لگی ٹہلنے پراچی پرانگن میں تبھی

[رات کے تسکین دینے والے وسائل بکھر گئے۔ صبح کی شفق نے پردہ الٹ
دیا اور۔ سرخ ڈوروں والی ٹیڑھی آنکھ سے دیکھا اور مسکرانے لگی۔ پھر کیا
تھا، مشرق کی کرنیں گھر کے آنگن میں ٹہلنے لگیں۔]

اسی طرح مہادیوی ورما رات سے بات چیت کرتی ہیں۔ رات کی ایک ایک بات سنتی اور سمجھتی ہیں۔ دیکھیے، ہوا کا پیامبر محبوب کا پیغام لایا ہے اور محبوبہ سے ہار سنگار کرنے کے لیے کہہ رہا ہے:

او وِبھاوری	اے تاروں بھری رات!
چاندنی کا انگ راگ	چاندنی کے سنگیت کو
مانگ میں سجا پراگ	اپنی مانگ میں پہلے سجا
رِشم تار باندھ مرُدُل	نرم نازک نور کے
چکر بھار ری	تار سے اسے گوندھ
او وِبھاوری	اے تاروں بھری رات!
اَنِل گھوم دیس دیس	بادل دیس بدیس گھوم کر
لایا پریہ کا سندیس	تیرے پریتم کا سندیسہ لایا ہے۔
موتیوں کے سَمَن کوش	اس پر موتیوں کے خزانے نچھاور
وار وار ری	کرنے کے لیے تیار ہو
او وبھاوری	اے تاروں بھری رات!

نرالا جی نے تو ملیانل اور کلی میں پریم کی چھیڑ چھاڑ بھی دکھائی ہے۔ یہ رومانک تصور دیکھیے، جس میں قدرت کے پردے میں وصال کا منظر دکھائی دیتا ہے:

وجن ون ولری پر	ایک جنگل کی گھنی بیل پر
سوتی تھی سہاگ بھری	ایک بیاہتا سوتی تھی

سمترانندن پنت

سپنیہ شیپن مگن

آمل کومل تنو ترونی جوہی کی کلی

دِرگ بند کیے شتھِل .. پترانک میں

واسنتی نشا تھی

درہے وِدُھر پریہ سنگ چھوڑ

کسی دور دیش میں تھا پون

جسے کہتے ہیں ملیانل

آئی یاد وچھڑن سے ملن کی وہ مدھر بات

آئی یاد چاندنی کی دھلی ہوئی آدھی رات

آئی یاد کانتا کی کمپت کمنی گات

پھر کیا ؟ پون

اپون سر سرِیتا گہن گری کا فن

کنج لتا پنجوں کو پار کر

پہنچا جہاں اس نے کی کیلی

کلی کھلی سا تھ

سوتی تھی

جانے کہو کیسے پریہ آگمن وہ ؟

نایک نے چومے کپول

ڈول اٹھی وَلری کی لڑی جیسے ہنڈول

اس پر بھی جاگی نہیں

چوک کھشما مانگی نہیں

نِدرَلس بنکم وِشال نیتر موندے رہی

کمباتوالی تھی، یوون کی بِدرا پیے

کون ہے

بڑے اُس نایک نے
پنٹ ٹھکرائی کو
کر جھانکو جھڑیا سے
سُندر شکمار دیہہ ساری جھکھور ڈالی
مسل دیے گورے کپول گول
چونک پڑی یووتی
چکت چتون نج چاروں اُور پھیر
ہیر پیارے کی سیج پاس
نمرِ مکھی ہنسی کھلی
کھیل رنگ پیارے سنگ

[محبت کے خواب میں کھوئی نرم و نازک جوہی کی جوان کلی چپ چاپ آنکھیں بند کیے پتّوں میں پیار کی رات تھی فراق سے بیحال' اپنے پیا کا ساتھ چھوڑے' پون کسی دور دیش میں تھا جسے ملیانل کہتے ہیں. اپنے پیا سے جدا ہونے کی وجہ سے اُسے وصالِ یار کی پیاری پیاری باتیں یاد آئیں. چاندنی سے دھلی' آدھی رات بھی اسے یاد آئی. اسے اپنی رفیقِ حیات کا نرم و نازک بدن یاد آیا. پھر کیا؟ پون باغوں' جھاڑیوں' ندیوں' کھائیوں اور بیلوں کے ڈھیروں کو پار کر کے وہاں پہنچا' جہاں اُس نے اُس کلی کو فریفتہ کیا تھا. وہاں وہ محوِ خواب تھی. جانتے ہو' اُس نے اپنے پریتم کا استقبال کیسے کیا؟ اُس کے دل کے مالک نے اُس کے گال چومے وہ بیل کی لڑی جھولے کی طرح کانپ گئی. اس پر بھی کلی بیدار نہیں ہوئی. اُس نے اپنی غلطی کی معافی بھی نہیں چاہی آنکھوں میں نیند بھری' وہ آنکھیں بند کیے' جوانی کی شراب میں سرمست پڑی رہی اب اس گستاخی پر اس سے کون کچھ کہے' نیَن اس ظالم دل کے مالک نے اس مغرور کو حکم دیا کہ وہ جاگے. اس کا خوبصورت نرم اور نازک بدن' در گول مٹول

گال مسل دیے۔ وہ مستِ شباب دوشیزہ چونک اٹھی۔ اس کی حیران
پیشانی کو چھوڑ، اس نے چاروں طرف نظر ڈالی اور اپنی محبوبہ کو سیج کے
پاس لے آیا۔ پیاری پیاری نرم و نازک ہنسی بکھر گئی اور اس نے پیار کے
ساتھ پریم کا کھیل کھیلا۔]

لیکن جہاں تک پنت جی کا تعلق ہے، انھوں نے قدرت کا ذکر کہیں زیادہ گہرائی سے
کیا ہے۔ انھوں نے اسے کائنات میں سب سے زیادہ مجسم صورت میں دیکھا اور
اسی پہلو سے اپنے فن میں استعمال کیا ہے۔ ان کے باغ پھولوں کے پیالوں
سے لدے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاں بادل بکری کے ننھے میمنوں کی طرح پہاڑوں
پر اچھلتے کودتے، ناچتے، کلولیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جب کوئی شاعر
قدرت کا بیان کرے، تو اسے سب چیزیں سچی دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے قدرت
کا محض جسم ہی نہیں دیکھا، اس کا دل بھی دیکھا ہے۔ ندی میں کہتے ہیں:

میں بھی اس کے گیت سیکھنے
آج گئی تھی اُس کے پاس
اُس کے کیسے مِرِدُل بھاوہیں
اُجوّل تن، مَن بھی اُجوّل

لہروں کا ناچ دیکھ کر ان کا دل فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ ایک موج کو اٹھتے
دیکھ کر کہتے ہیں:

چھوٹی موٹی سی تم پنچات	چھوٹی موئی کی طرح
چھوکر اپنا ہی مِرِدُو گات	تم نازک چال چل کر
مرجھائی ہو اگیات	اپنے آپ ہی ختم ہو جاتی ہو

صاف ستھرے نیلے آسمان پر رات کے پہریدار ستاروں کے بارے میں کہتے ہیں:

جگ کے انادی پتھ درشک وے	وہ ازل سے رہنمائی کرنے والے ہیں۔
مانو پران کی لگی دَرِشٹی	جن پر انسان کی آنکھیں جمی ہیں۔

سمترانندن پنت

ان کو قدرت کی سب چیزوں میں وہی پریم دکھائی دیتا ہے، جو عام مرد اور عورت کے درمیان جلوہ نما ہے:

مٹی کی سوندھی سُگندھ سے — مٹی کی سوندھی خوشبو سے
ملی شو کسُم سُمنوں کی سُورَ بھ — نازک پھولوں کی دولت ملی،
رُوپ سَپرش رَس شید گندھ کی — جس کا لمس اور لفظوں کی لذت کا رس
ہرت دھرا پر جُھکا نیل نبھ — مسرور زمین پر نیلا آسمان جھکا
کیا سمیر نے لپٹ وِٹَپ کو — ہوا نے ننھی کونپل کو الٹ پلٹ کر دیا۔
کیا پلودں میں رُوما نچت — نئے انکھووں کو ولولہ بخشا،
انگڑائی لے، بانہہ کھولنا — بازو کھول کر، انگڑائی لیتی ہوئی
سکھلایا ڈالوں کو کنپت — ڈالیوں کو کانپنا سکھایا۔
کیا کرنوں نے چوم کھلائے — کرنوں نے رنگ بھرے چہروں
رنگ بھرے پھولوں کے آنن — کو چوم کر کھلا دیا ہے
سَرجن پُران دے سپرش پریم کا — محبت کے لمس سے
سچ ہے جیون کرتا دھارن — سچائی کو زندگی ملتی ہے

قدرت کو سب نے اپنے اپنے رُخ سے دیکھا، لیکن پنت جی نے بے نیازانہ انداز سے اس کا مشاہدہ کیا اور بغیر کسی ایچ پیچ یا لگی لپٹی کے اسے اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ یہی ان کا دوسروں سے مابہ الامتیاز ہے، اور یہی ان کی ہندی شاعری کو بے مثال دین ہے۔

ادبی ہنگامے:

بائرن کی طرح سمترانندن پنت بھی جب ایک حسین صبح کو نیند سے بیدار ہوئے تو انھوں نے شہرت کی دیوی کو اپنا دروازہ کھٹکھٹاتے پایا۔ ان کی ادبی دنیا میں آمد سے پہلے ہندی شاعری برج بھاشا کی شاعری تھی۔ برج بھاشا کے شاعر ہی شاعر تھے، اور کسی پہلو سے توجہ کے مستحق نہیں تھے۔ اپنے مجموعۂ کلام 'پلو' کے

اشاعت سے پہلے انھوں نے کھڑی بولی میں شعر کہے، اور کھڑی بولی کی حمایت میں ایک طویل مضمون لکھا، جس میں دعوی کیا کہ ہندی شاعری صحیح معنوں میں کھڑی بولی ہی کی شاعری ہے۔ برج بھاشا کا اپنی جگہ مقام ہوگا لیکن وہ کھڑی بولی کی شاعری سے ٹکر نہیں لے سکتی۔ اس زمانے میں برج بھاشا کے سب سے بڑے شاعر دویدی جی تھے۔ جب ۱۹۲۶ء میں 'پلو' شائع ہوئی، تو ہنگامہ مچ گیا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ پنت جی نے بڑی جرأت سے کھڑی بولی کے حق میں آواز اٹھائی اور کہا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ لوگ برج بھاشا کو بھول جائیں۔ وہ کسی زمانے میں ادب کا معیار ضرور رہی، لیکن اب کھڑی بولی کی ضرورت ہے۔ برج بھاشا کے شاعر تصنع اور بناوٹ میں یقین رکھتے ہیں، لیکن اصلی اور حقیقی شاعری کھڑی بولی ہی میں ہو سکتی ہے۔ 'پلو' کا پیش لفظ ایک باغیانہ آواز تھی، جس نے دقیانوسی اور روایت پرست حلقوں میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ پرانے دور کے سب شاعر اس کل کے لونڈے کو چاروں شانے چت گرانے کے لیے شمشیر بکف ہو گئے۔ اس پیش لفظ میں یہ وضاحت بھی کی گئی تھی کہ نئے لکھنے والوں کا نقطۂ نظر کیا ہے، اور جدیدیت کیا ہے۔ ۱۹۲۶ کا لکھا ہوا یہ پیش لفظ آج بھی اتنا ہی صحیح ہے، جتنا اس وقت تھا۔ اپنے دلائل اور جذبات کی بدولت یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ اس وقت لکھا گیا تھا، جب ہندی میں تنقید بالکل بے بضاعت تھی۔ انڈین پریس، الہ آباد نے یہ کتاب چھاپنا منظور کر لیا تھا۔ اور کتاب ابھی چھپی بھی نہیں تھی کہ ادبی حلقوں میں اس پیش لفظ کے چرچے ہونے لگے۔ پنت جی ہر شام برج بھاشا کے شاعر بینی پرشاد کے ہاں جایا کرتے تھے۔ ایک دن شیام بہاری مشر جی بینی بابو کے پاس آئے۔ بینی بابو انھیں پنت کے پاس لے گئے۔ وہاں اس پیش لفظ کی بات نکلی۔ پنت جی سے کہا گیا کہ وہ پیش لفظ انھیں سنائیں۔ پنت جی نے مضمون پڑھ کے انھیں سنایا، تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ اب انھوں نے پنت جی سے اپنی کوئی نظم سنانے کو کہا۔ مشر جی کہنے لگے یہ کس بحر میں ہے!

بھر سنتے سنتے میرے کان اتنے حساس اور ماہر ہو گئے ہیں کہ میں کوئی نظم سنتے ہی فوراً اس کی بحر پہچان جاتا ہوں! اس نظم کی کوئی بحر نہیں ہے۔ جب پنت جی نے بحر کی کتاب کے مطابق اسے سولہ ماتراؤں کی بحر ثابت کر دیا، تو کہنے لگے: ہوگا، لیکن میں نے آج تک نہیں سنی۔ دراصل انھیں اتنا پنت کی شاعری پر غصہ نہیں تھا، جتنا ان کی برج بھاشا کی شاعری کی تنقید پر تھا۔

بعد میں شیام بہاری مشر نے اس پیش لفظ کی بہت تعریف کی اور تسلیم کیا کہ پنت جی نے ہندی شاعری کو نیا موڑ دیا ہے، وہ سچے معنوں میں نئی آواز ہیں اور عزت کے مستحق۔ برج بھاشا کے شاعروں نے انڈین پریس والوں سے اس بات کا تقاضا کیا کہ 'پلو' پیش لفظ کے بغیر شائع کی جائے، ورنہ اس کے خلاف مظاہرہ کیا جائیگا۔ پنت جی سے بھی پیش لفظ تبدیل کرنے کے لیے کہا گیا۔ لیکن اس دوران میں یہ پیش لفظ دوسرے اخباروں، ماہناموں وغیرہ میں اپنی اصلی شکل میں چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکا تھا، اور ہر جگہ اس کا چرچا تھا۔ یہ روایتی شاعری پر ایک زبردست چوٹ ہی نہیں تھی، بلکہ وقت کی آواز تھی۔ اس سے خیالات میں جدّت اور بلند پروازی آئی۔

میرے یووَن کے پیالے میں	میری جوانی کے پیالے میں
پھر وہ بالاپن بھر دو	پھر وہی بچپن بھر دو
ویوگی ہوگا پہلا کوی	شاعرِ اوّل کوئی ہجر کا مارا ہوگا
آہ سے اپجا ہوگا گان	اور اس کی آہ ہی سے پہلا مصرع پیدا ہوا ہوگا

ریشمی گھونگھٹ بادل کا	بادلوں کے ریشمی نقاب کو
کھولتی ہے کمُد کلا	نزاکتِ فن کھول دیتی ہے۔
تمھارے ہی مُکھ کا تو دھیان	اسی طرح تمھارے حسن کا خیال
مجھے کرتا تب انتر دھان	میرے پوشیدہ خیالات کو عیاں کر دیتا ہے

پنت جی کی شہرت کے ساتھ مخالفت بھی بڑھی۔ مثلاً سوریہ کانت ترپاٹھی کو پنت کی شاعری ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ انھوں نے ان کی شاعری کے خلاف کئی مضامین لکھے۔ پنت جی ان کے سامنے تو ان سے کچھ نہ کہتے، لیکن دل سے انھیں اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

اپریل ۱۹۴۸ کی بات ہے پنت جی الہ آباد سے الموڑہ جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ امرت لال ناگر ان سے ملنے کو آئے ہوئے تھے۔ بچن بھی موجود تھے۔ سہ پہر میں وہ کمرے کے اندر چائے پی رہے تھے کہ باہر برآمدے میں کسی کے پانو کی آہٹ سنائی دی۔ کیا دیکھتے ہیں کہ برآمدے میں ایک پہلوان کھڑے ہیں۔ ارے، یہ تو نرالا جی ہیں۔ پانو میں پنجابی جوتا، میلا سا تہبند، لمبا کرتا، منڈے سر پر چھوٹا سا صافہ، منھ اور گردن دھول سے اٹے ہوئے، بڑی بڑی آنکھیں، آنکھوں میں لال ڈورے۔ وہیں سے کھڑے کھڑے پوچھا:

"پنت ہیں؟"

"ہیں"

"ملونگا"

"آئیے"

کمرے میں گھستے ہی انھوں نے غصّے سے کہنا شروع کیا: پنت، تم نے کویتا تو بہت لکھی، اب ہماری تمھاری کشتی بھی ہو جائے۔ میں نرالا نہیں ہوں، میں تو تن خان کا بیٹا موتن خان ہوں۔ میں نے گاماں، زبسکو، ٹیگور سب کو چت کیا ہوا ہے۔ آؤ، آؤ۔ یہ کہہ کر انھوں نے کپڑے اتار دیے، سر سے صافہ اتار کر لنگوٹے کی طرح باندھ لیا، اور لگے ڈنڈ پر ڈنڈ پیلنے۔ پھر تال ٹھونکا۔ اس پر امرت لال ہوشیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ ہُت شاید مل جائے، لیکن پنت جی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ انھیں چپ دیکھ کر نرالا نے بچن کی طرف دیکھا: "تم آؤ"۔ پنت نے کہا: "نرالا جی، آپ تو آپ کے قدم چھونے کے لائق بھی نہیں، آپ سے کشتی کیا لڑونگا"۔ اس پر نرالا کچھ شانت

ہو گئے۔ پنت نے کہا: "نرالا جی، چائے پیجیے ۔" بولے: "میں مدعو نہیں ہوں، البتہ پانی پی سکتا ہوں۔ لوٹے میں لانا" کون کہہ سکتا ہے نرالا دیوانہ تھا یا ہوشیار، باہوش یا بے ہوش۔ غرض انھوں نے غٹ غٹ پانی پیا، اور لپک کے کمرے سے باہر نکل گئے۔ پنت ان سے ملنے کو نہ جاتے، تو ناراض ہوتے۔ ملنے جاتے تو وہ گالیاں دیتے۔ لیکن پنت جی ان سے کچھ نہ کہتے۔ کیونکہ نرالا حسد کی آگ میں جل کر اپنا سب کچھ کھو چکے تھے۔ ان کی زندگی کی مٹھاس زہر میں بدل کر رہ گئی تھی اور یہی وہ دوستوں میں تقسیم کرتے رہتے تھے۔ پنت جی سے وہ اس لیے بھی ناراض تھے کہ پنت نے کبھی انھیں اپنی کوئی کتاب کیوں نذر نہیں کی! بہرحال، وہ کسی نہ کسی بہانے کوئی نہ کوئی بات کہتے رہتے، اور ناراض ہوتے رہتے۔

نرالا کے علاوہ بچن بھی عجیب شخصیت کے مالک تھے۔ پنت کے ساتھ ان کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ ان کے پاس پنت کے خطوط کا بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ جب بچن نے یہ خط چھاپ دیے، تو پنت بہت ناراض ہوئے کیونکہ وہ ان میں حذف و اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اور بچن نے انھیں، ان کے اعتراض کے باوجود، جوں کا توں شائع کر دیا۔ بچن نے پنت کی شاعری پر بھی اعتراض کیا کہ یہ نہ ترقی پسندانہ ہے، نہ حقیقت پسندانہ۔

بچن کا قول تھا کہ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۴۰ء تک مہاراجوں کے محلوں میں رہنے والا پنت بھلا غریب مخلوق اور کسانوں کے بارے میں کیا لکھیگا۔ اس لیے ان کی نظر میں پنت کی شاعری مصنوعی تھی۔ پنت نے بھی اس کا جواب دیا اور کہا کہ ہندستان کی راجدھانی نئی دلی کے راج محلوں میں رہنے والا بچن خود کیونکر غریبوں کی نمایندگی کا دعوا کرتا ہے! وہ اونچے حلقوں میں گھومتا ہے۔ موٹر کار اس کے پاس، نوکر چاکر اس کی خدمت کرنے کو موجود، بھلا اسے غریبوں کے مسائل سے کیا سروکار!

پنت بھی ہیمنگوے کے ہیرو کی طرح کبھی گھبراتے نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی شکست

قبول نہیں کی۔ وہ ان سب مخالفتوں کو زندگی کے کھیل کا ایک حصّہ سمجھتے تھے۔ وہ عمر بھر معاندانہ تنقیدوں سے بے نیاز اپنی شاعری میں کھوئے رہے۔ شعر کہتے رہے۔ ادبی تخلیقات کرتے رہے۔ دوستوں پر جان نچھاور کرتے رہے۔ کوئی ان سے ملنے آتا ——— چھوٹا بڑا، وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرتے۔ سب سے محبت بھرا، عزت کا سلوک کرتے۔ وہ بڑے شاعر ہی نہیں تھے، بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی میں کتنے دکھ آئے۔ تینوں بھائی ان کی آنکھوں کے سامنے انتقال کر گئے۔ انھوں نے توصلہ نہیں چھوڑا۔ بہنیں مر گئیں، ساری عمر ان کے بچوں کی مدد کرتے رہے۔ ان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد خیال کیا اور اس کا مداوا کرتے رہے۔ ایسے عظیم انسان کہاں روز روز پیدا ہوتے ہیں! پس ان کے اٹھ جانے سے ہم نے صرف ... یادگار شاعر ہندی ادب کا ایک ستون ہی نہیں کھویا، بلکہ ہم ایک انسان ... بہت بڑے انسان سے بھی محروم ہو گئے۔

کبیر احمد جائسی (علیگ)

ایک ادبی سفرنامہ

(۱)

فارسی ادب پڑھتے پڑھاتے تقریباً ربع صدی کا عرصہ گذر چکا ہے، مگر ابھی تک اس سرزمین کے دیدار سے آنکھیں محروم تھیں، جس کے ادبا و شعرا کی تحریروں کو پڑھ پڑھ کر زندگی کے بہت سے رازہائے سربستہ بےنقاب ہوئے اور فکر و خیال کو نئی جولانی ملی۔ خوش قسمتی سے اس سال (۱۹۷۷ء) ایران کے دارالحکومت تہران کو طائرانہ نظر سے دیکھنے اور اس کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ اس سفر کی تقریب یہ تھی کہ یکم فروری ۱۹۷۷ء سے تین فروری تک "مجلسِ ملی انجمنِ استادانِ فارسی" کی طرف سے ایک سیمینار کا انعقاد طے پایا۔ حکومتِ ایران کی وزارتِ فرہنگ و ہنر نے ہندستان کے فارسی اساتذہ کو بھی دعوت دی وہ اس سیمینار میں شرکت کریں۔ چنانچہ ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے چودہ اساتذہ وزارتِ فرہنگ و ہنر کی دعوت پر تہران گئے۔

اساتذہ کا یہ وفد حکومتِ ایران کا مہمان تھا، حکومتِ ایران نے اپنی روایتی فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وفد کے اراکین کے قیام و طعام اور آسائش کا جس طرح خیال رکھا، وہ اس کی روایات کے عین مطابق تھا۔ سیمینار تو تین ہی دن کا تھا اور بیرونی وفود کو مزید پندرہ دنوں تک ایران میں رکنا تھا اس لیے وزارتِ فرہنگ و ہنر نے اس بات کا انتظام کیا کہ یہ وفود ایران کے تاریخی مقامات کو دیکھیں، شہر اور بازاروں کی سیر کریں اور جہاں تک ممکن ہو، تہران کے اہلِ علم حضرات سے مل کر باہم تبادلۂ خیالات کریں؛ تین دن اصفہان اور شیراز میں گذاریں اور پھر اپنے وطن واپس جائیں۔ اس سفر کے دوران ان سطور کے راقم کو تہران میں کیا محسوس ہوا، کیا کیا چیزیں دیکھیں، کن کن لوگوں سے

ملاقاتیں کیں، اور اس شہر کے بارے میں کیا تاثر لے کر وطن عزیز واپس آیا، اس کا ذکر قارئین کے لیے بھی دلچسپ ہوگا، اس لیے ذیل میں اس سفر کی مختصر داستان لکھی جارہی ہے، جس سے ایران کی موجودہ حالت، اس کے افراد کے سوچنے سمجھنے کا انداز، وہاں کے طریقِ زندگی اور مسائل پر بھی ایک ہلکی سی روشنی پڑیگی۔

بےمحل نہ ہوگا اگر اس موقع پر یہ عرض کردوں کہ اس سفر کے سلسلے میں خانۂ فرہنگ ایران دہلی کے اراکین کا بالعموم اور پروفیسر فتح اللہ مجتبائی کا رویہ بالخصوص وفد کے نمایندوں کے لیے نہ صرف طمانیت بخش تھا بلکہ راہ نما بھی انھوں نے ۲۴ جنوری کی رات کو اس وفد کے نمایندوں اور دلّی کے اصحابِ علم کی دعوت کی۔ انھوں نے وفد کے نمایندوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سال تہران میں بڑی سخت سردی پڑ رہی ہے، لہٰذا وفد کے نمایندے پوری تیاری کے ساتھ یہ سفر کریں تاکہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ ان کے اس ارشاد کے مطابق سب ہی لوگ پوری تیاری کے ساتھ عازمِ سفر ہوئے۔

۲۵ جنوری ۱۹۷۷ء کی صبح ہم لوگ بمبئی کے لیے روانہ ہوئے۔ ان دنوں دلّی میں کافی سردی پڑ رہی تھی اور کئی دن سے ابر و باد کا سلسلہ چل رہا تھا جس وقت ہمارا جہاز روانہ ہوا اس وقت بھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ جہاز کے بلند ہونے کے بعد کافی دیر تک بادلوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا؛ تقریباً سارے راستے یہی کیفیت رہی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہم بمبئی پہنچے۔ خانۂ فرہنگ ایران، دلّی نے ہم لوگوں کے قیام کا عارضی انتظام جوہو کے ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ ہوٹل میں دوپہر کا کھانا کھا کر میں اور ڈاکٹر سمیع الدین احمد صاحب سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے اور ہوٹل کی پشت پر آکر دیر تک سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا نیلگوں پانی اور ریت کا لامتناہی سلسلہ اور جگہ جگہ ناریل کے درختوں کے جھنڈ عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ ہوٹل میں تین چار گھنٹے گزار کر یہ قافلہ دوبارہ ہوائی اڈے پر آیا۔ بمبئی سے چار اور ساتھیوں کا اضافہ ہوا۔ اس طرح چودہ افراد کا یہ وفد تہران پہنچنے کے مراحل طے کرنے لگا۔ بمبئی سے چل کر طیارہ کراچی میں رکا؛ یہاں وہ پون گھنٹہ کھڑا رہا۔ ہم لوگ جہاز ہی میں بیٹھے

بیٹھے ہوائی اڈہ کے اس پار دیکھنے کی کوشش کرتے رہے جہاں ہم میں اکثر کے بھائی، بہن، عزیز، اقربا دوست سب ہی رہتے ہیں۔ کراچی سے چل کر جہاز تہران کے ہوائی اڈے مہرآباد پر رکا۔ اُس وقت ہماری گھڑیاں رات کے بارہ بجا رہی تھیں، لیکن مقامی وقت کے مطابق ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ ہوائی اڈے پر وزارت فرہنگ و ہنر کے نمائندے سہرابی صاحب خیر مقدم کے لیے موجود تھے۔ چونکہ وفد حکومتِ ایران کا مہمان تھا اس لیے ہمارے سامان وغیرہ کی کسٹم کے دفتر سے جانچ پڑتال نہیں ہوئی۔ ہم چند منٹ میں ہوائی اڈے سے باہر آگئے اور ہمیں ہوٹل رود کی پہنچا دیا گیا جہاں ہمارے قیام کا انتظام تھا۔

اگلی صبح آنکھ خاصی دیر سے کھلی۔ رات میں کسی وقت خاصی برفباری ہوئی تھی، جس کے آثار ہر طرف بکھرے نظر آ رہے تھے۔ لیکن اس وقت دھوپ نکلی ہوئی تھی اور ہمارے کمرے کی کھڑکی سے کوہِ شمیران صاف نظر آ رہا تھا۔ دھوپ کے باوجود ہر طرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ ابھی ہم لوگ ناشتہ سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ وزارتِ فرہنگ و ہنر کے نمائندے کاریں لے کر آ گئے تاکہ وفد کو "موزۂ[1] ہنرہای ملی" دکھلانے لے جائیں۔ ہم لوگ بعجلت تیار ہوئے۔ اس میوزیم میں گھومتے وقت بارہا اس بات کا احساس ہوا کہ ایرانی قوم نے اپنے نوادرات اور ہر طرح کی یادگاروں کو کس طرح محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں حسن و خوبی کے ایسے ایسے نادر مرقعے نظر آئے، اور انسانی ہنرمندی کے ایسے ایسے باقیات دیکھنے کو ملے کہ دل پر ایک انبساط انگیز عالمِ تحیر طاری ہو گیا۔ یہاں ہم نے ایران کے قدیم ترین آلاتِ موسیقی بھی دیکھے۔ بربط، چنگ، رباب، ستار، غرض کہ ہر قسم کے قدیم و جدید ساز یہاں موجود تھے۔ ہماری فرمائش پر کارپردازوں نے بعض ساز بجا کر بھی دکھلائے۔ میوزیم کے ایک حصہ میں کاشی کاری کا کام ہو رہا تھا، ہم دیر تک اور بغور اسے دیکھا کیے۔ یہاں ہر فنکار اپنے اپنے کام میں منہمک تھا۔ کوئی

۱۔ موزہ : میوزیم

پتھر کے ٹکڑوں پر نقشہ کھینچ رہا تھا، کوئی نقشے کو سنوارنے میں لگا ہوا تھا، کوئی بنے ہوئے کام پر آخری پالش کر کے اسے چمکا رہا تھا۔ ہم یہاں دو گھنٹے ٹھہرے۔

ہوٹل واپس آئے، تو دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس لیے ہم سیدھے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ سرزمینِ ایران میں ہمارا پہلا کھانا تھا۔ مینو کارڈ میں ہر چیز کا نام ہمارے لیے نیا تھا اور ہم یہاں کے کھانوں سے ناواقف بھی تھے۔ بہرحال میں نے سوپ، کباب قفقازی اور بستنی (آئس کریم) کا آرڈر دے ہی دیا۔ صبح جب ہم میوزیم کی سیر کر رہے تھے، تو چند ایرانیوں نے ہم سے کہا تھا کہ آپ جب تک یہاں رہیں، سنگترے یا مالٹے کا رس ضرور پیتے رہیں۔ اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ایک گلاس مالٹے کا رس بھی منگوایا۔ اتنے میں کھانا آگیا۔ پتا چلا کہ میں نام سے دھوکا کھا گیا۔ کباب کے بارے میں ہمارا جو تصور ہے، کباب قفقازی اس کے بالکل برعکس نکلا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گوشت کے ٹکڑوں کو سینک کر پلیٹ میں رکھ دیا گیا ہے۔ بہرحال اس پر لیمو نچوڑا گیا، نمک اور سیاہ مرچ چھڑکی گئی اور کھانا شروع ہوا۔ ہمارے احباب میں سے ایک صاحب نے مرغابی منگوائی تھی اور دوسرے نے مچھلی۔ ہندستانی معیار کے مطابق ان میں مرچ مصالحہ کا نام نہ تھا۔ اس لیے ہمیں اس میں پھیکی سی آتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنے دوست کے اصرار پر ایک لقمہ مرغابی کا لے لیا، چونکہ میں نے اسے پہلی مرتبہ کھایا تھا، شاید اسی وجہ سے وہ اتنی بری معلوم ہوئی کہ پھر کبھی اسے طلب کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔ کباب قفقازی کے ساتھ سلاد اور کچھ تلے ہوئے آلو بھی تھے بہرحال کسی نہ کسی طرح ایران کا پہلا کھانا ختم ہوا۔

ساڑھے چار بجے ہم لوگ 'کاخِ مرمر' دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وسیع و عریض محل کی سب سے اہم اور موثر چیز یہ ہے کہ قاچاری بادشاہوں کے آخری زمانے کے جبر و استبداد، غیر ملکیوں کی ایران پر چہار جانب سے یورش، اور پھر ایران کا ان تمام جکڑبندیوں اور چیرہ دستیوں سے نجات پانا، تصویروں (بلکہ ماڈلوں) کے ذریعے سے دکھایا گیا ہے۔ ان میں بھی دو برنجی ماڈل خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں ایک پر کٹی ہوئی زنجیروں کو بڑی خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے۔ یہاں کا وہ ہال بھی خاص طور سے دیکھنے کے قابل ہے، جسے

"تالارِ آئینہ" کہتے ہیں۔ یہ ہال ہر طرف سے آئینوں سے مزین ہے ا سے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ شیش محل کس کو کہتے ہیں۔ کاخِ مرمر کے احاطے میں ہر طرف برف ہی برف دکھائی دے رہی تھی۔ اس شدید برفباری کے زمانے میں بھی سرو کے درخت سرسبز اور ہرے بھرے دکھائی دیے۔ ایسے موسم میں جب کہ سبزہ تک جل جاتا ہے "سروِ آزاد" موسم کے شدائد کا نہ صرف مقابلہ کرتا ہے بلکہ اس کے اثرات سے خود کو محفوظ بھی رکھتا ہے۔ اسی سہ پہر ہمیں "موزۂ نگارستان" بھی دیکھنا تھا، اس لیے سب لوگ کاخِ مرمر کی سرسری سیر کرتے ہوئے باہر آ گئے، اور بعجلت "موزۂ نگارستان" کے لیے روانہ ہو گئے۔ تاکہ اس کے بند ہونے سے پہلے اس پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال لیں۔

ویسے تو یہ میوزیم کئی کمروں پر پھیلا ہوا ہے مگر میں اس کے صرف ایک کمرے کا ذکر کروں گا، جس میں بارھویں اور تیرھویں صدی ہجری کے دستکاری کے نمونے محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ اس کمرے میں بہت سی تصویریں (نقاشی) قلمدان، آیینے اور خطی نسخے محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ یوں تو یہاں کی ہر چیز دیدنی تھی، مگر میں خاص طور سے قلمی نسخوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں جو قلمی نسخے نظر سے گزرے ان کا تھوڑا سا ذکر کر دینا نامناسب نہ ہو گا۔ یہاں گلستانِ سعدی کا ایک بڑا اچھا نسخہ دیکھنے کو ملا جس کو عبدالوہاب حسینی مشہدی نے ۹۶۶ھ میں سلطان ابراہیم میرزا کے لیے لکھا تھا۔ اپنی قدامت کے لحاظ سے تو یہ نسخہ کسی خاص اہمیت کا حامل نہیں ہے، مگر اس کا خط اور اس کی تزیین قابلِ دید ہے۔ دیوان حافظ کا ایک مذہّب نسخہ بھی اس میوزیم کی زینت ہے۔ اس نسخہ کو پیر حسین شیرازی نے ۹۵۴ھ میں لکھا تھا۔ استاذی پروفیسر نذیر احمد صاحب کو اس نسخہ سے تقریباً ایک صدی پہلے کے مکتوبہ دو نسخے مل چکے ہیں انھوں نے اسے مرتب کر کے شائع بھی کروا دیا ہے اس لیے قدامت کے لحاظ سے یہ نسخہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے، مگر اپنے خط اور تذہیب کی بنا پر اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ فنِ خطاطی کے لحاظ سے تین قطعات بھی خاصے اہم نظر آئے۔ یہ تینوں نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں جن میں ایک مذہّب بھی ہے۔ مذہّب قطعہ مالک دیلمی (م: ۹۶۸ھ) کا لکھا ہوا ہے۔ دوسرے دو قطعات

جن سے ایک میر عماد الحسینی کا لکھا ہوا ہے دوسرا میر علی ہروی کا۔ کلام پاک کے بھی کئی خطی نسخے نظر آئے، جن میں سے کچھ نسخ میں ہیں، کچھ نستعلیق میں۔ ملکہ نور جہان کا ایک مذہّب تصویر چہ بھی نظر پڑا جس کے لیے یہ بتلایا گیا کہ اس کی پشت پر شاہ جہان کی مُہر بھی ہے لیکن چونکہ یہ تصویر چہ شیشے کی الماری میں بند تھا، اس لیے میں خود یہ مُہر نہ دیکھ سکا۔ چونکہ میوزیم بند ہونے کا وقت ہو چکا تھا، ہم لوگ یہاں سے بادلِ ناخواستہ باہر نکلے[۲۱] اور مغرب کے بعد ہوٹل پہنچے۔

اب پھر کھانے کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میری طبیعت خطر پسند بن چکی تھی۔ اس وقت میں نے پلو کباب اور اشیا کے ساتھ جوجہ کباب لانے کا آرڈر دے دیا۔ یہ کباب بھی نکلا تو سالم کباب ہی کی شکل کا، مگر چونکہ مرغ تھا اور بھوک بھی لگی ہوئی تھی اس لیے بغیر مرچ کا ہونے کے باوجود رغبت سے کھایا گیا۔ اس طرح ایران میں ہمارا پہلا دن دیکھتے دیکھتے ختم ہوا۔

اگلا دن گردشِ شہر اور سیر و تفریح کے لیے وقف تھا۔ ظہر سے قبل ہم لوگ کاروں میں بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر بے مقصد گھومتے رہے۔ دوپہر کے بعد ہم وہ بازار دیکھنے گئے، جو "سبزہ میدان" کے سامنے واقع ہے۔ یہ بازار بجائے خود ایک دنیا ہے۔ اس کے بارے میں دیکھے بغیر کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس بازار کے بعض حصے لکھنؤ کے قدیم بازار نخاس کی یاد دلاتے ہیں۔ جدید ترین دنیا میں قدیم ترین دنیا کا یہ پیوند عجیب منظر پیش کرتا ہے۔ چونکہ ایران میں جمعرات کو نصف دن اور جمعہ کو پورے دن کی تعطیل ہوتی ہے، اس لیے آج یہاں بہت بھیڑ تھی۔ عورتیں ———— برقعے میں بھی، اور جدید ترین لباس میں بھی، بچے، بوڑھے، جوان سب ہی شانہ بشانہ چلتے نظر آئے۔ میری شیروانی بھرے بازار میں بالکل اکیلی تھی! اسی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ پتا نہیں کیوں، کئی آدمیوں نے رک رک کر پوچھا: "پاکستانی ہستید" (پاکستانی ہو؟) میرے "نخیر، ہندی" (نہیں ہندستانی) کہنے پر مجھے کچھ عجیب نظر سے دیکھنے لگے، جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ اس بازار کا ایک واقعہ میرے لیے ناقابلِ فراموش رہیگا۔ میرے ہاتھوں

میں بڑے بڑے بالوں والا دستانہ تھا۔ ایک صاحبزادے کو خدا جانے اس میں کیا نظر آیا کہ انھوں نے اسے میرے ہاتھ سے اتروالیا، خود پہن کر دیکھا اور اپنے دوستوں کو بلا بلا کر دکھلایا۔ جب ہر طرح سے دیکھ چکے تو بار بار پوچھنے لگے "میفروشی" (کیا بیچتے ہو؟) میں نفی میں جواب دیتا رہا اور وہ برابر اصرار کرتے رہے۔ اسی ردوقدح میں کئی منٹ گزر گئے، تو ان کے ایک ساتھی نے اپنی دانست میں بھرپور وار کرتے ہوئے فرمایا "ہدیۂ اسلامی بدہ"۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میں ایک گرم ملک کا رہنے والا ہوں، یہاں کی سردی سے پریشان ہوں، اگر ہدیۂ اسلامی کے طور پر دستانہ انکو نذر کردونگا، تو پریشان ہونگا۔ خیر کسی نہ کسی طرح میرا دستانہ مجھے واپس ملا اب سوالات کی بوچھار شروع ہوئی۔ پہلا سوال تھا "گاو را می پرستی" (تم گائے کی پوجا کرتے ہو؟) میں نے جواب دیا کہ میں مسلمان ہوں اور غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا۔ فوراً دوسرا سوال ہوا: "مردۂ خود را می سوزانی" (تم اپنے مُردوں کو جلاتے ہو؟) میں نے ان سے عرض کیا کہ جس طرح آپ مُردوں کو دفن کرتے ہیں، ہم ہندوستانی مسلمان بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ شاید میرے جوابوں سے ان لوگوں کو تسلی نہ ہوئی۔ پھر سوال کیا کہ ہندوستان میں مسلمان کتنے ہیں؟ اب میری طبیعت مکدر ہو چکی تھی، میں نے جل کر کہا کہ ایران میں مجموعی طور پر جتنے مسلمان ہیں، اتنے ہی مسلمان ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں رہتے ہیں۔ ان لڑکوں کو میری بات پر مطلق یقین نہیں آرہا تھا اس لیے کچھ دیر وہاں رک کر میں نے انھیں ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں بتلایا۔ پتا نہیں، میری باتوں سے وہ مطمئن ہوئے یا نہیں بہرحال دس منٹ کے بعد انھوں نے مجھے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ اس سفر کے دوران اس طرح کے واقعات متعدد بار پیش آئے۔ غالباً فساد کی ساری جڑ میری شیروانی تھی، جب کبھی ٹیکسی پر بیٹھتا، اسی قبیل کے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کا تو ذکر ہی کیا، ایک بار تہران یونیورسٹی کے چند طلبہ نے بھی مجھے پاکستانی خیال کیا۔ میرے انکار کرنے پر اور یہ کہنے پر کہ میں ہندوستانی ہوں، انھوں نے بھی تقریباً ایسے ہی

سوالات مجھ سے پوچھے۔ مجھے اس بات کا بہت افسوس ہوا کہ تقسیم ہند سے پہلے بیشتر ایرانی ہندستان کی تہذیب، تمدن، ادب اور ثقافت سے بخوبی آشنا تھے، تیس سال میں وہ کون سا انقلاب آگیا جس کے باعث ایران کے بیشتر افراد اس بات سے بھی بےخبر ہیں کہ ہندستان میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ اس بےخبری کے لیے قصوروار ایرانی نہیں، خود ہم ہندستانی ہیں۔ اگر ہم نے ہندستانی مسلمانوں کی صحیح تصویر ایرانیوں کی زبان میں پیش کی ہوتی، انھیں باخبر رکھنے کی کوشش کی ہوتی، تو کسی ٹیکسی ڈرائیور یا کسی طالب علم کو مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ محسوس ہوتی کہ "مردہ خور را میسوزانی؟"

یہ بازار انواع و اقسام کی چیزوں سے بھرا پڑا تھا اور خریداری بھی اسی زور و شور سے ہو رہی تھی۔ ہندستان کے معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے یہاں تقریباً سب ہی چیزوں کے دام بہت زیادہ معلوم ہوئے۔ مگر خریداری کی رفتار دیکھ کر اندازہ ہوا کہ جو چیز ہمارے لیے خاصی گراں ہے، وہ ایرانیوں کے نزدیک مناسب دام پر بک رہی ہے۔ ہم کئی گھنٹے بازار کی سیر کرتے رہے اور ایران کی صناعیوں کی داد دیتے رہے۔

میں نے اس بازار میں ایک ایسی چیز بھی دیکھی جس کا میں ہندستان میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یعنی ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی شبیہیں قالین کے ٹکڑوں پر بنی دکھائی دیں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ قالین تبریز کے بنے ہوئے ہیں۔ آنحضرت کی شبیہ اتنی بھونڈی تھی کہ کیا عرض کروں۔ اس "بدعت" کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا، اگر یہی تصویریں کسی غیرمسلم ملک میں بنی ہوتیں، تو ہم مسلمان کتنا احتجاج کرتے! مگر جب خود مسلمان ہی اپنے پیشوا کی تصویر بنانے لگے، تو کسی عالم نے بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آج جس ٹیکسی میں ہم نے اپنا دن گزارا، اس کا ڈرائیور بہت دلچسپ، باغ و بہار اور ہمدرد انسان ثابت ہوا۔ وہ راستے بھر باتیں کرتا، سوالات پوچھتا اور ایران کے

طور وطریق پر روشنی ڈالتا رہا۔ یہ نوجوان ڈرائیور الکٹرانکس میں ڈپلوما لے چکا ہے، اور کسی جگہ ملازمت بھی کرتا ہے اجمعرات اور جمعہ کو ٹیکسی چلانے نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے اپنا نام حمید مہین ترابی بتلایا تھا۔ ایران کی یہ بات مجھ کو بہت پسند آئی کہ یہاں پڑھے لکھے لوگ بھی معمولی سے معمولی کام کرنے میں اپنی کوئی ہتک محسوس نہیں کرتے۔

شام ڈھلنے کے بعد، گھوم گھام کر، ہوٹل واپس پہنچے۔ آج پھر کھانے کی میز پر تجربہ کرنے کو جی چاہا۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر "میگو سرخ کردہ" کا آرڈر دیا۔ فارسی میں جھینگے کو میگو کہتے ہیں۔ جب پلیٹ سامنے آئی تو پتہ چلا کہ ڈھائی تین انچ لمبے اور اُسی مناسبت سے موٹے جھینگے کسی چیز میں لپیٹ کر تل دیئے گئے ہیں۔ میں نے ابھی پہلا ہی لقمہ کھایا تھا کہ محسوس ہوا ہمارے معیار کے مطابق جھینگے کچے ہیں۔ بہت پریشان ہوا، پلیٹ میں ایک چھوٹی سی پیالی بھی نظر آئی جس میں دہی رکھا تھا۔ اس دہی میں خدا جانے کیا کیا چیزیں ملی تھیں کہ بہت تیز ہو گیا تھا۔ میں دہی میں جھینگوں کو بھگو بھگو کر کھانے لگا، تو یہ ڈش نہ صرف یہ کہ گوارا ہو گئی بلکہ اچھی بھی لگنے لگی۔ کھانا کھا کر پھر آئس کریم کھائی۔ آب وہوا کا اثر بھی کیسا عجوبہ ہے۔ اگر یہی آئس کریم جنوری کے اواخر میں کہیں دلّی میں کھا لیتا تو خدا جانے کیا ہو جاتا۔ ایران میں جب کہ ٹمپریچر درجۂ انجماد سے دس درجے کم تھا، ہم لوگوں نے دن رات آئس کریم کھائی برف میں گھومتے پھرے، ہر طرح کی بے احتیاطی کرتے رہے، مگر بیفکری اور اچھی خوراک کی وجہ سے ہر بیماری سے بچے رہے۔

اب ہمیں ایران آئے تین دن ہو چکے تھے اور ہم یہاں کی چیزوں سے مانوس ہونے لگے تھے۔

۲۸ جنوری کی صبح جب آنکھ کھلی، تو معلوم ہوا کہ رات، کسی وقت برفباری ہوئی تھی۔ ننھے ننھے پودے، پیڑ، پودے، کاروں کی چھتیں، سڑک، غرض ہر چیز برف سے ڈھکی تھی۔ ابھی ہم لوگوں کو بیدار ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ پھر تیزی سے برفباری

شروع ہو گئی۔ زندگی میں یہ نظارہ دیکھنے کا پہلا موقع تھا' اس لیے میں بے قابو ہو کر باہر نکلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ میرا ذوق وشوق دیکھ کر ڈاکٹر سمیع الدین صاحب بھی ساتھ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم دونوں برفباری میں نکل کھڑے ہوئے اور دیر تک برف میں چہل قدمی کرتے رہے۔ ہمارے اوورکوٹ اور ٹوپیوں پر برف جم جاتی تو کسی دکان کے سائبان کے نیچے اسے جھاڑ کر پھر آگے بڑھ جاتے۔ غرض کہ اسی طرح کافی دیر تک گھومتے اور موسم کا لطف اٹھاتے رہے۔ برف مسلسل گر رہی تھی اور دو ہندوستانی تہران کی سڑکوں پر گشت کرتے ہوئے اپنے ملک کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ گھومنے کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے۔ سارا دن زبردست برفباری ہوتی رہی۔ ہمارے ایرانی ساتھیوں نے بتلایا کہ گذشتہ بیس برسوں میں تہران میں ایسی برفباری نہیں ہوئی ہے۔ دس بجے کے قریب وزارت فرہنگ و ہنر کے نمائندے آ گئے اور ہم ان کے ساتھ "گردش در شہر" کے لیے روانہ ہو گئے۔ تقریباً ایک بجے تک بے مقصد موٹریں ادھر ادھر دوڑتی رہیں۔ دوپہر کے کھانے کے لیے جب ہوٹل واپس آئے، تو معلوم ہوا کہ آج ہوٹل والوں نے ہمارے لیے خاص طور سے "چلو کباب" کا انتظام کیا ہے۔ ایران کی اس قومی غذا کا ذکر تو بہت سنا تھا، مگر ابھی تک دیکھنے اور کھانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ جب "چلو کباب" سامنے آیا تو پتہ چلا کہ ایک پلیٹ میں دو سیخ کباب ہیں، ان کے اوپر گرم گرم خشکہ، خشکہ پر مکھن کا ایک بڑا سا ٹکڑا، سامنے انڈے کی زردی پڑی تھی۔ مکھن اور انڈے کی زردی ڈالیے، چمچے سے مکھن، زردی اور چاول کو یک جان کیجیے! اور کباب کے ساتھ ملا ملا کر کھانا شروع کر دیجیے۔ اوروں کا تو علم نہیں، لیکن مجھے یہ غذا بہت پسند آئی، اور میں نے خوب جی بھر کر کھایا۔

سہ پہر کو ورزش گاہ آریا مہر دیکھنے کا پروگرام تھا۔ ہمارا قافلہ لدبھند کر وہاں پہنچا، مگر اس سبب سے ہم لوگ ورزش گاہ کے دروازہ ہی سے واپس آ گئے۔ اس وقت برفباری کم ہو چلی تھی اور وقت گزاری کا مسئلہ درپیش تھا۔ ہمارے راہبر

ہمیں شفرح پارک لے گئے۔ یہ وسیع و عریض پارک موسم بہار میں بڑا خوبصورت ہوتا ہوگا مگر اس وقت تو وہ ٹنڈرا کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کے باوجود ہم لوگ موٹروں سے اتر کر پارک میں ٹہلتے رہے، اور شام کے وقت اپنے مستقر پر واپس آ گئے۔

۲۹ جنوری کو بھی فجر کے بعد ہی سے برفباری شروع ہو گئی تھی۔ اس لیے میں اور ڈاکٹر سمیع الدین صاحب پھر گھومنے کو نکل پڑے اور گذشتہ دن کی طرح سیر گشتی کرتے رہے۔ ناشتے کے بعد وزارت کے نمایندے گاڑیاں لے کر آ گئے۔ آج ایک دوسرا بازار دیکھنے کا پروگرام تھا۔ سب لوگ بازار چلے گئے۔ میں اور ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کمرے ہی پر رک گئے۔ ڈاکٹر سمیع الدین صاحب تو کچھ لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو گئے اور میں اپنی عمرِ گذشتہ کی کتاب الٹنے پلٹنے لگا۔ مجھ کو خاص طور سے وہ دن یاد آنے لگے، جب یو۔ جی۔ سی کا وظیفہ ختم ہونے کے بعد نومبر ۱۹۶۹ء سے مجھے اپنا پیٹ بھرنے اور زندہ رہنے کے لیے سخت جد و جہد کرنی پڑی تھی۔ میں جس یونیورسٹی میں پوری آرٹس فیکلٹی میں اول آیا تھا، حالات کی مجبوری کا بھلا ہو اسی یونیورسٹی کے پریس میں روزانہ اجرت پر مجھے پروف ریڈر کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ چھ ماہ کے بعد یہ سہارا بھی چھن گیا۔ پھر میں نے اِدھر اُدھر کے مطبعوں میں پروف ریڈری شروع کی۔ کچھ نقل کا کام کرتا، کچھ پروف ریڈری سے مل جاتا، صرف اسی سہارے پر تقریباً سوا سال تک اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا رہا۔ میرے حال پر رحم کھا کر پروفیسر آل احمد سرور نے ۱۰ اپریل ۱۹۷۱ء کو انجمن ترقی اردو (ہند) میں ملازم رکھ لیا۔ ابھی ملازمت کو بمشکل پچیس دن گزرے تھے کہ میری تیرہ سالہ اہلیِ زندگی کا آہن واحد میں خاتمہ ہو گیا۔ اس حادثہ سے دوچار ہونے کے بعد معلوم ہوتا تھا کہ اب زندہ نہ رہوں گا مگر میری بیحیائی کام آئی۔ نہ صرف اس وقت زندہ رہا، بلکہ آج تک اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہا ہوں۔ پھر مئی ۱۹۷۴ء کے وہ دن آئے، جب میں نے انجمن کی نوکری سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس وقت میری آمدنی کا کوئی اور ذریعہ بجز کانفرنس گزٹ کے معاوضہ کے نہ تھا۔ کانفرنس سے مجھے صرف سو روپے ماہانہ ملتے تھے تاکہ میں کانفرنس گزٹ

کے ادار یے لکھ دیا کروں اور اسے مرتب کر کے شائع بھی کروا دیا کروں۔ اسی یاس و ناامیدی کے عالم میں میرا تقرر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہو گیا۔ اب کچھ فراغت نصیب ہوئی تھی کہ والد مفلوج ہو گئے اور مجھے ملازمت ملنے کے چار ماہ بعد وہ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ زندگی میں خلا تو پہلے ہی سے تھا، اب سناٹا دم بخود کا منظر سامنے تھا۔ بہر حال جینا تھا جیتا رہا۔ ایسا اندیشہ خلق جب کسی حکومت کا مہمان ہو، ساری آسائشیں اسے مہیا کر دی جائیں، پذیرائی کی حد کر دی جائے اور قدم قدم پر اسے نوازا جائے تو اسے اپنا ماضی کیوں کر نہ یاد آئیگا: میں انھیں باتوں میں الجھا رہا، لیکن خدا کا شکر بھی ادا کرتا رہا کہ اس نے اگر ایک طرف محروم بنایا ہے تو دوسری طرف کامرانی و شادمانی بھی تو دی ہے۔ اگر صرف محروم ہی رکھا ہوتا، تو بندۂ عاجز کیا کر سکتا تھا؟ انہی خیالات میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ سارے ساتھی بازار سے واپس آچکے تھے اس لیے ہم لوگ کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

سہ پہر کو "موزۂ جواہرات سلطنتی" دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اس لیے پونے تین بجے ہم لوگ نکل کھڑے ہوئے۔ جیسا کہ میوزیم کے نام سے ظاہر ہے یہ جواہرات کا میوزیم ہے۔ ایک وسیع و عریض ہال میں تمام چیزیں بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہیں۔ اسی میوزیم میں موجودہ شاہ اور ملکہ کے دو تاج بھی رکھے ہوئے ہیں، جو انھوں نے تاجپوشی کے موقع پر پہنے تھے۔ یہاں وہ لباس بھی محفوظ ہے جسے پہن کر موجودہ ملکہ جشن میں شریک ہوئی تھیں۔ ایک مرصع تخت سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ جن حضرات اسی کو تخت طاؤس بتا رہے تھے۔ گائیڈ نے جب اس پر کندہ اشعار پڑھے تو فتح علی شاہ کا نام نظر آیا۔ تلواریں، بندوقیں، شمشیر اور استعمال کی دوسری اشیا سب ہیرے جواہرات سے مرصع ہیں۔ ایک نیا رکابی نما ظرف تھا جو جواہرات سے پٹی ہوئی تھی مگر اس پر صرف فیروزے جڑے تھے۔ قاچاری بادشاہوں کے کچھ لباس بھی نظر آئے، جن کی آب و تاب ابھی تک باقی ہے اور ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے ابھی بنے ہیں۔ میوزیم کوئی بہت زیادہ بڑا نہ تھا اس لیے جلد ہی ہم لوگوں کو فرصت مل گئی۔ باہر برفباری جاری تھی اسی حالت میں ہم

واپس آنا پڑا۔ رات کے کھانے پر میں نے بھنے ہوئے مرغ کا آرڈر دیا۔ یہ چلو کباب کے مقابلہ میں زیادہ پسند آیا۔

۳۰ جنوری کو ہم لوگوں کو دانشگاہِ تہران کا مرکزی کتابخانہ دیکھنا تھا۔ ۹ بجے کے قریب وزارت کے نمایندے کے ساتھ روانہ ہوئے۔ دانشگاہ تہران ایک بہت بڑے رقبے پر پھیلا ہوئی ہے جو چاروں طرف سے لوہے کے موٹے موٹے چھڑوں سے گھیر دی گئی ہے۔ اس میں داخلہ کے لیے کئی دروازے ہیں۔ ہر دروازے پر پولس کا پہرہ رہتا ہے۔ استاد ہوں خواہ طالب علم، جب تک پولس والوں کو اپنا شناختی کارڈ نہیں دکھاتے، اندر نہیں جا سکتے۔ ہمارے سرکاری رہبر صاحب غالباً یونیورسٹی کے [illegible] آدمی نہیں تھے وہ جس دروازے پر جاتے پولس والے واپس کر دیتے کہ فلاں دروازے سے جاؤ۔ اسی طرح تین جگہ سے ہم لوگ واپس ہوئے۔ چوتھی جگہ پر جانے کی اجازت ملی۔ یونیورسٹی کی طرف سے جو صاحب کتابخانہ دکھانے پر متعین تھے، شاید ان کا خیال یہ تھا کہ ہندوستان میں کتابخانے ہی نہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو ہندوستان کے لوگ سائنٹفک انداز سے کتابخانے مرتب کرنا نہیں جانتے۔ اسی لیے وہ ہمیں صرف مختلف شعبوں میں گھما کر ہمارا وقت ضائع کرتے رہے۔ ہم لوگ تو اس شوق میں وہاں گئے تھے کہ یہاں کے مخطوطات دیکھینگے، جہاں مائکرو فلم اور فوٹو اسٹیٹ کاپیاں جمع کی گئی ہیں، اس حصہ کو دیکھ کر یہاں کے مخطوطات کے بارے میں کچھ علم حاصل کرینگے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا۔ مخطوطات کے حصے کی دور سے زیارت کرا دی گئی اور بس۔ یہیں رضا شاہ کبیر کا ایک قدِ آدم سنگی مجسمہ بھی نظر آیا۔ اس کے علاوہ اس یونیورسٹی کے اب تک کے وائس چانسلروں کی تصویریں بھی دکھائی دیں۔ ان تصویروں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک حصہ میں وہ وائس چانسلر ہیں جو وزیر تعلیم [illegible] وائس چانسلر بھی۔ اس کے سب سے پہلے وائس چانسلر اس زمانے کے وزیر تعلیم علی اصغر حکمت تھے، جو ہندوستان میں حکومتِ ایران کے سفیر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ تصویروں کا دوسرا حصہ وہ ہے جو ان اصحاب کی تصویروں پر مشتمل ہے [illegible] چارج لینے کے بعد وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یہیں پر ابراہیم پور داؤد، حسن پیرنیا، محمد علی فروغی، امیر کبیر،

قائم مقام، سعید نفیسی، دہخدا، سید حسن تقی زادہ، ادیب نیشاپوری، ملک الشعراء بہار، عباس اقبال آشتیانی کے بھی کانسے کے مجسمے دکھائی دیے۔ ایران کی ایک خاص بات یہ بھی نظر آئی کہ یہاں کی بیشتر سڑکوں اور گلیوں کوچوں کے نام ادبا اور شعرا کے نام پر رکھے گئے ہیں مثلاً خیابان سعدی، خیابان حافظ، خیابان وصال شیرازی، کوچہ نظامی، میدان فردوسی وغیرہ۔ بہرحال جس ذوق و شوق کے ساتھ ہم لوگ کتب خانہ دیکھنے گئے تھے اس پر اوس پڑ گئی اور تین گھنٹوں تک ادھر اُدھر سر مغزی کرنے کے بعد بھی ہم لوگ تشنہ کے تشنہ ہی لوٹے۔

سہ پہر کو "موزۂ کاخ گلستان" دیکھنے گئے۔ کاخ گلستان وہی محل ہے جس میں موجودہ شاہ کے والد رضا شاہ کبیر کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ باہر اور اندر سے ہر جگہ کاشی کاری اپنا جادو دکھاتی ہے۔ اس محل کی حفاظت کا انتظام بہت اہتمام سے کیا جاتا ہے۔ اسی محل کے ایک حصہ میں اب بھی باہر کے معزز مہمانوں، ممالک کے بادشاہوں اور وزرائے اعظم کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس محل کو مکمل طور سے ہم لوگ نہ دیکھ سکے کیونکہ حکومت ایران کا کوئی مہمان آنے والا تھا اور اس کی آمد کے اہتمام میں محل کا ایک حصہ سجایا اور درست کیا جا رہا تھا۔ جو حصہ ہم دیکھ سکے، اس میں قاچاری عہد کے بہت سے آثار بھی دیکھنے کو ملے۔ اس محل میں بھی ایک کمرہ ایسا ہے جس کو شیش محل کہنا چاہیے۔ اس دن اس محل کا جتنا حصہ کھلا تھا، اسے دیکھ کر کچھ زیادہ مسرت نہیں ہوئی۔

۱۳ جنوری کو "موزۂ مردم شناسی" دیکھنے کا پروگرام تھا۔ دس بجے کے قریب ہمارا وفد اس میوزیم کو دیکھنے پہنچا۔ یہ میوزیم اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ایران میں رہنے والی مختلف قوموں کے چہرے بشرے کو مجسموں کے ذریعہ واضح کر دیا جائے۔ اس میوزیم کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں کچھ مرمت ہو رہی تھی، اس لیے ہم اس کا صرف ایک ہی حصہ دیکھ سکے۔ یوں تو یہاں کا ہر مجسمہ قابلِ دید ہے مگر مجھے تین مجسموں نے خاص طور سے متاثر کیا۔ ایک جگہ پر تین عورتوں کے قدِ آدم مجسمے رکھے ہیں جو بظاہر زندہ گوشت پوست کی عورتیں معلوم ہوتی ہیں ایک چرخہ کات رہی ہے، دوسری چکّی

پیس رہی ہے، اور تیسری نے اپنے منہ کو ڈوپٹہ سے اس طرح چھپا رکھا ہے کہ پیشانی آنکھ اور اس کے علاوہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ خدا جانے یہ مجسمے کن چیزوں سے بنائے گئے ہیں کہ جلد تک انسانی جلد کے رنگ سے ملا دی گئی ہے۔ ان مجسموں کا لباس (بھی) قابلِ تعریف ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ بس اب یہ عورتیں بولنے والی ہیں۔ اسی طرح قاجاری دور کے ایک درویش کا بھی قدِ آدم مجسمہ ہے، جس کے ساتھ عصا، کنڈل وغیرہ درویشی کے تمام سامان بھی قرینے سے رکھے ہوئے ہیں۔ اس درویش کو بھی اس خوبصورتی سے لباس پہنایا گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک خدا پرست درویش کہیں سے آکر اس شیشے کی الماری میں بند ہو گیا ہے۔ ایک قدیم قہوہ خانہ کا منظر بھی بہت دلکش ہے۔ یہ حصہ پانچ قدِ آدم مجسموں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف تین گاہک بیٹھے ہیں۔ بیرا ان کی طرف قہوہ کی سینی لے کر جا رہا ہے اور مالک بھٹی کے سامنے اپنے کام میں مصروف ہے۔ قہوہ خانہ کا سارا سامان پاس ہی رکھا ہوا ہے۔ ان مجسموں کو دیکھ کر بھی زندہ انسانوں کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہاں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے صرف ہوئے۔

ابھی ہمارے پاس کافی وقت تھا، کچھ حضرات بازار چلے گئے اور میں ڈاکٹر وارث کرمانی (علی گڑھ) کے ساتھ ایرانین اکاڈمی آف فلاسفی کے دفتر جانے کے لیے تیار ہوا۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنؤ) اور محمد شفیع صاحب (سری نگر) بھی آ گئے اور چار آدمیوں کا یہ قافلہ اکاڈمی کے لیے روانہ ہوا۔ یہاں ڈاکٹر وارث کرمانی کو اپنے ایک امریکی دوست سے ملنا تھا۔ ہم لوگ گھومنے پھرنے کے لیے ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے تو ان صاحب سے ملاقات کی گئی، جن سے ملنے کے لیے یہاں آئے تھے۔ پھر انھوں نے از راہِ محبت وہاں کا کتب خانہ دکھلایا۔ یہ دیکھ کر مسرت آمیز تعجب ہوا کہ اس کتب خانہ میں اردو کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ صاحبِ موصوف نے ہمیں وہ کمرے بھی دکھلائے، جنھیں قدیم ایران کے اندازِ نشست کے مطابق سجایا گیا ہے۔ دیواروں پر ایرانی مفکروں، مثلاً خیام، غزالی اور عطار کی آرامگاہوں کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں ہیں۔ اس جگہ آکر سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوئی کہ سید حسین نصر صاحب سے بھی ملاقات ہو گئی۔

میں نے ان سے ان کے اس لکچر کا بھی ذکر کیا جو انھوں نے آزاد میموریل لکچرز کے تحت دیا تھا۔ ہنس کر فرمانے لگے: میں کوشش کرتا ہوں کہ سال میں ایک بار دہلی ضرور ہو آؤں۔ مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ اس سال میں دہلی نہ جا سکا۔ یہ ملاقات بہت مختصر رہی تاہم اس بات کی خوشی تھی کہ ایک علمی ادارہ میں اصحاب علم کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کا موقع مل گیا ورنہ جب سے یہاں آئے ہیں، کبھی اس میوزیم جا رہے ہیں، کبھی اس میوزیم! علمی موضوعات پر یہاں کے اصحاب علم سے بات چیت کا موقع ہی نہیں ملا۔

اسی دن شام کو یہ طے پایا کہ پوری پارٹی کوہ شمیران کو دیکھنے اور قدرتی مناظر سے لطف لینے کے لیے جائے۔ ویسے تو دو رویہ سڑک پر تھوڑی بہت برف موجود تھی، مگر پرسوں سے جو برف کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر ختم ہونے ہی کو نہ آیا۔ ہر طرف اونچے اونچے تودوں کی شکل میں برف جمی ہوئی تھی اور یہاں کا درجۂ حرارت تہران کے درجۂ حرارت سے بھی کم تھا (اس وقت تہران کا درجۂ حرارت منفی دس ڈگری تھا) ہمیں ہوٹل سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی تھی، اس لیے جب وہاں پہنچے ہیں، تو شام ہو چکی تھی اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ اس لیے ہم بمشکل دامن کوہ ہی تک جا سکے، نہ تو شمیران ہی پر کچھ دور تک چڑھ سکے اور نہ وہ جگہ ہی دیکھ سکے، جہاں پر آبشار ہے۔ میں نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ ٹیکسی اوپر کی طرف لے چلے۔ اس نے عذر کیا کہ اس کے پاس وہ زنجیر نہیں ہے، جو ایسے مواقع پر پہیے پر چڑھائی جاتی ہے، اگر بلا زنجیر اس نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی، تو موٹر کے پھسل جانے کا خطرہ ہے۔ عذر معقول تھا۔ لہٰذا ہمیں اپنی تفریح کو دامن کوہ تک محدود رکھنے پر قناعت کرنا پڑی۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا اس لیے وہاں رکنا بیکار معلوم ہوا۔ واپسی میں ہم نے "کاخ نیاوران" کے گرد چکر لگایا تاکہ اس محل کی وسعت کا اندازہ کر سکیں۔ یہ وہی محل ہے، جس میں موجودہ شاہ کا قیام ہے۔ اس طرح ہر طرف کی سیر کرتے کراتے رات ۸ بجے کے بعد واپس ہوٹل آئے۔

یکم فروری ۱۹۷۷ء کی صبح سے وہ اصل کام شروع ہوا، جس کے لیے ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ باشگاہِ بانکِ سپہ میں "چہارمین مجلس ملی انجمنِ استادانِ فارسی" کا جو سدہ

سیمینار ہو رہا تھا، اس میں بیرونی ممالک میں ہندوستان کے علاوہ مصر، ترکی، اسرائیل، لبنان اور امریکہ کے وفود شریک ہو رہے تھے۔ ان خارجی وفود کے علاوہ ایران کی مختلف یونیورسٹیوں کے نمایندے بھی بڑی تعداد میں آئے ہوئے تھے۔ پاکستان سے نجانے کیوں کوئی وفد نہیں آیا تھا، اس ملک کی نمایندگی دو طالبات نے کی، جو تہران میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ہم لوگ صبح سے وزارتِ فرہنگ و ہنر کے نمایندے کے انتظار میں تھے کہ وہ آجائیں، تو ہم ان کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہنچیں۔ خدا جانے کیوں انھیں آنے میں خاصی دیر ہو گئی۔ جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے ہیں، تو جلسہ کا افتتاح ہو چکا تھا اور ڈاکٹر محقق رئیسِ انجمنِ استادان تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر بھی ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ختم ہو گئی۔ اب صدرِ جلسہ نے ڈاکٹر عبدالحسین زرّین کوب، صدر شعبۂ فارسی، تہران یونیورسٹی کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر زرّین کوب کا مقالہ فکر انگیز بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ اس مقالہ کا لبِ لباب یہ تھا کہ فارسی ادبیات کا موجودہ نصابِ تعلیم نظرِ ثانی کا محتاج ہے کیونکہ اب یہ نصاب جدید ضروریات کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ آج بھی فارسی ادبیات کے استاد فرخی، خاقانی اور جوینی کو پڑھاتے ہیں، جن کے افکار و خیالات کو سمجھنا آج کے طلبہ کے لیے مشکل ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ آج کے استاد کی آواز "صدا بہ بیابان" بن کر رہ جاتی ہے۔ انھوں نے دو نسلوں کے خیالات کے ٹکراؤ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ٹکراؤ ہمارے زمانے سے پہلے بھی تھا، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہیگا کیونکہ آیینِ فطرت یہی ہے۔ ہمیں اس ٹکراؤ سے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ادبیات کی پیشرفت میں ایسے ٹکراؤ ممد و معاون بھی ثابت ہوتے ہیں۔

زرّین کوب صاحب نے اس بات پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ادب العالیہ ان جذبات و احساسات کی ترجمانی نہیں کرتا، جو آج کے نوجوانوں کے جذبات و احساسات ہیں۔ اسی لیے وہ اپنے ادب العالیہ سے گریزاں سے نظر آتے ہیں۔ یہ گریز نئے نئے راستوں کی طرف ان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اگر لڑکے اپنے والدین کے نقشِ قدم ہی پر

چلتے رہتے اور اس سے گریز یا بغاوت نہ کرتے، تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ نئے نئے راستے سامنے آتے۔ ادبیاتِ فارسی کے استادوں کا فرض ہے کہ وہ کمال ہوشمندی سے اس بات کی کوشش کرتے رہیں کہ نوجوانوں کے گریز اور بغاوت کے باوجود ایک نسل سے دوسری نسل کے افکار و خیالات کا تسلسل مجروح نہ ہونے پائے۔

ڈاکٹر زرین کوب نے آج کے اساتذہ اور نوجوانوں کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلے کی خاص طور سے نشاندہی کی۔ انہی کے الفاظ میں "جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے، وہ انتہائی سنگین اور وحشتناک ہے۔ آج کے ادبیاتِ فارسی کے اساتذہ کو نوجوانوں اور "فرہنگِ گذشتہ" کے درمیان ایک پل بنانا چاہیے تاکہ ہمارے نوجوان فرہنگِ گذشتہ سے یکسر محروم نہ ہو جائیں۔" اسی سلسلۂ سخن میں انھوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ ہمارے متشرعوں اور متصوفوں نے حافظ اور مولانا روم کو اپنے اپنے رنگ میں پیش کیا جو ان کے ظن و تخمین کا نتیجہ ہے۔ آج کے استاد کا فرض ہے کہ وہ حافظ اور رومی کے اشعار کی شرح اس زمانے کی مقتضیات کو سامنے رکھ کر کرے۔ اسی طرح ہمارے بہت سے نقادوں نے یہی غلطی کا ارتکاب کیا ہے کہ شعرا و ادبا کو ان کے اصل افکار و خیالات کی روشنی میں نہیں دیکھا بلکہ خود اپنے تجربات و احساسات کے آئینے میں اس شاعر یا ادیب کو سمجھنے پہچاننے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے ہماری تنقید میں بھی افراط و تفریط کی کیفیت پیدا ہوئی۔ فارسی ادبیات کے استاد کا فرض ہے کہ وہ اس افراط و تفریط کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آکر شاعر و ادیب کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے۔

ڈاکٹر زرین کوب کے اس مقالہ پر کئی حضرات نے اظہارِ خیال کیا جن میں دو استادوں کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ ماہیار نوابی صاحب نے ڈاکٹر زرین کوب کے مقالہ کے بعض اجزا سے اختلاف کیا۔ لیکن ان کا اندازِ بیان بالکل تلخ نہیں ہونے پایا۔ اس کے بالکل برعکس ڈاکٹر ... نے بڑے تلخ و تند لہجے میں ڈاکٹر زرین کوب سے اختلاف کیا۔ وہ اپنی تلخی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ صاحبِ مقالہ پر ذاتی نوعیت کا حملہ کر بیٹھے، جسے بیشتر شرکا نے پسند نہیں کیا۔ اس کے بعد ایک گھنٹہ کا وقفہ ہوا۔ چائے، کھانا بھی

حضرات جملے کے آخر میں ۱۲ کا عدد لکھ دیتے ہیں جو "حد" کے اعداد ہیں۔ اسی طرح ۱۳ سے بھی کوئی ایسا ہی لفظ مراد ہوگا۔ حاشیے پر اضافوں کی تعداد بہت کم ہے اور یہ جہاں بھی ہے کاتب متن ہی کے قلم سے ہے۔

نسخے کے شروع میں مصنف نے اپنا نام "محمد غوث زریں ساکن بجنور شگفتہ زمیں" لکھا ہے۔ داستان کے آخر میں بھی محمد غوث زریں بجنوری لکھتا ہے۔ یہ یقین ہے کہ یہ بجنور مغربی یوپی کا ضلع بجنور نہیں، بلکہ نواحِ لکھنؤ کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ زریں کے حالات موہن لال انیس کے تذکرہ انیس الاحبا میں دیے ہیں۔ یہ تذکرہ مرزا فاخر مکین کے شاگردوں کے احوال پر مشتمل ہے زریں بھی اسی زمرے میں ہیں۔ مجھے اس تذکرے کا علم نثار احمد فاروقی صاحب کے ایک خط سے ہوا تھا۔ میں نے بعد میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانے میں اس کا نسخہ دیکھا اور زریں کا اندراج پڑھا۔ اس میں بھی زریں کا نام محمد غوث درج ہے، محمد مومن نہیں۔

(۲)

داستان کی ابتدا میں حمد و نعت ہے، منقبت موجود نہیں۔ مصنف کے مربی لالہ رام دین ہیں، جو آصف الدولہ کی طرف سے چکلہ بیسواڑا کے انتظام پر مامور تھے۔ ان کے علاوہ لالہ رام دین کے والد لالہ ٹھاکر داس اور دو بڑے بھائیوں کا بھی ذکر ہے۔ فارسی شعر میں دعا گو ہیں:

مع بہ اقبال باشند ایں ہر چہار۔ منقبت کے نہ ہونے اور چہار حضرات کی توصیف سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سنّی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ اردو تلخیص میں صرف تین بھائیوں کا ذکر ہے والد کا نہیں۔ فارسی نسخے میں مربی کے دو بڑے بھائیوں کے نام کے ساتھ راجہ کا خطاب درج تھا؛ اردو تلخیص میں مربی کے نام کے ساتھ بھی لالہ کی بجائے راجہ کا خطاب شامل ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں یہ خطاب غالباً فارسی اور اردو نسخوں کی تالیف کے درمیانی عرصے میں ملا ہوگا۔

سبب تالیف میں لکھتے ہیں کہ اس سے پہلے کسی نے قصۂ چہار درویش کو قلم بند کیا تھا، لیکن چونکہ وہ "طوالت کلام و خار و خشش تمام" رکھتا تھا، اس لیے ان کے سرپرست لالہ رام دین نے فرمائش کی کہ زریں اسے دوبارہ لکھیں۔ چنانچہ انھوں نے انشا کیا اور تاریخ کہی:

۲ فروری کی شام کا کھانا میرے ساتھ میرے گھر پر کھائیے، وہیں ساری باتیں ہونگی۔ میں ان اصحاب سے گفتگو کر ہی رہا تھا کہ مجھے دور سے ایک مانوس چہرہ نظر آیا۔ یہ چہرہ ڈاکٹر صائمہ اینال صابی کا تھا جو ایک ترکی خاتون ہیں۔ ہم لوگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔ اے۔ کے کلاس میں ہمدرس تھے اور دو سال تک ایک دوسرے کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے تھے۔ بارہ سال کے بعد اچانک اس طرح ملنے پر ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ انھوں نے جلدی جلدی ہماری سب ساتھیوں اور استادوں کی خیریت پوچھی۔ پھر چونک کر بولیں: میں نے اپنے شوہر سے تو ملاقات کرائی ہی نہیں۔ وہیں ان کے شوہر آقائی صابی بھی کھڑے تھے۔ ان سے میرا، ڈاکٹر سمیع الدین احمد اور ڈاکٹر وارث کرمانی کا تعارف کرایا۔ آقای صابی بڑے باغ و بہار شخص ثابت ہوئے۔ وہ نسلاً عرب ہیں اور آج کل ایران ہی میں رہتے ہیں؛ اور مشہد میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دیتے ہیں۔ ابھی اتنے ہی لوگوں سے ملاقات ہونے پائی تھی کہ کھانے پر چلنے کی فرمائش ہونے لگی اور سب لوگ مجبوراً کھانے کی میزوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ کھانے کی میز پر موجودہ ایران کے مشہور ترین شاعر نادر نادر پور صاحب بھی نظر آئے۔ جی چاہا کہ ان سے بھی ملاقات کی جائے مگر وہ نوجوانوں میں اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ میں وہاں گھس نہ سکا۔ میں نے سوچا کہ کھانے کے بعد ملاقات کرونگا، مگر افسوس ہے کہ وہ کھانے کے بعد بھی گھرے رہے، یہاں تک کہ جلسہ کی دوسری نشست شروع ہوگئی اور ہم لوگوں کو وہاں جا کر بیٹھنا پڑا۔

جلسے کی دوسری نشست کی شروع میں ہر ایک نمایندے کو اپنا تعارف کرانا تھا۔ ایرانی اور غیر ایرانی جتنے بھی مندوبین تھے۔ سب نے اپنا اپنا تعارف کرایا۔ غیر ملکی وفود میں ہندستان کا وفد سب سے بڑا تھا، جو چودہ افراد پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد مصر کا وفد تھا جس کی نمایندگی [illegible] اور ایک خاتون نے کی تھی۔ ان دونوں وفدوں کے علاوہ کہیں سے تین نمایندے آئے تھے، کہیں سے دو اور کہیں کہیں سے صرف ایک۔ ابھی تعارف ہو ہی رہا تھا کہ [illegible] کی طبیعت [illegible] اس حد تک بگڑ گئی کہ

ان پر غشی طاری ہوگئی۔ ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر سمیع الدین احمد اور میں نے انھیں اٹھایا اور پاس ہی کے ایک کمرہ میں لٹا دیا۔ جتنی دیر ان پر غشی طاری رہی، ڈاکٹر ستودہ (استاد زبانِ فارسی، تہران یونیورسٹی) ہمارے ساتھ رہے۔ دوسرے ایرانی اور غیر ملکی نمائندے بھی آ کر ان کا حال پوچھ جاتے۔ ہمارے ساتھی کو ہوش تو جلد ہی آ گیا، مگر ہم تینوں [illegible] انھیں لٹائے رکھا اور ان کے پاس بیٹھے رہے۔ اس لیے اس نشست کی پوری کارروائی میں شریک نہ ہو سکے۔ بالآخر اپنے ساتھی کو ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کے حوالے کرکے میں جب جلسہ گاہ میں پہنچا، تو اصفہان یونیورسٹی کے مندوب، ڈاکٹر حمید فرزام استاد زبان و ادبیات فارسی تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کا جو حصہ میں سن سکا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں یونیورسٹیوں میں فارسی ادبیات کی تعلیم بڑی "ناہنجار" ہوگئی ہے [illegible] اور صحیح راستے پر چلانے کی سخت ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فرزام نے زور دے کر کہا کہ آج کل یونیورسٹیوں میں جو کتابیں شاملِ نصاب ہیں، وہ لفظی اور معنوی دونوں اعتبارات سے غلط ہیں؛ ان کتابوں کی تصحیح ہونی چاہیے تاکہ صحیح ادبیات کی تعلیم دی جا سکے۔ انھوں نے جدید و قدیم ادبیات کی آویزش کا ذکر کرتے ہوئے بہت واضح الفاظ میں فرمایا کہ جدید ادبیات کی پیشرفت اسی وقت ممکن ہے، جب قدما کے آثار کا دقیق نظر سے مطالعہ کیا جائے اور ان آثار کی روشنی میں اپنے زمانے کی مقتضیات کو مدنظر رکھتے ہوئے نئی نئی راہیں تلاش کی جائیں۔ انھوں نے فارسی زبان و ادب کے اساتذہ پر زور دیا کہ وہ کوئی ایسی راہ نکالیں، جس پر چل کر نوجوان طبقہ اپنے ادبی ورثہ سے بیگانہ نہ ہونے پائے۔

اب شام ڈھل چلی تھی، سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ اس لیے آج کے جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا گیا وزارتِ فرہنگ [illegible] کی کاریں موجود تھیں، مگر سمیع الدین احمد صاحب، وارث کرمانی صاحب اور میں صائمہ کی کار میں بیٹھ کر ہوٹل واپس آگئے۔

(۲)

سیمینار کا دوسرا دن بہت [illegible] موفقیت [illegible] گزرا۔ اس نشست میں [illegible] پہلے

ڈاکٹر عبدالامیر سلیم، استاد دانشگاہ آذرآبادگان نے اپنا مقالہ پڑھا۔ ان کے مقالے کو سن کر احساس ہوا کہ ایران کے موجودہ نصاب تعلیم سے سب ہی حضرات نامطمئن ہیں۔ انھوں نے بھی نصاب پر تنقید کرتے ہوئے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس کو تبدیل کیا جائے۔ کل اتنی زیادہ بحث ہو چکی تھی کہ اب اس مقالے پر مزید بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی، صرف چند مقامات کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دو ایک حضرات نے مختصر سے سوال کیے، ڈاکٹر سلیم نے ان کے جواب دے دیے اور بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد چائے کا وقفہ ہو گیا، لوگ چائے پیتے اور چلتے پھرتے رہے۔ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے رہے۔ آدھے گھنٹے تک یہی مصروفیت رہی۔ جب جلسہ دوبارہ شروع ہوا، تو میری دوست ڈاکٹر [illegible] نے اپنا مختصر مقالہ پڑھا، جو فارسی الفاظ کے تلفظ کے بارے میں تھا۔ مقالہ مختصر ہوتے ہوئے بھی بڑی محنت سے لکھا گیا تھا، اسی وجہ سے اس پہ زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ اس سیشن کی صدارت ہمارے وفد کے نمائندہ مولانا سلیمان عباس نے کی تھی۔ اس مقالے کے ختم ہونے پر ہم لوگ چار ٹکڑیوں میں تقسیم کر دیے گئے تاکہ الگ الگ جلسے گروہی شروع کیے جا سکیں۔ تقسیم اس طرح کی گئی تھی۔

١۔ غیر ایرانی فارسی اساتذہ (گروہ خارجیان)

٢۔ ادبیات فارسی کے ایرانی اساتذہ

٣۔ علوم فارسی کے ایرانی اساتذہ

٤۔ اسکولوں کے ایرانی اساتذہ

ہندوستانی وفد کے تمام اراکین گروہ خارجیان کے جلسے میں شریک ہوئے۔ اس جلسے میں غیر ایرانی وفود کے تمام اراکین موجود تھے۔ صرف دو ایرانی حضرات ڈاکٹر ستودہ اور ڈاکٹر مطہری بھی اس میں شریک تھے تاکہ وہ اس جلسے کی مکمل کاروائی انجمن استادان کی عام نشست میں پیش کر سکیں۔ جلسہ کا آغاز میری معروضات سے ہوا۔ میں نے اس جلسے میں جو کچھ عرض کیا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہندستان ایک ایسا ملک ہے، جہاں آٹھ سو سال تک فارسی سرکاری زبان کے طور پر رائج رہی ہے۔ ان آٹھ سو سالوں میں اِس زبان نے ہندستان کی صرف آریائی ہی نہیں، بلکہ دراوڑی زبانوں کو بھی متاثر کیا ہے اور آج بھی دراوڑی زبانوں میں فارسی کے بہت سے الفاظ اپنے قدیم مفاہیم و معنی میں مستعمل ہیں۔ ایرانی زبان کے علاوہ ایرانی تمدن و ثقافت نے بھی ہندستان کے تمدن و ثقافت کو متاثر کیا ہے، جس کے مظاہر موجودہ ہندستان میں بھی قدم قدم پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اب ہمارے ملک میں فارسی زبان کا وہ چلن نہیں رہ گیا ہے، جو پہلے تھا۔ اس کے چند در چند اسباب ہیں، جن کی تفصیل میں جانا باعثِ طوالت ہوگا۔ بہر حال آزادی کے بعد سے لوگ پھر فارسی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور اس میدان میں ہندستانی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں خاصہ وقیع کام ہو رہا ہے جس سے اہلِ ایران بھی ناواقف نہیں۔

ہم ہندستانی فارسی کے استادوں کی دشواری یہ ہے کہ ہم "سبکِ ہندی" اور "سبکِ ایرانی" دونوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہماری تعلیمی اور تہذیبی ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہم اُس فارسی پر زیادہ زور دیں، جو ہندستان میں پیدا ہوئی کیونکہ ہمارا آٹھ سو سالہ تاریخی، تہذیبی، علمی اور ادبی ورثہ اسی زبان میں محفوظ ہے۔ اور ہم اس سے کسی بھی قیمت پر دستبردار ہونے کو تیار نہیں، تاہم اسی کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم ایران کے عصری ادب سے غافل نہ رہیں، اور اس کی بھی درس و تدریس کرتے رہیں۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں اب فارسی بول چال کی زبان نہیں رہی، اس لیے ہم فارسی کے طلبہ کو بالواسطہ انداز سے فارسی پڑھاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ہندستان جیسے ملک کے لیے یہی طریقۂ تعلیم زیادہ مناسب ہے۔ اب رہا ایرانی حکومت کی مدد کا سوال، تو اس سلسلے میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ہمیں کسی قسم کی مالی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ایرانی حکومت ہمیں جدید فارسی کی اعلیٰ مطبوعات، یہاں کے اساتذہ کے پروگراموں کے ریکارڈز اور دوسری تعلیمی چیزیں دیتی رہے، تو امید ہے کہ ہم ان چیزوں کے ذریعے ہندستان میں فارسی علوم و ادبیات کی پیشرفت میں خاصہ اضافہ کر سکیں گے۔

اس کے علاوہ اگر ہماری یونیورسٹیوں میں دو دو تین تین سال کے لیے ایرانی اساتذہ بھی آکر کلاس لیا کریں، تو اس سے اور بھی مدد ملیگی۔ اگر حکومتِ ایران ہندستان میں فارسی زبان وادب کی ترقی چاہتی ہے، تو اسے ہندستانی اساتذہ کو کم ازکم دو سال کے لیے اپنے یہاں بلانا چاہیے، تاکہ وہ اِن دو سالوں میں بول چال کی زبان پر پوری دسترس حاصل کرلیں، اور جب اپنے وطن واپس جائیں تو اس طرح سے فارسی علم و ادب کی ترویج و ترقی میں بھرپور حصہ لے سکیں۔

ابھی میری طول بیانی جاری ہی تھی کہ کھانے کا اعلان ہوا اور یہ جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد کچھ لوگوں کو ٹیلی ویژن کے لیے انٹرویو دینے کو بلایا گیا تھا۔ ترکی کے وفد سے دائمہ اینال، امریکہ کے وفد سے مسٹر اسپراکمن، ہندستان کے وفد سے مولانا علیمان ندوی اور میں، مصری وفد کی ایک خاتون اور انجمن اساتذہ کی طرف سے ڈاکٹر ستودہ اس انٹرویو میں شریک ہوئے۔ ڈاکٹر ستودہ سوالات کرتے رہے اور ہم لوگ جوابات دیتے رہے۔ یہاں بھی قرعۂ فال سب سے پہلے میرے نام نکلا۔ میں نے اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ پورے ایران میں یہ پروگرام دکھلایا جائیگا، پھر اپنی اسی بات کا اعادہ کیا کہ ہندستان میں فارسی زبان آٹھ سو سال تک نوشت وخواند ہی کی نہیں بلکہ سرکار کی زبان بھی رہ چکی ہے۔ اگرچہ آج اسے یہ درجہ حاصل نہیں ہے، پھر بھی ہم یہ بات فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مولوی، سعدی اور حافظ کی زبان کی آبیاری کی ہے اور ہم ہی اس کے محافظ بھی رہے ہیں اور انشا اللہ آیندہ بھی رہینگے۔

اس پروگرام میں اتنی دیر ہو گئی کہ ہم لوگ ڈاکٹر فلاح دستگار کا مقالہ نہ سن سکے جب یہاں سے فارغ ہوئے، تو چائے کا وقفہ ہو چکا تھا۔ چائے کے بعد پھر "گروہِ خارجیاں" کی نشست ہوئی اور ہر رکن نے فرداً فرداً ان مسائل کا بیان کیا جو فارسی زبان و ادب کے درس و تدریس میں سامنے آتے ہیں۔ ابھی آدھے مندوبین ہی اپنی بات نہ کہہ پائے تھے کہ جلسہ کا وقت ختم ہو گیا۔ اس وقت یہ طے ہوا کہ بقیہ حضرات کل بارہ بجے دوسری نشست میں اپنے خیالات کا اظہار کرینگے۔

تیسرے دن کا جلسہ صبح کے ساڑھے نو بجے مصری خاتون کی صدارت میں شروع ہوا۔ ان خاتون نے فرخی سیستانی پر کابل سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے اور آج کل جامعۂ ازہر کے کلیۂ نسوان ہومنز کالج میں شعبۂ فارسی کی صدارت پر فائز ہیں۔ اس جلسہ میں سب سے پہلے اصفہان یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد جواد شریعت نے اپنا مقالہ پڑھا۔ صاحب موصوف کے اس مقالہ میں ایران کی درسی کتابوں کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شریعت نے مثالوں کے ذریعہ واضح کیا کہ کس طرح درسی کتابوں میں بھی غلط زبان اور غلط الفاظ کا ستعمال کیا جارہا ہے جس کی وجہ سے نوآموزوں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ساری درسی کتابوں کو از سرِ نو مرتب کیا جائے تاکہ وہ ان اغلاط سے پاک ہو جائیں۔

صاحبِ موصوف کے اس مقالے سے غالباً سب ہی شرکا کو اتفاق تھا، اسی لیے اس پر ئی بحث نہیں ہوئی۔ البتہ ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب نے پُرزور الفاظ میں ان کی تائید ، اور درسی کتابوں کی از سرِ نو ترتیب پر زور دیا۔

ں کے بعد چائے کا وقفہ ہوگیا اور نصف گھنٹہ تک لوگ ایک دوسرے سے ملتے اور دلۂ خیالات کرتے رہے۔

سرا مقالہ دانشگاہِ جندی شاپور کے استاد وحیدیان کامگار نے پڑھا۔ ڈاکٹر وحیدیان وضوع بھی وہی تھا، جس پر ڈاکٹر جواد شریعت بحث کر چکے تھے۔ انھوں نے اپنی بات کو ضح کرنے کے لیے سب سے پہلے زبان و ادب کو دو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرتے ئے دونوں کے جداگانہ مسائل سے بحث کی۔ زبان کے سلسلہ میں ڈاکٹر وحیدیان نے ں طور سے ان مسائل کا ذکر کیا جو عربی الفاظ کے غلط استعمال کی وجہ سے فارسی زبان ، پیدا ہو رہے ہیں اور اس کی ساخت کو بُری طرح مجروح کر رہے ہیں۔

، مسایل سے بحث کرتے ہوئے انھوں نے انتخاب پر زور دیا اور اس بات کی سفارش جو انتخابات شاملِ نصاب ہوں، وہ ہر لحاظ سے اعلیٰ پایے کے ہوں۔ اسی ضمن میں انھوں ، بھی واضح کیا کہ آج کے طالب علموں کو کن کن مسایل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر

ایک ادبی سفرنامہ

وحید یان نے ایسے نصابِ تعلیم کو رائج کرنے کا پُر زور مطالبہ کیا، جو طالب علموں میں خود سے مطالعہ کرنے اور معلومات فراہم کرنے کا شوق پیدا کر سکے۔ انھوں نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ابھی تک ادبیاتِ معاصر کو نصابِ تعلیم میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔ ان کا مشورہ تھا کہ ادبیاتِ معاصر کو بھی شاملِ نصاب کیا جائے، اور طالب علموں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ اپنے زمانے کی نظم و نثر کو نہ صرف سمجھ سکیں، بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوں۔

اس مقالے پر تین حضرات نے بحث کی۔ جو صاحب سب سے پہلے بولے، بدقسمتی سے میں ان کے نام سے واقف نہیں تھا اور اس وقت کسی سے ان کا نام پوچھ ہی سکا۔ بہر حال، انھوں نے فرمایا کہ ادب کا استاد ہونا دوسرے مضامین کے استاد ہونے سے زیادہ مشکل ہے کیونکہ ادبیات کے استاد کو فلسفہ، علم الکلام، نجوم و ہیئت، معما، کیمیا، سیمیا اور علم حیوانات جیسے علوم کا آشنا ہی نہیں ان کا محرم راز بھی ہونا چاہیے؛ اور اسی کے ساتھ ساتھ ادبیاتِ قدیم کا زبردست پارکھ بھی۔ یہ سلسلہ یہیں پر نہیں رک جاتا بلکہ ادبیات کے استاد کو قرآن، حدیث، قصص، افسانہ و حکایات سے بھی بخوبی واقف ہونا چاہیے، تاکہ وہ کسی ادب پارہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں کہیں ٹھوکر نہ کھائے۔ انھوں نے ادبیاتِ معاصر کی تدریس سے پہلے اس بات کا مطالبہ کیا کہ یہ طے ہونا چاہیے کہ ادبیاتِ معاصر سے ہماری مراد کون سا ادب ہے؛ جب تک یہ طے نہ ہوگا ادبیاتِ معاصر کی تدریس ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر حکمت (علی) نے اس مقالے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سب سے پہلے تو میں یہ عرض کروں گا کہ محقق کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ یہ تو ممکن ہے کہ لوگوں کے نقطۂ نظر میں اختلاف ہو، مگر کسی محقق کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی نقطۂ نظر کی پاسداری کرے۔ اسے تو جو کچھ، اور جیسا کچھ ہے، اُسی کو قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر دینا چاہیے۔ ڈاکٹر حکمت نے اپنے پیشرو کی بات کا جواب دیتے ہوئے ادبیاتِ معاصر کی یہ تعریف کی کہ جو کچھ آج کل لکھا جا رہا ہے، وہ سب کا سب ادبیاتِ معاصر

میں شامل ہے۔ ہمیں ادب کی تدریس کرتے وقت اس سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے اور نہ اسے نظر انداز ہی کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر حکمت کے بعد ڈاکٹر رجائی کھڑے ہوئے۔ صاحب موصوف نے بڑی دلسوز اور پُر زور تقریر کی، جو خاصی طویل بھی تھی۔ انھوں نے خاص طور سے زور دیتے ہوئے فرمایا کہ استادوں کو انصاف پسند ہونا چاہیے، خواہ اس انصاف پسندی کی وجہ سے ان سے بوڑھے خفا ہوں یا نوجوان۔ انھوں نے دیانتداری سے فرمایا کہ تعلیمی دنیا میں جو انحطاط آیا ہے، اس کی ذمہ داری سے اساتذہ بری نہیں قرار دیے جا سکتے۔

اس سلسلے میں انھوں نے استادوں کی کمیوں اور خامیوں کا تفصیل سے ذکر کیا۔ یہ مجمع صرف استادوں ہی پر مشتمل تھا، مگر ڈاکٹر رجائی کی تقریر بڑی خاموشی اور صبر و سکون سے سنی گئی۔ جب انھوں نے اپنی تقریر ختم کی، تو پُر زور تالیوں سے ان کی پذیرائی کی گئی۔

اس سہ روزہ سیمینار کا یہ آخری مقالہ تھا۔ مقالہ اور اس پر بحث کے فوراً بعد "جلسہ ہای گروہی" شروع ہو گئے۔ ہم لوگ یعنی "گروہ خارجیان" کے مندوبین ڈاکٹر ستودہ اور ڈاکٹر مطہری کے ساتھ ایک دوسرے کے مسائل سننے میں مصروف ہو گئے۔ اس جلسے میں موجود ہر شخص نے فرداً فرداً فارسی تدریس کے مسائل بیان کیے اور اپنے مطالبات گنوائے جنھیں ڈاکٹر ستودہ نوٹ کرتے گئے، تاکہ انجمن کی مجلسِ عام میں انھیں پیش کیا جا سکے۔ اتنے میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے بعد فوراً جلسہ کی کارروائی شروع کر دی گئی۔ سب سے پہلے چاروں "گروہوں" کی سفارشات پڑھ کر سنائی گئیں۔ اس کے بعد ایک مجلسِ شعرخوانی کا انعقاد ہوا۔

مجلسِ شعرخوانی میں باہر کا کوئی شاعر نہیں شریک تھا، صرف مندوبین اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے۔ سب سے پہلے ہمارے ساتھی ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی استاد ذاکر حسین کالج (دلی کالج) نے حافظ کی غزل "دل سراپردۂ محبت اوست" اپنے دلکش ترنم میں سنائی۔ ایک ہندی کی زبان سے ہندی لہجے میں اپنے عظیم شاعر کی غزل سن کر ایرانی اساتذہ بہت خوش ہوئے۔ ان کے پڑھنے کے فوراً بعد جو صاحب ڈائس پر تشریف لائے ان کا نام تو مجھے

یاد نہیں رہا البتہ یہ ضرور ذہن میں محفوظ ہے کہ لوگوں نے ان کے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ مرحوم وصال شیرازی کے پوتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا: چونکہ ایک ہندی نے ایک ایرانی کی غزل پیش کی ہے اس لیے میں بھی برِ صغیر کے ایک فارسی شاعر کی غزل پیش کروں گا۔ غالباً انھیں کسی ہندستانی شاعر کی کوئی غزل یاد نہ تھی اس لیے انھوں نے صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کی غزل پیش کی۔ اس کے بعد اپنی بھی غزل سنائی۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے تک شعر خوانی ہوتی رہی۔ اس مجلس شعر خوانی میں دو ہندستانی مندوبین نے بھی حصہ لیا۔ ڈاکٹر وارث کرمانی کی وہ نظم جو انھوں نے شاہ کے جشنِ تاج گذاری کے موقع پر کہی تھی، ڈاکٹر نثیم الحق صدیقی نے پڑھی۔ اس کے علاوہ یعقوب احمد صاحب استاد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد نے اپنی غزل سنائی۔

اس مجلس شعر خوانی کے علاوہ مجھے تہران کی کسی اور مجلس شعر خوانی میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ ایران میں شعر خوانی کا یہی انداز ہے یا اس سے کچھ مختلف بھی ہے۔ اس مجلس میں سب ہی شعرا نے تحت میں اپنا کلام پیش کیا، جو خاموشی کے ساتھ سنا گیا۔ شعر خوانی کے بعد ہی داد دی گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ایرانی غزل کہنا ہی بھول گئے ہیں۔ یہاں زیادہ تر نظمیں پڑھی گئیں، جن میں سے بیشتر مثنوی کی شکل میں تھیں اور ان سے کمتر آزاد نظمیں تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ایرانیوں میں سے صرف ایک صاحب نے غزل پیش کی تھی۔ ابھی کئی شعرا باقی تھے، لیکن چونکہ بہت سے کام ابھی نپٹانا تھے، اس لیے یہ مجلس جلد ختم کر دی گئی۔

اس کے فوراً بعد جلسہ ہائے گروہی کی رپورٹ پیش کی گئی، اور اختتامی تقریر کے بعد مغرب کے قریب اس جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔

(۳)

جن مقاصد کے لیے ہم ایران آئے تھے، وہ تو پورا ہو چکا تھا، مگر ان وفود کو ابھی ایک ہفتہ اور ایران میں قیام کرنا تھا۔ اس لیے وزارتِ فرہنگ و ہنر نے اس بات کی کوشش کی کہ ہم لوگ جن تاریخی مقامات کو نہیں دیکھ سکے ہیں انھیں بھی دیکھ لیں اور

شہر و بازار کے کچھ اور چکر لگا لیں، تاکہ ہمارا وقت آسانی سے گذر جائے۔ ہندستانی وفد جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا، ۳۱ جنوری سے مصری وفد بھی اسی ہوٹل میں آ گیا۔ اس کے بعد سے ہم لوگ جہاں بھی گئے، دونوں وفود ساتھ ساتھ رہے۔ چودہ ہندستانی مندوبین اور چھ مصری کل بیس افراد ایک ساتھ تاریخی مقامات بھی دیکھتے رہے، اور "گردش در شہر" میں بھی مشغول رہے۔

۴ فروری کی صبح کو مصری اور ہندی وفد مسجد سپہ سالار دیکھنے گئے۔ جمعہ ہونے کی وجہ سے مسجد کا اسکول اس دن بند تھا۔ دروازے پر صرف پولس والوں سے ملاقات ہوئی۔ شدید برفباری کے بعد ہم لوگ یہاں آئے تھے؛ سارے کھلے حصے میں برف بھری تھی۔ مسجد کا فرش اتنا سرد محسوس ہوا کہ اس پر ٹھہرا رہنا دشوار تھا۔ اس لیے ہم لوگ اس حصے میں زیادہ دیر تک گھومتے رہے، جہاں جوتا پہن کر چلا جا سکتا ہے۔ یہ وسیع و عریض مسجد اپنے کاشی کاری کے کام کی وجہ سے دیدنی ہے۔ اس کا حسن اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ یہاں آنے والا دو رکعت نماز پڑھے بغیر واپس نہ جائے۔ یہاں سے اور لوگ تو ہوٹل چلے گئے، لیکن میں مصری وفد کے ساتھ نماز جمعہ ادا کرنے کو روانہ ہو گیا۔ ہمارے ساتھ وزارت کے نمائندے بھی تھے۔ اس بھری ہوئی مسجد میں صرف ہم پانچ افراد ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے والے تھے ورنہ اور سب حضرات ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھ رہے تھے۔ بعض بچوں اور نوجوانوں نے ہماری نماز کو عجوبہ کی طرح دیکھا۔ نماز جمعہ کی سنتوں کے فوراً بعد نماز عصر پڑھائی گئی، جس میں ہم لوگ بھی شریک رہے۔ نماز کے بعد ہم لوگ ہوٹل واپس آ گئے۔

اسی دن سہ پہر کو ڈاکٹر حکیم الدین قریشی تشریف لائے۔ ڈاکٹر قریشی جولائی ۱۹۷۴ء سے تہران چلے گئے ہیں۔ تہران جانے سے پہلے موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں فارسی کے استاد تھے۔ تہران میں وہ اس وقت تین مختلف کاموں میں مصروف ہیں۔ بنیادی طور پر وہ کتابخانۂ پہلوی کی ایک اسکیم میں کام کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ تہران یونیورسٹی میں جز وقتی استاد بھی ہیں اور ریڈیو زاہدان کی اردو سروس کے انچارج بھی۔ اس وقت

وہ اسی آخری حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے ہندستانی مندوبین سے ہندستان میں فارسی تدریس کے مسائل کے بارے میں انٹرویو لیا۔ انٹرویو ریکارڈ ہوتے ہوتے شام ہوگئی، تو ہندستانی مندوبین کا قافلہ ان کی معیت میں ان کے گھر کی طرف چلا، جہاں رات کا کھانا کھایا گیا۔ واپسی میں ہم میں سے چند افراد ایک فلم دیکھنے چلے گئے، جس کا نام "کارمن عشوہ گر" تھا۔ یہ فلم فارسی میں ڈب کی ہوئی تھی اور ہندستانی نقطۂ نظر سے بڑی ننگی فلم تھی۔ اس میں جو مناظر قلم بند کیے گئے ہیں، ہندستان کے فلم بین اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تعجب ہے کہ ایسی فلمیں کھلے عام دکھلائی جاتی ہیں، اور ان پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔

ہم میں سے کئی افراد علمی مصروفیتوں سے گھبرا گئے تھے، اس لیے میں، ڈاکٹر سمیع الدین احمد اور ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی ۸ فروری کی صبح کو ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا سے ملنے کے لیے ان کے دفتر چلے گئے۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا ان ایرانی علما میں سے ہیں، جن کے دم سے فارسی علم و دانش کا بھرم قایم ہے۔ وہ مشہور زمانہ استاد بدیع الزّمان فروزانفر کے قابلِ فخر شاگرد، اور خود بھی یگانۂ روزگار استاد ہیں۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ دانشگاہ تہران میں ادبیاتِ فارسی کے استاد اور صدر رہے تھے۔ آج کل موصوف شورای عالی فرہنگ و ہنر کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ موصوف کی اب تک ۴۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ صدہا مقالات بھی تحریر فرمائے ہیں۔ موصوف نے کمال مہربانی سے ہمیں وقت دیا، اور کامل ایک گھنٹہ تک ہمارے مختلف قسم کے سوالوں کا جواب دیتے رہے۔ ان میں سے بیشتر سوالات خود ان کی ذات اور طریقِ کار سے متعلق تھے اور کچھ سوالات جدید ایرانی ادب کے سلسلے میں۔ یہاں اس پوری گفتگو کو نقل کرنے کا محل نہیں ہے، صرف اس کے بعض گوشوں ہی کی طرف چند اشارے کیے جا سکتے ہیں۔

اس گفتگو میں پہلی بار مجھے اس کا علم ہوا کہ ڈاکٹر صفا شاعر بھی ہیں، اور ان کا ایک مجموعۂ کلام "نشۂ جام" شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متعدد ناول اور افسانے

بھی لکھے ہیں، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے، لیکن جلد ہی شائع ہو رہے ہیں۔
عصرِ جدید کی فارسی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے صاحبِ موصوف نے موجودہ دور کے شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا: (۱) روایت پرست (۲) میانہ رَو (۳) جدید۔ روایت پرستوں کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ ان کے یہاں اتنی تکرار ہوتی ہے کہ ان کا اصل مدعا یا مفہوم چند موضوعات کے گرد گھوم کر رہ جاتا ہے۔ اور وہ ادبیات یا سماج کو کوئی قابلِ قدر کارنامہ نہیں دے سکتے۔ جدیدیوں کے بارے میں انھوں نے بہت ہی واضح الفاظ میں فرمایا کہ یہ شعرا نہ تو "دانش مند" ہیں، نہ "اہلِ ادب" ہی۔ یہ شعرا صرف انھی لوگوں میں مقبول ہیں، جو ادبیات سے ناواقف ہیں۔ صفا صاحب نے ایسے شعرا کو سنّت شکن شعرا کا نام دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ حضرات شعر کے نام پر جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ غالباً شعر نہیں ہے۔ میانہ رو شعرا کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ ان شعرا کے یہاں نئی فکر بھی ملتی ہے، اور کلاسیکی سلیقۂ اظہار بھی۔ اسی سلیقے کا نام سبک (طرزِ بیان) ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ بہار، صورتگر، رہی معیری، پژمان بختیاری، کے اشعار میانہ رو شعرا کے بہترین نمایندے ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں انھوں نے جو جملہ فرمایا تھا وہ انھی کے الفاظ میں درج کیا جاتا ہے۔ "سنّت نمایندۂ روحِ یک قوم است، دانش نمایندۂ روحِ انسان بطورِ کلّی است۔"

ہم لوگوں کو گفتگو کرتے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ جی تو نہیں چاہتا تھا کہ یہ دلچسپ صحبت ختم ہو، مگر صفا صاحب کی مصروفیت کا خیال کرتے ہوئے ہم نے ان سے اجازت لی اور ان کے دفتر سے باہر آگئے۔ وزارتِ فرہنگ و ہنر نے ہمارے لیے جو پروگرام بنایا تھا، اس کے مطابق آج صبح ہمیں اصفہان جانا چاہیے تھا۔ اصفہان میں ایک دن ایک رات گذار کر دوسرے دن عصر کے وقت شیراز پہنچنا اور ۷ فروری کی شام کو تہران واپس آنا تھا۔ مگر برفباری اتنی شدید ہو رہی تھی کہ ہم اپنے میزبانوں کی خواہش کے باوجود نہ اصفہان جا سکے نہ شیراز۔ ہم سبھی کو اس کا سخت افسوس تھا مگر موسم کے ہاتھوں مجبور تھے۔ صفا صاحب کے پاس سے آنے کے بعد خرابیِ موسم کی وجہ سے ہم لوگ ہوٹل ہی میں محصور ہو کر رہ گئے۔

۶ فروری کو ہمیں شیراز میں ہونا چاہیے تھا، مگر ہم تہران کے ہوٹل رودکی میں آسمان کی طرف نظر لگائے ہوئے تھے۔ ہمارے میزبانوں نے سوچا کہ وہ آج ہمیں "ورزشگاہ آریا مہر" دکھلائیں۔ چنانچہ ہم چودہ ہندستانی اور چھ مصری اس موسم میں بھی ورزشگاہ دیکھنے روانہ ہوگئے۔ یہ ورزشگاہ کیا تھی، پورا ایک شہر تھا۔ ہر طرف برف جمی ہوئی، سامنے کوہِ شمیران کی برف پوش چوٹیاں، اس ورزشگاہ کا مصنوعی دریا یخ بستہ ہوکر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس ورزشگاہ کے منتظمین نے یہاں کا ایک ایک گوشہ دکھلایا۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ورزشگاہ اتنی بڑی ہے کہ ہم چلتے چلتے تھک سے گئے۔ پھر بھی برف کی فراوانی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم ساری ورزشگاہ میں گھومتے پھرے۔ بعض بعض جگہوں پر یہاں کے منتظمین نے کچھ عملی مظاہرے بھی دکھلائے۔ غرض کہ دوپہر تک وہاں کی سیر کرنے کے بعد یہ قافلہ واپس ہوا۔

ہم لوگ ابھی راستے ہی میں تھے کہ تیز ہوائیں چلنے لگیں اور برفباری کے بجائے بارش ہونے لگی۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ تین بجے کے قریب حسبِ وعدہ رحیم چاوُش اکبری صاحب تشریف لے آئے۔ رحیم چاوُش صاحب "دانش سرای راہنمایی" میں فارسی کے استاد ہیں۔ آذری ہونے کے باوجود فارسی میں شعر کہتے ہیں، اور ان کا ایک مجموعۂ کلام "سہر دادنامہ" کے نام سے شائع بھی ہوچکا ہے۔ ڈاکٹر سمیع الدین احمد کی معیت میں ہم تینوں آدمی چل کھڑے ہوئے۔ بارش ہورہی تھی، اس لیے تھوڑی دور چلنے کے بعد چاوُش صاحب نے ٹیکسی لے لی اور ہم ان کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ گھر پہنچ کر ان کی اہلیہ اور دو خورد سال بچوں نے جس طرح پذیرائی کی وہ ہمیشہ یاد رہیگی۔ ہم ان کے اہلِ خانہ سے رسمی بات چیت کرتے رہے، تھوڑی دیر بعد جب ان کی اہلیہ کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں، تو ادبی گفتگو کا آغاز ہوا۔ یہاں پہلے دو باتوں کا ذکر کردینا بہت ضروری ہے۔ اوّل تو یہ کہ چاوُش اکبری صاحب کو ہندستان اور اہلِ ہندستان سے بڑی عقیدت ہے۔ میں نے ان کے کمرہ میں مہاتما گاندھی کی ایک بہت بڑی تصویر بھی آویزاں دیکھی۔ اس کے علاوہ ان کے کتابخانے میں ہندستانی مشاہیر اور ہندستان سے متعلق فارسی کتابوں کا بھی قابلِ قدر ذخیرہ موجود تھا۔ دوسری

درد کی شکایت کی۔ ساری رات تکلیف میں کٹی۔ یکم فروری صبح کے وقت ڈاکٹر آیا، اس نے بھی کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ دن بھر دوا کا استعمال جاری رہا، جس سے تکلیف میں خاصا افاقہ محسوس کیا۔ شب میں نیند بھی آگئی، لیکن نصف شب کے بعد دو تین بجے دل کا شدید دورہ پڑا، اسی حالت میں جمعرات ۲ فروری ۱۹۷۸ء (۲۳ صفر ۱۳۹۸ھ) چاشت کے وقت ساڑھے نو بجے روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ جنازہ اسی دن اٹھا اور انھیں اپنے مرشد حضرت سیّد عبد اللہ شاہ نقشبندی کی درگاہ مصری گنج، حیدر آباد میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ تیرہ برس پہلے انھوں نے کتبے کے لیے یہ چند شعر کہے تھے، یہی قبر پر کندہ کیے گئے ہیں۔

نقشبندی چمن کی ہر کیاری باغ فردوس کی ہے پھلواری
اس چمن میں جو آکے سوتا ہے وہ خدا سے قریب ہوتا ہے
بن کے میں خوش نصیب صدیقی! شیخ سے ہوں قریب صدیقی
رات پر دن ہے، دن پہ رات فدا میری اس موت پر حیات فدا
کیوں نہ ہو کیف اس پہ ہے دن رات سایۂ دامنِ ابوالحسنات

از مے نقشبند سرمستم
خانہ زادِ ابوبکر ہستم

ان کے محبِّ صادق مولانا سیّد معز الدین معز قادری الملتانی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا ہے، جس کے ہر مصرعے سے تاریخ نکلتی ہے:

فا دنند محبانِ دکن شاہدِ عظمت
(۱۹۷۸ء)
عشقِ نبوی، موجِ وفا، سایۂ رحمت
(۱۳۹۸ھ)
تاریخ وصالش زِ معز آمدہ مکنوں
(۱۹۷۸ء)
مدّاحِ نبی، ماہِ مبیں، رفت بجنت
(۱۳۹۸ھ)

ڈاکٹر سمیع الدین احمد اور مجھ پر بہت دیر تک قائم رہا۔ انسانی اقدار نے نسل، رنگ اور قوم کی ساری دیواریں گرادی تھیں۔ اس وقت نہ کوئی ہندی تھا، نہ ایرانی؛ ہم صرف انسان تھے، جو ایک دوسرے کی جدائی سے گرانبار ہو رہے تھے۔

اب وزارتِ فرہنگ وہنر کے پروگرام کے مطابق کوئی ایسی جگہ باقی نہیں بچی تھی، جسے ہم کو دیکھنا ہو۔ اس لیے ہم لوگ آزاد تھے کہ خواہ بازاروں میں گھومیں، خواہ ایران کے اہلِ علم حضرات سے ملاقات کرتے پھریں۔ ۷ فروری کی صبح کو میں نے اور ڈاکٹر شمیم الحق صدیقی نے یہ طے کیا کہ سعیدی سیرجانی صاحب سے ملاقات کی جائے۔ صاحبِ موصوف بنیادِ فرہنگِ ایران کے سکریٹری ہیں، اور اسی مناسبت سے متعدد بار ہندستان آچکے ہیں۔ ان سے دلی میں بھی کئی مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی۔ اسی لیے ہم لوگ ان سے ملنے کو بیقرار تھے۔ دس بجے کے قریب ہم دونوں ان کے دفتر کے لیے روانہ ہوئے۔ صبح ہی سے موسم خراب تھا۔ ابھی ہم لوگ آدھا راستہ بھی نہ گئے ہونگے کہ ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ اسی بارش میں ہم لوگ غلطی سے انتشاراتِ بنیادِ فرہنگ کے دفتر پہنچے۔ یہاں آکر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہیں سے ایک صاحب کو ساتھ لیکر بنیادِ فرہنگِ ایران کے دفتر پہنچے۔ سعیدی صاحب موجود تھے، لیکن اب ان کے اٹھنے کا وقت ہو چکا تھا، اس لیے ہم لوگوں نے مختصر اور رسمی سی گفتگو کی، اور آدھ گھنٹہ کے بعد وہاں سے اٹھ گئے۔ سعیدی صاحب بھی ہمارے ساتھ آئے۔ دروازے پر یکایک ان کو احساس ہوا کہ ہم لوگ پیدل آئے ہیں، اور اس بارش میں ہوٹل پہنچتے پہنچتے بالکل بھیگ جائینگے۔ اس پر انھوں نے ہمیں وہیں روک لیا۔ جب ان کے دفتر کی گاڑی انھیں لینے آئی، تو انھوں نے اسی کار سے ہمیں ہوٹل بھیجا۔ راستے بھر بارش کے دوران ہی میں اتنی شدید برفباری ہوئی کہ سامنے کی چیز تک بالکل نظر نہ آتی تھی۔ بہر حال، خدا خدا کر کے ہم ہوٹل پہنچ ہی گئے۔

بارش کا سلسلہ جاری رہا، لیکن ڈاکٹر سمیع الدین احمد، ڈاکٹر وارث کرمانی اور میں رات کے کھانے پر مسرور حسین صاحب کے یہاں مدعو تھے، اسی لیے ٹیکسی کر کے وہاں روانہ ہو گئے۔ مسرور حسین صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اولڈ بوائے اور وہاں

کی اصطلاح کے مطابق مجھ سے دو تین سال جونیر ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سمیع الدین صاحب اور وارث کرمانی صاحب سے ان کے دوستانہ مراسم بھی ہیں۔ اس سے یہاں اگر بڑی بےتکلفی کا ماحول بن گیا۔ ہندوستانی کھانا جس میں ارہر کی دال فرمائش کر کے پکوائی گئی تھی، چپاتی، آلو گوبھی کی سبزی، سرخ مرچ اور لہسن کی چٹنی، غرض ہر قسم کا ٹھیٹھ ہندوستانی کھانا میز پر موجود تھا۔ گیارہ بجے رات تک یارانِ طریقت ہو حق کرتے رہے۔

اب ایران میں ہمارا قیام صرف ساڑھے تین دن کا رہ گیا تھا۔ اس لیے جلدی جلدی سب کام نپٹا لینا چاہتے تھے۔ ۸ فروری صبح کو ناشتہ کے بعد میں اور ڈاکٹر وارث کرمانی نکل کھڑے ہوتے، تاکہ سب سے پہلے تو کتابیں خریدیں، پھر دانشگاہِ تہران چل کر پروفیسر عبدالحسین زرّین کوب سے ملاقات کریں۔ دانشگاہِ تہران کے سامنے بہت ساری کتابوں کی دکانیں ہیں۔ ہم نے سب سے پہلے "بنگاہِ ترجمہ" سے کتابیں دیکھنا شروع کیں۔ اس دکان پر کتابیں دیکھتے وقت اندازہ ہوا کہ ایران میں ترجمہ کا کام کس تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یہاں ہم نے انگریزی، جرمن، فرنچ اور دوسری زبانوں کی اعلیٰ پایے کی کتابوں کے ترجمے دیکھے۔ سائنسی علوم ہوں یا سماجی، ادب ہو خواہ انسانیات، جس موضوع پر بھی مذکورہ زبانوں میں کوئی اچھی کتاب شائع ہوتی ہے، بالعموم چند مہینوں کے اندر اس کا فارسی ترجمہ دستیاب ہو جاتا ہے۔ بنگاہِ ترجمہ کے علاوہ، کتابخانۂ سنائی، کتابخانۂ طہوری، کتابخانۂ پہلوی اور خدا جانے کون کون سے کتابخانے ہم نے دیکھ ڈالے۔ یہاں کتابوں کی طباعت کا معیار بھی بہت اچھا ہے! بڑی روشن، صاف ستھری کتابیں چھپتی ہیں۔ انہی دکانوں پر تاجیکستان اور روسی آذربائجان کی فارسی مطبوعات بھی نظر سے گذریں۔ مجھے صدرالدین عینی کی کتاب "یادداشتہا" کی تلاش تھی۔ وہ تو نہ ملی، مگر اس کے بدلے میں نسیمی آذربائجانی کا دیوان، نظامی گنجوی کی دو مثنویاں اور رودکی پر ایک کتاب مل گئی، جس کا نام "دربارۂ ابوعبداللہ رودکی و آثار منظوم رودکی" ہے۔ روسی مطبوعات کی قیمتیں بڑی واجبی تھیں، اسی لیے میں یہ ساری کتابیں خرید سکا۔ ایران میں ڈاکٹر اقبال کا سارا فارسی کلام "کلیاتِ مولانا اقبال لاہوری" کے نام سے بڑے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ علی گڑھ میں یہ نسخہ میری نظر سے گذر چکا تھا، اور مجھے

اس کی تلاش تھی۔ دو تین دکانیں دیکھنے کے بعد میں اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس خوبصورت مجموعۂ کلام کی قیمت صرف ۲۵ تومان (۲۵ روپیہ پچاس پیسے) ہے۔ دل نے اس نعمت سے محروم رہنا گوارا نہ کیا، اس لیے اسے بھی خرید لیا۔ کتابیں دیکھتے دیکھتے بہت دیر ہوچکی، تو شعبۂ فارسی جانے کا خیال آیا۔ ہم لوگ کتابوں کی دو کانوں پر نظر ڈالتے ہوئے یونیورسٹی کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ چونکہ معلوم نہ تھا کہ شعبۂ فارسی کس طرف ہے، اس لیے کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ پھر ایک نوجوان پر نظر پڑی، جو بظاہر طالب علم معلوم ہوا۔ ہم نے اُس سے شعبۂ فارسی کا پتا پوچھا۔ اُس نوجوان نے بجائے پتا بتانے کے نہ صرف ہمارا ساتھ دیا، بلکہ جب تک ہم تہران میں رہے، ہماری ہر طرح سے رہبری کرتا رہا۔ اس نوجوان کا تذکرہ بعد میں کیا جائیگا۔

زرّین کوب صاحب سے خاصی دیر تک ملاقات رہی۔ ایران کے عام اہلِ علم ترتیبِ متون کے کام میں مصروف ہیں، لیکن زرّین کوب صاحب نے تنقید کو اپنے خصوصی مطالعے کا موضوع بنایا ہے۔ اسی مناسبت سے ان سے فارسی میں تنقید نگاری کے مسائل پر تفصیلی گفتگو رہی۔ زرّین کوب صاحب نے اپنی مشہور کتاب "نقدِ ادبی" کے علاوہ اور بھی تنقیدی کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے بعض علمی تنقید سے متعلق ہیں اور بعض نظریاتی تنقید سے۔ علمی تنقید کے سلسلے میں ان کی وہ کتاب بہت پسند کی گئی ہے، جس میں انھوں نے فارسی کے بیس بڑے شاعروں کے کلام کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ موصوف سے گفتگو کے بعد یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ ابھی تنقید کے میدان میں اہلِ ایران نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اہلِ ایران ابھی اپنے قدیم سرمایے کو جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ جب اس کام سے فارغ ہو لینگے، تو صحیح معنوں میں ان کے یہاں تنقید نگاری کا دور شروع ہوگا۔ تنقید کی کساد بازاری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ علی دشتی کی کتاب "قلمروِ سعدی" کی اشاعت سے پہلے سعدی کی حیات اور کارناموں پر صرف ایک بھرپور کتاب "حیاتِ سعدی" تھی، جس کا ترجمہ فارسی میں کرلیا گیا تھا۔ اِدھر چند سالوں میں البتہ تنقید نگاری کے چند اچھے نمونے سامنے آئے ہیں، خاص طور سے علی دشتی نے مولانا روم، خیام، خاقانی اور بامداد

کی شاعری پر جو کتابیں لکھی ہیں، وہ فارسی تنقید نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ تنقید کے بنیادی مسائل پر زریں کوب سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی، یہاں تک کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوگیا۔ ہم لوگوں نے ڈاکٹر زریں کوب سے اجازت لی اور یونیورسٹی سے باہر آگئے۔ جو ایرانی طالب علم ہمارے رہبر تھے، انھوں نے اپنا نام محمد ایران منش بتایا تھا؛ وہ ازراہ مہمان نوازی ہمیں ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔

نامناسب نہ ہوگا، اگر یہاں ڈاکٹر محمد راشد خان کا بھی ذکر کردوں۔ ڈاکٹر راشد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے "اولڈ بوائے" ہیں اور آج کل بسلسلۂ ملازمت تہران میں مقیم ہیں۔ ان کے بڑے بھائی شبلی ہائر سکنڈری اسکول، اعظم گڈھ میں میرے ہم درس بھی رہے تھے۔ ان دو نسبتوں کی وجہ سے پہلے ہی دن سے ان سے کافی بےتکلفی ہوگئی۔ ڈاکٹر سمیع الدین احمد اور ڈاکٹر راشد کے بڑے پرانے خاندانی تعلقات ہیں۔ اسی وجہ سے تہران میں بھی علی گڑھ کا سا ماحول بن گیا تھا۔ راشد ہم لوگوں کے ساتھ خرید و فروخت کرتے، گھومنے نکل جاتے، اور ہر ممکن طریقے سے ہماری پذیرائی کرتے۔ انھوں نے کئی بار ہم دونوں کو کھانے پر بھی بلایا اور لذیذ ہندستانی کھانے کھلائے۔

۹ فروری کو نیر محمدی صاحب نے ہندستانی اور مصری وفود کے مندوبین کو کھانے پر بلایا۔ یہ پہلا دن تھا جب وزارتِ فرہنگ و ہنر کے کسی ذمہ دار شخص نے ہم سے ملاقات کی، ورنہ اب تک ہم نے اپنے میزبانوں کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ نیر محمدی صاحب نے معذرت کی کہ وہ اپنی غیر معمولی مصروفیات کے باعث آج تک ہم سے نہیں مل سکے تھے۔ ان کی اس معذرت کے بعد اب شکوہ شکایت کا کوئی محل نہیں رہ گیا تھا، تاہم مجھے اس عبارت کا افسوس ضرور ہے کہ وزیر فرہنگ و ہنر نے ہم سے ملنے کی زحمت نہیں کی، حالانکہ ہم انھی کی دعوت پر ان کے ملک میں حاضر ہوئے تھے۔ یہ شکایت اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ ہم "دیارِ غیر" میں ان کی زبان کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں اور انھی کی فرمائش پر ان کے مہمان ہوئے تھے۔

دوسرے دن بنیادِ فرہنگِ ایران کی طرف سے دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی جس میں ہندی

اور میری دونوں وفود شریک تھے۔ ہم اس دعوت سے واپس پہنچے ہی تھے کہ ڈاکٹر حکیم الدین قریشی تشریف لے آئے۔ آتے ہی انھوں نے نوٹس دے دیا کہ اس وفد میں جتنے بھی شعراء ہیں وہ اپنی اپنی بیاضیں سنبھال لیں؛ وہ ریڈیو زاہدان کے واسطے ایک مشاعرہ رکارڈ کریں گے۔ حسنِ اتفاق سے ہمارے اس وفد میں چار شاعر نکل آئے۔ ہندوستانی فضا پیدا کرنے کے لیے جلدی جلدی فرش پر چادریں بچھا دی گئیں۔ گاؤ تکیہ کا کام تکیوں سے لیا گیا اور مولانا سلیمان عباس کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر انوار احمد (پٹنہ یونیورسٹی) نے اپنے اشعار سنائے، اس کے بعد جناب یعقوب عمر (جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد)، راقم الحروف اور ڈاکٹر وارث کرمانی نے علی الترتیب اپنا کلام پیش کیا۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے محمد ایران منش بھی آ گئے تھے۔ ان کے لیے یہ بالکل نئی چیز تھی۔ اس لیے بڑی توجہ اور دلچسپی سے ہماری حرکتوں کو دیکھتے رہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہیں محمد ایران منش کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر دوں۔

محمد ایران منش دانشگاہِ تہران میں ایم۔ اے (اکنامکس) کے طالب علم ہیں۔ ۸ فروری کو ہماری ان سے [illegible] دوران کی اچانک ملاقات سرِ راہ ہو گئی تھی۔ مگر انھیں ہم ہندوستانیوں سے کچھ ایسی عقیدت ہو گئی کہ وہ برابر ہمارے پاس آنے جانے لگے۔ ہم بازار جاتے، تو وہ ہماری راہنمائی کرتے؛ ہمارے لیے سیر و تفریح کے مواقع فراہم کرتے! اور جب گفتگو کرتے، بیشتر وقت ہندوستان اور ہندوستان میں فارسی کے تدریسی مسائل پر گفتگو کرتے۔ خدا جانے کیوں، انھیں مجھ سے [illegible] عقیدت ہو گئی تھی؛ جس دن سے ملے تھے، اس دن سے آخری روز تک روزانہ تین چار [illegible] ضرور ساتھ ر[illegible] کی دلنواز شخصیت کا اثر اب بھی دل پر قائم ہے۔ آج جب رخصت ہونے لگے [illegible] نظر آئے کیونکہ کل صبح ہی ہم کو ہوٹل چھوڑ کر فرودگاہ پہنچنا تھا۔ میں ان کو رخصت کرنے کے لیے ہوٹل سے باہر آیا، تو ایران کی رسم کے مطابق گلے ملے۔ گلے ملنے کے ساتھ ہی ایک رسم "روبوسی" بھی یہاں رائج ہے۔ میرا قد ان کے قد سے لمبا تھا، اس لیے وہ میری شیروانی کو بوسہ دے کر تیزی سے مجھ سے الگ ہو گئے اور اسی تیز رفتاری کے ساتھ اپنے راستے پر چلے گئے تاکہ میں ان کی آنکھوں کے آنسوؤں کو نہ دیکھ سکوں۔ اس

ایک ادبی سفرنامہ

"حادثہ" نے کافی دیر کے لیے مجھے دل گرفتہ رکھا۔ رات ۹ بجے کے قریب علی اکبر جعفر صاحب تشریف لائے۔ جعفری صاحب کرمان کے رہنے والے ہیں، لیکن اتنی شستہ اور بامحاورہ اردو بولتے ہیں کہ سُن کر تعجب ہوتا ہے۔ صاحبِ موصوف وزارتِ فرہنگ و ہنر میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں جس کا نام فارسی میں "رئیس ادارۂ نمایندگیہای فرہنگی در آسیا" ہے۔ اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں اکثر پاکستان میں بھی رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے، وزارتِ فرہنگ و ہنر میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ جعفری صاحب نے فرمایا، فارسی کا جتنا سرمایہ ایران میں ہے اس سے دوچند سرمایہ برِ صغیر میں موجود ہے۔ ان کے ہمکاروں کو یہ بات بُری لگی۔ اس پر کافی دیر بحث ہوتی رہی۔ آخر کار زچ ہو کر لوگوں نے کہا کہ ہم ایک یونٹ بنا دیتے ہیں، جائیے آپ اپنے کام کی ابتدا پاکستان سے کیجیے۔ جعفری صاحب اس کام کے لیے آمادہ ہو گئے اور انھوں نے پاکستان جا کر اپنا کام شروع کر دیا۔

ایک سال بعد پھر وزارتِ فرہنگ و ہنر میں میٹنگ ہوئی، جس میں جعفری صاحب بھی شریک تھے۔ ان کے ہمکاروں نے انھیں چھیڑنے کے لیے کہا "کہیے اب کیا خیال ہے؟" جعفری صاحب نے کہا: "میں اپنی گذارش میں ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔" ان کا یہ جواب سن کر حریفوں کے چہرے کھِل اٹھے۔ مگر انھوں نے یہ کہہ کر کہ برِ صغیر میں فارسی ادب کا سرمایہ ایران سے دوچند نہیں، سہ چند ہے، اپنے حریفوں کے کھِلے ہوئے چہروں کو کمھلا دیا۔

جعفری صاحب سے دیر تک ان کتابوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی، جو ان کے ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی ہیں۔ چونکہ ہمیں صبح سفر کرنا تھا، اس لیے موصوف دس بجے کے قریب رخصت ہو گئے۔

ہم ۱۱ فروری کو کراچی ہوتے ہوئے بمبئی آئے۔ بمبئی میں رات ایک ہوٹل میں قیام رہا۔ اگلی صبح کی ایربس سے دلّی آ گئے۔ دلّی کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی یہ احساس تازہ ہو گیا:

روی گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

ساہتیہ اکاڈمی

ساہتیہ اکاڈمی قومی ادارہ ہے۔ اسے ۱۹۵۴ء میں اس لیے قائم کیا گیا تھا کہ اس کے ذریعے سے دنیا کا بہترین کلاسیکی ادب ترجمے کی شکل میں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں مہیا کیا جائے اس اسکیم کے تحت بیسیوں ترجمے شائع کیے جا چکے ہیں۔ تازہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہیملٹ : شیکسپیر کا مشہور ڈراما۔

اس کا ترجمہ اردو کے ممتاز شاعر اور نقّاد فراق گورکھپوری نے کیا ہے۔

قیمت : دس روپے

۲۔ آرسی : پرنسپل تیجا سنگھ کی خود نوشت سوانح عمری۔

اصل پنجابی سے مشہور ادیب پرکاش پنڈت نے ترجمہ کیا۔ قیمت : آٹھ روپے

۳۔ میڈیا : یوری پیڈیز یونانی کا شہرہ آفاق ڈراما۔

اس کا ترجمہ ممتاز ادیب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔

قیمت : پانچ روپے

ساہتیہ اکاڈمی رابندر بھون، نئی دلّی۔ ۱۱۰۰۰۱

مالک رام

وفیات

ساحر سنامی ، دیوان تیجونت کمار

سنام (ضلع پٹیالہ ، پنجاب) تاریخی اور مردم خیز بستی ہے۔ یہاں کی خاک سے بڑی بڑی صاحبِ علم و فضل ہستیاں پیدا ہوئیں۔ سنام کا قانونگویان" کا گھرانا بہت پرانا ہے۔ یہ لوگ ہندوؤں کی اگروال (ویش) ذات کے تھے۔ دلّی سلطنت کے زمانے سے وہ حکومتِ وقت کی ملازمت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ، بلکہ میر منشی کا عہدہ تو طویل مدت تک نسلاً بعد نسلٍ اسی خاندان میں رہا۔ غرض بہت جاہ و جلال سے بسر ہوتی رہی۔ اسی خاندان کے ایک بزرگ رائے پرتاپ سنگھ نے ریاست پٹیالہ کے بانی بابا آلھا سنگھ کے دستِ راست بن کر ان کے استحکام تسلّط میں نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں۔ اسی باعث وہ پٹیالہ ریاست کے پہلے وزیرِ اعظم اور سپہ سالارِ افواج مقرر ہوئے تھے۔ اس کے بعد چھ سات پشتوں تک ریاست پٹیالہ کی وزارتِ عظمیٰ اور دیوانی انھیں کے خاندان میں رہی۔

ساحر اسی قانونگویان خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے دادا رائے جسونت رائے بھی پٹیالہ ریاست ہی میں کمشنر رہے۔ وہ فارسی ، عربی ، سنسکرت تینوں زبانوں کے عالم تھے۔ فارسی میں شعر بھی کہتے اور دانش تخلّص کرتے تھے۔ ان کی تین تصانیف "لطفِ کوہسار"، "کہکشاں" اور "مراۃ الغیب" ابھر گو سنگھتا

ماٰخذ : دیباچۂ گلِ صد رنگ ؛ بہارستان (تذکرہ) ؛ خطوط جگدیش رائے منگلا (پسر ساحر سنامی مرحوم)

کا ترجمہ) کا سراغ ملتا ہے۔ غالباً ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں بھی تھیں۔ انھوں نے ایک اخبار بھی "انبار گزٹ" کے نام سے جاری کیا تھا۔

ساحر کے والد رائے بھگونت رائے بہار سُنامی ایک زمانے تک ریاست میں ڈپٹی کمشنر رہے۔ وہ بھی فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ان کا مرتّب کردہ "کلیاتِ برہمن" اب بھی دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس میں عہدِ شاہجہانی کے مشہور فارسی شاعر منشی چندر بھان برہمن کا کلام جمع کیا ہے اس کے شروع میں ان کا مبسوط مقدمہ معرکے کی چیز ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اردو میں ایک رسالہ "رئیسِ ہند" کے نام سے جاری کیا تھا۔ جو پہلے مدّتوں دلی سے شائع ہوتا رہا، بعد کو انھوں نے اس کا دفتر پٹیالے منتقل کر لیا تھا۔ یہ پرچہ ان کی وفات (۱۹۳۲ء) کے بعد ساحر نے بھی ۱۹۳۷ء تک جاری رکھا۔

ساحر ۲۵ جولائی ۱۹۱۴ء کو سُنام میں پیدا ہوئے[ٍ]۔ ابھی دسویں تک کی تعلیم بھی ختم نہیں کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا، اور اس طرح مزید تعلیم کے حصول میں دشواری پیدا ہوگئی۔ اس پر خاندان کی خدماتِ دیرینہ کے پیشِ نظر ریاست نے ان کا نائب تحصیلداری کے لیے انتخاب کر لیا، اور یوں یہ کم عمری ہی میں برسرِ روزگار ہو گئے۔ لیکن تعلیم کا شوق تھا، ملازمت کے دوران میں بھی مطالعہ جاری رکھا اور رفتہ رفتہ پرائیوٹ طور پر پنجابی آنرز (۱۹۴۵ء)، انٹر (۱۹۵۶ء) اور بی اے (۱۹۶۰ء) کے امتحان پاس کر لیے۔ علم سے ان کے عشق اور قوتِ ارادی کا کچھ اس سے اندازہ کیجیے کہ انھوں نے ایم اے (اردو) کی سند ۱۹۶۵ء میں حاصل کی، جب ان کی عمر ۵۱ برس کی تھی۔ وہ جولائی ۱۹۶۹ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

انھیں شعرگوئی کا شوق تو ورثے میں ملا تھا، لیکن اس میں ترقی روشن لال روشن پٹیالوی اور منشی نربدا پرشاد عاصی گیاوی کی صحبت میں ہوئی، جو بہت دن تک پٹیالے میں

ٍ۔ ان کے دسویں درجے کے سرٹیفکیٹ پر تاریخ ولادت ۲۹ جولائی ۱۹۱۴ء لکھی ہے۔ لیکن وہ خود کہا کرتے تھے کہ یہ ٹائپ کرنے والے کا سہو ہے؛ صحیح تاریخ ۲۵ جولائی ہے۔

وفیات

مقیم رہے تھے۔ انھوں نے مختلف اوقات میں مہاراج بہادر برق دہلوی (ف: فروری ۱۹۳۶ء) اور منوہر سہاے انور (ف: فروری ۱۹۷۴ء) سے اصلاح لی۔ لیکن بالآخر حضرت جوش ملسیانی (ف: جنوری ۱۹۷۶ء) کے دامن سے وابستہ ہو گئے؛ اور ان کی رہبری میں تکمیل کے مدارج طے کر کے زبان و بیان وغیرہ کے رموز سے خوب واقف ہو گئے تھے۔ ان کی مندرجہ ذیل تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) "نورِ ہدایت (رہنماے حکمۂ مال)"۔ یہ ان کی سب سے پہلی تالیف ہے، جو انھوں نے ملازمت کے دوران میں ۱۹۴۱ء میں شائع کی تھی۔

(۲) پیپسو کے شاعروں کا تذکرہ "بہارستان" (۱۹۶۴ء)

(۳) "تیرِ نشتر"۔ قطعات و متفرقات (۱۹۶۵ء)

(۴) پیامِ وطن"۔ ۱۹۶۵ء کی جنگِ ہند و پاکستان کے دوران میں لکھی ہوئی نظمیں۔

(۵) "گلِ صد رنگ" (حصہ اول)، "گلِ صد رنگ" (حصہ دوم) ان دونوں حصوں میں بھرتری ہری شتک کا منظوم ترجمہ ہے۔ ترجمے کی ثقاہت اور زبان و بیان کی متعدد دیدہ ور نقادوں نے تعریف کی ہے۔

۶۔ "گورو درپن" (ہندی) (۱۹۶۵ء)۔ اس میں نویں گورو شری گورو تیغ بہادر مہاراج کے شبدوں اور اشلوکوں کا آسان ہندی میں ترجمہ پیش کیا ہے۔

۷۔ "فریادِ بنگال" (۱۹۷۲ء) بنگلا دیش کی آزادی کے زمانے کی منظومات۔

۸۔ "سحرِ اعجاز" (نظم و نثر)

اپریل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی سنگرور کے ایک خاندان کے جناب دربار لال ملک کی صاحبزادی لیلا سے ہوئی تھی۔ ان سے ماشاء اللہ چھ بیٹیاں اور تین بیٹے (جگدیش رائے منگلا، دنیش رائے منگلا، پردیش رائے منگلا) اولادیں چھوڑ رہے۔

انھیں گردے کی تکلیف بہت دن سے تھی۔ اسی میں ہفتہ ۷ جنوری ۱۹۷۸ء کو شب کے سوا گیارہ بجے جاں بحق ہوئے۔

ابن انشا، شیر محمد خان

پنجاب کے ضلع جالندھر میں بعض خصوصیات کے باعث پھلور بہت مشہور قصبہ ہے یہاں پولیس کا ایک اسکول انگریزی عہد سے قائم ہے، جس میں تربیتی تعلیم دی جاتی ہے۔ خیر، اسی پھلور کے نواح میں ایک گاؤں تھلہ ہے۔ یہاں ایک متوسط الحال کھوکھر راجپوت قوم کے زمیندار تھے، منشی خان نام (منشی جزوِ علَم ہے) زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے؛ اس زمانے کے رواج کے مطابق ہی کچھ ہندی اور گورمکھی جانتے تھے۔ ۱۰ جون ۱۹۲۶ء کو ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام انھوں نے شیر محمد خان رکھا۔ یہی شیر محمد خان اردو کا مشہور شاعر، مزاح نگار اور صحافی اور ادیب "ابن انشا" کے قلمی نام سے معروف ہوا۔

تھلہ میں ورنیکلر مڈل اسکول تھا؛ شیر محمد خان نے یہاں کا نصاب مکمل کر کے ۱۹۴۰ء میں لدھیانہ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا، جہاں سے ۱۹۴۲ء میں درجۂ اول میں دسویں کی سند لی۔ اسی زمانے میں انھیں لکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور اسی سے روزنامہ نوائے وقت لاہور کے (جو اس زمانے میں پندرہ روزہ تھا) مدیر خواجہ حمید نظامی (ف: فروری ۱۹۶۲ء) سے سلسلۂ خط و کتابت قائم ہو گیا۔ اس زمانے میں وہ "قیصر" تخلص کرتے تھے۔ گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے لیے سازگار نہیں تھے۔ کالج کی تعلیم جتنی گراں تھی، وہ ظاہر ہی ہے؛ اور منشی خان غریب کی اوقات نہیں تھی کہ وہ بیٹے کو لاہور کے کسی کالج میں تعلیم دلا سکیں۔ حمید نظامی نے شیر محمد خان کو مشورہ دیا کہ آپ لاہور آ جائیں، اور یہاں کالج میں تعلیم حاصل کریں۔ اس پر وہ لاہور چلے گئے، لیکن خلافِ توقع کوئی معقول انتظام نہ ہو سکا۔

ماخذ: امروز (روزنامہ)، لاہور، ۱۳ جنوری ۱۹۷۸ء؛ اخبارِ جہاں، کراچی؛ جنگ (روزنامہ) کراچی، ۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء۔

چونکہ لاہور کا قیام نہ صرف مفید نہیں تھا، بلکہ وہاں کے اخراجات بھی ان کے بس کے نہیں تھے، اس لیے شیر محمد خان انبالے چلے آئے اور وہاں ملٹری اکاونٹس کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔ چندے بعد انھیں پوسا زراعتی انسٹی ٹیوٹ نئی دلّی میں نوکری مل گئی۔ یہاں دلّی میں ان کا حلقۂ احباب وسیع تر ہو گیا۔ اور اسی کے ذریعے سے وہ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ اس کے تھوڑے دن بعد ملک آزاد ہو گیا، اور پاکستان وجود میں آیا۔ شیر محمد خاں نے ملازمت کے لیے پاکستان کا انتخاب کیا، اور ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور پہنچ گئے، جہاں ان کا ریڈیو پاکستان لاہور اسٹیشن میں تقرر ہو گیا۔ لاہور سے تبادلہ ہوا، تو کراچی چلے گئے۔

کراچی میں انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل پر توجہ کی اور رفتہ رفتہ ۱۹۵۳ء میں وہاں کے اردو کالج سے ایم اے (اردو) کی سند لینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں اپنے طالب علمی کے زمانے میں وہ کالج کے جریدے "برگِ گل"، کے مدیر بھی رہے۔ اس کے بعد انھوں نے ڈاکٹریٹ کے لیے "اردو نظم کا فنی اور موضوعی ارتقا" کے موضوع پر مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) کی نگرانی میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھی کیونکہ کسبِ معاش کے تقاضوں کے باعث انھیں وہ یکسوئی نصیب نہیں تھی، جو ایسے کاموں کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے ریڈیو کی ملازمت ۱۹۵۰ء میں ترک کر دی تھی اور قومی اسمبلی میں مترجم مقرر ہو گئے تھے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۵۶ء تک رہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب کے دورِ اقتدار میں ترقیِ دیہات کا شعبہ قائم ہوا، تو اس کے مرکزی دفتر کی طرف سے ایک ماہنامہ "پاک سرزمین" جاری ہوا؛ ابن انشا اور احمد بشیر اس کے مدیر تھے۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری نے بھی اس محکمے میں کام کیا تھا۔

وزارتِ تعلیم پاکستان نے ۶۲ ۱۹ء میں یونسکو کے تعاون سے کراچی میں نیشنل بک سنٹر (حال نیشنل بک کونسل) قائم کیا؛ ابن انشا اس کے سکتر مقرر ہوئے

او . . . نیٰ کر کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ اس حیثیت میں انھوں نے دنیا کے مختلف ممالک کے سفر کیے، جن کے حالات انھوں نے بیحد شگفتہ نثر میں "چلتے ہو تو چین کو چلیے" (۱۹۶۷ء)، "آوارہ گرد کی ڈائری"، "دنیا گول ہے"، "ابن بطوطہ کے تعاقب میں" ——— چار سفرناموں میں قلمبند کیے ہیں۔

انجمن ترقی پسند مصنفین سے ان کا تعلق قیام دلّی کے زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ کراچی میں اس کی تجدید ہوئی۔ اسی دور میں انھوں نے دو طویل نظمیں لکھیں : "بغداد کی ایک رات" اور "شنگھائی"۔ ان کے کلام کے دو مجموعے "چاند نگر" (۱۹۵۵ء) اور "اس بستی کے ایک کوچے میں" شائع ہو چکے ہیں۔ جس زمانے میں ان کی نظم "انشا جی اٹھو اب کوچ کرو، اس شہر میں جی کا لگانا کیا!" استاد امانت علی خاں مرحوم (ف : ۱۹۷۵ء) نے گائی ہے، تو دھوم مچ گئی ؛ ہر کرہ و مہ کے لب پر ان کا نام تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ابن انشا نے ناصر کاظمی مرحوم (ف : ۱۹۷۲ء) کے ساتھ مل کر میر کے رنگ کو پھر سے زندہ کرنے میں نمایاں اور قابل لحاظ کام کیا ہے۔

. . . . نظمیں "اردو کی آخری کتاب" میں محفوظ ہیں۔ مزاحیہ مضامین کی کتاب "اردو کی آخری کتاب" "خمار گندم" . . . کی چیز ہے۔ انگریزی سے متعدد تراجم ان کے علاوہ ہیں۔

ان کی کالم نویسی کی ابتدا روزنامہ "انجام" سے ہوئی۔ ان ایام میں وہ "پہلا درویش"، "درویش دمشقی"، "حاجی بابا"، "نانا فرنویس" وغیرہ مختلف قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔ بعد کو جب ابراہیم جلیس اس اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ان کے مشورے سے انھوں نے مستقلاً "ابن انشا" قلمی نام اختیار کر لیا۔ وہ پاکستان کے دو روزناموں — امروز اور جنگ — سے برسوں بحیثیت کالم نگار وابستہ رہے : وہ ان میں "کوچہ گرد کی ڈائری" اور "دخل در معقولات" کے عنوان سے لکھتے تھے۔ جنگ کے ماہنامہ "اخبار جہاں" میں بھی "باتیں انشا کی" کے عنوان

سے لکھتے رہے۔ غرض انھوں نے نظم و نثر کا بہت قابلِ قدر اور پایدار سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

اواخر ۱۹۷۵ء میں تشخیص ہوئی کہ ان کے گلے کے غدود متورّم ہو گئے ہیں اور یہ کینسر کی ابتدا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں حسبِ معمول اپنے کارِ منصبی کے سلسلے میں آوارہ گردی کرتے جاپان پہنچ گئے، اور وہاں آپریشن کرا لیا۔ کچھ افاقہ ہوا، لیکن مستقل صحت قسمت میں نہیں لکھی تھی۔ کراچی واپس آئے، تو اب حکومتِ پاکستان نے علاج کی سہولت مہیا کرنے کی خاطر انھیں اپنے سفارت خانہ لندن میں بحیثیت وزیر (منسٹر) بھیج دیا۔ اور ان کے ذمّے کام یہ لگایا کہ انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتابخانوں سے ان کتابوں اور دستاویزوں کی نقلیں اور مائکروفلم تیار کرائیں، جن کا پاکستان کی تاریخ سے تعلق ہے۔ وہ اس کام کے اہل بھی تھے، اور اس سے انھیں دلچسپی بھی تھی۔ چنانچہ کام تسلی بخش طریقے پر ہوتا رہا۔

جب علاج سے مرض میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، تو اپریل ۱۹۷۷ء میں مضافاتِ لندن میں سیلن کے ہلکنسن اسپتال میں عملِ جراحی کیا گیا۔ اس کے بعد سات آٹھ مہینے عافیت سے گزرے، لیکن دسمبر ۱۹۷۷ء میں کرسمس سے قبل دماغ میں ورم پیدا ہو گیا اور وہ دوبارہ اسپتال چلے گئے۔ ۲ جنوری ۱۹۷۸ء کو سکتے کی حالت طاری ہو گئی۔ نو دن بعد ۱۱ جنوری (منگل / بدھ کی درمیانی رات) بیہوشی کے عالم ہی میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ موت کا سبب دماغ پر فالج قرار دیا گیا۔ ہفتہ ۱۳ جنوری ۱۹۷۸ء لاش کراچی پہنچی اور اسی دن سہ پہر میں انھیں پاپوش نگر قبرستان (اقبال ٹاؤن) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

کئی اصحاب نے تاریخِ وفات کہی۔ محشر بدایونی نے قطعہ لکھا:

یہ جگہ اب کوئی بھر سکتا نہیں — فن حسین، لہجہ حسین، انشا حسین
بن گئے تاریخ کی سرخی یہ لفظ — "ابن انشا قصرِ جنت کے مکیں"
(۱۳۹۸)

عیسوی میں راغب مرادآبادی نے کہا:

تاریخ شمسی کی خاطر "ماہ مبیں" نے دی یہ صدا
"چاند نگر کا ابن انشا مٹی میں رُوپوش ہوا"
(۱۹۷۸ = ۱۸۳۰ + ۱۴۸)

۲۳ مارچ ۱۹۷۸ء "یوم پاکستان" کے موقع پر حکومت نے انھیں "ستارۂ امتیاز" (بعد الموت) دینے کا اعلان کیا۔

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیگم کا بیٹا برسرِ روزگار ہے۔ دوسری بیوی سے دو خُرد سال لڑکے (۶ سال اور دو سال) یادگار ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

محمد حسن عسکری، پروفیسر (عرف اظہار الحق)

اگرچہ ان کی تعلیمی اسناد میں تاریخ ولادت ۱۵ مئی ۱۹۲۱ء لکھی ہے، لیکن ان کے خاندان کے لوگوں کا بیان ہے کہ یہ سال ٹھیک نہیں؛ صحیح سال ۱۹۱۹ء ہے۔ وہ سراوہ (ضلع میرٹھ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں پائی۔ ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۴۴ء میں ایم اے (انگریزی) کی سند حاصل کی۔ یہاں ان کے اساتذہ میں پروفیسر کرار حسین اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ دلّی کے مشہور ماہنامے ساقی کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو گئے۔ یہ تعلق تقریباً تین برس (یعنی ۱۹۴۷ء تک) رہا۔ اسی دوران میں ۱۹۴۵ء میں وہ عارضی طور پر اینگلو عربک کالج، دلّی میں انگریزی پڑھانے پر ملازم ہو گئے؛ چونکہ یہ جگہ صرف چھ مہینے کے لیے خالی ہوئی تھی، لامحالہ اس کے بعد وہ بیکار ہو گئے۔ اسی دوران میں انھیں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کی مدرّسی

ماٰخذ: ماہِ نو، لاہور (مارچ ۱۹۷۸ء)؛ ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور؛ گورنمنٹ کالج گزٹ، لاہور؛ لاہور اور کراچی کے روزنامے نوائے وقت، جنگ، حریت۔

پیش ہوئی، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں دلّی سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ لیکن اس سے تو کام نہیں چل سکتا تھا۔ آخر ان کے بعض دوستوں نے ان کے لیے شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ میں ملازمت کا انتظام کیا۔ طوعاً و کرہاً انھوں نے وہاں جانے کی حامی بھرلی۔ اعظم گڑھ آج بھی کوئی بہت بارونق شہر نہیں ہے، آج سے ۳۰۔۳۲ سال پہلے تو بالکل گانوٴ سا معلوم ہوتا تھا۔ خیر، عسکری صاحب ریل سے اعظم گڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر اترے۔ تانگے والے سے کہا کہ شبلی کالج لے چلو بمشکل تھوڑی دور گئے ہونگے کہ وہاں کے سنسان ماحول سے خلجان ہونے لگا۔ تانگے والے سے کہا: میاں! واپس اسٹیشن لے چلو، ہم شبلی کالج نہیں جائینگے۔ کوچوان حیران تو ضرور ہوا ہوگا کہ یہ عجیب مسافر ہے، بلکہ ممکن ہے اسے ان کی دماغی کیفیت کے بارے میں بھی کچھ شبہہ ہوا ہو، لیکن خموش رہا اور اس نے گھوڑے کی باگ اسٹیشن کی طرف موڑ دی۔ یہ اگلی گاڑی پر سوار ہوئے اور دلّی واپس پہنچ گئے۔ یہاں دوستوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ تو شبلی کالج، اعظم گڑھ گئے تھے! فرمایا: ہاں جا ئی گیا تھا۔ لیکن وہ تو عجیب ویران جگہ ہے، اجاڑ سی سڑک، جوں جوں تانگہ آگے گیا، ویرانی کا احساس شدید تر ہوتا گیا۔ غضب خدا کا، سڑک پر بجلی تک نہیں، ہر جگہ لالٹینیں لٹک رہی تھیں۔ بالکل گانوٴ سا ماحول۔ مجھے تو اختلاج ہونے لگا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں یہاں نہیں رہ سکونگا۔ لہٰذا میں نے تانگے والے سے کہا کہ میاں، مجھے اسٹیشن واپس لے چلو، میں شبلی کالج واج نہیں جاؤنگا۔ شکر ہے، اعظم گڑھ اور شبلی کالج سے نجات ملی۔

جس نے بھی یہ واقعہ سنا اس نے عسکری صاحب کی سادگی اور معصومیت سے لطف لیا اور ان سے ہمدردی کی۔ بالآخر تھوڑے دن بعد عربک کالج ہی میں ان کی ملازمت کا دوبارہ انتظام ہوگیا۔ یہاں وہ تقسیم وطن تک رہے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ ہجرت کر کے لاہور چلے گئے، جہاں انھوں نے اولاً سعادت حسن منٹو

وفیات

(ف : جنوری ۱۹۵۵ء) کے تعاون سے ایک ماہنامہ "اردو ادب" جاری کیا تھا۔ لیکن اس کے صرف دو شمارے شائع ہوئے، اور یہ بند ہوگیا، دونوں کے مزاج میں جو بُعدُ المشرقین تھا اس میں زیادہ دن تک نبھ بھی کیونکر سکتی تھی!

آزادی کے بعد شاہد احمد دہلوی (ف : مئی ۱۹۶۷ء) بھی پاکستان چلے گئے تھے۔ ان کے بیشتر ادیب احباب بھی وہیں مقیم تھے۔ انھوں نے اسی بھروسے پر ۱۹۴۷ء کے آخر میں ساقی کراچی سے شائع کرنا شروع کیا۔ لیکن یہ امر واقع ہے کہ اگرچہ انھوں نے بات کی پچ نباہنے کو اسے کسی نہ کسی طرح جاری تو رکھا، لیکن نہ اس کی وہ اگلی شان رہی تھی، نہ وہ اس سے کوئی مالی منفعت حاصل کر سکے بلکہ یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ محمد حسن عسکری بھی پاکستان پہنچنے کے بعد (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۹ء) غیر رسمی طور پر ساقی اور شاہد احمد کے معاون رہے۔

۱۹۵۰ء کے آغاز میں وہ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے اور جنوری ۱۹۵۰ء سے جولائی ۱۹۵۰ء تک سات مہینے سرکاری ماہنامے "ماہِ نو" کے مدیر رہے۔ ۱۵ جولائی کو وہ اسلامیہ کالج، کراچی کے شعبۂ انگریزی میں مدرّس مقرر ہو گئے اور رفتہ رفتہ شعبے کے صدر کے عہدے تک پہنچے۔ وفات کے وقت اسی اسامی پر تھے۔

فرشتۂ موت نے انھیں اچانک آ لیا۔ انھوں نے ساری عمر تجرّد میں گزاری۔ کراچی میں وہ اپنی والدہ اور ہمشیرہ کے ساتھ رہتے تھے۔ بدھ ۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء کی صبح حسبِ معمول پیدل کالج گئے۔ رستے ہی میں تھے کہ دل کا دورہ پڑا، اور سڑک پر گر گئے۔ ایک صاحب نے دیکھا، تو ٹیکسی میں ڈال کر ان کے مکان پر لے آئے۔ ٹیکسی والے کو خود کرایا دیا۔ زینہ چڑھ کر اوپر آئے اور لیٹ گئے۔ بہن اور والدہ کے دریافت کرنے پر اتنا کہا کہ سینے اور پیٹ میں کچھ درد ہے۔ انھوں نے فوراً لڑکے کو ڈاکٹر کے لیے دوڑایا۔ ابھی وہ پہنچا بھی نہیں تھا کہ عسکری صاحب

کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اسی دن عشا کے وقت کورنگی (کراچی) میں مفتی محمد شفیع مرحوم کے دارالعلوم کے قریب تدفین عمل میں آئی۔

عسکری صاحب نے ابتدا افسانوں سے کی تھی، اگرچہ ان کی سب سے پہلی تحریر ایک انشائیہ "کالج سے گھر تک" تھا۔ اس صدی کے پانچویں دہے کے آغاز میں ان کا افسانہ "حرامجادی" لاہور کے مشہور ماہنامے ادبی دنیا کے سالنامہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا، تو مدتوں ادبی محفلوں کا موضوع بنا رہا۔ اس کے بعد جب اسی مجلے کے اپریل ۱۹۴۲ء میں ان کا دوسرا افسانہ "چائے کی پیالی" شائع ہوا، تو سب نے تسلیم کر لیا کہ اردو کے افسانوی افق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا ہے۔ ان کا افسانہ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" ایک طویل مختصر افسانہ ہے (کوئی ۱۰۰ صفحے) جو کہ ۔۔۔ پر مشتمل ہے۔ ان سے پہلے یہ تکنیک یلدرم نے اپنے افسانے "صحبتِ ناجنس" میں برتی تھی (جو دراصل ترکی سے ترجمہ ہے)۔ لیکن عسکری کے افسانے میں حقیقت نگاری زیادہ ہے، جب کہ یلدرم کا افسانہ ہماری سوسائٹی پر طنز ہے۔ عسکری کے افسانوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں: (۱) جزیرے (۱۹۴۳ء) اور (۲) قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے (۱۹۴۷ء)

لیکن عسکری نے جلد ہی افسانہ نگاری چھوڑ کر اپنی توجہ تنقید اور ترجمے پر مبذول کر دی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو میں افسانے کی تکنیک ٹھیک خطوط پر مرتب نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں اس کی وجہ یہ تھی کہ اردو افسانہ نگاروں کے سامنے انگریزی کے سوا اور کسی مغربی زبان کا نمونہ نہیں تھا۔ اس پر انھوں نے فرانسیسی اور جرمن اور دوسری یورپی زبانوں کے تراجم پیش کیے اور افسانے پر مختلف پہلوؤں سے تنقیدی مضمون شائع کیے۔ ان کے یہ تراجم شائع ہو چکے ہیں: (۱) میں ادیب کیسے بنا، از گورکی (۱۹۴۹ء)؛ (۲) ریاست اور انقلاب از لینن؛ (۳) آخری سلام از کرسٹفر اشرووڈ (۱۹۵۰ء)؛ (۴) مادام بواری از فلابیر (۱۹۵۰ء)

دفیات

(۵) سرخ و سیاہ از ستان دال (۱۹۵۲ء)؛ (۶) موبی ڈِک از ہرمن میلول
(۱۹۶۸ء)۔ ان کے تنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی ان کی زندگی میں چھپے:
(۱) انسان اور آدمی (۱۹۵۳ء)؛ (۲) ستارہ یا بادبان (۱۹۶۳ء)۔ تیسرا
"وقت کی راگنی" موت کے وقت مطبع میں تھا؛ اسے دیکھنا انھیں نصیب نہ ہوا۔
ں کے علاوہ "میری بہترین نظم" (۱۹۴۲ء)؛ "میرا بہترین افسانہ" (۱۹۴۳ء)
"دز انتخاب طلسم ہوشربا" (۱۹۵۸ء) تین انتخابات بھی ان سے یادگار ہیں۔
مر کے آخری حصے میں ان پر مذہب اور تصوف کا بہت غلبہ ہو گیا تھا۔ نہ صرف
وہ مذہب کے تمام ارکان کے سختی سے پابند ہو گئے تھے، بلکہ اوراد و وظائف
میں بھی توغل و شغف بڑھ گیا تھا۔ انھیں ایام میں انھوں نے بعض دینی کتابوں
کا انگریزی ترجمہ بھی کیا مثلاً حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب "الانتباہات
المفیدہ" کا ترجمہ پروفیسر کرار حسین کے اشتراک سے
کے نام سے چھاپا تھا۔ وفات سے پہلے مولانا مفتی محمد شفیع مرحوم
کی تفسیر قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے تھے۔ ایک جلد مکمل کر چکے تھے کہ خدا
کے گھر سے بلاوا آگیا۔
وہ فرانسیسی زبان بہت اچھی جانتے تھے، اور لطف یہ کہ اسے انھوں نے کسی
استاد کی مدد کے بغیر اپنے ذاتی مطالعے اور محنت سے حاصل کیا تھا، اور پھر مشق اور
مزاولت سے اس میں اتنی استعداد پیدا کر لی کہ اس میں مضمون نگاری کرنے
لگے۔ ان کے یہ مقالات فرانس کے بعض موقت الشیوع مجلات میں چھپے۔ اس
سلسلے میں ایک لطیفہ سنیے:
کراچی کے ایک ادبی اجتماع میں ایک صاحب ان کے قریب آئے، اور باتیں کرنے
لگے۔ دورانِ گفتگو میں انھوں نے کہا کہ حضرت! جب تک آپ اردو میں لکھتے
رہے، ہم آپ کی تحریروں سے استفادہ کر سکتے تھے۔ اب آپ نے فرانسیسی
میں لکھنا شروع کر دیا ہے اور یوں ہم پر یہ درِ فیض بند ہو گیا۔ آپ ان مضامین

کے اردو میں ترجمے کا کوئی انتظام کیجیے ۔ تو فرمایا: ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں! ان مضامین کا ترجمہ مفید ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ ترجمہ کون کرے! اس کے لیے ضرورت ہے کہ مترجم فرانسیسی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری طرح حاوی ہو اور ان کے محاورے اور مزاج کا صحیح شعور رکھتا ہو۔ یہاں پاکستان میں آپ کو فرانسیسی جاننے والے اصحاب تو بہت مل جائینگے، لیکن اردو جاننے والا بھی کوئی مل سکیگا، اس کا مجھے یقین نہیں ہے ۔

نیّر، محمد شفیع الدین

جمعرات ۹ فروری ۱۹۰۳ء (۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۰ھ) کو ضلع علی گڑھ کے موضع اترولی کے محلے قانون گویان میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان نومسلم تھا۔ یہ لوگ دراصل بھٹناگر کائستھ تھے۔ نیّر سے گیارہ پشت اوپر ان کے کسی بزرگ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے دادا نورالدین تو کسی حد تک تعلیم یافتہ اور معلمی پیشہ تھے، لیکن والد حکیم الدین بالکل ناخواندہ تھے، اس لیے پولیس میں بھرتی ہو گئے۔ پہلے کچھ دن چوکیدار رہے، بعد کو ترقی ہوئی، تو کانسٹیبل بن گئے۔ نیّر صاحب محض سات برس کے تھے، جب ان کے والد کا ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا ہے۔ ان کی والدہ کا نام غفور النسا تھا۔ وہ بھی ناخواندہ تھیں، لیکن بڑی غیور اور خوددار۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالا، لیکن کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ میرے بچے تعلیم حاصل کر کے نام پیدا کریں۔ نیّر صاحب کے علاوہ ان کے دو بچے اور تھے۔ سب سے بڑی بچی محمود فاطمہ تھیں۔ ان کا جوانی میں انتقال ہو گیا، ان کے اکلوتے بیٹے حیدرآباد (پاکستان) میں ہیں۔ ان سے چھوٹے ایک بھائی نعیم الدین اور تیسرے یہی ہمارے

ماخذ: نیّر مرحوم کی خودنوشت، نیّر صاحب کی کہانی، خود ان کی زبانی؛ پیام تعلیم (نیّر نمبر) ستمبر ۱۹۷۷ء؛ فریدہ نیّر (نیّر مرحوم کی چھوٹی صاحبزادی)

نیر صاحب تھے۔

جب سنِ شعور کو پہنچے تو بسم اللہ ہوئی۔ خود لکھتے ہیں کہ قاعدے اور پارۂ عم یتسآءلون پر کافی وقت صرف ہوا۔ اس کے بعد مقامی مدرسہ مصباح الاسلام میں بھیج دیے گئے۔ یہاں اردو فارسی کی تعلیم ہوئی۔ ان کی ننھیال سکندرہ راؤ (ضلع علی گڑھ) میں تھی۔ وہاں ان کے ایک دور کے رشتے دار حافظ احمد علی جامع مسجد کے امام تھے۔ یہ ان کے پاس چلے گئے اور وہاں کتابت سیکھتے رہے لیکن اس فن کی تکمیل نہ کر سکے۔

اب یہ بارہ برس کے تھے۔ حالات سے مجبور، نہ آگے تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں نہ روزگار پیدا ہونے کی کوئی سبیل ہے۔ حسنِ اتفاق سے ایک موقع پیدا ہو گیا کہ یہ دلی پہنچ گئے۔ اترولی میں ان کے محلے قانون گویان میں ایک کمپاؤنڈر بلبیر سنگھ نے اپنا مطب کھول دیا۔ وہ جلد ہی نیر صاحب اور ان کے خاندان سے مانوس ہو گئے۔ تھوڑے دن بعد انھیں اپنے بچے کے علاج کے لیے دلی جانے کی ضرورت پیش آئی۔ نیر صاحب بھی والدہ کی اجازت سے ان کے ساتھ ہو لیے۔ یہ اواخر اپریل ۱۹۱۵ء کی بات ہے۔

یہاں دلی میں خوب رستے چار پانچ مہینے اپنے ایک ہم وطن حافظ باقر علی خوشنویس کے ساتھ رہے، لیکن انھوں نے حافظ صاحب پر بار بننا پسند نہ کیا، اور اپنی بسر اوقات کے لیے خود کام کیا۔ اخبار بیچے، کتابت کی، محنت مزدوری تک سے جی نہ چرایا اور اس طرح اپنی روزی پیدا کرتے رہے۔

ان ایام میں جو اخبار انھوں نے بیچے، ان میں ایک مولانا محمد علی کا روزنامہ "ہمدرد" تھا، دوسرا کلکتے کا اخبار "رسالت"۔ ان کے خریداروں میں جامع مسجد دلی کے امام شمس العلما سیّد احمد بخاری (ف: ستمبر ۱۹۴۷ء) بھی تھے۔ رفتہ رفتہ امام صاحب اس ہونہار محنتی لڑکے میں دلچسپی لینے لگے۔ ایک دن انھوں نے دریافت کیا: "کیا تم پڑھنا چاہتے ہو؟" اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں! ان

کے تو دلی آنے کا مقصد ہی تعلیم حاصل کرنا تھا۔ امام صاحب نے انھیں اینگلو عربک ہائی اسکول کی محلہ چوڑیوالان کی پرائمری شاخ کے پانچویں درجے میں داخلہ دلا دیا اور اپنے مکان پر رہنے کی اجازت دے دی۔ یہاں انھوں نے اتنی محنت اور تندہی سے کام کیا کہ جلد ہی ضلع دلی کے مقابلے کے امتحان میں پاس ہو گئے اور وظیفہ کے مستحق ٹھہرے۔ چھٹے درجے میں وہ اسی اسکول کی شاخ کوچہ چیلان میں چلے گئے؛ مڈل کے امتحان تک اسی جگہ تعلیم پائی۔ نتائج ہمیشہ بہت اچھے رہے۔ آٹھویں میں پھر چھ روپے ماہانہ وظیفہ مل گیا۔ اور اس کے بعد اسی اسکول کی اجمیری دروازے والی شاخ کے نویں درجے میں داخلہ لے لیا۔ یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔

یہ غیر ملکی حکومت کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء ہی میں مہاتما گاندھی (ف: جنوری ۱۹۴۸ء) نے عدم تعاون کی تحریک شروع کی، جس کی ایک شق سرکاری تعلیم گاہوں کا بائیکاٹ بھی تھی۔ نیر صاحب اپنے مطالعے کے دوران میں سیاسی کتابیں اور مضمون وغیرہ پڑھتے رہتے تھے اور ان کا میلان بھی قوم پرستی کی طرف تھا۔ اب جو گاندھی جی نے سرکاری مدارس چھوڑنے کی دعوت دی، تو نیر صاحب نے بھی اینگلو عربک ہائی اسکول اور سرکاری وظیفے سے ہاتھ اٹھا لیا، اور آزاد قومی درسگاہ، دلی میں داخلہ لے لیا، جو مسٹر آصف علی بیرسٹر مرحوم (ف: اپریل ۱۹۵۳ء) نے کٹرہ آدینہ بیگ خاں میں قائم کی تھی۔ یہ عمارت کسی زمانے میں نواب بشیرالدین احمد کی ملکیت تھی۔ انھوں نے نیچے کا حصہ اسکول کے لیے خالی کر دیا، اور خود اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اوپر کی منزل کے دو کمروں میں اٹھ گئے۔ آج کل اس مکان میں ہمدرد دواخانہ کا دفتر ہے۔ لیکن کچھ دن بعد اسکول اس عمارت سے کوچہ بلاقی بیگم (مقابل پریڈ گراونڈ) میں منتقل ہو گیا؛ اور پھر بند ہی ہو گیا۔

یہ اسکول جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، علی گڑھ کے ساتھ ملحق تھا۔ اور اس کا دسویں کا امتحان

جامعہ جونیر کہلاتا تھا۔ نیرّ صاحب نے یہاں سے دسویں کی سند ۱۹۲۲ء میں درجۂ اوّل میں حاصل کی۔ وہ اس سال یہاں کے جملہ امید واروں میں اوّل آئے تھے۔ جامعۂ ملیہ اسلامیہ کا مرکز ہنوز علی گڑھ میں تھا۔ دسویں کی سند لینے کے بعد نیرّ صاحب علی گڑھ پہنچے اور جامعہ کی ابتدائی کلاس میں داخل ہو گئے۔ جامعہ کی طرف سے ان کو خاص مراعات حاصل ہو گئیں، لیکن ظاہر ہے کہ علی گڑھ کا اور خرچ بھی تو تھا، اسی کا انتظام کرنے سے یہ قاصر رہے۔ مجبوراً تین مہینے بعد دلّی واپس آ گئے اور یہاں مدرسۂ عالیہ فتحپوری میں داخلہ لے لیا۔ بچّوں کو نجی طور پر (ٹیوشن) پڑھاتے اور اس سے جو کچھ یافت ہو جاتی، تنگی ترشی سے اسی میں گزارا کر لیتے۔ مدرسۂ عالیہ میں فارسی کے نصاب پر خاص توجہ تھی۔ انھوں نے جلد ہی اتنی استعداد پیدا کر لی کہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے دو امتحان — منشی (فارسی) اور ادیب عالم (اردو) — اوّل درجے میں پاس کر لیے اور تمام طلبہ میں بھی اوّل رہے۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ اینگلو عربک ہائی اسکول نے انھیں اپنے انگریزی درجے میں حاضری کی اجازت دے دی جس سے یہ ۱۹۲۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کا میٹریکولیشن (انگریزی) کا امتحان دینے کے قابل ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے ۱۹۲۵ء میں اسی یونیورسٹی سے ادیب کامل (اردو) کا اور اگلے برس (۱۹۲۶ء) صرف انگریزی میں انٹر کا امتحان پاس کر لیے۔

اس بیقاعدہ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہے۔ کبھی کسی اخبار میں مترجم بن گئے، کبھی کسی اسکول میں عارضی مدرسی کر لی۔ سب سے آخری ملازمت اینگلو عربک اسکول کی چھ مہینے کی مدرسی تھی (نومبر دسمبر ۱۹۲۵ء تا اپریل ۱۹۲۶ء)۔ جب اس اسکول سے الگ ہوئے تو ہیڈ ماسٹر نے ان کی خدمات اور صلاحیت کا بہت اچھے الفاظ میں اعتراف کیا۔ حسنِ اتفاق سے انہی دنوں ماڈرن اسکول، دلّی میں اردو مدرس کی جگہ نکل آئی۔ نیرّ صاحب نے

اس کے لیے تگ ودو کی، اور ان کا اس اسامی پر تقرر ہوگیا۔ ساٹھ روپے مشاہرہ مقرر ہوا اور یوں اب یہ اطمینان کی سانس لینے کے قابل ہوگئے۔ چھ مہینے کے آزمائشی وقفے کے بعد ملازمت مستقل ہوگئی اور جلد ہی تنخواہ میں غیر معمولی ترقی بھی مل گئی۔

وہ ماڈرن اسکول میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۴ء تک ۱۸ برس رہے۔ آخر میں سوا سو ماہانہ تنخواہ مل رہی تھی۔ اب ان کے مضامین اردو کے متعدد مقتدر مجلّوں میں شائع ہوتے تھے۔ بعض مقابلے کے مضامین پر انعام بھی ملے۔ اسی زمانے میں انھوں نے شاعری میں بھی شہرت حاصل کی۔ غرض راوی ہر طرح چین لکھتا ہے کا مضمون تھا۔ شاید ان کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال رہا ہو کہ انھوں نے اپنی زندگی کی معراج حاصل کرلی ہے۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ ان کی منزلِ مقصود کسی اور سمت میں ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین (ف: مئی ۱۹۶۹ء) جامعہ ملیہ اسلامیہ، علی گڑھ میں ان کے استاد رہے تھے۔ نیر صاحب ان کے حسنِ اخلاق سے بہت متاثر ہوئے تھے؛ یہ حقیقت ہے کہ ذاکر صاحب نے اپنی دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں سے ہماری دو تین نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ۱۹۲۵ء میں علی گڑھ سے دلّی آگئی۔ نیر صاحب یہاں دلّی میں بھی گاہے ماہے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ وہ ذاکر صاحب اور ان کے ہمکاروں کی لگن اور قربانیوں، بےنفسی اور خدمتِ خلق سے اور بھی متاثر ہوئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جب ۱۹۴۴ء میں ذاکر صاحب نے انھیں جامعہ ملیہ کی ملازمت قبول کر لینے کی دعوت دی، تو انھوں نے بطیبِ خاطر اس پر لبیک کہا۔ مالی پہلو سے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ ماڈرن اسکول میں وہ سوا سو ماہانہ پا رہے تھے، اور جامعہ ملیہ میں انھیں ۶۵ روپے پیش کیے گئے تھے۔ لیکن انھوں نے اس قربانی کی کوئی پروا نہ کی اور ماڈرن اسکول کی ملازمت سے مستعفی ہو کر جامعہ ملیہ چلے گئے۔ وہ ۱۳ جنوری ۱۹۴۵ء

کو یہاں کے مدرسۂ ثانوی میں اردو کے مدرّس مقرر ہوئے تھے۔ یہیں سے انھوں نے ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے (انگریزی) کا اور پھر ۱۹۵۲ء میں وہیں سے بی اے (فارسی اور تاریخ) اور ۱۹۵۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) کے امتحان پاس کیے۔ ۱۹۵۶ء میں انھیں جامعہ کالج میں اردو کا مدرّس مقرر کیا گیا، جہاں سے تقریباً ۱۴ سال بعد ۱۹۷۰ء میں سبکدوش ہوئے۔

ان کی شہرت بچوں کے شاعر کی حیثیت سے مسلّمہ ہے۔ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی! وہ خود لکھتے ہیں کہ ماڈرن اسکول میں مس ینگ مانٹیسری اسکول کے چھوٹے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔ وہ اکثر بچوں کو انگریزی نرسری نظمیں اور لوریاں سنایا کرتی تھیں۔ نیّر صاحب بھی یہ نظمیں سنا کرتے۔ ان کے [illegible] میں خیال آیا کہ اسی طرح کی سادہ نظمیں اردو میں کیوں نا لکھی جائیں! اگر بچے اور ان کے والدین ایسی نظمیں اپنی مادری زبان میں سنیں گے تو یقیناً وہ انھیں پسند کریں گے اور ان کا یاد کرنا بھی ان کے [illegible] اس پر انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھنا شروع کیا [illegible] پہلی نظم تھی:

صبح

اٹھو بیٹا آنکھیں کھولو — بستر چھوڑو، لو منھ دھو لو
اتنا سونا ٹھیک نہیں ہے — وقت کا کھونا ٹھیک نہیں ہے
صبح ہوئی ہے وقت سہانا — گاؤ خدا کی حمد کا گانا
سورج نکلا تارے بھاگے — دنیا والے سارے جاگے
ڈالی ڈالی چڑیاں چہکیں — کیاری کیاری کلیاں مہکیں
پھول کھلے خوش رنگ رسیلے — سرخ، سفید اور نیلے پیلے
جوہی اور چنبیلی مہکی — چنپا الگ اکیلی مہکی
سورج [illegible] نکلا ہے — ٹھنڈا وقت ہے سرد ہوا ہے

پتوں پر ہیں اوس کے قطرے — صاف اور ستھرے موتی جیسے
سرخی مشرق پر چھائی ہے — اچھی خاصی بہار آئی ہے
تم بھی اٹھ کر باہر آؤ — اس منظر کا لطف اٹھاؤ
بنیا، پنساری، حلوائی — سب نے اپنی دکان لگائی
ہل اور بیل کسان بھی لے کر — جا پہنچا اپنی کھیتی پر
کاریگر بھی کام پہ آیا — آکر اپنا کام جمایا
دنیا دن بھر کام کریگی — رات کو پھر آرام کریگی
تم بھی پہلے کھانا کھاؤ — پھر بستہ لو، مکتب جاؤ

کام میں جو اس آن نہیں ہے
نیرّ! وہ انسان نہیں ہے

یہ نظم صبح کے عنوان سے دلّی کے ماہ نامے "ہونہار" میں ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔ جسے فیاض حسین جامعی نکالتے تھے۔ پھر تو وہ باقاعدگی سے ایسی نظمیں لکھنے لگے۔ اور یہ نظمیں بچّوں کی نصاب کی کتابوں میں بھی شامل ہوگئیں۔ بعد کو انھوں نے بچّوں کے لیے کہانیاں بھی لکھیں، کچھ انگریزی سے ترجمہ بھی کیں۔ ان کی چھوٹی بڑی نظم ونثر کی کوئی پچاس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے بعض کے آٹھ آٹھ، نو نو بلکہ اس سے بھی زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ہنوز غیر مطبوعہ ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ بلاشبہہ ان کا اس میدان میں کوئی حریف نہیں تھا۔ بچّوں کے نفسیات کو جیسا وہ سمجھتے تھے، کم کسی نے سمجھا ہوگا۔ اسی لیے وہ اپنی تحریر کے لیے ایسی زبان اور اسلوب اختیار کرتے تھے کہ بچے کو اس کے پڑھنے اور یاد کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔

۱۹۶۹ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بظاہر ٹھیک ہی رہے۔ عمر کے تقاضے سے کمزور ضرور ہو گئے تھے، اور کبھی کبھی کسی شکایت میں بھی مبتلا ہو جاتے تھے، لیکن بحمدہٖ کسی خاص مرض کا شکار نہیں ہوئے۔ تاہم ۷۶ ۱۹ء کا پورا سال

کم و بیش مختلف معمولی علالتوں کی نذر ہوگیا، لیکن ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ وہی لکھنا پڑھنا اور مطالعہ، دوست احباب کی ملاقاتیں، یاروں کے جلسے جاری رہے۔ ادھر کچھ دن سے وہ سب پرانے دوستوں سے جلد جلد ملنے لگے تھے۔ بعض دوستوں سے برسوں بعد ان کے گھر پر جاکر ملاقات کی۔ ۲۰ جنوری ۱۹۷۸ء کا سارا دن بھی اسی طرح ملنے ملانے میں گزر گیا۔ شب کا کھانا کھایا اور حسب معمول کچھ مطالعہ کرنے لگے۔ ساڑھے دس بجے اپنی بچی فریدہ کو آواز دی اور سانس لینے میں تکلیف کی شکایت کی۔ جب کسی طرح تکلیف کم نہ ہوئی، تو انھیں قریب کے ہولی فیملی اسپتال لے گئے۔ وہیں نصف شب سے چند منٹ پہلے جان بحق ہوئے۔ حرکتِ قلب کا بند ہونا بہانۂ موت قرار پایا۔ ۲۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو جنازہ اٹھا اور انھیں جامعہ نگر کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یرحمہ اللہ تعالیٰ۔

محترمہ نکہت فاطمہ (جامعہ کالج) نے قطعۂ تاریخ وفات کہا؛ اس کے آخری دو شعر یہ ہیں:

تھی کاوش نکہتِ خستہ جگر کو — کہ ہو تاریخ رحلت روح پرور
درِ فردوس سے "آواز" آئی — "ہے جنّت میں شفیع الدین نیّر"
(۱۵ + ۱۳۸۳ = ۱۳۹۸)

انھوں نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی ۱۹۲۵ء میں انھیں حافظ احمد علی کی صاحبزادی زبیدہ خاتون سے ہوئی، جن کے پاس اوائل میں وہ سکندرہ راؤ میں رہے تھے۔ ان سے کوئی بچہ زندہ نہ رہا اور وہ خود بھی دسمبر ۱۹۳۲ء میں چل بسیں۔ اگلے ہی برس ۱۹۳۳ء میں دوسرا نکاح ڈاکٹر سعید احمد[۵] بریلوی (ف: ۲۳ دسمبر ۱۹۵۷ء) کی صاحبزادی صالحہ خاتون سے ہوا۔ یہ دوسری

---

[۵] اتفاق ہے کہ ڈاکٹر سعید احمد بھی نو مسلم تھے۔ ان کے والد (عبدالرحیم) نے اسلام قبول کیا تھا۔ ڈاکٹر سعید احمد شاعر اور نثار تھے۔ وہ کسی زمانے میں صحافت سے بھی وابستہ رہے تھے؛ انھوں نے مختلف اوقات میں روزنامہ "ہمدرد" اور "کامیابی" کے ادارۂ تحریر میں کام کیا۔ ۱۹۲۵ء میں نیّر صاحب "ہمدرد" میں ان کے ہمکار تھے۔ ڈاکٹر سعید احمد کی یہ تین کتابیں میری نظر سے گزری ہیں: پتھر سے ہیرا (تبلیغی ناول)؛ اسلام اور عورت؛ اسلام اور عبادت۔

بیگم ماشاالله حیات ہیں، اور ان سے چار بیٹے اور چار بیٹیاں مرحوم کی یادگار ہیں۔

تبسّم، غلام مصطفیٰ، صوفی

۴ اگست ۱۸۹۹ء کو امرتسر کے ایک متوسط الحال کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی مشن اسکول میں پائی اور اس کے بعد وہیں خالصہ کالج میں داخلہ لیا۔ انٹر کی سند اسی کالج سے لی۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں لاہور جاکر فورمین کرسچین کالج کے بی اے کے درجے میں داخلہ لیا۔ ایم اے (فارسی) کی سند بعد کو اسلامیہ کالج، لاہور سے اور بی ٹی کی سنٹرل ٹریننگ کالج سے حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انھوں نے ملازمت کا آغاز اپنے وطن کے گورنمنٹ اسکول سے کیا۔ پھر لاہور چلے گئے اور تین سال تک (۱۹۲۴ء - ۱۹۲۷ء) سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور میں فارسی پڑھاتے رہے۔

۱۹۲۷ء میں اپنے پرانے کالج (سنٹرل ٹریننگ کالج) میں بطور استاد مقرر ہوئے، اور چار سال بعد ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کالج، لاہور میں فارسی کے مدرس (لیکچرر) بن گئے۔ رفتہ رفتہ وہ اس شعبے کے صدر کے عہدے تک پہنچے اور ۱۹۵۴ء میں اسی جگہ سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۵۵ء میں اپنی فارسی سے دیرینہ دلچسپی کے باعث، وہ ایران کلچرل سنٹر سے بحیثیت ڈائرکٹر وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں انھوں نے پاکستان میں جدید فارسی کی ترویج پر خاص توجہ کی۔ ۱۹۵۸ء میں انھوں نے یہ سنٹر حکومت ایران کے حوالے کر دیا۔ اسی سال وہ لاہور کے مشہور ہفت روزہ "لیل و نہار" کے ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ اپنی ادارت کے دور میں انھوں نے بچّوں کے ادب پر خاص طور پر لکھنا شروع کیا، ان کے لیے کہانیاں لکھیں، نظمیں لکھیں، ان میں سے

ماخذ: تذکرہ شعرائے جدید از عبدالوحید، نوائے وقت (روزنامہ) لاہور: ۸ فروری ۱۹۷۸ء؛ روزنامہ مساوات، ۱۰ فروری ۱۹۷۸ء

بیشتر تحریریں آج بچوں کی نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "ٹوٹ بٹوٹ" اسی عہد کی یادگار ہے۔ اس پر انھیں انعام بھی ملا تھا۔

لیل و نہار کی ادارت سے دستبردار ہونے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان کے مشیر مقرر ہو گئے۔ یہاں وہ ان مضامین کی نوک پلک درست کرتے جو نشر کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ادبی پروگرام بھی ان کی نگرانی میں ہوتے۔ ان کی اس زمانے کی تقریریں اور کتابوں کے تبصرے اپنی گیرائی اور گہرائی کے لیے یادگار رہینگے۔ ریڈیو سے وہ کم و بیش پندرہ برس تک منسلک رہے

اب حکومت نے انھیں پاکستان آرٹ کونسل، لاہور کا صدر مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ اقبال اکیڈمی کے نائب صدر بھی منتخب ہو گئے۔ انھوں نے ان اداروں کی بھی ناقابلِ فراموش خدمات سرانجام دیں؛ دونوں کی موجودہ عمارتیں انھیں کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۷ء کے آغاز میں حکومتِ پاکستان نے لاہور میں علامہ اقبال مرحوم (ف: اپریل ۱۹۳۸ء) کی یادگار میں ایک بین الاقوامی کانگرس منعقد کی تھی۔ اس کی تنظیم اور کامیابی میں بھی ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

تبسم نے بہت کم عمری میں شعر گوئی شروع کی؛ ابھی گیارہ بارہ برس کی عمر ہوگی۔ اپنے کلام پر انھوں نے مشہور استاد حکیم فیروزالدین فیروز طغرائی (ف: فروری ۱۹۳۱ء) سے اصلاح لی۔ اپنے استاد کی طرح وہ بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتے تھے۔ ابتدا میں ان کا تخلص صوفی تھا۔ ایک دن ان کے استاد بھائی حکیم محمد حسین عرشی نے ان سے کہا کہ بھائی، تم میں صوفیوں والی کوئی بات نہیں تم ٹھہرے ہنس مکھ اور کھلنڈرے آدمی، یہ بھاری بھرکم اور سنجیدہ تخلص تم پر نہیں کھلتا؛ اسے ترک کر کے تبسم رکھ لو کہ اسم بامسمّیٰ ہو جاؤ۔ اس پر انھوں نے تبسم تخلص اختیار کر لیا۔ ان کا مجموعۂ کلام "انجمن" کے نام سے چھپ چکا ہے۔

انھوں نے اقبال پر خود بھی بہت کچھ لکھا، اور ترجمہ بھی کیا۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں، "کلامِ اقبال" اور "نقشِ اقبال" اور "جاوید نامہ" کا منظوم اردو ترجمہ

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ امیر خسرو کے کلام کا انتخاب بھی اردو نظم میں منتقل کیا تھا۔

آخر عمر میں انھوں نے پنجابی میں بھی خاصا لکھا۔ اس میں ذرا مبالغہ نہیں کہ ان کی اس زبان سے دلچسپی نے گویا پنجابی شاعری کی مردہ رگوں میں خونِ تازہ دوڑا دیا۔ ان کی دیکھا دیکھی اور لوگوں کو بھی توجہ ہوئی؛ اور اس طرح وہ اس کا معیار بلند کرنے کا باعث بن گئے۔

پنجابی شاعری سے ان کی دلچسپی کے آغاز کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے:

ہیر وارث شاہ پنجابی زبان کا شہرۂ آفاق اور لازوال شاہکار ہے۔ ایک دن دوستوں کے حلقے میں یہ بات زیرِ بحث آگئی کہ وارث شاہ نے یہ نظم کس بحر میں لکھی ہے۔ خیر، تھوڑی سی بحثا بحثی کے بعد یہ طے ہوگیا کہ کونسی متداول بحروں میں حذف و اضافہ کرکے یہ نئی بحر ایجاد کی گئی ہے۔ لیکن اب یہ بحث چھڑ گئی کہ کیا یہ بحر اردو میں بھی استعمال ہوسکتی ہے! کچھ لوگ کہتے تھے کہ یہ ممکن ہے؛ دوسرے اس پر شبہے کا اظہار کر رہے تھے۔ صوفی تبسم ٹھہرے استاد، کہنے لگے کہ اس میں ناممکن ہونے کی کیا بات ہے! اور شعر کہا:

شبِ ہجر کی یاس انگیزیوں میں، آئی اس طرح یادِ وصال تری
جیسے شمع قندیل میں ہو روشن، جیسے بادلوں میں مہتاب چمکے

یہ بحر جیسی اوبڑ کھابڑ ہے، وہ ظاہر ہے۔ غرض اس کے بعد انھوں نے باقاعدگی سے پنجابی میں لکھنا شروع کردیا ـــــ نظمیں بھی کہیں اور غزلیں بھی، لیکن ہمیشہ ہیر وارث شاہ کی اس بحر سے کترا کر نکل گئے۔

انھوں نے غالب کے کلام کو بھی پنجابی کا جامہ پہنایا۔ آخری ایام میں فیض احمد فیض کے اشتراک سے اقبال کا ترجمہ کر رہے تھے۔

عمر کے تقاضوں سے قطع نظر کہ اُن سے مفر نہیں، صحت بالعموم اچھی رہی۔ لیکن منزلِ مقصود بالکل اچانک آئی۔ ۶ فروری، ۱۹۷۸ء کو اقبال کے سلسلے میں

ایک ٹی وی پروگرام میں حصہ لینے کو راولپنڈی گئے تھے۔ وہاں سے منگل ۷ فروری ۱۹۷۸ء سہ پہر میں واپس لاہور پہنچے۔ گاڑی سے اترے ہی تھے کہ دل کا شدید دورہ پڑا۔ کوئی طبی امداد بھی بروقت نہ پہنچ سکی، آناً فاناً وہیں ریلوے اسٹیشن پر جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ جنازہ اگلے دن (بدھ ۸ فروری) اٹھا، اور انھیں لاہور کے قبرستان باغِ گل بیگم میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ وہ "نیاز مندانِ پنجاب" کے حلقے کے آخری فرد تھے۔

بہت لوگوں نے تاریخ وفات کہی۔ عیسوی میں راغب مرادآبادی نے لکھا:

خوش فکر غلام مصطفےٰ تھے صوفی ۔۔۔ دانشور و درد آشنا تھے صوفی
لب پر دمِ مرگ بھی تبسم ہی رہا ۔۔۔ اک مومن و واثق بخدا تھے صوفی
(۱۹۷۸)

ہجری میں عبدالصمد صارم الازہری نے کہا:

بود صوفی صاحبِ علم و ادب ۔۔۔ صدرِ بزمِ دانش و فن و طرب
کرد صارم فکرِ تاریخ وفات ۔۔۔ گفت ہاتف "او شدہ منظورِ رب"
(۱۳۹۸)

سید سلمان رضوی نے ایک کے تخرجے سے ان کے نام سے تاریخ نکالی ہے:

کہتا کر ایک کہ تاریخِ رحلت ۔۔۔ غلام مصطفےٰ صوفی تبسم
(۱۹۷۹) - (۱ = ۱۹۷۸)

اولاد میں تین لڑکیاں اور پانچ لڑکے اپنی جسمانی یادگار چھوڑے۔

اعجاز صدیقی، اعجاز حسین

عاشق حسین سیماب اکبرآبادی (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کے نام سے کون اردو کا طالب علم ناواقف ہوگا! اعجاز حسین انھیں سیماب اکبرآبادی کے صاحبزادے تھے۔ ان کا خاندان دراصل ولایتی تھا۔ مورثِ اعلیٰ عہدِ اورنگ زیب عالمگیر میں

ماخذ: ۱۹۷۰ء کے گت رسالے اعجاز مرحوم کی خود نوشت حالات بشاعر آگرہ اسکول نمبر (کارولی) ۱۹۳۷ء؛ خطوطِ تاجدار احتشام (پسر اعجاز مرحوم)

بخارا سے ہندستان آئے۔ ان کا پیشہ تجارت تھا۔ وہ شال، دوشالے، فروخت کرتے، یہاں وارد ہوئے اور آگرے کی مرکزی حیثیت دیکھ کر وہاں بس گئے۔ انھیں کے اخلاف میں چودھری نبی بخش نے تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرلی، اور سرکاری مطبع، الٰہ آباد میں ملازم ہو گئے۔ چودھری نبی بخش نے اپنے بیٹے محمد حسین کو عربی، فارسی کے علاوہ اردو اور انگریزی کی بھی معقول تعلیم دلائی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعد کو انھیں ٹائمز آف انڈیا پریس کی اجمیر شاخ کی منیجری مل گئی۔ یہی محمد حسین، اعجاز حسین کے دادا تھے۔

مولوی محمد حسین سخت کٹر مذہبی آدمی تھے۔ یہ وہ دور ہے، جب آگرے میں غلام امام شہید (ف: جنوری ۱۸۷۹ء) اور حکیم امیر الدین عطار کا طوطی بولتا تھا؛ دونوں مدّاح رسولؐ تھے اور نعت گوئی میں دُور دوران کی شہرت تھی، مولوی محمد حسین نے عطار کی شاگردی اختیار کرلی؛ فقیر تخلص تھا، لیکن زیادہ شغف نثر سے رہا۔ شعر بہت کم کہتے تھے۔ سیرتِ نبوی پر چار حصّوں میں ایک کتاب "گلدستۂ عطار" کے نام سے لکھ کر استاد سے منسوب کردی۔ وعظ وتذکیر کے لیے راجپوتانے کے اکثر شہروں میں بلائے جاتے تھے۔ اسی زمانے میں ان کا تبادلہ اجمیر ہوگیا۔ اجمیر کے قیام نے گویا سونے میں سہاگے کا کام کیا۔ یہیں انھوں نے "مجموعۂ شہادت" اور "کراماتِ غوثیہ" تالیف کیں۔ ایک ماہنامہ بھی "مشعر الحدیث" کے نام سے جاری کیا تھا؛ اس سے احادیثِ نبوی کی اشاعت مقصود تھی۔ ۱۶ اپریل ۱۸۹۷ء کو بعارضۂ سل آگرے میں انتقال کیا؛ وفات کے وقت عمر ۵۰ برس کی تھی۔

مولوی محمد حسین کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ بیٹوں میں بڑے عاشق حسین سیماب اکبرآبادی تھے۔ ان سے دو چھوٹے بھائی منشی صادق حسین صدیقی اور حاجی عبدالکریم صدیقی تھے۔ دونوں پریس کمپوزیٹر تھے۔ بڑے نے ساری عمر گورنمنٹ پریس، لشکر (گوالیار) میں ملازمت کی، اور چھوٹے نے گورنمنٹ پریس

شملہ میں۔
سیماب اکبرآبادی کسی خاص تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ ۵ جون ۱۸۸۰ء (۱۸ رجب ۱۲۹۹ھ) پیر کے دن پیدا ہوئے۔ داغ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے، بلکہ ان کا داغ کے نورتنوں میں شمار ہوتا ہے۔ ان سے ہزاروں شاعروں نے فیض پایا، جس سے ایک الگ سیماب اسکول قائم ہوگیا۔ ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو کراچی (پاکستان) میں رحلت کی۔

حضرت سیماب کی اولاد میں چھ بچے ہوئے بڑی صاحبزادی حسینہ خاتون کا ۱۹۱۹ء میں انتقال ہوگیا۔ دوسری صاحبزادی جمیلہ خاتون بھی فوت ہو چکی ہیں۔ سب سے بڑے صاحبزادے شمشاد حسین منظر صدیقی تھے۔ جن کا ۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔ اعجاز حسین ان سے چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹے دو اور بھائی سجاد حسین اور مظہر حسین ہوئے۔ سجاد حسین نے چند سال پہلے کراچی میں رحلت کی۔ مظہر حسین (مظہر صدیقی) ماشاءاللہ حیات ہیں اور آج کل کراچی میں مقیم ہیں۔ بہت دن ماہنامہ "پرچم" نکالتے رہے۔ نثر سے زیادہ مزاولت ہے۔
اعجاز حسین ۱۹۱۳ء[۱] میں آگرے میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بہت بیقاعدہ اور غیر مسلسل رہی۔ سیماب مرحوم نے سرکاری نوکری سے مستعفی ہوکر (۱۹۲۱ء میں) آگرے میں سکونت اختیار کرلی، اور یہاں ایک ادبی ادارہ "قصر الادب" کے نام سے قائم کردیا۔ یہاں سے مختلف ماہنامے اور ہفتہ وار اخبار شائع ہونے لگے۔ ۱۹۲۵ء میں وہ تاجور مرحوم (ف: جنوری ۱۹۵۱ء) کی دعوت پر "ادبی مرکز" میں کام کرنے کو لاہور گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر ۱۹۲۶ء میں دلی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن بالآخر آگرے کی کشش سب پر غالب آگئی۔

[۱] ۱۹۱۳ء کی تاریخ خود سیماب مرحوم کی ایک یادداشت پر مبنی ہے، ورنہ اعجاز کی والدہ مرحومہ کے بیان کے مطابق تاریخ ۱۴ ۱۹۱۴ء ہے؛ مہینا اور دن دونوں میں سے کسی کے ہاں نہیں۔ اعجاز مرحوم نے ایک جگہ اپنی تاریخِ ولادت ۱۹۱۶ء لکھی ہے؛ یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اور انھوں نے ہر طرف کا خیال چھوڑ کر اپنے وطن ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ فروری ۱۹۳۰ء میں ماہنامہ "شاعر" جاری کیا، تو پہلے اسے بڑے صاحبزادے منظر صدیقی کو اور چار سال بعد (منظر کے اپنا کاروبار الگ کر لینے کے باعث) اعجاز صدیقی کو سونپ دیا۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ اعجاز مرحوم نے مختلف اوقات میں پرائمری اسکول، ٹونڈلہ (ضلع آگرہ)، بپٹسٹ مشن مڈل اسکول، آگرہ، شعیب محمدیہ ہائی اسکول، آگرہ میں تعلیم پائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی رسمی تعلیم بہت کم اور ناقابلِ لحاظ تھی۔ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا، اپنے والد سیماب مرحوم سے اور اپنے علمی ماحول سے۔ وہ بہت کم عمری میں شعر و شاعری سے متعارف اور مانوس ہو گئے۔ جب ۱۹۳۵ء میں شاعر کی ایڈیٹری ان کے سپرد ہوئی ہے، تو ان کی عمر ۲۲ برس سے زیادہ کی نہیں تھی۔ لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اس فرض سے بوجوہِ احسن عہدہ برآ ہوئے۔

تقسیمِ ملک کے بعد شمالی ہند میں اردو کا مستقبل بہت تشویشناک ہو گیا تھا۔ اعجاز مرحوم نے فیصلہ کیا کہ بہتر ہوگا، اگر آگرے کی بجائے بمبئی کا قیام اختیار کرلیا جائے، جہاں کی فضا اس کے فلمی صنعت کا مرکز ہونے کے باعث اردو کے علاوہ تجارتی پہلو سے بھی زیادہ سازگار تھی۔ ان کا یہ اندازہ بہت صحیح ثابت ہوا، جو ان کی کاروباری سوجھ بوجھ کی بیّن دلیل ہے۔ چنانچہ وہ فروری ۱۹۵۱ء میں بمبئی منتقل ہو گئے اور ان کے یومِ وفات تک "شاعر" وہیں سے شائع ہوتا رہا۔ اس دوران میں انھوں نے اس کے بعض بہت شاندار خاص نمبر شائع کیے مثلاً گاندھی نمبر، کرشن چندر نمبر، غالب نمبر، قومی یکجہتی نمبر، ہمعصر اردو ادب نمبر وغیرہ۔ یہ حقیقت ہے کہ صحت کی خرابی کے باوجود اتنے ضخیم کامیاب نمبر مرتب کرلینا کچھ انھیں کا کام تھا۔

ان کی صحت کبھی تسلی بخش نہیں رہی۔ ان کے خون میں کوئی فتور تھا جس سے

سارے جسم میں کچھ زہریلا مادہ سرایت کر گیا تھا۔ جب اس کا دورہ پڑتا تھا، تو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ کئی مرتبہ حالت بہت خراب ہو گئی اور انھیں علاج کے لیے اسپتال جانا پڑا۔ لیکن ہر مرتبہ خدا نے رحم کیا اور بحمدہ وہ لوٹ پوٹ کر گھر واپس آ گئے۔

جمعرات ۹ فروری ۱۹۷۸ء فجر سے پہلے ساڑھے پانچ بجے دل کا شدید دورہ پڑا۔ فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ علاج ہو رہا تھا کہ وہیں دوسرا پہلے سے بھی شدید تر دورہ پڑا۔ اسی میں سات بجے رہگرائے عالمِ جاودانی ہو گئے۔ ہوش و حواس آخر تک قائم رہے، بیوی بچوں سے باتیں کرتے رہے، انھیں نصیحتیں کرتے رہے۔ اسی میں خدا حافظ کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی اپنی وصیت کے مطابق ناریل باڑی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ خدا ان سے عفو و کرم کا سلوک کرے۔ آمین!

۱۹۲۹ء میں ان کی شادی بھر تپور کے زمیندار اور مہاراجا بھرتپور کے طبیبِ خاص حکیم صاحب داد خان کی دخترِ نیک اختر منظور نسیم سے ہوئی تھی۔ ماشاءاللہ سات بیٹے اور دو بیٹیاں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ بڑے بیٹے تاجدار احتشام صدیقی، ان کی وصیت کے مطابق "شاعر" کو جاری رکھنے کا عزم رکھتے ہیں۔ خدا سب کا حامی و ناصر رہے۔

اعجاز مرحوم نے زندگی بھر اردو کی جو خدمت کی ہے، وہ بھولنے کی چیز نہیں۔ جب بھی بیرونی یا اندرونی مخالفین کی طرف سے اردو پر کوئی حملہ ہوا، وہ سینہ سپر ہو گئے۔ ان کے قلم میں زور تھا اور وہ اردو کی حمایت میں لکھتے وقت کسی لگی لپٹی کے روادار نہیں تھے۔ افسوس، ان کا مجموعۂ کلام آج تک شائع نہیں ہوا، اگرچہ ان کی متعدد نظموں پر مختلف اوقات میں انعام بھی ملے۔ ایک طویل نظم "خوابوں کا مسیحا" البتہ تین زبانوں (اردو، ہندی، انگریزی) میں شائع ہوئی تھی اس میں پنڈت جواہر لال نہرو مرحوم کے کارناموں کا ذکر ہے۔

وفیات

ہنر الٰہ آبادی، محمود احمد

ان کا آبائی وطن شاہجہاں پور (یوپی) تھا، جہاں سے ۱۸۹۰ء میں ان کے والد مشرف علی صاحب کلکٹری میں ملازم ہو کر الٰہ آباد گئے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ان کا یکم جنوری ۱۹۳۶ء کو الٰہ آباد ہی میں انتقال ہوا۔

مشرف علی صاحب کی اولاد میں پانچ بیٹیوں کے علاوہ تین بیٹے تھے: ولی شاہجہان پوری (جو آج کل مکتبۂ جامعہ، نئی دلی سے وابستہ، اور پیام تعلیم اور کتاب نما کے ایڈیٹر ہیں)، مظفر علی شاہجہان پوری، محمود احمد ہنر۔

محمود احمد ہنر ۱۹۱۹ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سراسر نجی طور پر گھر ہی پر ہوئی۔ انھیں نہ جانے کیونکر بلاک سازی کے کام سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اسی سلسلے میں کام سیکھنے کے لیے ۱۹۳۱ء میں وہ بھارگو پریس، بنارس میں چلے گئے۔ بنارس کے قیام کے دوران میں جہاں ایک طرف انھوں نے کام سیکھا وہیں ہندی بھی سیکھی اور رفتہ رفتہ اس میں اتنی استعداد اور مہارت پیدا کر لی کہ آیندہ زندگی میں انھوں نے ہندی کے مصنف اور مترجم کی حیثیت سے بہت شہرت حاصل کی۔

انھوں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ شروع میں ہندی سے اردو میں ترجمہ کرتے رہے؛ اس میں بھی زیادہ توجہ افسانے پر رہی۔ جب ۱۹۳۶ء کے اسمبلی کے انتخابات کے بعد کانگریس نے پہلی مرتبہ حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی، تو یوپی میں ایک "گرام سدھار و بھاگ" بھی قائم ہوا تھا؛ اور اس کی طرف سے ماہنامہ "ہل" جاری کیا گیا تھا۔ یہ پرچہ ہندی اور اردو، دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔ ہنر اپنی کم عمری کے باوجود ۱۹۳۸ء میں اس کے نائب مدیر مقرر ہو گئے تھے۔ یہ پرچہ الٰہ آباد سے شائع ہوتا رہا۔ بعد کو ۱۹۴۳ء میں اس کا دفتر لکھنؤ

ماخذ: ولی شاہجہاں پوری (برادرِ اکبر ہنر مرحوم)

تبدیل ہوگیا، تو ہنر بھی لکھنؤ چلے گئے۔
ہنر شروع سے قومی خیالات کے آدمی تھے، کھدّر پہنتے اور گاندھی ٹوپی اوڑھتے۔ لکھنؤ میں بھی ان کا یہی لباس رہا۔ اگرچہ حکومت کانگریس کی تھی، لیکن گورنر راج تھا، اور سارا عملہ ہنوز پرانا نوکر شاہی کا۔ چونکہ یہ ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے اس لیے کارِ منصبی کے سلسلے میں انھیں اکثر سکریٹریٹ جانا پڑتا۔ وہاں لوگ ان کے لباس اور خاص طور پر گاندھی ٹوپی کا مذاق اڑاتے۔ قدرتاً یہ انھیں بہت ناگوار گزرتا۔ آخر جب پانی سر سے گزر گیا، تو اور تو کچھ نہ کر سکے، ایک دن جھنجلاہٹ میں استعفیٰ داخل کر کے واپس الٰہ آباد چلے گئے۔
اب انھوں نے ترجمے کو بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ "مایا" اور دوسرے ہندی رسالوں میں ان کی کہانیاں باقاعدگی سے چھپنے لگیں، جن سے اتنی یافت ہوجاتی کہ وہ عزّت زندگی بسر کرنے کے قابل ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں پنڈت سندر لال جی کی سفارش پر گاندھی جی نے انھیں "ہری جن سیوک" میں کام دے دیا۔ لیکن وہ آشرم کی حد درجہ نظم و ضبط کی زندگی زیادہ دن نباہ نہ سکے۔ اس پر ان کا نوجیون پریس، احمد آباد تبادلہ ہوگیا، جہاں "ہری جن سیوک" چھپتا تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ "ہری جن سیوک" کا اردو ایڈیشن گاندھی جی نے محمود احمد ہنر ہی کے کہنے پر شروع کیا تھا۔ اس کا پہلا شمارہ ۶ اپریل ۱۹۴۶ء میں نکلا تھا۔ ہنر ہی اس کے مرتب تھے۔

گاندھی جی ہندستانی کے پرچارک تھے۔ یعنی وہ عام فہم زبان جو کسی تبدیلی کے بغیر اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے، اور سب اسے کسی دشواری کے بغیر سمجھ سکیں۔ اس سلسلے میں ہنر نے ان دونوں رسالوں کی ترتیب و تدوین میں بہت کام کیا؛ اور گاندھی جی ان کے کام سے بہت خوش اور مطمئن تھے۔
۱۹۴۷ء میں گاندھی جی نواکھالی کے دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں انھوں نے ہنر کو اپنے پاس نواکھالی بلا لیا۔ اور اپنی ہندی اور اردو خط و کتابت کا بیشتر حصّہ ان کے سپرد کر دیا۔ نواکھالی سے گاندھی جی کے ساتھ بہار آئے اور پٹنے میں بھی یہ فرائض انجام دیتے رہے۔ گاندھی جی پٹنے سے دلّی

وفیات

آگئے اور یہیں ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ کو وہ قاتل کی گولی کا نشانہ بنے۔ ہنر اس کے بعد دلّی پہنچے، تو پنڈت ۔۔ لال نے انھیں اپنے ماہنامے "نیا ہند" میں کام کرنے کی دعوت دی، جسے انھوں نے قبول کر لیا اور الٰہ آباد چلے گئے۔ "نیا ہند" میں انھوں نے مارچ ۱۹۵۲ء تک کام کیا۔

اگلے تین چار سال ہنر نے آزاد صحافی کے طور پر بسر کیے۔ مختلف رسالوں میں مضمون، افسانے وغیرہ لکھتے رہے۔ بالآخر جنوری ۱۹۵۸ء میں مشہور افسانوی ہندی ماہنامہ "مایا" کے نائب مدیر مقرر ہو گئے۔ وہ اس عہدے پر ۱۹۷۱ء تک، تیرہ برس رہے۔ اسی دوران میں انھوں نے اپنا اردو ماہنامہ "شاہکار" جاری کیا، جو شتم پشتم پہلے الٰہ آباد سے اور پھر بنارس سے پانچ چھ سال نکلا۔ اور آخر کار مالی دشواریوں کا شکار ہو گیا۔ اس کے بعد "منوہر کہانیاں" (الٰہ آباد) کے منیجر مقرر ہو گئے تھے۔

ان کی ہندی نگارشات کی تعداد معتد بہ ہے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے کم از کم ۴۰۰۰ کہانیاں اور ۰۰ ناول اور درجن بھر شعری مجموعے (اصل اور ترجمہ) ہندی میں شائع کئے ہیں۔ اگر یہ اندازہ بالکل ٹھیک نہ بھی ہو، جب بھی اتنا تو ثابت ہے کہ ہندی دنیا میں وہ صف اوّل کے مترجم تھے۔ اسی لیے ان کا ہندی کے مسلّمہ ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ اور اسی حیثیت سے کل ہند ہندی سمتی نے انھیں اپنا رکن چنا تھا۔

موت اچانک دبے پاؤں آئی۔ ۹/۸ فروری ۱۹۷۸ء کو زکام کی شکایت لی، لیکن کسی تشویش کا اظہار نہیں کیا۔ ۱۱ فروری ہفتے کے دن تک اچھے خاصے رہے۔ حسبِ معمول سب سے ملے جلے؛ رات گئے تک دوستوں سے گپ کرتے رہے، اور سو گئے۔ شب میں ایک بجے کے قریب آنکھ کھلی اور سانس میں تکلیف کا اظہار کیا۔ پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر آئے، روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یعنی اتوار ۱۲ فروری ۱۹۷۸ء کے اوّلین وقت۔ سی دن سہ پہر میں جنازہ اٹھا اور انھیں محلّہ اکبر پور (الٰہ آباد) کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

انھوں نے اپنی عمر میں دو نکاح کیے۔ پہلی شادی شاہجہانپور ہی میں اپنے ماموں کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ بیوی ۶-۷ مہینے کی ایک بچی چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں؛ اور اس کے بعد یہ بچی بھی چل بسی۔ اس کے کافی دن بعد ان کی دوسری شادی غازیپور (ضلع بلیا) کے جونیر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر عبدالمجید مرحوم کی صاحبزادی افسر جہاں سے ہوئی۔ ان سے تین لڑکیاں (فرزانہ، سلطانہ، شاہینہ) اور دو لڑکے (داؤد احمد، ودود احمد) اپنی یادگار چھوڑے۔ یہ بیگم حیات ہیں۔

تحریر

علمی مجلس دِلّی کا سہ ماہی رسالہ

(۴۵)

مرتب : مالک رام

جلد ۱۲   جولائی/ستمبر ۱۹۷۸ء   شمارہ ۳

چندہ سالانہ

ہندستان : پندرہ روپے

غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی)
آٹھ ڈالر (امریکی)

یہ شمارہ: ۷ روپے

پرنٹر و پبلشر مطلق عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس، دلّی میں چھپواکر علمی مجلس، ۱۲۲۹ چھتہ نواب صاحب، فراش خانہ، دلّی ۶ سے شائع کیا۔

ملاحظات

قبلِ تقسیم کی دلّی میں ملّا واحدی کی شخصیت بہت نمایاں تھی۔ خاندانی وجاہت اور سماجی خدمت کے باعث یہاں ان کی خاصی شہرت تھی۔ انھوں نے اور جو کچھ کیا ہو، وہ اپنی جگہ، لیکن اردو صحافت کے میدان میں بھی ان کے کارنامے کچھ کم اہم نہیں۔ وہ اردو کے اچھے ادیب تھے۔ ان کی زبان سادہ، سلیس، دلّی کی مستند زبان ہے۔ اگر وہ اپنے پیر و مرشد خواجہ حسن نظامی مرحوم کی طرح اردو انشا پردازی ہی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے، تو ان کا نام تاریخِ ادبِ اردو میں کسی کے مٹائے نہ مٹتا۔ اب بھی وہ جو کچھ چھوڑ گئے ہیں، نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "میرا افسانہ" کے عنوان سے لکھنا شروع کی تھی۔ افسوس کہ وہ اسے مکمّل نہ کر سکے۔ ۲۱ فروری ۱۹۶۶ء کو ان پر فالج کا حملہ ہوا اور لکھنے کا کام رک گیا۔ سال ڈیڑھ سال تک وہ اس طرف توجہ نہ کر سکے۔ اس کے بعد انھوں نے مزید ایک باب قلمبند کیا، اور اسی پر یہ افسانہ ختم کر دیا۔ ۲۲ اگست ۱۹۷۶ء کو وہ اپنے خالقِ حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہو گئے۔

جتنے صفحات انھوں نے لکھے تھے، ان کے پوتے سیّد محمد علی واحدی سلمہٗ نے سائیکلو اسٹایل کرا کے دوست احباب میں تقسیم کر دیے تھے۔ اندیشہ تھا کہ یہ تحریر کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ اس لیے ہم نے تحریر کی ایک اشاعت وقف کرنے کا فیصلہ کیا:

نامِ نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

مالک رام

پیش لفظ

بڑا آدمی ہونے کی قید نہیں ہے۔ ہر ادنےٰ سے ادنےٰ آدمی کی زندگی میں ایسے واقعات گذرتے ہیں کہ آدمی کو انھیں تولنا اور بیان کرنا آتا ہو تو ان واقعات سے دنیا سبق سیکھ سکتی ہے اور فائدہ اٹھا سکتی ہے۔
مجھے اپنی حیثیت کا الحمدللہ احساس ہے۔ میں واقف ہوں کہ میرے حالات پڑھنے کا شوق کسے ہو سکتا ہے۔ یہ حالات اشاعت کی غرض سے نہیں لکھے گئے ہیں۔ یہ صرف اولاد کے لیے ہیں۔ اولاد اپنے باپ دادا کے حالات ضرور جاننا چاہتی ہے۔ جھونپڑیوں میں پیدا ہونے والے بچے بھی، سوچنے کی قابلیت آتے ہی سوچنے لگتے ہیں کہ ہم کون ہیں اور ہمارے بزرگ کیا تھے!

انقلاب ۱۹۴۷ء نے ہمیں تتر بتر کر دیا ہے۔ حالات قلمبند نہ کیے گئے تو اعزا و اقربا کا پہچاننا دشوار ہو جائے گا۔

اس خود نوشت سوانح عمری کا نام میں نے "میرا افسانہ" رکھا ہے۔ ہر ادنےٰ سے ادنےٰ آدمی کے حالات سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ افسانے کی طرح دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ شرط وہی ہے کہ بیان کنندہ بیان کر سکتا ہو۔ میں اگر بیان کر سکنے کے دعوے میں تکلف برتوں، تو اس کے معنی ہیں کہ اپنی حیثیت کے احساس کے متعلق جو کچھ اوپر کہا ہے، وہ بھی تکلف ہے، اور جتنا حال اس کتاب میں درج ہے، وہ بھی مبالغے سے پاک نہیں ہے۔

حیثیت کے گھٹانے سے بھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ مرنے کے بعد اللہ کے سایۂ رحمت کے نیچے جگہ مل گئی، تو پھر حیثیت ہی حیثیت ہے ایک شاعر صاحب فرماتے ہیں:

ما ز آغاز و انجام جہاں بے خبریم
اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادست

(یعنی شاعر کائنات کے آغاز و انجام سے بےخبر ہے۔ اس کے سامنے کتاب کائنات کے سارے اوراق موجود ہیں۔ مگر کتاب کا پہلا اور آخری ورق گم ہوگیا ہے)

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ وہ دونوں ورق مجھے مل گئے ہیں۔ کائنات کے سارے اوراق میرے سامنے نہ سہی۔ لیکن کائنات کے گمشدہ یہ دونوں ورق میرے پاس ہیں۔ لہٰذا میں اپنے تئیں کم حیثیت کہتا ہوں تو اس کا مطلب فقط اتنا ہے کہ وہ حیثیت مجھے حاصل نہیں ہے، جسے دنیا اہمیت دیتی ہے اور جس قسم کی حیثیت والوں کی سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں۔ مگر اس سوانح عمری میں ایسے قابلِ ذکر حضرات کا بھی بہت ذکر ہوگا اور اس سوانح عمری میں وہ تجربے کی باتیں ہونگی، جنھیں اس وقت جانا جاتا ہے جب انسان کے پاس ان سے فائدہ اٹھانے کا وقت نہیں رہتا۔ یعنی انسان میری عمر کا ہوجاتا ہے اور تجربے کی باتوں کو ساتھ لے کر قبر میں جا سوتا ہے۔ اللہ کے فضل سے میں انہیں قلمبند کر رہا ہوں اور پڑھنے والوں کو فائدہ اٹھانے کی دعوت دیتا ہوں۔ وہ باتیں اہلِ نظر "میرے افسانے" کے ایک ایک سطر میں پوشیدہ پائینگے۔

واحدی

یکم جنوری ۱۹۶۶ء

میرا افسانہ

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

میرا نام

ماں باپ کا رکھا ہوا میرا نام محمد ارتضےٰ ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ایک صاحب ظہیر احمد زاہدی ہم جماعت تھے۔ ان کے چچا مشتاق زاہدی کے مضامین کا مجھ پر رعب تھا۔ زاہدی صاحب آخر میں نو بہاولپور کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت نیا نیا بی۔ اے پاس کیا تھا اور "مخزن" لاہور اور "زمانہ" کانپور وغیرہ ماہوار رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے۔ مضمون نویسی کا شوق میرے اندر بھی پیدا ہوا چلا تھا۔ میں نے ظہیر احمد سے مذاقاً کہا: تم "زاہدی" میں "واحدی"۔ وہ مذاق کچھ اس درجے سازگار رہا کہ میں "واحدی" ہی بن گیا۔ سب دوست واحدی کہنے لگے۔ پھر جب خواجہ حسن نظامی صاحب سے تعلقات بڑھے تو انھوں نے واحدی عرف کو پکا کر دیا۔ علامہ اقبال کو یہ عرف بیحد پسند تھا علامہ فرمایا کرتے تھے کہ اقبال نام مشہور ہو چکا ہے۔ ورنہ میں تم سے تمھارا عرف چھین لیتا۔

"نظام المشائخ" جاری ہوا تو لوگوں نے واحدی کے ساتھ مولوی اور مولانا لکھنا شروع کیا۔ اس سے طبیعت گھبراتی تھی کہ ہوں خاک نہیں اور کہلاؤں مولوی، مولانا۔ لہٰذا سوچا کہ لفظ کوئی لگانا ہی ہے تو ملاّ کا لفظ لگایا جائے۔ میرا خیال تھا کہ مولوی، مولانا کہلانے سے بہتر ہے کہ ملاّ کہلاؤں اور اب تو میری شناخت

لفظ "ملا" سے ہوتی ہے۔ واحدی ماشاءاللہ اور کئی ہیں سبھی بیٹیاں سب واحدی ہیں۔ دیگر حضرات بھی واحدی عرف رکھنے لگے ہیں۔

میرے بڑے اور میرے چھوٹے

والدِ ماجد کا اسمِ گرامی سید محمد مصطفےٰ تھا۔ ان کے والد حافظ سید محمد الیاس، ان کے والد میر پناہ علی، ان کے والد میر امام بخش، ان کے والد سید حمایت اللہ المعروف بہ سید شاہ میر (المتوفی ۲ جمادی الثانی ۱۱۹۴ھ) ان کے والد سید شاہ شکر اللہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۵ محرم ۱۱۴۹ھ) ان کے والد حضرت میر محمد اکبر المعروف بہ حکیم سید شاہ ارزانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷ ربیع الثانی ۱۱۲۴ھ بزمانہ شاہ عالم بادشاہ)۔ حکیم ارزانی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے طبِ یونانی کی کتابوں کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا اور ترجمہ کرکے طب کو عام اور ارزاں کر دیا۔ اسی وجہ سے انھیں ارزانی کہا جاتا ہے۔ طبیب بھی اعلیٰ پایے کے تھے، اور درویش بھی تھے۔ حکیم ارزانی کے والد حضرت میر محمد مقیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱ جمادی الاول ۱۰۹۷ھ) حضرت خواجہ محمد معصوم نقشبندی رحمہ اللہ کے خلیفہ تھے۔

یہ سب میرے پردادا میر پناہ علی کے بزرگ ہوئے۔ میری پردادی میر نجف علی آخری فوجدار خان کی بیٹی تھیں۔ فوجدار خان ایک مستقل خطاب بالقب تھا۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر صدیوں حکومت کی، لیکن جتنا سکون و اطمینان اور لطفِ حکومت شاہ جہاں کے عہد میں نظر آتا ہے اتنا کسی اور بادشاہ کے دور میں نہیں ملتا۔ جس بادشاہ کا دماغ دلی کی جامع مسجد اور دلی کے لال قلعے اور آگرے کے تاج محل جیسی عمارتوں کا تصور

کر سکتا ہو وہی سوچ سکتا تھا کہ تین موقع ایسے ہیں کہ لوگ میری طرف پشت کرتے ہیں، ایک نماز جمعہ، دوسرے نماز عید اور تیسرے جب میں ہاتھی پر سوار ہوتا ہوں۔ بادشاہ کی طرف صرف آلِ رسولؐ کی پشت ہونی چاہیے۔ میں ہر کس و ناکس کی پشت اپنی طرف نہیں کراؤنگا۔

شاہ جہاں نے امیر بخارا کو لکھا کہ بخارا کے متعدد سیّدوں میں سے تین سیّد منتخب کر کے بھیج دو۔ چنانچہ تین سیّد تشریف لائے۔ ایک کے سپرد جامع مسجد کی امامت کی گئی، ایک کے عیدگاہ کی امامت اور ایک کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ بادشاہ اور فیلبان کے درمیان بیٹھا کریں، بادشاہ کی طرف منہ کر کے اور فیلبان کی طرف پشت کر کے۔ اس ڈیوٹی یا اس عہدے کا نام پیش نشینی تھا، اور عہدیدار کا خطاب فوجدار خان تھا۔ فوجدار خان پیش نشینی کے علاوہ فیل خانے کی نگرانی بھی کرتے تھے۔ اور ایک ڈیوٹی ان کی اور تھی کہ بادشاہ تختِ عدالت پر چڑھنے لگتا تو وہ تخت کے قریب کھڑے ہوتے تھے اور بادشاہ سیّد کے ہاتھ کا سہارا لے کر تختِ عدالت پر بیٹھتا تھا۔

شاہی فیلخانہ فیض بازار (دریا گنج) میں درگاہِ حضرت شاہ صابر بخش کے سامنے تھا۔ درگاہ کو جو راستہ درگاہ اور مولا بخش جن، والی چھوٹی سی مسجد کے بیچ میں سے جاتا ہے وہ فیلخانے کا راستہ تھا۔ درگاہ کی زمین میر نجف علی آخری فوجدار خان کی ملکیت تھی۔ میر نجف علی، شاہ صابر رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ انھوں نے یہ زمین اور فیض بازار کی وہ زمین جس میں ترکاری کی منڈی ہے، شاہ صاحب کی نذر کی تھی۔

میری پردادی کا خاندان میرے پردادا کے خاندان کی نسبت چونکہ امیر تھا، ہم لوگوں نے حکیم شاہ ارزانی کے علم و فضل پر فوجدار خان کی امارت کو فوقیت دے دی اور اپنے تئیں فوجدار خان سے منسوب کر لیا۔ فوجدار خان

کے بیٹوں کی اولاد تو فوجدار خانی ہے ہی، ہم بیٹی کی اولاد بھی فوجدار خانی کہلاتے ہیں۔

میری پردادی میر نجف علی کی پہلی اولاد تھیں۔ میر نجف علی کے آخری بیٹے میر عبدالرزّاق اپنے بھانجے، یعنی میرے دادا، سے ایک آدھ برس شاید چھوٹے تھے، یا ایک آدھ برس بڑے۔ میر عبدالرزّاق کے بیٹے حافظ میر عبدالوہاب سے میری پھوپھی (حضرت بیگم) بیاہی گئیں۔ میں نے نہ دادا کو دیکھا اور نہ میر عبدالرزّاق کو۔ لیکن میر عبدالرزّاق کی اہلیہ ۱۹۱۰ء تک زندہ تھیں فوجدار خان زیادہ تر کوچہ چیلان کے رہنے والے ہیں۔ مگر چند حضرات بلّی ماران، فراش خانہ اور پنڈت کے کوچے میں بھی جا بسے تھے۔ جمعہ کے جمعہ ہر فوجدار خانی جامع مسجد آتا تھا اور نماز پڑھ کر میر عبدالرزّاق کی اہلیہ کے ہاں حاضر ہوتا تھا۔

کوچہ چیلان لال قلعے کے نزدیک ہے۔ یہاں کبھی قلعے کے چالیس متوسلین کی حویلیاں تھیں۔ کوچہ چیلان دراصل کوچہ چہل امیران تھا۔ خیر، کوچہ چیلان لال قلعے کے نزدیک ہے اور جامع مسجد سے بھی دور نہیں ہے۔ میر عبدالرزّاق کی اہلیہ جمعہ کے دن اپنے دالان کی دری جھڑواتیں اور چاندنی بدلواتیں اور اہلِ خاندان کا انتظار کرتیں۔ خاندان کے چھوٹے بڑے ان کی قدم بوسی کو سعادت جانتے تھے، اور ان کی دعائیں لیتے تھے۔

دو ڈھائی گھنٹے محفل جمتی۔ بزرگ خاتون خاندان کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتیں۔ رائے اور مشورے سے معاملہ نہ سلجھتا تو ان کا حکم چلتا تھا۔ کسی کی مجال نہیں تھی کہ حکم کو ٹال جاتا۔

ان کے اشارے پر بیٹا بیٹی کے رشتے طے پاتے تھے۔ فرماتیں "میاں حفیظ الرحمٰن! مسعود ماشاءاللہ جوان ہو گیا۔ کہیں بات ٹھہرائی یا نہیں؟" جواب ملتا "جی اماں! آپ کی موجودگی میں ہم بات ٹھہرانے والے کون!

بزرگ خاتون مڑ کر مجید اللہ سے پوچھتیں، کیوں میاں مجید اللہ! افروز جہاں اور مسعود الرحمٰن کی جوڑی کیسی رہیگی؟ میاں مجید اللہ ہاتھ جوڑ کر اور سرِ تسلیم جھکا کر عرض کرتے: جو ارشادِ عالی۔ بزرگ خاتون بٹوے سے دو روپے نکالتیں اور دو روپے کی جلیبیاں منگا، حاضرین کا منھ میٹھا کرا دیتیں۔ آج کل کے بھاؤ کا خیال نہ کرنا۔ دو روپے میں چار پانچ سیر جلیبیاں آجاتی تھیں۔

خیر نکاح سال چھ مہینے میں ہو جائیگا۔ نکاح کی عجلت نہیں ہے۔ بات اتنی پختہ ہے کہ مسعود الرحمٰن اور افروز جہاں کو نبھانی پڑیگی اور ہنسی خوشی نبھانی پڑیگی۔ دادی اماں کی طے کردہ بات توڑی نہیں جا سکتی۔ دادی اماں کی لاج رکھنی ضروری ہے۔ دادی اماں کے دم سے خاندان کا بندھن اور بھرم قائم ہے۔

دادی اماں اور دادی اماں کے خاندان والے آج کل جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ البتہ تربیت یافتہ آج کل سے بڑھ کر تھے۔ انھوں نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی تھی کہ "جو چھوٹوں پر شفقت اور بڑوں کی توقیر نہیں کرتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے"! یعنی وہ حضورؐ کے مسلک سے برگشتہ ہے۔ لیس منامن لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا۔

مجھی پروفیسر محمد ایوب قادری بدایونی ایم۔ اے، سابق رکن ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، دحال لکچرار اردو کالج کراچی نے عرصہ گذرا مجھے لکھا تھا:

: میر عبد الرزاق ابن میر نجف علی المعروف بہ فوجدار خاں نے ۱۲۷۲ھ میں مطبع نقشبندی سے تفسیر رفیعی طبع کرائی تھی اس کی ابتدا میں میر عبد الرزاق رقم طراز ہیں کہ میرے والد ماجد حضرت شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ سے ترجمہ قرآن کریم پڑھا کرتے تھے اور ان کی اجازت سے ترجمہ شاہ صاحب

کو دکھایا۔ اس طرح شاہ صاحب کا ترجمہ قرآن مکمل کیا گیا اور
شائع کیا گیا۔
میر نجف علی نے شاہ رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے
سن سن کر سورۂ بقر کی تفسیر الگ قلمبند کی تھی۔ تفسیر میر
عبدالرزاق نے تفسیر رفیعی کے نام سے ۱۲۷۲ھ میں طبع
کرائی۔ اس کے حاشیے پر مولانا یعقوب چرخی کی تفسیر ہے۔
تفسیر رفیعی مطبوعہ مطبع نقشبندی انجمن ترقی اردو کراچی
کی لائبریری میں موجود ہے۔"

اس تصوّر سے میرے دل کی کلی کھل جاتی ہے کہ حضرت شاہ رفیع الدین کا ترجمہ قرآن پاک یعنی اردو کا پہلا ترجمہ میر نجف علی فوجدار خان نے جمع کیا تھا۔ میرا سرمایہ افتخار اسی نوع کی چیزیں ہیں۔

ہمارے خاندان کو حضرت شاہ رفیع الدین اور ان کے والد حضرت شاہ ولی اللہ کے خاندان سے کافی لگاؤ ہے۔ میرے تایا حافظ محمد ایوب اور میری پھوپی ہرمزی بیگم اس کٹہرے میں مدفون ہیں، جس کٹہرے میں شاہ ولی اللہ کے خاندان سے باہر اور کوئی آدمی دفن نہیں ہے۔ پھوپی ہرمزی بیگم کی قبر پر سیماب اکبرآبادی کا لکھا ہوا قطعہ کندہ ہے۔ میرے چچا حافظ محمد عمر کی قبر کٹہرے سے باہر ہے، مگر اس مسجد کے اندر ہے، جہاں شاہ صاحبان کا خاندان حشر تک کے لیے سو رہا ہے۔

شاہ صابر بخش صاحب کے خاندان کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ رہا کہ شاہ صابر بخش صاحب کے پوتے شاہ امیر حسین صاحب ہمارے خاندان کے بچوں اور بوڑھوں کو عید کے دن دو پیسے اور ایک آنہ عیدی دیا کرتے تھے۔ اور ہمارے بوڑھے ہم سے کہا کرتے تھے کہ ان پیسوں کو خرچ نہیں کرنا۔ میں نے شاہ امیر حسین صاحب سے عیدیاں لی ہیں۔ آج کل

شاہ صاحب کے سگّے پوتے میاں ناصر حسین درگاہ صابر بخش کے سجّادہ نشین ہیں۔

اس خاندان سے عقیدت فوجدار خانیوں کو ورثے میں ملی تھی۔ اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میر نجف علی، شاہ صابر بخش صاحب سے بیعت تھے۔ شاہ صاحب نے رحلت کے وقت اپنے فرزند شاہ محمد عبداللہ، یعنی شاہ امیر حسین کے والد کا ہاتھ میر نجف علی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ شاہ محمد عبداللہ اس وقت آٹھ نو برس کے تھے۔ مگر میر نجف علی اس وقت بھی پیر زادے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ شاہ محمد عبداللہ جب کھانا کھاتے لگتے، تو وہ تو مسند پر گاؤ تکیے سے پیٹھ لگائے تشریف فرما ہوتے تھے، اور میر نجف علی مسند کے کنارے پر دو زانو بیٹھتے تھے، اور صرف نگرانی کی جاتی تھی کہ ملازمین نے کھانا یا ناشتہ ٹھیک طرح پیش کیا یا نہیں۔ کھانے میں شرکت نہیں کی جاتی تھی، شرکت کرنا گستاخی سمجھا جاتا تھا۔

میرے دادا حافظ محمد الیاس صاحب نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کی تھیں۔ بیویوں کے مرنے پہ۔ پہلی بیوی کی اولاد میرے والد اور ان سے بڑے بھائی، حافظ محمد ایوب (جن کی قبر حضرت شاہ ولی اللہ کے کٹہرے میں ہے) اور ایک بڑے بھائی سے بھی بڑی بہن، امتہ القدیر بیگم اور ایک چھوٹی بہن حضرت بیگم (حافظ عبدالوہاب ابن میر عبدالرزاق کی اہلیہ)۔

دوسری بیوی کی اولاد ہمرمزی بیگم، حافظ محمد عمر اور انشاء اللہ بیگم۔ تیسری بیوی کی اولاد محمد سلیمان، صاحب زادی بیگم اور بشیر بیگم۔

بشیر بیگم حاجی عنایت حسین کی اہلیہ اول تھیں، جو محلہ پہاڑی بھوجلا میں رہتے تھے اور گھنٹے والے ان کے خاندان کا عرف تھا۔ بشیر بیگم لاولد اور صاحب زادی بیگم کنواری مر گئیں اور محمد سلیمان بھی لاولد مر گئے۔

انشاء اللہ بیگم کی شادی نواب سردھنہ (ضلع میرٹھ) کے بھتیجے آغا سید احمد شاہ

سے ہوئی تھی۔ حافظ محمد عمر کی پہلی شادی ڈپٹی اکبر علی کی بیٹی سے اور دوسری شادی مولوی عظمت اللہ ایڈوکیٹ کی پھوپی سے اور ہرمزی بیگم کی شادی میر سید حسین سے۔ میر سید حسین کے بڑے بھائی میر ببر علی، سر سید احمد خان (بانیِ علی گڑھ کالج) کے بڑے بھائی سید محمد خان کے داماد تھے۔ میر ببر علی کے بیٹے نواب سید محمد علی، آخری سکریٹری علی گڑھ کالج اور نواسے پروفیسر مرزا محمد سعید، پرنسپل رہتک کالج۔

پھوپی حضرت بیگم اور تایا حافظ محمد ایوب کنبے ہی میں بیاہے گئے۔ پھوپی امۃ القدیر بیگم دلّی کے نامور وکیل میر مشتاق علی کی بہو تھیں اور میری والدہ حافظ حکیم فیاض علی کی بیٹی تھیں۔ حکیم فیاض علی کا مطب دلّی میں نہ چمکا تو وہ بھاگلپور (صوبہ بہار) چلے گئے تھے۔ وہاں انھوں نے کامیابی حاصل کی۔

میرے والد محکمۂ نہر میں اسسٹنٹ انجینیر تھے۔ تایا حافظ محمد ایوب ڈپٹی مجسٹریٹ نہر، اور چچا حافظ محمد عمر ضلعدار نہر، چھوٹے چچا محمد سلیمان پوسٹ مین تھے۔ انھوں نے پڑھ کر چھوڑ دیا تھا اور پڑھا میرے والد اور تایا نے بھی کونسا تھا دونوں اپنے والد سے پوشیدہ چھٹی ساتوین تک پہنچ گئے تھے۔ اور چچا محمد عمر کو بھائیوں کی زبردستی سے پڑھوایا گیا تھا۔ وہ بھی مڈل سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ذرا ذرا سی تعلیم اس زمانے میں اچھی اچھی سرکاری نوکریاں دلوا دیتی تھی۔ چچا محمد عمر کو تو نواب سردھنہ نے چھوٹتے ہی ضلعدار کرا دیا تھا۔ اور رحلت کے وقت وہ ڈپٹی مجسٹریٹ ہونے والے تھے۔ ان کا انتقال پینتیس چھتیس سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ میرے والد اور تایا نے سب اوور سیری اور سے بتدریج ترقی کی تھی۔ مگر اس زمانے کی نراجی تعلیم خدا معلوم کیسی ہوتی تھی؟ ۱۸۹۸ء میں ایک بی۔ اے پاس (مسٹر مظہر علیم فریدآبادی) اپنی انگریزی درست کرانے میرے والد کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔

میرے ماموں تین تھے، دو حقیقی نانی سے اور ایک سوتیلی نانی سے۔ میرے نانا نے

بھاگلپور میں ایک اور شادی کرلی تھی۔ میرے سگے ماموؤں کے نام یاں بھائیا سید مفوض علی اور سید ضمانت علی۔ سوتیلے ماموں کا نام میں بھول گیا۔ انھیں کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

سید مفوض علی بے بیاہے مرگئے تھے۔ سید ضمانت علی کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا ہے۔ وہ محکمہ ریل میں ہیڈ ڈرافٹسمین تھے۔ خالائیں میری تین تھیں۔ بڑی خالہ مگر میری میری والدہ سے چھوٹی نور جہاں بیگم، منجھلی خالہ، حاجی بیگم، چھوٹی خالہ سلطان جہاں بیگم۔ سید ضمانت ماموں کی بیوی سید تھیں اور سب خالاؤں کے شوہر سید۔ اس زمانے میں سید صاحبان بیٹیاں تو مغل یا پٹھان کی لے کر تے تھے، لیکن اپنی بیٹیاں غیر سید کو نہیں دیتے تھے۔ میری بڑی خالہ کا رشتہ پچاسی برس قبل کے آٹھ سو روپے ماہوار کے تنخواہ دار سے نہیں کیا گیا تھا کیوں کہ وہ سید نہیں تھے اور ایک سید سے کر دیا جو دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور جن کے مستقبل کے متعلق اطمینان نہیں تھا کہ کیا بنیں گے۔ مگر پھر یہ اکڑ جاتی رہی۔ دلی کے مشہور و ممتاز رئیس نواب فیض احمد خان کے ماموں کی شادی میری بڑی خالہ کی سسرال میں ہوئی، وہ پٹھان تھے۔ نواب فیض احمد نواب زادہ، لیاقت علی خان وزیر اعظم اوّل پاکستان کے چچا تھے۔ (لیاقت علی کے والد کے سگے چچا زاد بھائی)

میری بڑی خالہ کے خسر دیوبند کے مدرسے میں مدرّس تھے۔ حکیم عبدالوہاب المعروف بہ حکیم نابینا نے علم دین ان سے پڑھا تھا۔

میری دادی پٹھانی تھیں۔ قاری سرفراز حسین کی والدہ اور مولوی امیر حمزہ کی والدہ میری دادی کی بھتیجیاں تھیں۔ مگر عمر میں برابر تھا اور قاری سرفراز حسین اور مولوی امیر حمزہ میرے والد سے بہت چھوٹے نہیں تھے۔

خواجہ فضل احمد خان اور خواجہ محمد احمد خان کی والدہ میری دادی کی ماموں زاد بہن تھی۔

قاری سرفراز حسین کے دو بیٹے ہیں۔ قاری عباس حسین اور قاری اخلاق حسین اور مولوی امیر حمزہ کے بھی دو بیٹے ہیں۔ مولوی محمد ناصر جلالی* اور مولوی محمد حامد جلالی۔ خواجہ فضل احمد خان کے بیٹے کا نام ظہیر احمد ہے۔ اور خواجہ محمد احمد کے بیٹوں کے نام ہیں:

۱۔ محمود احمد خان

۲۔ جلیل احمد خان، اور

۳۔ انیس احمد خان۔

خواجہ محمد احمد خان کے بڑے بیٹے محمود احمد خان، حکیم جمیل خان (فرزند ارجمند مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان) کے داماد ہیں اور آج کل مغربی پاکستان کے الیکشن کمشنر ہیں۔ اور خواجہ محمد احمد خان کی بڑی بیٹی نفیس بیگم، علامہ راشد الخیری کی بہو ہیں، مسٹر صادق الخیری کی بیوی۔

میری بڑی خالہ نور جہان بیگم، دو برس کی بیاہی بیوہ ہو گئیں تھیں۔ انھوں نے عقد ثانی نہیں کیا تھا۔ ایک بیٹے پر زندگی نثار کر دی۔ طویل عمر پا کر ۱۹۵۷ء میں اللہ کے پاس گئی ہیں، اور ان کے بیٹے خان صاحب سید محمد ادریس (ریلوے انجینیر) تھے، ۱۹۶۰ء میں انتقال کیا ہے۔ محمد ادریس صاحب مجھ سے تین برس بڑے تھے۔ دوسری خالہ حاجی بیگم اور تیسری خالہ سلطان جہان بیگم نے بڑی خالہ کے بعد رحلت کی۔ حاجی بیگم کے بیٹے سید معین الدین مرحوم، (آرکی ٹکٹ) تھے اور سلطان جہان بیگم کے بیٹے سید منور رضا اور سید دبیر رضا لاہور میں ہیں۔ دبیر رضا کا اچھا کاروبار ہے۔ منور رضا ڈاک خانے میں ملازم ہیں۔ ماموں سید ضمانت علی کے بیٹے سید بشارت علی کراچی کی کسی فرم میں اچھے عہدے پر ہیں۔

بڑی پھوپی امتہ القدیر بیگم بھی دو برس کی بیاہی بیوہ ہوئی تھیں۔ انھوں

---

* قاری عباس حسین اور مولانا ناصر جلالی کا انتقال ہو گیا۔

نے بھی عقد ثانی نہیں کیا تھا، اور ایک بیٹے پر زندگی نثار کر دی تھی۔ ان کے بیٹے سید ابوالحسن، میری ددھیال میں سب سے زیادہ دولت مند تھے مگر آخر وقت بالکل بے زر رہ گئے تھے۔

تایا حافظ سید محمد ایوب کے ہاں بیٹا نہیں ہوا۔ ایک بیٹی ہیں جہاں آرا بیگم جہاں آرا، صاحبِ اولاد ہیں اور خوشحال۔ پھوپی حضرت بیگم کے بیٹے سید عبدالسلام (سب ڈیویزنل افسر محکمۂ نہر) تھے۔ سید عبدالسلام کے بیٹے سید محمد اور سید احمد اور سید حبیب احمد ہیں۔ سید حبیب احمد اقوام متحدہ (یو این) کے محکمۂ حساب میں اونچے عہدیدار ہیں۔ حبیب احمد سے میری بھانجی امۃ الحفیظ بیگم منسوب تھیں۔

پھوپی ہرمزی بیگم کی یادگار صرف میری دو لڑکیاں، ناہدہ خاتون اور رابعہ خاتون ہیں، اور ان کی اولاد ہے۔ میری پہلی بیوی محمودہ بیگم پھوپی ہرمزی بیگم کی بیٹی تھیں۔ ناہدہ خاتون کے شوہر کا نام قیس رامپوری ہے، جن سے بحیثیت ناول نویس لوگ خوب شناسا ہیں۔ رابعہ خاتون کے شوہر کا نام حمید شاہ خان ہے۔ یہ شمس العلماء خان بہادر منشی ذکاء اللہ کی حقیقی بھتیجی کے بیٹے ہیں۔ چچا سید محمد عمر کی یادگار مسٹر غیاث الدین صدیقی چیف انجینئر کی اولاد ہے۔ چچا سید محمد عمر کے فرزندِ اکبر سید منظور احمد کا نام و نشان مٹ گیا۔ فرزندِ اصغر سید مسعود احمد کی بیٹی، رقیہ بیگم، مسٹر غیاث الدین سے منسوب تھیں۔ رقیہ بھی اللہ کو پیاری ہو چکیں۔

پھوپی انشاء اللہ بیگم کے بیٹے آغا سید حبیب شاہ سردھنہ، ضلع میرٹھ میں ہیں اور بیٹی مہ رخ سلطان بیگم خاص میرٹھ میں۔ دونوں صاحبِ اولاد ہیں اور خوشحال ہیں۔ چچا محمد سلیمان، پھوپی صاحب نادی بیگم اور پھوپی بشیر بیگم، تینوں لاولد رہیں۔

میرے والد اپنے بھائی بہنوں میں تیسرے نمبر پر تھے۔ تایا ایک امۃ القدیر

بیگم، نمبر دو حافظ سید محمد ایوب، نمبر تین سید محمد مصطفےٰ۔

سید محمد مصطفےٰ کے ہاں تین لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ سب سے بڑے سید محمد اقبال (ولادت: ۱۸۷۶ء وفات: ۱۸۷۸ء) ان کے بعد راقم الحروف محمد ارتضےٰ واحدی۔ میرے بعد گوہر آرا بیگم (انھیں اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں بلا لیا تھا)۔ ان کے بعد گیتی آرا بیگم، یہ خان صاحب سید احمد (ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس اجمیر شریف) سے بیاہی گئیں۔ گیتی آرا بیگم کے بعد سید محمد مرتضےٰ (یہ خاندان میں واحد حاجی تھے اور ایکسپورٹ امپورٹ کا کام کرتے تھے) سب کا انتقال ہوگیا۔ بھائی بہنوں میں فقط میں بقیدِ حیات ہوں۔

گیتی آرا بیگم کے بچوں کے نام یہ ہیں: (۱) سید احمد حسین (لاہور میں پی۔ آئی۔ اے کے منیجر ہیں)، (۲) امۃ الحفیظ بیگم (جن کے شوہر سید حبیب احمد اقوامِ متحدہ میں افسرِ حساب ہیں)، (۳) سید فرید احمد (آسٹریا میں کسی اچھے عہدے پر ہیں)، (۴) محمدی بیگم (اپنے شوہر سید یوسف علی سابق جاگیردار کے ساتھ اجمیر میں ہیں)، (۵) سید صغیر احمد کراچی کی کسی فرم میں ملازم ہیں)، (۶) امۃ نصیر بیگم (ان کے شوہر سید نور الحسن برماشیل میں انجینئر ہیں)، (۷) سید شبیر احمد (لائلپور کاٹن مل میں ملازم ہیں)، (۸) سید حبیب احمد (فوج میں میجر ہیں)، (۹) سید مسعود احمد (یہ بھی فوج میں میجر ہیں) اور دونوں کرنل ہوگئے)، (۱۰) سید ممتاز احمد (پی۔ آئی۔ اے میں ملازم ہیں)

سید محمد مرتضےٰ کے بچوں کے نام یہ ہیں: (۱) آمنہ خاتون۔ ہمارے خاندان کی لڑکیوں میں سب سے پہلے انھوں نے بی۔ اے پاس کیا، لیکن نیاپن ان میں بالکل نہیں ہے۔ اپنی نانی دادی کی سی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کے شوہر سید دبیر علی چشتی بی۔ اے کراچی کے دفترِ خزانہ میں ملازم ہیں۔

(۴) سید محمد اعلیٰ ؛ (۴) سید نور الہدیٰ ؛ (۴) سید عبد الدجیٰ ؛ (۵) سید صفدر العلیٰ۔

محمد اعلیٰ کی ملازمت بیس سال سے اوپر ہو چکی ہے۔ آمنہ خاتون کے بڑے بیٹے سید اوصاف علی کو مضمون نویسی کا شوق ہے۔ صحافت کی لائن اختیار کرنی چاہتے ہیں۔

میرے بچوں کے نام یہ ہیں:۔ پہلی بیوی محمودہ بیگم سے۔ زاہدہ خاتون اور رابعہ خاتون۔ موجودہ بیوی منظور فاطمہ سے۔ (۱) سید احمد مجتبےٰ واحدی ؛ (۲) سید علی مقتدیٰ واحدی ؛ (۳) شاکرہ خاتون ؛ (۴) حامدہ خاتون ؛ (۵) ساجدہ خاتون ؛ (۶) عابدہ واحدی ؛ (۷) سید موسیٰ رضا واحدی ؛ (۸) صالحہ واحدی ؛ (۹) نسیمہ واحدی ؛ (۱۰) سعیدہ واحدی ؛ (۱۱) سید عیسےٰ رضا واحدی ؛ ماشاء اللہ ہم تینوں بہن بھائی کثیر الاولاد ہیں۔ حافظ سید محمد الیاس کے ایک بیٹے، سید محمد مصطفےٰ کی نسل نے دوسرے بیٹوں اور بیٹیوں کی کسر پوری کر دی ہے۔

الحمد للہ ہمیں (تینوں بہن بھائیوں کو) کثیر الاولاد ہونے کی وجہ سے تکلیف نہیں رہی۔ میرے لیے تو کثرتِ اولاد اللہ تعالےٰ کی رحمت ہے۔ میری بہن کیفی آرا بیگم کا انتقال ہو چکا ہے۔ میرے بہنوئی خان صاحب سید احمد پنشن پاتے ہیں، اور اولاد کے قطعی محتاج نہیں ہیں۔ میرے چھوٹے بھائی سید محمد مرتضےٰ کا بزنس تھا، وہ بچوں سے کیا لیتے۔ بچوں کو کچھ دے دیتے تھے۔ میری مالی حالت، البتہ کراچی آکر وہ نہیں رہی جو دلی میں تھی۔ میری موجودہ بیوی منظور فاطمہ کے بڑے بچوں نے چھوٹے بھائی بہن کو سنبھالا اور مجھے مجبور نہیں کیا کہ میں بھی باوجود ضعیفی کے پھر نہ پھر کماؤں میری ساکھ کو بگڑنے نہیں دیا۔ آج اللہ تعالیٰ کے فضل سے قریب قریب سب اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ سب پیسے سے زیادہ بھائی بہن سے محبت کرتے

بلکہ پیسے کے معاملے میں مغائرت نہیں برتتے۔ کچھ ادا کرتے مل کر گھر کا بھرم بنا رکھا ہے۔ ایک دو بچے ہوتے تو شاید وہ ایسا بھرم بنا سکتے۔
بھائی بہن کو سنبھالنے کا نمونہ پیش کرنے کی ابتدا سید مجتبیٰ واحدی نے کی تھی۔

احمد مجتبیٰ دلی سے ملازمت کرتے آئے تھے۔ اب مرکزی وزارت پاکستان میں سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ سید علی مقتدیٰ واحدی وہاں ایم۔ اے میں پڑھ رہے تھے کراچی پہنچ کر انھوں نے بھی ملازمت کرلی، اور پرائیویٹ طور پر ال، ال، بی کا امتحان دیا۔ الحمد للہ پاس ہوگئے اور آج کل بفضلہ تعالیٰ مرکزی وزارت صنعت میں سکشن افسر ہیں۔ علی مقتدیٰ کا سلوک بھی بھائی بہن کے ساتھ احمد مجتبیٰ جیسا رہا۔ شاکرہ خاتون کی شادی مسٹر محمد شریف خان بی۔ اے سے ہوئی ہے۔ شریف خاں پہلے مرکزی وزارت خزانہ میں سکشن افسر تھے۔ اب اکسپورٹ پروموشن میں ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ حامدہ خاتون کی شادی مسٹر مرتضیٰ احسن ایم۔ اے سے ہوئی ہے۔ مرتضیٰ حسن پاکستان کیبلز لمیٹڈ میں افسر ہیں۔ حامدہ خود بھی بی اے۔ بی، ٹی ہیں اور گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں ریاضی پڑھاتی ہیں۔ ساجدہ خاتون ایم۔ اے ہیں اور زنانہ کالج میں لکچرار ہیں۔ ساجدہ کے شوہر مسٹر عامر ایم کام سینٹ پیٹرک کالج میں پروفیسر ہیں۔ عابدہ بی، اے، بی، ٹی ہیں اور گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں مدرس سائنس ہیں۔ عابدہ کی بھی شادی ہو گئی۔ عابدہ کے شوہر مسٹر شاکر الدین۔ بی، اے اس فرم میں ملازم ہیں جو ڈالڈا گھی وغیرہ چیزیں تیار کرتی ہے۔ سید موسیٰ رضا واحدی آئل اینڈ گیس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن میں اسسٹنٹ انجینیر ہیں۔ صالحہ واحدی بی۔ اے کا امتحان دینے والی ہیں (صالحہ نے بی۔ اے پاس کرلیا) نسیمہ واحدی بی۔ اے کر چکی ہیں اور بی ٹی کرنا چاہتی ہیں۔ سعیدہ واحدی ایف۔ اے میں ہیں (سعیدہ بی۔ اے

ہو گئیں) اور میرے بیٹے رضا واحدی نے پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ سے فراغت پائی ہے۔ ڈپلوما لے لیا ہے۔

ساجدہ، عابدہ اور موسیٰ رضا نے بھی بڑے بھائیوں تقلید کی ہے۔ ان کی تنخواہیں صالحہ، نسیمہ، سنجیدہ اور بیٹے رضا کے لیے وقف ہیں۔ عابدہ بھی شادی سے پہلے مدد کرتی رہیں۔ بیٹے رضا پڑھتے بھی رہے اور واحدی منجھی کے بنوانے اور بکوانے کا بھی انتظام کرتے رہے۔

میرے دادا حافظ سیّد محمد الیاس صاحب کے دو حقیقی بھائی اور تھے۔ ایک بھائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دلّی سے نکلے، تو پھر دلّی نہیں پلٹے۔ کسی گاؤں میں رہ پڑے۔ وہیں انھوں نے عقد کر لیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اورنگ زیب عالمگیر کی بعض پوتیاں اور نواسیاں گنواروں کے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں، اور دلّی کے متعدد شرفا نے گنوار عورتوں سے گھر بسا لیے تھے۔ میرے دادا کے بھائی کے گنوار پوتے گنوارو لباس پہنے ۱۹۰۸ء تک پھوپی امۃ القدیر کے پاس کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔ میں نوجوان تھا۔ انھیں خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اور اپنے تہذیب کے انگرکھے اور دو پلّی ٹوپی پر نازاں تھا۔ کاش، آج ان سے ملاقات ہو جائے، تو گاڑھے کے گنوارو اور میلے کپڑوں کو چوم لوں۔ میرے ہمسن تھے۔ ممکن ہے، جیتے ہوں۔

میرے دادا کے دوسرے بھائی کے پڑپوتے سیّد محمد احمد عرف بادشاہ کراچی میں کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن میں میٹروں کے انچارج ہیں۔ دادا صاحب کے متعلق روایت ہے کہ ۱۸۵۷ء میں بھگدڑ مچی، تو سارا کوچہ چیلان خالی ہو گیا۔ کوچہ چیلان وہ محلہ ہے، جہاں کی بیگمات نے آبرو بچانے کی خاطر کنوؤں میں گر گر کر جانیں دی تھیں۔ میرے دادا نے میرے تایا اور میرے والد کو میری بڑی پھوپی کے سپرد کر دیا، جو سسرال والوں کے ساتھ روانہ ہو رہی تھیں۔ مگر میرے دادا کی بوڑھی والدہ مرض اسہال میں مبتلا تھیں، وہ انھیں لے

کرم چیاں میں کافی دن تنہا رُکے رہے۔ اور مجبور ہو کر چلے تو ماں کو کمرے
باندھ کر چلے۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ محمد الیاس کی اولاد کے پھلنے پھولنے کا سبب
ماں کی خدمت ہے۔ اللہ تعالے نے بیٹے ماں کو کمرے باندھ کر چلنا پسند فرمالیا۔
حافظ محمد الیاس کی اولاد میں اب تک کوئی بھوکا نہیں رہا سوائے پھوپی
امۃ القدیر کے بیٹے، سید ابوالحسن کے۔ ان سے بڑھ کر میری ددھیال میں
کسی نے روپیہ نہیں کمایا۔ مگر بڑھاپے میں نہایت مفلس ہو گئے تھے۔ ان کا
قصہ عبرتناک ہے۔ ٹھیکے لیتے تھے۔ ہزاروں روپیہ ماہانہ آمدنی تھی۔ ستر اسی
برس پہلے کے ہزاروں کی آمدنی۔ شہر میں جگہ جگہ جائدادیں تھیں۔ جامع مسجد
کے قریب محلہ گڑھیا تمام کا تمام ان کی ملکیت تھا۔ ایک بیٹی تھیں، فخر جہاں بیگم۔
میر شریف حسین، مالک حسین بخش کمپنی (شملہ) کے اکلوتے بیٹے میر الطاف حسین
سے ان بیٹی کی شادی کی۔ مسلمانوں میں اس شان کی شادی میں نے عمر بھر
نہیں دیکھی۔ میں شادی کے وقت آٹھ برس کا تھا۔ فخر جہاں بیگم عجیب بھاگوان
عورت تھیں۔ باپ کے گھر رہیں، تو وہاں ہن برسا۔ سسرال گئیں، تو سسرال
کو نہال کر دیا۔ اور باپ زوال میں آ گئے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ آخر آنے ماہوار
کرایے کی کوٹھری میں انتقال ہوا۔ میں انھیں اپنے دفتر میں ملازمت دینے کی
جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کا دفتر بھی اتفاق سے میرے
مکان میں تھا۔ خواجہ صاحب نے برائے نام کام پر لگا لیا تھا۔ بھائی ابوالحسن
فرمایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں دولت میرے پیچھے پیچھے پھرتی تھی۔ آج میں
پیسوں کے پیچھے دوڑتا ہوں، لیکن وہ میرے ہاتھ نہیں آتے۔ اس طرح آگے
نکل جاتے ہیں، جس طرح میرا سایہ مجھ سے آگے نکل جاتا ہے۔ فخر جہاں بیگم
باپ کے سامنے مر گئی تھیں۔ ان کے مرتے ہی حسین بخش کمپنی بھی آہستہ آہستہ
گھلتی چلی گئی۔

بہرحال سید ابوالحسن تو مستغنی قسم کے شخص تھے۔ اور کسی نے حافظ محمد الیاس

کی اولاد میں تا ایں دم افلاس کا منہ نہیں دیکھا۔ ہم لوگ اوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ افلاس اور امیری دونوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔" ہم لوگ" کا لفظ شاید غلط استعمال کر گیا، کم از کم میں اوسط طبقے ہی میں رہنا چاہتا ہوں اور اپنی اولاد کے لیے بھی دست بدعا ہوں کہ ان سب کو بھی اوسط طبقے میں رہنے کی قدر کا احساس ہو جائے۔

ہم آلِ رسول ہیں۔ ہمارا شرف فقر میں ہے، امارت میں نہیں ہے۔ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے خلافت سے دست بردار ہو کر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ نبوت اور خلافت دونوں چیزیں ہمارے خاندان میں جمع نہیں رہ سکتیں۔ یعنی نبوت کا ابر تو اور سایہ تو رہیگا، امارت اور اقتدار ہمیں حاصل نہیں ہوگا۔ دونوں نعمتیں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی تھیں۔ لیکن حضور فقر کی زندگی گزارتے تھے اور فرمایا کرتے تھے "الفقر فخری" مجھے اپنے فقر پر فخر ہے، اور دعا مانگا کرتے تھے کہ الٰہی! زندگی غریبوں کی سی گذرے اور موت غریبوں جیسی آئے اور میرا حشر غریبوں کے ساتھ کیا جائے۔ (قال او کما قال) میری تمنا ہے کہ اس بات کو میرے بیٹے اور میری بیٹیاں کم از کم میرے برابر ہی سمجھ لیں۔ آلِ رسولؐ اور اولادِ بتول کو چھوٹی سی ایک آدھ جگہ کے سوا چودہ سو برس میں کبھی اور کہیں اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ ہندوستان کا ایک حکمراں خاندان سیّد کہلاتا ہے، مگر مؤرخین نے اس خاندان کی سیادت تسلیم نہیں کی۔ اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ خضر خان کو کسی بزرگ درویش نے سیّدی کے لفظ سے مخاطب کر لیا تھا، سیّدی یعنی میرے سردار۔ یوں خضر خان سیّد مشہور ہو گیا، ورنہ وہ سیّد نہیں تھا۔ علیٰ ہذا مصر کے فاطمی بادشاہ بھی تحقیق کی کسوٹی پر سچے نہیں اترتے۔ حضرت امام حسن کی بات اور پیشین گوئی

فقر سے مراد بھیک مانگنا نہیں ہے۔ بھیک مانگنا، صدقہ اور زکوٰۃ لینا تک آلِ رسولؐ کے لیے منع ہے۔ یہ وہ فقر ہے جس کے سامنے بادشاہ سرنگوں ہے۔

ہی صحیح ہے۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں اپنے خاندان والوں کو امارت اور اقتدار کے قریب اور مستقل طور سے قریب نہیں جانے دیا تھا۔ لیکن حضور کا ارشاد ہے کہ میں تم میں قرآن مجید اور اپنی آل چھوڑتا ہوں۔ کیا اتنا شرف ہمارے واسطے کافی نہیں ہے؟

میری پیدائش اور میرا بچپن

میں ۱۷ ماہ رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۷ مئی ۱۸۸۸ عیسوی کو جمعہ کے دن، صبح صادق کے وقت، بھائی میر سلطان علی والے مکان واقع کوچہ چیلان، گلی مسجد کالے خان میں پیدا ہوا تھا۔ یہ مکان ۱۳۰۵ ہجری تک میرے والد کا تھا۔ پھر والد ماجد نے اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے میر سلطان علی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ گلی مسجد کالے خان کے کل مکان فوجدار خانیوں کے تھے۔ صرف ایک کٹھڑا حافظ غیاث الدین کی ملکیت تھا، جس میں چمار بستے تھے۔ ان چماروں سے ہمارا آپسداری کا سا معاملہ تھا۔ وہ ہمارے کام آتے تھے، ہم ان کے کام آتے تھے۔ کل مکانوں کو بیچ میں دروازے اور کھڑکیاں پھوڑ پھوڑ کر ایک دوسرے سے ملا رکھا تھا۔ گلی مسجد کالے خان کے باہر بھی بائیں جانب سڑک پر دور تک فوجدار خانیوں ہی کی جائیدادیں تھیں۔ کھڑکیاں اور دروازے ان تک بھی پہنچتے تھے۔ گلی مسجد کالے خان کے سامنے بھائی سید ابو الحسن کا عظیم الشان مکان تھا، اور وہ مکان، جسے والد ماجد نے میری پیدائش کے بعد تعمیر کرایا تھا، اور میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو اس میں دیکھا، اور پچاس سال مسلسل اس میں رہا، اور اسی سے ۱۹۴۷ء میں کراچی منتقل ہوا، یہ بھی محلے کا بڑا مکان تھا، مگر بھائی سید ابو الحسن کے مکان کے برابر بڑا نہیں تھا۔

۱۸۷۶ء میں میرے والدین کے ہاں سیّد محمد اقبال پیدا ہوئے تھے ۱۸۷۶ء

میں اللہ نے انھیں واپس بلا لیا اور بارہ برس میرے والدین اولاد کو ترستے رہے، حتے کہ انھیں ایک لڑکی کو بیٹے کی طرح پالنا پڑا۔ یہ دوسرا اولاد سے گھبرانے کا نہیں تھا، اولاد کی قدر کا تھا۔ دعائیں دی جاتی تھیں کہ دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، اولاد کے کھٹرے بسیں۔ بارہ برس تعویز گنڈوں میں کٹے۔ سنا ہے پھوپی حضرت بیگم کے شوہر پیر جی حافظ سید عبدالوہاب رات کے بارہ بجے جمنا میں جا کھڑے ہوتے تھے اور ختم پڑھتے تھے۔ آخر ایک روز میرے والد کے پیر و مرشد حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کی کہ یا اللہ محمد مصطفٰے کو بیٹا عنایت کر۔ اللہ تعالےٰ نے اسی سال مجھے دنیا میں بھیج دیا۔

چونکہ مجھے بہت ترسا کر بھیجا تھا، میری پیدائش پر غیر معمولی خوشیاں منائی گئیں۔ ناز و نعم کے ساتھ پرورش ہوئی۔ تعلیم کے لیے روپیہ جمع کیا جانے لگا۔ ماں باپ اپنے اوپر خرچ نہ کرتے تھے، مجھ پر خوب خرچ کرتے تھے۔ والد ماجد کرشن ملز اور دلّی کلاتھ ملز کے حصے خرید تے رہتے تھے۔ تاکہ میری تعلیم میں کبھی رکاوٹ نہ پیدا ہو۔

چمڑے کا سوٹ کیس اور ہولڈال تو بڑی چیزیں ہیں، والد ماجد دلّی سے باہر جاتے تھے یا باہر سے دلّی تشریف لاتے تھے تو کپڑوں کے لیے ٹاٹ کا بیگ ہوتا تھا اور بستر سُتلی سے باندھا جاتا تھا۔ اور گھر سے اسٹیشن اور اسٹیشن سے گھر بغل میں بستر دبائے اور ہاتھ میں کپڑوں کا تھیلا لٹکائے چلے جاتے تھے، اور چلے آتے تھے۔ سواری اور قلی کا لینا ان کے نزدیک بیماری کی علامت تھی۔

والد ماجد کا سنہ پیدائش ۱۸۵۰ء تھا۔ انتقال ۳۱ دسمبر ۱۹۰۱ء کو بحالت سلامتی ہوا۔ پچپن (۵۵) سال سے عمر کم تھی۔ لیکن بہر حال بڑھاپے کا آغاز تھا۔ اس بڑھاپے میں درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ

پیدل آتے جاتے تھے۔ کوچہ چیلان سے درگاہ سلطان جی کا فاصلہ ساڑھے تین میل ہے۔ ایک دو مرتبہ درگاہ حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ بھی پیدل آئے گئے۔ اس درگاہ کا فاصلہ کوچہ چیلان سے گیارہ میل ہے۔ میں نے والد ماجد کو عیدین کے سوا گھوڑا گاڑی میں سوار نہیں دیکھا۔ عیدگاہ کوچہ چیلان سے اتنی بعید تھی کہ وہ تو نماز پڑھنے شاید وہاں بھی پیدل ہی پہنچ جاتے، لیکن میں نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے نماز عید پڑھانے گھوڑا گاڑی میں لے جاتے تھے۔

میرے ابتدائی نو دس سال دلی میں نہیں گذرے۔ اٹاوہ اور کانپور (یو۔پی) کے دیہاتوں اور جنگلوں میں گزرے۔ ڈوڑہ، بکھاکا، بدرھنو، پپھو ندا وغیرہ نام مجھے یاد ہیں۔ چند دن پلول ضلع گوڑگانوہ میں بھی قیام کیا۔ آخری قیام پلول ہی کا تھا۔ دیہاتوں اور جنگلوں میں رہنے کے وقت بھی دلی کے پھیرے لگائے جاتے تھے۔ پھیروں کے بس دو واقعے یاد ہیں۔ ایک دفعہ (غالباً ۱۸۹۴ء میں) میں لیسدار ٹوپی اور ریشمی اچکن[1] اور کانپوری شوز[2] پہنے کسی دیہاتی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹرین سے اتر کر ٹہل رہا تھا

[1] شیروانی نہیں۔ اچکن۔ شیروانی ابھی عام نہیں ہوئی تھی۔ اچکن، شیروانی اور انگرکھے کے درمیان کا لباس تھا۔ اچکن میں انگرکھے کی طرح کمر بیٹھی ہوتی تھی۔ اچکن کو پیٹی نکال کر اور ذرا سی تراش بدل کر شیروانی بنا دیا گیا ہے۔ اچکن چست رہتی تھی۔ شیروانی تر رکھی جاتی ہے۔

[2] کلکتے کے انگریزی جوتے اس زمانے میں مقبول تھے۔ ان کے بعد کانپور کے انگریزی جوتے پسند کیے جاتے تھے۔ دلی میں کامدار سلیم شاہی جوتیوں کا رواج تھا۔ دلی میں سادی جوتیاں بھی بے مثل بنتی تھیں، خوشنما، ہلکی اور مضبوط۔ لیکن انگریزی جوتے دلی کے اچھے نہیں ہوتے تھے۔ ڈاسن فرم ولایت کے تیار کردہ جوتوں کا رواج بھی کم تھا۔ میں نے ڈاسن کا جوتا دلی آکر

پھر گھروالیوں نے جو ٹرین کے اندر بیٹھی تھیں آپس میں کہا اری اس چھوکرے کو دیکھو، کتنا اتراوے ہے۔ اور میں فوراً سہما کا اعلیٰ اپنے درجہ میں جا کھڑا ہوگیا اور مجھے محسوس ہوا کہ میری چال میں واقعی کوئی خرابی تھی۔ والدہ نے بھی نصیحت فرمائی کہ ہاں اترا کر اور اینٹھ کر نہیں چلنا چاہیے۔ دوسری دفعہ (غالباً ۱۸۹۵ء میں) ہم پلول سے اونٹ گاڑی میں آرہے تھے جب دلّی دروازے سے دلّی میں داخل ہوئے اور دریا گنج رفیعی بازار پہنچے تو سامنے غلاظت کی گاڑی (کراچی) دکھائی دی جس کا مہتر ڈنڈا لیے بہلوان سے۔ اللہ کا بھی یہی حکم ہے، ولا تمش فی الارض مرحا۔ انک لن تخرق الارض و لن تبلغ الجبال طولاہ زمین پر (اترا کر اور) اینٹھ کر مت چلو۔ تم زمین پر زور زور سے قدم مار کے، زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ اور نہ گردن کی رگیں کھینچ کے پہاڑ کی اونچائی تک پہنچ سکتے ہو۔ (سورہ ۱۷ آیت ۳۷)

(صفحہ ۴۰ سے آگے) سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں پہنا۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک کالی پوسے کے جوتے یا دلّی کی کامدار سلیم شاہی جوتیاں پہنتا رہا۔ کالی پوسے کے جوتے ڈھائی تین روپے میں مل جاتے تھے، اور دلّی کی کامدار سلیم شاہی کام جوتیاں بھی ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھیں۔ ڈاسن کا پہلا جوتا بارہ روپے میں خریدا تھا۔ یہ وہی ڈاسن ہے جس کا نام حضرت اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر میں آیا ہے:

جوتا ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا
میرا مضموں رہ گیا، ڈاسن کا جوتا چل گیا

حضرت اکبر نے "جوتا چل گیا" کے محاورے کو باندھا ہے اور اہل قلم کی زبوں حالی کا ذکر کیا ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے پہلے یہ حال نہیں تھا۔ مسلمان بادشاہ جوتا کاری کو بھی روکتے تھے اور اہل قلم کی بھی قدر کرتے تھے۔

کی طرح موٹا تھا۔ وہ گاڑی چلاتا جاتا اور گاتا جاتا تھا۔ اس کی آواز سریلی تھی۔ مجھے بھلی لگی، اور آج تک میرے کانوں میں گونجتی ہے۔ مہتر سری کرشن جی سے خطاب کر رہا تھا، اور کرشن مراری ہا کرشن مراری کہہ رہا تھا۔ میرے دل پر کرشن مراری کا نقش سا جم گیا۔ حالانکہ میں مطلق نہیں جانتا تھا کہ کرشن مراری کون ہیں[۱]۔

میری بڑی بہن کا نام روشن آرا بیگم تھا۔ روشن آرا بیگم اگرچہ متبنّیٰ تھیں، مگر میرے والدین کہا کرتے تھے کہ شاہ فضل الرحمٰن صاحب کی دعا اور روشن آرا کے قدموں کی برکت سے اللہ تعالےٰ نے بیٹا عنایت فرمایا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو ایک بہن اور موجود تھیں۔ گوہر آرا بیگم۔

ان میں اور روشن آرا بیگم میں فوقیت تھی، تو روشن آرا بیگم کو تھی۔ گوہر آرا بیگم تین چار برس کی ہو کر مر گئیں۔ ان کا مرنا یاد ہے[۲]۔ یہ یاد نہیں کہاں مری تھیں۔

۱۔ آواز کا جادو بڑا موثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو توفیق دے کہ وہ مؤذن اور پیش امام ہمیشہ خوش آواز رکھیں۔ بدآواز سے اذان دلوانا یا نماز میں قرأت کرانا بعض اوقات غضب ڈھا دیتا ہے۔ مولانا رومی اپنی مثنوی میں لکھتے ہیں کہ کوئی بدآواز شخص اذان دینے کا شوقین تھا۔ محلے والوں نے چندہ جمع کیا اور کہا: یہ روپیہ لے اور حج کرنے چلا جا۔ کچھ عرصے تو تیری آواز سے ہم محفوظ رہیں۔ وہ حاجیوں کے قافلے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ لیکن راستے میں بھی اذان کا شغل جاری تھا۔ ایک دن کچھ لوگ مٹھائی اور پھلوں کے خوان سروں پر اٹھائے اس کے پاس آ گئے اور بولے: ہمارے یہودی آقا کی بیٹی اسلام کی طرف مائل تھی اور باپ کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود مسلمان ہونے کے لیے تیار تھی۔ آج تیری اذان سن کر لڑکی کا دل اسلام سے پھر گیا۔ ہمارا آقا قافلے کا ممنون ہے کہ قافلہ تجھے لایا۔ تو اذان نہ دیتا تو ہمارے آقا کے سر سے یہ مصیبت نہ ٹلتی۔ اس نے سارے قافلے کے لیے مٹھائی اور پھل بھیجے ہیں۔

۲۔ گوہر آرا بیگم کا جنازہ مجھے نہیں دیکھنے دیا گیا تھا۔ جنازہ میں نے سب سے

نکسیر پھوٹی تھی، جنگل میں طبیب میسّر نہ آیا۔ گوہر آرا بیگم مجھ سے دو برس چھوٹی تھیں۔ ان سے تین برس چھوٹی گیتی آرا بیگم، اور گیتی آرا بیگم سے تین برس چھوٹے حاجی سیّد محمد مرتضےٰ۔ سب کی ولادت میرے سوا قصبات اور دیہات اور جنگلوں ہی میں ہوئی تھی۔

ایک میلی سی کوٹھی یاد ہے۔ کوٹھی کا ڈول؛ الگ نہر کے نزدیک تھی۔ کوٹھی کا طول و عرض کافی تھا۔ اور اس کے چاروں طرف کا صحن، تو آموں اور امرودوں کا پورا باغ تھا۔ میں اور روشن آرا بیگم امرودوں کو تو ہاتھ نہ لگاتے تھے اور آم کھانے میں کسر نہ چھوڑتے تھے۔ آم ٹپ ٹپ گرتے جاتے تھے اور ہم اٹھا کر کھاتے رہتے تھے۔ جیسے مزے کے اور قسم قسم کے آم وہاں کھائے، پھر کہیں نہیں کھائے۔ اور تعداد کا تو سوال ہی کیا تھا۔ آم ٹپکتے نہیں تھے، برستے تھے۔ آم کھاتے تھے اور گھر کی بھینسوں کا دودھ پیتے تھے۔

(صفحہ ۴۲ سے آگے) پہلا دلی آنے کے بعد کوچہ چیلان کے ایک صاحب کا دیکھا، جو مسجد کالے خان میں لاکر رکھا گیا تھا۔ اس سے پہلے میں جنازے کا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ اس جنازے کا دل پر آج تک اثر ہے۔ وہ جنازہ محمد مرزا خان کے بیٹے اور فضل علی خان کے والد کا تھا۔

سنہ ۱۹۳۹ء کی بات ہے میر محمد حسنین، تحصیلدار دہلی نے اپنے وطن ضلع مظفر نگر کے ایسے ہی باغ میں میری اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی دعوت ابنہ کی تھی اور چار پانچ گھنٹے وہی سماں رہا تھا، جو اپنی کوٹھی کے باغ میں روز رہتا تھا۔ میر حسنین، اللہ بخشے خوبیوں کے آدمی تھے۔ وہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک میرے پڑوسی رہے۔ گرداور قانون گو ہو کر دلی آئے تھے۔ یہیں صدر قانون گو بنے۔ یہیں نائب تحصیلدار، اور یہیں تحصیلدار۔ انھیں دلی کی مخلوق جتنا جانتی تھی اتنا کسی اور تحصیلدار کو نہیں جانتی تھی۔ ان سے اہلِ دہلی محبت کرتے تھے۔

وغیرہ اور اتنی تعداد میں کراچی کے امرا بھی تصور میں نہیں لا سکتے۔ دودھ کی افراط سے گھر آنے لگی تھی، مگر آموں کی افراط سے بھی نہیں لگتا تھا۔

پلول میں ہمارا قیام ہندوانہ مکان میں تھا، جس کے دروازے کے ادھر اُدھر دکانیں تھیں۔ دروازہ صحن میں کھلتا تھا، اور صحن کی بغلوں میں گودام تھے

(صفحہ ۴۳ سے آگے) میرا اور میر صاحب کا ہوا خوری میں روزانہ ساتھ رہتا تھا کبھی کبھی ٹیلی فون کرنے بھی تشریف لاتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کے گیارہ بجے مجھے آن جگایا اور فرمایا: دو کام میں کبھی نہیں کروں گا۔ ایک تو گھر پر ٹیلی فون نہیں لگواؤں گا۔ ٹیلی فون لگ گیا تو آپ کی طرح ایک روز نیند خراب ہوئی ہے، میری روز کی نیند حرام کر دی جائیگی۔ دوسرے تحصیل میں بجلی نہیں گھسنے دوں گا۔ پانچ سات آدمی تحصیل کے کمروں میں چھت کے پنکھے کھینچ کر بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ بجلی گھسی، تو یہ غریب بھوکے مرینگے۔

جنگل میں ساتھ کھیلنے کے لیے صرف تین لڑکے تھے۔ ایک شور رتن، سائیس، اور دو کبیر خان اور وزیر خان (کبیرا اور وزیرا) امام خان، خدمتگار اور اس کی بیوی رحمت کے بیٹے۔ میں ان میں سے کسی کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا۔ میں تو کھیلنے لگتا۔ وہی احساس کمتری کی وجہ سے الگ رہتے تھے۔ اور میری کچھ فطرت ہے کہ جو مجھ سے الگ الگ رہے، خود اس کی طرف نہیں بڑھتا۔ اور اگر کوئی پہل کرے، تو اس طرح بڑھتا ہوں، جس طرح خواجہ حسن نظامی کی طرف بڑھا، خواجہ فضل احمد کی طرف بڑھا، مولانا عارف ہسوی کی طرف بڑھا، مولانا راشد الخیری کی طرف بڑھا، بھیا احسان کی طرف بڑھا، خان بہادر حبیب الرحمٰن کی طرف بڑھا۔ بڑھ تو سکتا ہوں، پہل نہیں کر سکتا۔ خالہ نورجہان اپنے بیٹے محمد ادریس اور خالہ حاجی اپنے بچوں، معین الدین وغیرہ کو لے کر ہمارے ہاں مہمان آتی تھیں۔ مگر معین الدین چار سال چھوٹے تھے اور بھائی ادریس تین سال بڑے۔ اس زمانے میں اتنی چھوٹائی بڑائی کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا، تاہم بھائی ادریس بزرگانہ شان سے میری طرف بڑھے اور میری

ان گوداموں اور دکانوں کے اوپر رہائش کرتے تھے۔ نیچے کا صحن ہمارے گھوڑوں اور بھینسوں کے لیے وقف تھا۔ دودھ کی ہمارے ہاں نہریں بہتی تھیں۔ دودھ سے دہی جمتا تھا، مکھن نکلتا تھا، اور گھی بنتا تھا۔ پھلول میں آموں کی کثرت نہیں تھی۔ لیکن دودھ، دہی، مکھن اور گھی کی کثرت تھی اور ہاں جلیبیوں کی بھی۔ میں ان پانچوں چیزوں سے گھبراتا تھا، اور والدہ کہا کرتی تھیں: کھالے، پھر یہ نعمتیں نصیب نہیں ہوں گی۔ پھلول سے پہلے میں نے جلیبی نہیں دیکھی تھی، اور پھلول میں بھی فقط جلیبی دیکھی، اور مٹھائیاں نہیں دیکھیں۔ مگر ان جلیبیوں کی کیا تعریف کروں، واقعی نعمت تھیں۔ وٹامن بی (VITAMIN-B) کیا کام کریگی جو چار آنے سیر کی جلیبیاں کرتی تھیں ۱۹۱۴ء تک دلی میں جلیبیوں اور بیشتر مٹھائیوں کا بھاؤ فی سیر بارہ آنے کا تھا۔ لہٰذا میرا گمان ہے کہ ۱۸۹۶ء میں پھلول کی جلیبیوں کا بھاؤ فی سیر چار آنے

(صفحہ ۴۴ سے آگے) ان کی اڑسٹھ سال تھی۔ وہ بھائی ہی نہیں تھے، بچپن کے دوست بھی تھے، بزرگ دوست، جیسے بھائی فضل احمد ہیں۔ قاری عباس حسین مجھ سے فقط چار برس چھوٹے ہیں۔ لیکن یوں ملتے ہیں، گویا میں سچ مچ چچا ہی ہوں۔ حال آنکہ وہ مولانا محمد علی جوہر کے لفٹننٹ رہے ہیں۔ یہی برتاؤ میرا بھائی ادریس کے ساتھ تھا، اور بھائی فضل احمد کے ساتھ ہے بھائی ادریس نے ہمیشہ مجھے تم کہہ کر مخاطب کیا۔ میں ان کے لیے آپ اور جناب کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ تم کہنے والے اب تنہا بھائی فضل احمد باقی ہیں۔ اور تو کو تو کان ترس گئے۔ حقارت کے "تو" کو نہیں، محبت کے "تو" کو کان ڈھونڈتے ہیں۔

۱۹۴۹ء تک "تو" کہنے والی خالہ نور جہاں زندہ تھیں۔ اچھا ہوا میں شورہ تن اور کبیرا وزیرا کے ساتھ نہیں کھیلا، ورنہ ان سے کونسی اچھی باتیں سیکھتا۔ البتہ اس کا ایک برا نتیجہ نکلا کہ میری طبیعت میں اکل کھرا پن جم گیا۔ بیحد تنہا پسند ہوں۔

ہوگا۔ ورنہ اس وقت میں بھاؤ دلاسے واقف نہیں تھا۔ دلی میں ۱۹۱۰ء تک
اچھی بھینس کی قیمت چالیس پچاس روپے تھی۔ اور گھوڑا تانگے سمیت
۱۹۱۷ء تک ڈھائی سو روپے کا، میں نے خود خریدا تھا۔ اس لیے ہمارے
پلول کے گھوڑوں اور بھینسوں پر تعجب نہ کیجیے۔ میرے والد کی ڈھائی سو
روپے ماہوار تنخواہ تھی، جنھیں آج کل کے تین ساڑھے تین ہزار کے برابر
سمجھنا چاہیے اور ہر شے کا بھاؤ آج کل کی نسبت بیس گنا اور پچیس گنا کم تھا!

(پہلے اور اب)

پلول چونکہ قصبہ آباد تھا، مجھے گھوڑے پر چڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جنگل
کی رہائش کے زمانے میں ہر وقت گھوڑا تھا اور میں۔ میرے لیے گھوڑا نہیں
تھا، گھوڑی تھی، نہایت شریف بڑھیا گھوڑی۔ میرا سائیس چودہ پندرہ
برس کا، ہندو پوربیا لڑکا، شورتن نام تھا۔ مجھے چھ برس کی عمر سے آٹھ برس
کی عمر تک اس گھوڑی نے سواری دی اور اس سائیس نے لگام پکڑ کر گھوڑی
کو دوڑایا، مگر میں گرا کبھی نہیں۔

شورتن کی ماش کی دال کا آج تصور کرتا ہوں، تو منہ میں پانی بھر آتا ہے اور
اپنے بچوں پر اور آج کل کی تمام پود پر ترس کھانے لگتا ہوں۔ بڑی سی پیتل
کی چمکدار تھالی میں شورتن گرم گرم دال مٹی کی سوندھی سوندھی ہنڈیا
سے پلٹتا تھا اور آدھ پاؤ کا ڈلا، گھی کا، اس دال کے اوپر رکھتا تھا اور مجھے
بلاتا تھا کہ "آؤ کھاؤ۔ اُڑا کی دال۔ ہئی ہئی مچھان" (ارہر کی دال ہے اور ہری
ہری مرچیں ہیں، کھالو۔ دال مزے کی ہے)۔ اس وقت تو میں کیوں کھاتا،
لیکن اب اس کا تصور مزہ دیتا ہے۔ اب تو شاید سیّد امجد علی، سابق وزیر
مالیات پاکستان (و حال جانشین سر محمد ظفر اللہ خان در یو این) کا خاندان
بھی اپنے کارخانہ وزیر علی اینڈ سنز کا "گھی" ہی استعمال کرتا ہوگا۔ روز ریڈیو
میں بار بار اعلان کیا جاتا ہے۔

"امان تلو میں پکارو۔ ہم کو تعلیم پڑھنا ہے۔ سب سے آگے بڑھنا ہے۔ ملک کی خاطر کام کریں گے۔ اونچا اس کا نام کریں گے۔ امان تلو میں پکارو۔ ہمیں صحت مند بناؤ۔

میری تعلیم

تعلیم میری چار پانچ برس کی عمر کے درمیان جاری ہو چکی تھی۔ دلی میں بسم اللہ کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ جنگل میں پھوپی حضرت بیگم کے فرزند سید عبد السلام صاحب نے انگریزی شروع کرائی اور والد کے عملے کے کسی آدمی نے اردو۔ حساب کا سبق والد صاحب خود دیتے تھے۔ بھائی عبد السلام نے ہمارے خاندان میں قاری سرفراز حسینؒ کے بعد سب سے پہلے انٹرنس پاس کیا تھا۔ اور تلاش ملازمت کے لیے ہمارے ہاں

سلہ قاری سرفراز حسین کی والدہ میرے والد کی ماموں زاد بہن تھیں۔ قاری صاحب ہمارے خاندان میں غیر معمولی قابلیت کے انسان تھے۔ پاس تو انھوں نے علی گڑھ کالج سے صرف ایف۔ اے ہی کیا تھا۔ لیکن ان کے انگریزی میں لکھے ہوئے مضامین یورپ اور امریکہ کے رسالوں میں چھپتے تھے۔ دینی معلومات ان کی مولویوں جیسی تھیں۔ بیگم صاحب بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم نے تبلیغ اسلام کرنے انھیں انگلستان اور جاپان بھیجا تھا۔ لکھنؤ کے مرزا محمد ہادی رسوا کے مقابلے کے ناول نویس تھے۔ بلکہ مرزا رسوا سے سینیئر (SENIOR)۔ درجنوں کتابیں بھی تصنیف کیں اور زندہ دلی تو ان کی مشہور تھی۔ علی گڑھ کالج پہنچ جاتے تھے تو علی گڑھ کالج میں زندہ دلی چھا جاتی تھی۔ منشی ہدایت اللہ ابن شمس العلما منشی ذکاء اللہ نے ایک مرتبہ

مشہور ہوئے تھے۔ میرے بھانجے والد سید حبیب احمد بھیرولیہ میں اعلیٰ
عہدے دار ہیں اور ساڑھے چھ ہزار روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں ان ہی
عبدالسلام صاحب کے بیٹے ہیں۔

مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ جس دن بھائی عبدالسلام نے انگریزی شروع
کرائی اسی دن میں نے انگریزی اخبار میں حروف بتا دیے کہ یہ اے ہے
یہ بی ہے۔ حساب سے البتہ جی بولاتا تھا۔

۱۹۰۶ یا ۱۹۰۷ء میں والد ماجد نے حکم دیا کہ سارا گھر دلّی جا کر رہے تاکہ
میری تعلیم کا باقاعدہ انتظام ہو۔ ایک صاحب حبیب الرحمٰن میرے رشتے کے
چچا تھے۔ انھوں نے اس سال انگریزی کا مڈل[۳] پاس کیا تھا۔ وہ دس
روپے ماہوار پر مقرر کیے گئے کہ دن بھر مغز ماریں، اور دو سال کے اندر اس
قابل کر دیں کہ پانچویں جماعت میں لے لیا جاؤں۔ حبیب الرحمٰن
(صفحہ ۴ سے آگے) مجھ سے فرمایا کہ سرفراز حسین کے سر میں اللہ تعالیٰ نے
چالیس آدمیوں کا بھیجا بھرا تھا لیکن اس نے اللہ کی نعمت کا صحیح استعمال
نہیں کیا۔ منشی عنایت اللہ قاری صاحب کے ہم جماعت رہ چکے تھے۔ اور تادمِ
مرگ دوست رہے۔ قاری صاحب کے بیٹے، قاری عباس حسین، نامور اخبار
نویس، سابق سب ایڈیٹر ہمدرد، دہلی آج کل کراچی میں مفلوج پڑے ہیں۔
دوسرے بیٹے قاری اخلاق حسین ہمدرد دواخانہ، دہلی کے اسسٹنٹ ایڈمنسٹریٹر
ہیں۔ قاری عباس حسین بھی آخری زمانے میں اخبار نویسی ترک کر کے
ہندوستانی دواخانہ، دہلی کے جنرل منیجر ہو گئے تھے اور پھر ہندوستانی
دواخانہ، لاہور کے جنرل منیجر رہے تھے۔

۳؎ اس زمانے میں اردو کا مڈل بھی تھا۔ انگریزی اور اردو، دونوں مڈلوں کے امتحان
انٹرنس کی طرح یونیورسٹی لیتی تھی۔ اردو مڈل پاس حساب میں طاق سمجھے جاتے
تھے، انھیں انٹرنس میں صرف انگریزی کا امتحان دینا پڑتا تھا۔

جوان تھے، مجھے ان کا سلیقہ بہت پسند آیا۔ ہمارے مکان کے قریب ہی ان کا مکان تھا۔ شادی ابھی نہیں ہوئی تھی، لیکن ایک ضعیف ماں، ایک اپاہج بھائی عبدالعلی اور بھائی کی بیوی[۱] کا خرچ ان کے ذمے تھا۔ دو تین لڑکے انھوں نے میرے علاوہ بٹھا لیے تھے، جس سے پانچ سات روپے اور آمدنی ہو جاتی تھی۔ سولہ سترہ روپوں میں کیوں کر گزارہ ہوتا تھا، آج کل اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ لیکن یقین کیجیے، چچا حبیب الرحمٰن شام کو سیر کرنے نکلتے تھے، تو نظر آتا تھا کہ آج کل کا سات آٹھ سو روپے پانے والا جا رہا ہے۔ قمیص، پاجامہ، شیروانی، سب کپڑے ٹھیک تراش کے اور نہایت اُجلے، سر پہ پھُندنے دار ترکی ٹوپی۔ پیروں میں انگریزی جوتے۔ دن صاحبِ موصوف کا ہمارے ہاں گزرتا تھا۔ ایک کمرہ اور ایک کوٹھری ان کے سپرد تھی۔ اپنے گھر ضروریات سے فارغ ہوتے، کھانا کھانے اور سونے جاتے تھے۔ کھانا کیسا کھاتے تھے، اس کا علم نہیں۔ ہاں، خمیرہ گاؤزبان عنبری جواہر والا ضرور تیار کراتے تھے۔ اور اسے ہمارے گھر کی کوٹھری میں رکھتے تھے

---

۱ ان بیوی نے اپاہج شوہر کو ایسی خندہ پیشانی سے نبھایا کہ اللہ کی طرف سے انھیں اس کا انعام ملا۔ اپاہج شوہر مر گئے تو میر جمال الدین کی بیوی بنا دیا۔ میر صاحب دلی کے بہت خوشحال حضرات میں تھے۔ پہلی بیوی کے لڑکوں کو ان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک ڈی ٹی ایس تھا، دوسرا کاروبار کرتا تھا۔ ان بیوی سے بھی لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام ماں کے نام محمد مغنی رکھا گیا، ماں کا نام مغنی بیگم تھا۔ محمد مغنی جرمنی سے انجینیری سیکھ آئے اور جرمن بیوی ساتھ لائے۔ محمد مغنی کی ایک لڑکی پاکستان کے ایر مارشل محمد اصغر خان سے منسوب ہے محمد مغنی دلی میں ہیں۔ اب مغنی بیگم کی قسم کی صابر و شاکر بیویاں نہیں دکھائی دیتیں۔ میں نے کتنی دیکھی ہیں۔ ایک حافظ عزیز حسن بقائی، ایڈیٹر پیشوا کی حقیقی خالہ تھیں، جو میرے رشتے کے پھوپھی زاد بھائی سید آغا میر سے بیاہی ہوئی تھیں۔ آغا میر بہت سیدھے اور بھولے انسان تھے، مگر انھوں نے سیدھے اور بھولے شوہر کو کامل شرافت سے نبھایا۔ حالانکہ وہ خود بڑی سگھڑ اور سمجھدار عورت تھیں۔ ہمارے خاندان میں ان کا جواب نہیں تھا۔

کوٹھری صاحب موصوف کی تحویل میں تھی میں بھی اس میں نہیں جا سکتا تھا۔ ناشتہ روزانہ خود ہی وغیرہ نکالتے اور کھاتے تھے۔ شام کو کپڑے بدلتے اور سیر کرنے جاتے تھے گھر کا لباس حسب ذیل تھا۔

مضبوط موٹے کپڑے کا تہ بند اور مضبوط موٹے کپڑے کی نیم آستین۔ کہیں سے فوجیوں کے پرانے بوٹ خرید لیے تھے اور کارٹ گران کے سلیپر بنا لیے تھے۔ وہ سلیپر صاحب موصوف کے پیروں میں بیسیوں برس چلے اور ان کے مرنے کے بعد ورثے میں چھوٹے بھائی کو ملے

ہمارے مکان کے سامنے مسجد تھی، مسجد کالے خاں[سہ] عمر بھر رومال لپیٹ کر نماز باجماعت پابندی سے ادا کرتے تھے۔ ویسے ننگے سر بیٹھتے تھے۔ سیر کو جاتے تھے تو گرمی میں بھی جرابیں چڑھاتے تھے۔ جرابوں میں پیوند اپنے ہاتھ سے اتنا خوبصورت لگاتے تھے کہ جرابیں نئی ہو جاتی تھیں۔ قلیل آمدنی میں اس طرح اچھی زندگی بسر کرنا کچھ تو صاحب موصوف کے سلیقے کی وجہ سے تھا اور کچھ یوں کہ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے تک مہنگائی نے پاؤں نہیں نکالے تھے۔ مہنگائی تو پہلی جنگ عظیم کے بعد سے بڑھی ہے۔ ۱۹۱۴ء تک گرمی کی شیر والی کا ابر دن چھ

سہ کالے خاں اس مسجد کے کوئی خوش بخت مؤذن تھے کہ ان کا نام زندہ ہے ورنہ یہ مسجد دراصل مولانا شاہ رفیع الدین یا مولانا شاہ عبدالقادر کی تھی۔ ہمارے مکان کے آگے کی سڑک پر دو مسجدیں ہیں، ایک یہی مسجد کالے خاں دوسری کھجور والی مسجد۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کے دفتر ہمدرد و کامریڈ سے متصل سا ایک مسجد میں مولانا شاہ رفیع الدین درس دیتے تھے۔ دوسری مسجد میں مولانا شاہ عبدالقادر۔ کوچہ چیلان سے نکل کر محلہ کلاں محل میں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ تھا۔ اس جگہ میونسپل کمیٹی کا بورڈ "مدرسہ شاہ عبدالعزیز" تا دم تحریر ہذا آویزاں ہے۔ تینوں مولانا شاہ صاحبان امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ کے بیٹے تھے۔ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی تھے مولانا شاہ اسمٰعیل شہید کے والد۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

کے گز بکتا تھا۔ کرتے کی مل اور پاجامے کا لٹھا ادنےٰ درجے کا تین آنے بلکہ ڈھائی آنے گز، اور اعلیٰ درجے کا نو آنے گز۔ ویسا لٹھا اب ناپید ہے۔ جنگ عظیم سے آدمیوں کی تعداد بجائے گھٹنے کے یکایک بڑھ گئی کہ بکری کا گھٹیا گوشت چھ پیسے سیر سے آج ساڑھے چار روپے سیر ہے۔ جس میں ساڑھے چار روپے سیر گوشت خریدنے کی طاقت نہ ہو اسے گھٹیا گوشت کھانے کا بھی حق نہیں رہا۔ ۱۹۱۴ء سے پہلے بڑھیا گوشت دو آنے سیر تھا۔ جنگ عظیم سے قبل ہر گوشت خور کو گوشت کھانے کا حق تھا۔ جنگِ عظیم نے معیارِ زندگی بلند کر دیا۔ بھائی عبدالسّلام، جن کا اوپر ذکر آیا ہے، تیس روپے ماہوار کے ملازم ہوئے تھے۔ ترقی کرتے کرتے سو روپے تنخواہ ہو گئی۔ انھوں نے انگریز افسر سے شکایت کی کہ سو روپوں میں پورا نہیں پڑتا۔ اس انگریز نے پوچھا، تیس روپے میں کیسے پورا پڑ جاتا تھا؟ انھوں نے جواب دیا، حضور! پہننے، اوڑھنے، کھانے پینے، اور رہنے سہنے کے وہی نرخ کر دیجیے، جو تیس روپے تنخواہ کے وقت تھے، میں سو (۱۰۰) چھوڑ کر تیس لینے کو تیار ہوں۔

میں اپنی تعلیم کا حال سناتے سناتے کیا فضول قصہ لے بیٹھا۔ پھر مجھے حبیب الرحمٰن صاحب کا سلیقہ تو پسند تھا، مگر پیٹنا پسند نہیں تھا۔ اس زمانے میں استاد علم کو گھول کر پلا دینا چاہتے تھے، اور شاگرد نہیں پیتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتے تھے۔ اب استادوں کو شاگردوں سے ویسا تعلق نہیں رہا ہے۔ اس زمانے کے استاد شاگردوں کو اس جذبے سے پیٹتے تھے۔ جس جذبے سے ماں باپ اولاد کو پیٹا کرتے ہیں۔ اور حبیب الرحمٰن تو نرے استاد نہیں تھے، چچا بھی تھے۔ لیکن بہر حال، اس وقت مجھے ان کا پیٹنا پسند نہیں تھا، ناگوار تھا۔ جو اور لڑکے ان سے پڑھتے تھے، وہ اتنا نہیں پٹتے تھے، جتنا میں پٹتا تھا۔ میری خفیف سی غفلت یا درحقیقت سی غلطی پر ان کا غصہ بھڑکا دیتی تھی۔ آج میرے دل میں اس جذبے کی قدر ہے، اس وقت نہیں تھی۔ اس زمانے میں اسکول بھیجو

پیٹا کرتے تھے، اور ماں باپ کی طرح شاگردوں کے خیر خواہ ہوتے تھے۔ میں اپنے زمانے کے اسکول ٹیچروں کی خیر خواہی کا معترف تو ہمیشہ رہا، مگر حبیب الرحمٰن صاحب کی خیر خواہی بچپن کے باعث نہیں سمجھ سکتا تھا۔ امین الدین ان کے ایک دوست تھے۔ وہ مجھے پٹنے سے بچایا کرتے تھے، ان کا اب بھی شکر گزار ہوں اور رعب بھی تھا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے، چچا حبیب الرحمٰن کے ایک اور دوست تھے، محمد حسین، ایک فرانسیسی نومسلم کے گیلڑ بیٹے۔ فرانسیسی نومسلم حاجی علی جان والوں کے کارخانہ تارگنج میں انجینیر تھا۔ سر شیخ عبدالقادر کا دفتر "مخزن" اور مولانا محمد علی جوہر کا دفتر "ہمدرد"، کامریڈ جس مکان میں رہا وہ اس کارخانہ تارگنج کے لیے بنا تھا اور اس لیے مل والا مکان کہلاتا تھا۔ محمد حسین، چچا حبیب الرحمٰن کے پاس مغرب اور عشا کے درمیان تشریف لاتے تھے میری پڑھائی عشا تک ہوتی تھی۔ جو کمرہ چچا حبیب الرحمٰن کے سپرد تھا، وہ سڑک کے کنارے تھا۔ اس کمرے کے آگے تین فٹ اونچی اور فٹ بھر چوڑی سنگین پٹری تھی۔ بعد مغرب میں پٹری پر بیٹھتا تھا اور چچا حبیب الرحمٰن اور محمد حسین کے واسطے کرسیاں بچھتی تھیں۔ ایک ہندو کہار دیسی چاٹیں، سونٹھ کے بتاشے، دہی بڑے اور جل جیرا (زیرے کا پانی) بہنگی میں رکھ کر بیچنے آتا تھا محمد حسین چاٹیں خریدتے تھے اور چچا حبیب الرحمٰن کو اور مجھے کھلاتے تھے۔ بعد مغرب پڑھائی نہیں ہوتی تھی، کھلائی ہوتی تھی۔ چچا حبیب الرحمٰن میرے کھانے سے کھل جاتے تھے۔

اللہ اللہ کر کے دو سال ختم کیے اور چچا حبیب الرحمٰن صاحب شاہ زادہ ہائی اسکول میں داخل کرانے لے گئے۔ شاہ زادہ ہائی اسکول اس شان کا اسکول کہ مڈل پاس کو بھی ہیڈ ماسٹری دے دی جاتی تھی! آٹھویں پاس ہیڈ ماسٹر نویں اور دسویں کو پڑھاتا تھا۔ لیکن شاہ زادہ ہائی اسکول نے مجھے پانچویں جماعت میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا امتحان لیا گیا اور میں اس قابل نہیں سمجھا

کہا کہ شاہزادہ ہائی اسکول کی پانچویں کا طالب علم بن سکوں۔ چچا حبیب الرحمٰن نے کہا: انشاء اللہ دلّی کے سب سے بڑھیا اسکول میں داخل کراؤں گا۔ چنانچہ پندرہ دن اور محنت کی اور سینٹ اسٹیفنس مشن ہائی اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ واقعی دلی کا بہترین[1] اسکول تھا۔ ماسٹر جانکی ناتھ (عیسائی) اس کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اور قابل استاد ان کے ماتحت کام کرتے تھے، جن میں دو انگریز تھے۔ کیمرج اور آکسفورڈ کے ایم۔ اے۔ نمبر دو گورنمنٹ ہائی اسکول تھا، نمبر تین اینگلو عربک ہائی اسکول، نمبر چار اینگلو سنسکرت ہائی اسکول اور نمبر شاہزادہ ہائی اسکول۔

پانچویں جماعت کے طالب علم کو پڑھانا چچا حبیب الرحمٰن کے بس کا نہ تھا۔ علاوہ ازیں انھیں کسی انگریزی فرم میں تیس روپے ماہوار کی ملازمت بھی مل گئی تھی لہٰذا وہ رخصت ہوئے اور ماسٹر عبدالقیوم فریدآبادی آ گئے۔ ماسٹر عبدالقیوم انٹرنس کے پاس تھے، کچہری میں نوکر تھے، اور ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ وہ روزانہ دو گھنٹے پڑھانے لگے۔

تعلیم اطمینان سے ہو رہی تھی۔ پانچویں پاس کر کے چھٹی میں جا چکا تھا کہ تقدیر نے پلٹا کھایا۔ ماسٹر امیر چند جنھیں لارڈ ہارڈنگ (وائسرائے ہند) پر بم پھینکنے

---

[1] عیسائی مشنریوں کے اسکول آج بھی نمبر ایک ہیں، بلکہ آج اسلامی مملکت پاکستان میں تو ان کی مقبولیت کا کچھ ٹھکانا نہیں رہا ہے۔ وہ ہمیں دھکے دیتے ہیں اور ہم ان کے دامن میں چھپے جاتے ہیں۔ میرے بچپن میں حالت برعکس تھی۔ عیسائی مشنریوں نے دلّی میں ایک یہ اسکول کھول رکھا تھا، جس میں داخل تھا، اور ایک ان کا کالج تھا، سینٹ اسٹیفنس مشن کالج۔ کالج کی تعلیم کی بھی دھاک تھی۔ پرنسپل ویسن عیسائی، اور ماتحت پروفیسر [illegible] عالم فاضل انگریز یا ہندو، پڑھنے والے زیادہ تر ہندو، مسلمان کم۔

۲۔ یہ حال تھا ۱۸۹۹ء کا نہیں۔ ۱۸۹۹ء میں انٹرنس پاس بھی بڑی بات تھی۔ مسلمان بی۔ اے تو سارے شہر میں شاید آٹھ دس ہوں گے۔ کئی برس بعد میں نے گنے تھے تو کل سولہ تھے اور سب اتنے اونچے تھے کہ گفتگو کرتے نہیں پھرتے تھے۔

کا الزام دھر کر ۱۹۱۲ء میں پھانسی پہ چڑھایا گیا تھا۔ سینٹ اسٹیفنسز مشن ہائی اسکول میں نویں دسویں جماعتوں کے استاد تھے چھٹی جماعت والوں سے انھیں واسطہ نہیں تھا مگر ان کی شکل بندر سے مشابہ تھی۔ مجھے خواہ مخواہ شرارت سوجھی۔ میں نے بہ آواز بلند ان کے سامنے انھیں "بندر" کہہ دیا۔ وہ بالکل خاموش رہے جیسے سنا ہی نہیں۔ لیکن مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا یا میری تقدیر کو اپنا کرشمہ دکھانا تھا میں ڈر کے مارے سینٹ اسٹیفنسز مشن ہائی اسکول سے نام کٹوا کر اینگلو عربک ہائی اسکول پہنچ گیا۔

سینٹ اسٹیفنسز ہائی اسکول کے طلبا کو اینگلو عربک ہائی اسکول میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ یہاں چھٹی جماعت کے دو فریق تھے، اے اور بی۔ اے کے انچارج مرزا احمد بیگ تھے، بی کے انچارج ماسٹر امتیاز حسین۔ دونوں نے مجھے لینے کی کوشش کی۔ ماسٹر امتیاز حسین جیت گئے۔ یہ بھی تقدیر کا کھیل تھا۔ مرزا احمد بیگ اینگلو عربک ہائی اسکول کے بہترین استاد تھے، خاموش اور متین، پڑھانے ہی میں ان کی دلچسپی محدود تھی۔ ماسٹر امتیاز حسین ادبی آدمی تھے، ہزار در اشعار ازبر اور طوطی ہزار داستان۔ پڑھاتے کم تھے۔ شاعرانہ اور ادبی نوعیت کی چٹپٹی دار باتیں زیادہ کرتے تھے۔ مرزا احمد بیگ کے علاوہ اینگلو عربک ہائی اسکول کا ہر استاد طلیق اللسان تھا۔ ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین کی طلاقت ماسٹر امتیاز حسین کی طلاقت سے بھی فائق تھی۔ اور ان کی باتیں آب زر سے لکھنے کے لائق ہوتی تھیں۔ اپنے دور کے شیخ سعدی تھے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول کے اساتذہ نصاب کی کتابیں پڑھانے پر اتنا زور نہیں دیتے تھے جتنا ذہن اور ذہانت چمکانے پر زور دیتے تھے۔ نصاب تو اس زمانے میں بھی آج کے نصاب جیسا تھا، اسی سے ملتا جلتا، جس کے جوہر مزید ترقی اللہ ہندوستان اور پاکستان میں آزادی ملنے کے بعد کھلے ہیں۔ لیکن اساتذہ اینگلو عربک ہائی اسکول نے ایسے انسان پیدا کیے جن کے مثل دلّی کا کوئی دوسرا اسکول پیدا نہیں کر سکا۔ اینگلو عربک

ہائی اسکول میں جب تک پرانی وضع کے ان ٹرینڈ (UNTRAINED) استاد رہے، عمامے باندھنے والے اور چشمہ پہننے والے اس وقت تک اینگلو عربک ہائی اسکول سے اعلیٰ قسم کے گروپ نکلا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک گروپ کو میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ گروپ قاری سرفراز حسین مرزا محمد اشرف گورگانی مولوی اشرف حسین، اور مولانا راشد الخیری کا تھا۔ دلی کے دوسرے اسکول بڑے بڑے جج اور مجسٹریٹ، بڑے بڑے ڈاکٹر اور انجینیر تو پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس گروپ کی مثل لوگ نہیں پیش کر سکتے۔ ان چاروں کو مولانا الطاف حسین حالی کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ مولانا ان کے زمانے میں یہاں پڑھاتے تھے

نصاب کی کتابیں پڑھانے پر زور نہ دینے کے باوجود پاس اینگلو عربک ہائی اسکول کے طلبا بھی ہو جاتے تھے۔ اینگلو عربک ہائی اسکول کا نتیجہ اینگلو سنسکرت ہائی اسکول سے اچھا رہتا تھا۔ میں یہاں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں میں اسی طرح چلا جس طرح سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول میں چل رہا تھا۔ آٹھویں کا امتحان دینے والا تھا کہ یکایک میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ انگریز اگزیکیٹو انجینیر سے اثنائے گفتگو میں انھیں فول (FOOL) یعنی بیوقوف کہہ دیا تھا۔ انھوں نے اسی کی میز سے رول اٹھایا اور رسید کیا۔ اور کوئی کمرے میں نہیں تھا۔ انگریز نے فوراً صفائی کر لی، بولا: جو ہوا ہے، اسے بھول جاؤ۔ لیکن خود نہیں بھولا۔ افسران بالا کے کان بھر کر والد کا عہدہ گھٹوا دیا۔ اسسٹنٹ انجینیر نہیں رہے۔ والد نے ایک سال کی فرلو (چھٹی) لے لی اور دلی آ گئے۔ ایک سال چلے کھینچنے اور درویشوں سے دعائیں کرانے میں کاٹا۔ مہینے میں کئی چکر درگاہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور درگاہ حضرت خواجہ قطب الدین

۱؎ میرے زمانے تک ان ٹرینڈ استاد موجود تھے۔ مشتاق احمد زاہدی اور آصف علی جیسے ممتاز لوگوں کو ان ہی ان ٹرینڈ استادوں نے ٹرین کیا تھا۔

بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ کے لگائے تھے اور کھنڈرات میں درویشوں کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔ کوئی درویش شکل اور درویش وضع کا آدمی مسجد کالے خان میں آجاتا تو اس کی دعوتیں کرتے تھے۔ جس کمرے میں چچا حبیب الرحمٰن نے مجھے پڑھایا تھا، اب وہ میرا کمرہ تھا۔ گھر آنے والے درویش اس کمرے میں بٹھائے جاتے تھے۔ میرا دل کبھی ان درویشوں کی طرف نہیں کھنچا۔ بجز ایک کے جنھوں نے اپنی کٹیا کے لیے درگاہ قطب الدین کے پہاڑی علاقے میں جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ والد ماجد ان بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو میں بھی ہمراہ تھا۔ عصر کا وقت، سنسان سماں، صاف ستھری کٹیا، آگے چٹیل، ہموار سا میدان، بزرگ کی نورانی شکل اور سادی وضع، سب چیزوں نے مل کر دل پر اچھا اثر کیا۔

المختصر سال گزر گیا، اور والد مجبوراً بحالت تنزلی نوکری کرنے روڑا ضلع کان پور [illegible] لوٹے۔ روڑے میں ریل سے اترے تو رات تھی۔ وہیں انھیں پروانہ دیا گیا کہ آپ بحال کیے جاتے ہیں۔ اسٹیشن کے باہر موجودہ اسسٹنٹ انجینیر کے خیمے موجود ہیں، اسسٹنٹ انجینیر کل صبح چارج دے دیگا۔ رات خیموں میں بسر کیجیے۔ رات کو نہ جانے کیا بیتی، ایسے سوئے کہ حشر تک جاگنا قسم ہو گیا۔

نہر کے ایک ڈپٹی مجسٹریٹ تھے، سید محمد، میرٹھ کے باشندے، اور اخبار البشیر اٹاوے کے خاص مضمون نگار۔ انھوں نے مجھے تار بھیجا کہ تمھارے ابا انتقال کر گئے۔ یہ تار ۱۳ دسمبر ۱۹۰۱ء کی شام کو ملا تھا۔ والدہ نے اسی وقت پھوپھا عبد الوہاب اور میر سید علی[1] سے درخواست کی کہ جائیں اور تجہیز و تکفین کرآئیں۔[2] تیسرے

۱۔ میر سید علی میرے دادا کے حقیقی بھائی کے پوتے تھے۔ ایک بھائی کا پوتا میں، ایک بھائی کے پوتے وہ۔ میر سید علی کا ایک واقعہ نوٹ کرنے کے لائق ہے۔ ایک دفعہ کسی عزیز سے ان کی مقدمہ بازی ہو گئی۔ عزیز مذکور دلی آتے تھے تو ہمیشہ انہی کے یہاں مہمان ہوتے تھے۔ اب بھی میر صاحب نے انھیں مہمان رکھا۔ کھانا کھلاتے، حقے بھر بھر کے پلاتے، تانگے میں کچہری لے جاتے، اگرچہ عدالت میں داخل ہونے تک

دن وہ دونوں واپس آ گئے، مگر عقدہ وا کھلا کہ موت کا سبب کیا تھا۔ یکایک بیمار ہو گئے تھے، یا زہر دے دیا گیا تھا۔

والد کے انتقال سے میری تعلیم کی رفتار بگڑ گئی۔ ہشتم پشتم مڈل کا امتحان دیا اور فیل ہوا۔ وہ مڈل کا آخری امتحان تھا۔ جو یونی ورسٹی کی طرف سے لیا گیا تھا۔

دوسرے سال اسکول نے نویں میں چڑھا دیا۔ اور تیسرے سال دسویں میں پہنچا دیا۔ لیکن اب میرا دل نصاب کی کتابوں سے گھبراتا تھا اور سرسید احمد خاں، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی وغیرہ کی کتابوں میں لگتا تھا۔ والد کی تنخواہ تو انتقال کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی، فقط جائداد کا کرایہ اور ملوں کا منافع آتا تھا۔ والدہ نے اس آمدنی میں سے دس روپے ماہوار میرے جیب خرچ کے مقرر کر دیے تھے۔ دس میں سے پانچ چھ روپے میں کتابیں خریدنے پر خرچ کرتا رہتا تھا۔

دسویں جماعت کا طالب علم ہو کر دلی کے ماہنامے "زبان" امرتسر کے سہ روزہ "وکیل" اور لاہور کے ہفتہ وار "وطن" اور روزنامہ "پیسہ اخبار" میں مضامین بھیجنے کا

(صفحہ ۹۴ سے آگے) وہ سید صاحب کے مہمان رہتے، مگر کمرۂ عدالت میں داخل ہو کر خوب مقابلہ کرتے اور کمرۂ عدالت سے نکل کر پھر ایک کے ایک۔

۱۔ میرے والد کی قبر رودولی ریلوے اسٹیشن کے نزدیک ہے۔ "سید کی قبر" کہلاتی ہے ایک دفعہ زیارت کی ہے۔ میں اور خواجہ حسن نظامی صاحب لکھنؤ سے دلی آ رہے تھے۔ رودولی کے قریب پہنچے تو عین قبر کے سامنے ٹرین اتفاقاً پاؤ گھنٹے کے واسطے رک گئی۔ کوئی گنوار مجاور بنا بیٹھا تھا۔ اس نے بتایا کہ صاحب قبر کون تھے، کیسے تھے کیوں کر مرے، اور اب جمعرات کی جمعرات قبر پر قوالی ہوتی ہے۔ حالانکہ میرے والد نقشبندی تھے۔ قوالی زندگی میں انھوں نے اپنے ارادے سے کبھی نہیں سنی تھی لکھنؤ سے رخصت کرنے والوں نے مجھے اور خواجہ حسن نظامی صاحب کو ہار پہنائے تھے، ہم دونوں نے ہار قبر پر ڈال دیے

آغاز کیا۔ میری والدہ نے ایک دفعہ بھائی قاری سرفراز حسین سے فرمایا کہ تم مدرسے جاکر پوچھو تو ان سے مدرسے میں کیسا ہے۔ ان ٹرینڈ اساتذہ خواجہ شہاب الدین مرزا احمد بیگ، ماسٹر امتیاز حسین، ماسٹر ذاکر حسین، مولوی آفتاب حسین دہلی کے شیعہ خطیب مولوی سید محمد کے والد، مولوی رحمت اللہ، مولوی عمر علی، مولوی نجم الدین وغیرہ جا چکے تھے۔ اور ٹرینڈ ٹیچر آ چکے تھے۔ مولوی فضل الدین، بی۔ اے بی۔ ٹی ہیڈ ماسٹر تھے۔ قاری سرفراز حسین نے ان سے میرا حال دریافت کیا۔ قاری صاحب اور فضل الدین صاحب اسکول میں ہم جماعت رہتے تھے۔ فضل الدین صاحب نے مسکرا کر کہا "ان کی آوارگی روز افزوں ترقی پر ہے"، اور یہ کہ کر

سہ میں نے ان ٹرینڈ (UNTRAINED) مگر چالیس برس کا تعلیمی تجربہ رکھنے والے اور باپ جیسے شفیق استادوں کو بھی برتا۔ ان کی ملازمت پر زوال میرے ہی سامنے آیا تھا۔ اور ٹرینڈ (TRAINED) استادوں کا دور بھی میرے سامنے شروع ہوا تھا ان ٹرینڈ استاد سمجھتے تھے کہ یہیں اس اسکول میں جینا ہے اور اسی اسکول میں مرنا ہے۔ وہ سب دلی کے تھے، اور تقریباً ہر طالب علم کے خاندان سے واقف تھے۔ ٹرینڈ استاد بیشتر ادھر ادھر سے آئے اور یہ ادھیڑ بُن ساتھ لائے کہ یہاں سے زیادہ تنخواہ کہیں ملے تو وہاں چلے جائیں۔ ماسٹر فضل الدین دلی کے تھے اور دلی ہی میں رہنا چاہتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر ہونے سے پہلے یہیں سیکنڈ ماسٹر تھے۔ انھوں نے یہیں پڑھا تھا اور اب ان ٹرینڈ استادوں کا پورا اثر لیا تھا۔ ان ٹرینڈ استادوں کے قدم بقدم تھے اینگلو عربک ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ کالج بنا تو وہی پرنسپل بنائے گئے۔ لیکن انھوں نے عمامہ باندھ کر اور ادھوڑی استرکی جوتی پہن کر پرنسپلی کی۔ مولوی فضل الدین شاگردوں کی اتنی نگرانی رکھتے کہ شاگردوں کو راہ چلتے خوف رہتا تھا کہ مولوی صاحب نہ آ جائیں۔ اور مولوی صاحب واقعی آ جاتے تھے۔ میں نے بارہا اس کا تجربہ کیا اور ان کا ہر شاگرد اسے جانتا ہے کہ مولوی صاحب کا تصور کرنا کافی تھا۔ مولوی صاحب تصور کرتے ہی پہنچ جاتے تھے۔

مجھے دیکھا۔ میرے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ کیونکہ میں کیسا بھی رہا ہوں، مگر آوارہ عمر کے کسی حصے میں نہیں رہا۔ آوارگی سے مجھے مناسبت نہیں ہے میرا چہرہ متغیر دیکھا تو مولوی فضل الدین صاحب نے وضاحت فرمائی کہ طالب علمی کے زمانے میں مضمون نگاری کرنا بھی آوارگی ہے۔ میرے چہرے کی سرخی ہلکی ہوئی، لیکن میں نے دل میں کہا،

کہ این آوارۂ کوے بتاں آوارہ تر بادا

میرے بچپن کے اور محلے کے ساتھی، آصف علی، اسکول کے ساتھی سید رؤف علی اور شیخ محمد تقی سینٹ اسٹیفنز مشن کالج میں جا بیٹھے اور میں انٹرنس میں فیل ہوتا رہا۔ آصف علی اور رؤف علی ایف۔ اے کر کے بیرسٹری پڑھنے انگلستان چلے گئے اور محمد تقی نے بی۔ اے اور ایل۔ ایل۔ بی کا پروگرام بنایا۔ لیکن جس کے باپ کا پروگرام تھا کہ مڈل پاس کر کے اٹاوہ ہائی اسکول جائیگا اور اٹاوہ ہائی اسکول سے علی گڑھ کالج، اور وہاں سے بی۔ اے کے بعد بیرسٹری کے لیے انگلستان، اس کا رخ اور ہی طرف مڑ چکا تھا۔ مادر چہ خیالیم و فلک در چہ خیال۔ خدا مجھے فیل نہیں کر رہا تھا، امتحانوں میں پڑنے سے بچا رہا تھا۔ میں نے مولوی فضل الدین صاحب کی باتیں سن کر کہہ تو دیا تھا: کہ این آوارۂ کوے بتاں آوارہ تر بادا لیکن متواتر تین سال انٹرنس میں فیل ہونے سے میرا دل بیحد رنجیدہ اور غمگین تھا۔ پر میں اب سمجھتا ہوں کہ اللہ نے میرے لیے جو کچھ کیا، ٹھیک کیا۔ اس وقت نہیں سمجھا تھا اور نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اب ایم۔ اے، بی۔ اے اور بیرسٹر نہ بننے کا مجھے مطلق افسوس نہیں ہے۔ ہاں افسوس ہے، تو دینی مدرسے میں نہ پڑھنے کا ہے۔ اللہ نے دین کو باضابطہ اور سبقاً سبقاً کیوں نہیں پڑھوایا، اس کا راز ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے مسٹر آصف علی پر کبھی رشک نہیں کیا، مگر مولانا سید سلیمان ندوی پر رشک کرتا ہوں۔ ایم۔ اے اور بی۔ اے یا بیرسٹر بننے سے ممکن ہے کہ میری فطرت اسلامی پچک کر جاتی لیکن ندوہ یا دیوبند جانے سے تو شاید اور سنورتی۔

یہ اللہ کا مجھ پر بڑا فضل ہے کہ میں مسلمان پیدا کیا گیا اور پھر امتحانوں میں نہیں بٹھایا گیا۔ حدیث ہے کہ ہر بچہ اسلامی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے، ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔ مجھے نہ ایسے ماں باپ سے سابقہ پڑا جو میری اسلامی فطرت کو بگاڑ دیتے۔ اور نہ ایسے اور لوگوں سے سابقہ پڑا۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ ایم۔ اے، بی۔ اے اور بیرسٹر سب اپنی اسلامی فطرت بگاڑ لیتے ہیں۔ خطرناک ماحول سے گذر کر بھی بعض حضرات اسلامی فطرت کو مرنے نہیں دیتے۔ اس کا انحصار ظرف پر ہے۔ میرا ظرف غالباً خطرناک ماحول سے گذرنے اور امتحانوں میں ڈالے جانے کے قابل نہیں تھا۔ میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ امتحانوں میں دیر لگا کر بچپن سے بڑھاپے تک اسلامی فطرت کو زندہ رکھوں۔ مجھے عمر کے کسی دور میں بڑی کتابوں اور بڑے انسانوں کی صحبت نہیں ملی۔ کتابیں میں ساری عمر پڑھتا رہا۔ میری تعلیم آج بھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ لیکن میں نے جوانی میں بھی ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی عبدالحلیم شرر کے چند ناولوں کے سوا کسی ناول کو ہاتھ نہیں لگایا۔ صحبت مجھے ملی بچپن میں بھائی محمد ادریس، مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی اور قاضی لطیف الحق حقی کی اور جوانی میں خواجہ فضل احمد شہید، خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، مولانا عارف ہسوی، مولانا نیاز فتحپوری اور بھیا احسان الحق کی۔ بڑھاپے میں صحبت کے اثر کا سوال نہیں تھا اور مجھے تو نظام المشائخ کی ایڈیٹری نے جوانی ہی میں بوڑھا کر دیا تھا۔

بچپن میں باپ کے انتقال کے بعد میں رانڈ کا سانڈ نہیں بنا اور والدہ کے انتقال نے سولہ سترہ برس کی عمر میں چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کا بزرگ بنا دیا تھا۔ کبھی موت الکبری۔ والدہ کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔

جوانی آئی تو ایک دینی اور ثقہ رسالہ کی ایڈیٹری ساتھ لائی۔ جوانی مجھ پر نہیں چھائی میں نے جوانی کو مغلوب کر لیا۔ رسالے کی ایڈیٹری کی وجہ سے حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواری، حضرت اکبر الہ آبادی، علامہ شبلی، علامہ اقبال، شمس العلما مفتی

ذکاء اللہ، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، میر غلام بھیک نیرنگ، حکیم اجمل خان، حکیم رضی الدین، حکیم نابینا، مفتی کفایت اللہ، نواب غلام نصیر الدین (بہادر عرف) غلام نظام الدین (خاکسار) جیسے حضرات سے ملاقاتیں رہی تھیں۔

عربی زبان پوری طرح نہیں سیکھی اور دینی علوم پوری طرح نہیں حاصل کیے۔ مگر عربی زبان سیکھنے اور دینی علوم حاصل کرنے کی کوشش برابر کرتا رہا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب صدر مدرس مدرسۂ امینیہ سے کہہ کہہ کر مدرسۂ امینیہ کے منتہی طلبا عربی سکھانے اور دینی علوم پڑھانے کے لیے لگائے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب رامپوری سے بھی پڑھا اور پھر ان کے شاگرد رشید مولانا محمد ایوّب صاحب کی تقریریں پینتیس (۳۵) سال مسلسل سنیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی میری طرف اس وقت متوجہ ہوئے جب وہ اپنے دورِ "روشن خیالی" کی تصنیفات کو دریا سلائی دکھا چکے تھے۔ مولانا نیاز فتح پوری جس زمانے میں میرے یہاں رہے، اس زمانے میں نادر روزنے کے بڑے پابند تھے۔ جوش ملیح آبادی نے تشریف لا کر مجھے اپنے رنگ میں نہیں رنگا، بلکہ میرے پاس اٹھنے بیٹھنے سے وہ مولانا محمد ایوّب کی تقریروں کے شائق ہو گئے تھے۔

اعمال میرے ناقص ہیں، ایمان ناقص نہیں ہے۔ یہ ایسی نعمت ہے کہ اللہ کا فضل نہ ہوتا اور اللہ تعلیم و تربیت کا رُخ نہ موڑتا تو مجھ جیسے معمولی ظرف کے انسان کو بھلا یہ نعمت کیا میسر آتی! میری زندگی کا کوئی دور الحمد اللہ شکوک اور شبہات میں نہیں گزرا۔ حقِ معرفت تو بڑی چیز ہے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، "ما عرفناک حق معرفتک" میں اپنی ادنےٰ سی حیثیت کے مطابق اللہ کے وجود اور حضور سرورِ کائنات کی رسالت کا فقط اتنا قائل ہوں کہ میری عقل باور نہیں کرتی کہ کائنات کا کارخانہ بغیر کسی کے چلائے چل رہا ہے۔ اپنے آپ کو مثلِ حباب، بلکہ مثلِ خواب محسوس کرتا ہوں اور حقیقی ہستی اسی واجب الوجود کی مانتا ہوں۔ نیز عقل باور نہیں کرتی کہ حضور

حضور سرورِ کائنات جن کا لایا ہوا قرآن پاک اور جن کے اسوۂ حسنہ کا پورا ریکارڈ سامنے موجود ہے، نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر سکتے تھے۔ میں نے معمولی قسم کے اچھے آدمیوں کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا، حضور تو اچھوں کے سردار تھے۔ حضور صلعم سے اچھا انسان تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔

طالب علمی کے زمانے کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ضیاءالدین احمد برنی اور شوکت علی خان میرے ہم جماعت تھے۔ ہم تینوں نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا (میٹرک اس زمانے میں انٹرنس کہلاتا تھا)۔ ایک دن شوکت علی خان مجھے اور برنی صاحب کو اپنے گھر لے گئے۔ ان کا گھر محلہ فراشخانہ میں تھا۔ ان کے والد نواب اکبر علی خان خاصے امیر اور بارسوخ آدمی تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب امیر کابل ہز مجسٹی حبیب اللہ خان وائسرائے کے مہمان ہوئے ہیں، تو ان کی مہمانداری کا اہتمام حکومتِ ہند نے اکبر علی خان کے سپرد کیا تھا۔

خیر، ہم تینوں نواب اکبر علی خان کی شاندار حویلی میں پہنچے ہی تھے کہ ایک صاحب تہبند باندھے اور کرتا کندھے پر ڈالے اور دوسرے کندھے پر بچے کو بٹھائے آتے دکھائی دیے۔ شوکت علی صاحب نے دور سے آواز دی: "تشریف لائیے، بابو جی! اس وقت آپ کی ضرورت تھی۔ بتلائیے، ہم تینوں انٹرنس کے امتحان میں پاس ہوں گے یا نہیں؟" میں اور برنی صاحب اس حویلی میں پہلی دفعہ گئے تھے۔ بابو جی مجھ سے اور برنی صاحب سے واقف نہیں تھے، اور نہ ہم بابو جی کو جانتے تھے، لیکن بابو جی نے بچے کو کندھے سے اتارا، اور سب پر نگاہِ غور ڈالی، برنی صاحب کی بابت کہا: "یہ انٹرنس میں بھی پاس ہو جائیں گے اور بی۔اے بھی کر لیں گے۔ شوکت! تم پاس نہیں ہو گے، تاہم تمہارے لیے گھوڑا مقدر ہے۔ خواہ مالک بنو یا چابک سوار، گھوڑا بہرحال تادمِ مرگ ران تلے رہے گا۔ ان تیسرے صاحب کی (یعنی میری) تقدیر میں بھی امتحان پاس کرنا نہیں ہے۔ مگر ان کا شمار پڑھے لکھے لوگوں میں ضرور ہو گا۔ لاؤ، ان کا تو پورا کچا چٹھا گھسیٹ دوں!"۔۔۔

سائز کا ایک دیم کمرے کے کونے میں پڑا تھا۔ بابوجی نے اس میں سے کاغذ کا تاؤ نکالا، اسے موڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔ بابوجی نے زائچہ نہیں کھینچا، ہاتھ بھی نہیں پڑھا۔ صرف میری صورت پر نظر دوڑاتے تھے اور لکھے چلے جاتے تھے۔ کاغذ کے چاروں رخ بھر دیے اور کاغذ مجھے تھما دیا۔

سه ان بابوجی کا نام کرامت علی تھا۔ یہ باشندے تو پنجاب کے تھے، لیکن دلّی میں بس گئے تھے۔ غالباً شادی دلّی میں کر لی تھی۔ اولادِ بابو کرامت علی کی بالکل دہلوی ہے۔ ایک صاحبزادے، حکیم اقبال حسین ایم اے کراچی میں ہیں۔ انھیں دیکھو لو، دہلویت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ کرامت علی صاحب تجارتی چٹھیاں لکھنے کے ماہر تھے۔ دلّی کے پنجابی سوداگر اپنے آرڈر انگریزی میں ان سے لکھواتے تھے۔ انڈنٹ رائٹری ہی کے باعث بابوجی کہلاتے تھے۔ قیافہ شناسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے انھیں کمال عطا فرمایا تھا۔

میں اللہ کے سوا کسی کو عالم الغیب نہیں مانتا۔ انبیاء کو بھی علمِ غیب اتنا تھا جتنا اللہ نے بتا دیا تھا۔ عالم الغیب فقط اللہ ہے۔ ''وما تدری نفس ماذا تکسب غداً'' کوئی (دعوے سے) نہیں کہہ سکتا کہ وہ کل کیا کرے گا (اور کیا نہیں کرے گا) (۳۱ تا ۳۴) وہ کل زندہ بھی رہے گا یا نہیں۔ علمِ نجوم، فراست الید اور قیافہ شناسی وغیرہ کے ذریعہ کچھ ٹھیک اور کچھ غلط اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ بابو کرامت علی بے حد ذہین انسان تھے۔ مگر میں ان کی جس کرامت کا قائل ہوں، وہ ان کی ایک ادا تھی۔ کرامت علی صاحب نے میری بابت لکھا تھا کہ میں لکھنے پڑھنے کو اوڑھنا بچھونا بنا لوں گا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک کرامت علی صاحب کہیں نظر نہیں پڑے۔ ۱۹۰۹ء میں نظام المشائخ جاری ہوا تو انھوں نے خواجہ فضل احمد صاحبؒ کی معرفت مجھے پیغام بھیجا کہ فلاں جمعہ کو جامع مسجد سے سیدھا تمھارے ہاں آؤں گا۔ چنانچہ تشریف لائے اور اپنی پیشین گوئی کی طرف توجہ دلائی۔ شام تک ٹھہرے اور ہر سال اسی مہینے کے مقررہ جمعہ کو تشریف لاتے رہے۔ اور سال بھر کی ترقی سے

وہ کاغذ میرے پاس ۱۹۴۷ء تک محفوظ تھا۔ اس میں ماضی کے چند حالات بھی تھے وہ صحیح تھے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مستقبل کے حالات بھی صحیح ہوں گے اور صحیح نکل رہے تھے۔ اس لیے کاغذ رکھ چھوڑا تھا۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری میں کھو گیا۔

انٹرنس میں فیل ہونے کی تصدیق تو چھ دن بعد ہی ہو گئی تھی۔ شوکت صاحب بھی فیل اور میں بھی فیل، برنی صاحب پاس۔ یہ اس سال کا قصہ ہے، جس سال امیر حبیب اللہ خان آئے تھے۔ شوکت صاحب نے تعلیم ترک کر دی اور ان کے ابّا نے انھیں ریاست رامپور کی نائب تحصیلداری دلوا دی۔ پھر عرصہ بعد وہ بہار شریف میں سید حسن امام بیرسٹر کی جائیداد کے منصرم ہو گئے اور سید حسن امام کے مر جانے پر سید حسن امام کی یوروپین بیوہ نے ان سے عقد کر لیا اور صرف گھوڑا ہی رانوں تلے نہیں رہا، لاکھوں روپوں میں کھیلنے لگے، ۱۹۴۷ء تک زندہ تھے، اب حال کی خبر نہیں۔ میں نے دو سال اور انٹرنس کے کاٹے کاٹے۔ ۱۹۰۶ء میں بھی فیل ہوا، اور ۱۹۰۷ء میں بھی۔ فارسی کی ابتدائی کتابیں گلستاں، بوستاں وغیرہ اور قرآن پاک ورود دلی سے قبل پڑھ لیا تھا بلکہ کئی پارے حفظ کر چکا تھا جو افسوس کہ اب اچھی طرح یاد نہیں ہیں یا اعزاولت نہیں کر سکا۔

مسیحی مشنریوں کا چھوٹا سا تجربہ

(مس فرانسس: ایک انگریز پادرن)

۱۹۰۳ء تا ۱۹۰۴ء میں ایک نوجوان انگریز عورت مس فرانسس ہمارے محلے کے دروازے کھٹکھٹایا کرتی تھی، اور آواز لگایا کرتی تھی کہ مفت پڑھنا لکھنا سیکھیا

(صفحہ ۵۳ سے آگے) خوش ہوتے رہے۔ مرتے دم تک یہ وضع قائم رکھی۔ سال میں ایک بار سے زائد نہیں آتے تھے، اور سال میں ایک بار مقررہ مہینے میں اور مقررہ جمعہ کو آنا اپنے اوپر لازم کر لیا تھا۔

پڑھنا چاہتی ہو؟ عورتیں اسے دروازے سے آگے قدم نہیں دھرنے دیتی تھیں۔ فوراً جواب ملتا تھا کہ ہم نہیں پڑھنا چاہتے۔ پورے محلے میں صرف تین بیویوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایک میر سراج الحسن کی بیوی نے، جو بعد میں ڈاکٹر اظہر علی کی ساس بنیں۔ دوسری مسٹر آصف علی کی والدہ اور خالہ نے۔ تیسری عبد الغفور عرف گپتو کی بیٹیوں نے۔ میر سراج الحسن کی بیوی اور مسٹر آصف علی کی والدہ پڑھتی پڑھاتیں کیا، مس فرانسس ان کی تفریح کا سامان تھی۔ گپتو کی بیٹیوں نے البتہ تھوڑی بہت انگریزی سیکھ لی۔

محلے کے مسلمانوں سے مایوس ہو کر مس فرانسس نے محلے کے چماروں کی طرف توجہ کی، جنھیں وہ چیمبر کہتی تھی۔ چماروں کے کوچہ چیلاں میں کئی گھر تھے۔ مس فرانسس نے چمار لڑکیوں کے لیے باقاعدہ مدرسہ کھول دیا۔ مس فرانسس مشنری عورت تھی۔ روپیہ انگلستان سے آتا تھا جسے وہ مدرسے ہی پر لگاتی تھی، خود انتہائی سادگی کے ساتھ رہتی تھی۔ شادی اس نے عمر بھر نہیں کی۔ یہی مدرسہ اس کا شوہر تھا یہی مدرسہ اس کی اولاد۔ وہ مدرسہ آہستہ آہستہ مس فرانسس گرلز ہائی اسکول ہو گیا۔ آخر چمار لڑکیوں کی دیکھا دیکھی مسلمان لڑکیوں نے بھی اسے نوازنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمان دلّی سے بھاگے ہیں، تو یہ اسکول سائیں سائیں بولنے لگا تھا۔ ننانوے فی صد طالبات اس اسکول کی مسلمان تھیں۔ اور ایک فی صد چماریاں، جو اب عیسائنیں تھیں۔ مس فرانسس گرلز اسکول میں ہندو لڑکی کوئی نہیں تھی، ہندو لڑکیوں کے اپنے اسکول اور کالج تھے۔

مس فرانسس نے چماروں کو تو عیسائی کیا۔ مرد مشنری چماروں کو عیسائی کرتے رہتے تھے۔ مس فرانسس چماروں کو عیسائی کرتی رہی، لیکن مسلمان لڑکوں کو سینٹ اسٹیفنز مشن ہائی اسکول اور سینٹ اسٹیفنز مشن کالج نے نہیں چھیڑا۔ مسلمان شہد کھلانے سے مر سکتے ہوں، تو انھیں زہر کھلا کر کیوں مارا جاتا:

یوں قتل کی لڑکوں کے پڑتی نہ ضرورت　　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

حالات ایسے کر دینے کافی ہیں کہ اسکول اور کالج میں پڑھے بغیر چارہ نہ رہے۔ مجھ جیسا شخص بلکہ اکبر الٰہ آبادی جیسا شخص اولاد کو اسکولوں اور کالجوں میں بھیجنے پر مجبور ہو جائے۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم اور فضا ایسی رکھنی کافی ہے کہ مسلمان بچے اور بچیاں اپنی معاشرت، اپنے تمدن اور اپنے دین کو شبک اور ہلکا محسوس کرنے لگیں بس مسلمان کو مسلمان نہ رہنے دیا جائے اور بچے اور بچیاں ماں باپ کو خبطی سمجھنے لگیں۔ مس فرانسس گرلز ہائی اسکول کی طویل عمر میں ایک لڑکی عیسائی ہوئی تھی جس کا باپ سر پہ ہنڈا اٹھائے برف کی قلفیاں بیچتا پھرتا تھا اور وہ بھی دوبارہ مسلمان ہوگئی تھی۔

عیسائی مبلغ حکومتِ الٰہیہ کی خاطر نہیں، حکومتِ فلاں ملک اور حکومتِ فلاں ملک کے مضبوط اور مستحکم کرنے کی خاطر جیسے سلیقے اور جیسی دلسوزی سے کام کرتے ہیں، وہ رشک کے قابل ہے۔ کبھی مسلمان مبلغ اللہ کی حکومت کی خاطر اس سے زیادہ دلسوزی سے کام کیا کرتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے کروڑوں مسلمان ان ہی قدیم مبلغوں کی کرامت ہیں۔ آج کل تو تبلیغ اسلام مفقود ہے، ابتدائے سلام میں ہر مسلمان مبلغ تھا جو صرف اپنے کردار سے لوگوں کو اسلام کی طرف کھینچ لیتا تھا؛ اہلِ تصوف نے تبلیغ کو اپنا مشن قرار دیا۔ حضرت داتا گنج بخش لاہور میں اور حضرت خواجہ معین الدین اجمیر میں پیدا نہیں ہوئے تھے، دور دراز مقامات سے اسلام پھیلانے ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ان کے سفر کی صعوبتوں کا عیسائی مشنری کیا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور انھیں ہندو پنڈتوں اور سادھوؤں نے جتنا پریشان کیا تھا، عیسائی مشنری اس پریشانی کو کیا جانیں! عیسائی مشنریوں کی تو حکومتِ انگریزی پشت پناہ تھی اور ہے۔ حضرت داتا گنج بخش اور خواجہ معین الدین کا اللہ کے سوا کونسا سہارا تھا! اور پھر جب یہاں مسلمانوں نے حکومت قائم کرلی تو مسلم حکومتیں ان مبلغوں کی کون سی سرپرستی کرتی تھیں! حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے سات مسلمان بادشاہتیں دیکھیں۔ سات میں سے چھ بادشاہ حضرت خواجہ

نظام الدین اولیا کے اثر و رسوخ سے جلتے ہی رہے، اور مغل بادشاہوں کو تو اپنے اقتدار اور اپنے عیش ہی سے فرصت نہیں ملی، جو اسلام اور تبلیغ اسلام کی فکر کرتے

سیّد حیدر رضا سے دوستی

میں گذشتہ صفحات میں لکھ آیا ہوں کہ پہلی دوستی میری اپنے خالہ زاد بھائی سیّد محمد ادریس سے ہوئی تھی، جو مجھ سے تین برس بڑے تھے۔ دوسری دوستی میری خواجہ فضل احمد خان شیدا سے ہوئی۔ یہ مجھ سے آٹھ برس بڑے ہیں۔ اوّل اوّل میرا ان کا تعلق سالے بہنوئی کا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں میری بہن روشن آرا بیگم شیدا صاحب سے بیاہی گئی تھیں۔ اس وقت میری عمر میں اور ان کی عمر میں نمایاں فرق تھا۔ دوستی کیسے ہوتی! لیکن کچھ عرصے بعد میری بہن کا انتقال ہو گیا اور تعلق نے دوستی کی شکل اختیار کر لی، اور جوں جوں میری عمر بڑھتی گئی اور عمروں کا فرق گھٹتا گیا، دوستی ترقی کرتی گئی، یہاں تک کہ شیدا صاحب، مولانا راشد الخیری اور مولانا عارف ہسوی وا۔۔ میرے گروپ میں شامل ہو گئے۔ دوستوں کے اس گروپ کا مفصّل ذکر ان شاء اللہ آگے کروں گا۔

تیسرے نمبر پر دوسرے دوست مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی اور قاضی لطیف الحق تھے۔ بھائی ادریس کی دوستی میں اور کوئی شریک نہیں تھا۔ بھائی فضل احمد شیدا بھی مدّتوں اکیلے دوست رہے، مگر مولانا احمد سعید، مسٹر آصف علی اور قاضی لطیف الحق حقّی کا گروپ دوستوں کے دوگروپ کا پہلا گروپ تھا، جو مجھے ملا۔ مولانا احمد سعید اس وقت حافظ احمد سعید تھے۔ مسٹر آصف علی میرے ہم جماعت تھے اور قاضی لطیف الحق حقّی ہم محلّہ۔ ہم محلہ تو ہم تینوں ہی تھے۔

مسٹر آصف علی اور میرے ایک اور ہم جماعت مسٹر رفاقت علی کا سیّد حیدر رضا سے دوستانہ تھا۔ حیدر رضا تھے تو نوجوان، ہم سے فقط چار چار، پانچ پانچ سال بڑے سال کے سال ایم۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دیتے تھے اور فیل ہو جاتے تھے۔

مگر نہایت اچھا نہ بولنے والے، اور نہایت اچھا لکھنے والے۔ ہزارہا کے مجامع میں دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔ اور ایک ہفتہ وار اخبار "آفتاب" کا نکال رکھا تھا، اس میں دھڑلے سے اسپِ قلم دوڑاتے تھے۔ مسٹر آصف علی اور رؤف علی ان کے لیفٹیننٹ مشہور تھے۔ پھر تینوں بیرسٹری پڑھنے انگلستان سدھارے۔ حیدر رضا نے کسی کروڑپتی انگریزن سے شادی کرکے انگلستان ہی میں ڈیرے ڈال دیے۔ اٹھارہ یا بیس برس بعد انگریز بیوی مرگئی تو دلّی لوٹے۔ لیکن مولانا محمد علی کے سامنے چراغ نہ جل سکا۔ آصف علی اور رؤف علی ۱۹۱۰ء میں واپس آگئے تھے۔ رؤف علی نے بیرسٹری کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ رؤف علی دلّی کے کامیاب بیرسٹروں میں سے تھے، آصف علی بیرسٹری بھی کرتے رہے، اور سیاست کے بھی رسیا رہے۔ آل انڈیا کانگریس کی ہائی کمانڈ کے ممبر تھے۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہوئی تو وزیر بنے، سفیر بنے، اور گورنر بنے۔

انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء سے قائم تھی۔ مگر مسلمان اس کے قریب نہیں جاتے تھے۔ بال گنگادھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے کے دور تک مسلمان کانگریس سے بھاگتے تھے۔ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء تک کل سات آٹھ مسلمانوں نے کانگریس کی ممبری قبول کی تھی۔ ان میں سید حیدر رضا، مسٹر محمد علی جناح، اور مولانا حسرت موہانی کے اسمائے گرامی یاد ہیں۔ اوروں کو میں بھی بھول گیا اور دنیا نے بھی بھلادیا۔ سید حیدر رضا بھی شاید کم لوگوں کو یاد ہوں۔ شمالی ہند کے مسلمان اخبارات مسلمانوں لیگیوں کے سخت مخالف تھے۔ مولانا حسرت موہانی کو شریان حسرت موہا اور سید حیدر رضا کو موہانے حیدر رضا لکھتے تھے۔ میں بھی روزانہ "پیسہ اخبار" لاہور، ہفتہ وار "وطن" لاہور اور سہ روزہ "وکیل" امرتسر میں حیدر رضا کے خلاف مراسلے بھیجتا رہتا تھا۔ آصف علی کو میرے مراسلے کھلتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے "میں حیدر رضا سے آپ کی ملاقات کرانی چاہتا ہوں۔" لال قلعہ کے دلّی دروازہ کے بالمقابل ایک کنواں تھا، حیدر رضا فراش خانے سے وہاں آگئے۔ [illegible]

اور رؤف علی کوچہ چیلان سے مجھے لے گئے اور ہم دونوں کی ملاقات کرادی۔

سی کانگریسی مسلمان کا مسلمانوں پر اثر نہیں تھا۔ سات آٹھ مسلمان کانگریسی لیڈر اگر تھے تو ہندوؤں کے تھے، مسلمانوں کے نہیں تھے۔ البتہ حیدر رضا کا دلی کے مسلمانوں پر اثر تھا۔ باہر تو ان کی گاڑی بھی ہندو کھینچتے تھے۔ لیکن دلی کے تمام مسلمان ان کے گرویدہ تھے۔ حیدر رضا تقریریں عام مسلمانوں کے مطلب کی کرتے تھے۔ محلہ سوئی والان میں تقریر کی تو کہا کہ یہ سوئیاں، تو انگریزوں کے تم بھی چبھو سکتے ہو۔ سوئیاں ہی لے کر کھڑے ہو جاؤ۔ ایک مرتبہ اعلان کیا گیا کہ فلاں دن، فلاں وقت، کمپنی باغ میں فلاں جگہ پر سید حیدر رضا تقریر فرمائیں گے۔ حکومت نے جھٹ دفعہ ۱۴۴ لگادی۔ مگر لوگ جوق در جوق جمع ہو گئے کہ دیکھیں حیدر رضا دفعہ ۱۴۴ توڑتے ہیں یا نہیں۔ حیدر رضا آئے، لیکن کمپنی باغ میں رکے نہیں۔ لوگوں نے بھی ان کی اتباع کی، آگے آگے حیدر رضا پیچھے پیچھے ہزاروں کا ہجوم۔ راستہ میں ہجوم اور بڑھتا گیا۔ جو دیکھتا ساتھ ہو لیتا۔ حیدر رضا کمپنی باغ سے نکل کر جمنا کے پل کی طرف روانہ ہوئے۔ پل کا ایک سرا دلی گورنمنٹ کے ماتحت تھا اور دوسرا سرا یو پی گورنمنٹ کے ماتحت۔ یو پی کے حدود میں پہلے پر کھڑے ہو کر حیدر رضا نے کہا: "تم ہندوستان میں چالیس کروڑ ہو اور انگریز صرف دو لاکھ ہیں۔ تم تھوک دو تو خالی تمہارے تھوک سے انگریز دب جائیں گے۔" ایسے فقرے اور ایسے تماشے ہندوؤں سے زیادہ مسلمانوں کو پسند تھے۔ دلی کے مسلمان ساری رات حیدر رضا کے مکان کا پہرہ دیتے تھے۔ اور گرفتاری کی صورت میں حیدر رضا پر جان نثار کرنے کو تیار رہتے تھے۔ چنانچہ دو ڈھائی برس حیدر رضا کا ڈنکا بجا اور حکومت حیدر رضا کا بال بیکا نہیں کر سکی۔ وہی حکومت جس نے ۱۹۱۲ء میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا تھا ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء میں حیدر رضا سے نہیں الجھ سکی، حالانکہ وہ حکومت کی زیادہ مضبوطی کا زمانہ تھا۔

ایک شام کو کمپنی باغ میں اہل حکومت کا جلسہ ہو رہا تھا۔ چیف کمشنر اور

ڈپٹی کمشنر رائے بہادروں اور خان بہادروں کے درمیان براجمان تھے۔ اسٹیج قالینوں اور صوفا سیٹوں سے آراستہ تھا۔ حاضرین کے لیے بید کی کرسیاں بچھی تھیں۔ جلسہ جاری تھا کہ حیدر رضا جلسہ گاہ کے برابر سے گذرے اور ذرا اوپر جاکر ٹھہر گئے۔ خلافت نے سرکاری جلسے کو دعوت دی تو بتائی اور نوے فی صد آدمی حیدر رضا کے پاس چلے گئے اور حیدر رضا کی تقریر شروع ہو گئی۔ رائے بہادروں اور خان بہادروں کی بات سننے والے نہیں رہے تو وہ بھی مع چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر اٹھ گئے اور اسٹیج پر حیدر رضا نے اور بید کی کرسیوں پر عوام نے قبضہ کر لیا۔ تقریر اسٹیج پر مکمل کی گئی۔

حیدر رضا کی ملاقات سے قبل میں ان کے ایک جلسے میں گیا تھا۔ جلسہ گاہ کے دروازے پر بوڑھے مسلمان سب انسپکٹر پولیس نے کہا: "بیٹے! تم اپنی زندگی کیوں خراب کرتے ہو۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔" ملاقات کے بعد بھی ایک ہی جلسے میں شریک ہوا جہاں حیدر رضا نے صدارت کرنے کے لیے مجھ سے کہا مگر میری ہمت نہیں پڑی۔ میری عمر کے اور میری حیثیت کے لڑکے کو صدر بنانے کے معنی یہ تھے کہ پڑھے لکھے مسلمان، آصف علی اور شوکت علی کے سوا دلی میں بھی حیدر رضا کے ہمنوا نہیں تھے۔

میرا اور حیدر رضا کا دوستانہ سیر سپاٹوں تک محدود تھا۔ حیدر رضا، آصف علی اور شوکت علی اتوار کے اتوار، کبھی ہمایوں کے مقبرے، کبھی منصور کے مقبرے کبھی اوکھلے، کبھی قطب صاحب ضرور جاتے تھے، اور مجھے بھی لے لیتے تھے باقی دنوں میں حیدر رضا دکھائی دیتے تھے تو خاص خاص موقعوں ہی پر دکھائی دیتے تھے۔ مثلاً مرزا غلام احمد قادیانی دلی آئے، اور اعظم خاں کے حویلی کے نزدیک الف خان روشنائی والے کا مکان کرایے پر لیا، ہم چاروں بھی ان کے دیدار کرنے گئے۔ مرزا صاحب مکان کے بڑے ہال میں تشریف فرما تھے، اور ان سے پانچ گز پرے حکیم نورالدین الگ بیٹھے تھے۔ حیدر رضا نے مرزا صاحب

سے چند سوال کیے۔ مرزا صاحب نے حکیم نورالدین سے کہا: "بھئی! تم جواب دو۔ میں تو اندر جارہا ہوں۔" حیدر رضا بولے "حضرت! ہم تو آپ کے جواب کے مشتاق ہیں۔ اور سے ہمیں بات نہیں کرنی ہے۔" مرزا صاحب نے التفات نہیں فرمایا اور زنان خانے میں چلے گئے۔

المختصر حیدر رضا کی سیاست سے مجھے دلچسپی ملاقات کے بعد بھی نہیں ہوئی۔ جس سیاست میں للہیت نہ ہو، وہ مجھے اپیل نہیں کرسکتی۔ بھلا للہیت کی صورت میں یہ ممکن تھا کہ حیدر رضا کو ان کے تحصیلدار چچا نے "غالباً" حکومت کے اشارے سے لالچ دیا کہ مجھ سے پیسہ لو اور بیرسٹری پڑھنے انگلستان جاؤ۔ واپس آنے پر اپنا داماد بھی بنا لوں گا اور حیدر رضا انگلستان چلے گئے اور "ہندوستان انگریزوں کا نہیں ہے" کہتے کہتے خود ایک انگریزن کے ہو گئے۔

حیدر رضا کی بیرسٹری مطلق نہیں چمکی۔ ریاست حیدرآباد، دکن کے اضلاع میں کہیں پریکٹس کرتے تھے۔ وہیں ۱۹۲۲ء یا ۱۹۲۳ء میں انتقال ہو گیا۔

خواجہ حسن نظامی سے ملاقات

والد کے انتقال کے وقت میں بارہ تیرہ برس کا تھا۔ تایا حافظ محمد ایوب پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ چچا حافظ محمد عمر کا بھی سال بھر کے اندر اندر انتقال ہو گیا۔ باقی کنبہ بارہ تیرہ برس کے بچے کی طرف توجہ کیا کرتا۔ کس کی بکری کون ڈالے گھاس۔ والدہ زندہ تھیں۔ لیکن ان کے بھائی سید ضمانت علی اپنی نوکری پر دلی سے باہر تھے۔ اور دور کے عزیز کوچہ چیلان میں نہیں رہتے تھے۔ کوچہ چیلان میں صرف ددھیال تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد بڑی پھوپی امتہ القدیر بیگم نے سرپرستی کی۔ مگر والدہ کی زندگی تک پھوپی اور والدہ نند اور بھاوج بنی رہیں۔ والدہ کا انتقال ۱۹۰۴ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۹ء

کے درمیان بڑی پھوپی نے مجھے اور میرے بھائی بہن کو سنبھالا۔ والدہ کی زندگی میں ہم نے رہائشی مکان نہیں بدلا تھا۔ والدہ رحلت کر گئیں تو رہائشی مکان ہم تین بچوں کے لیے بہت بڑا تھا۔ اسے کرایے پر دے دیا گیا۔ اور کم کرایے کا مکان گلی مسجد کالے خان میں لے لیا گیا۔ وہیں بڑی پھوپی آگئیں۔ موروثی جایداد کی آمدنی اتنی تھی کہ میری اور میرے بہن بھائی کی گذر بسر آسایش سے ہوتی تھی۔ لیکن میرا دل مطمئن نہیں تھا۔ بچپن تھا، اور ماں کی محبت اور باپ کی شفقت کو ڈھونڈتا تھا۔ والدہ کی محبت کا ایک واقعہ میرے دل پر آج بھی نقش ہے۔ والدہ مرض الموت میں مبتلا تھیں اور قریب المرگ تھیں تو انتقال سے آٹھ دس روز پہلے کا واقعہ ہے کہ میں اپنے بہنوئی خواجہ فضل احمد خاں شہید کے یہاں بیٹھا تھا۔ بہن نے پان دیا۔ چھالیہ میں تمباکو کے ذرات مل گئے تھے۔ پان کھاتے ہی میں چکرا گیا۔ اسی حالت میں بھائی فضل احمد مجھے میرے گھر لائے۔ والدہ نے یہ حالت دیکھی، تو بات معمولی تھی، مگر وہ اپنی بیماری بھول گئیں۔ ایک دم اٹھ بیٹھیں اور سراسیمہ ہو گئیں۔ والدین کی محبت اور شفقت کا اس عمر میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا، لیکن جوں جوں میں بڑا ہو گیا، یہ واقعہ میری یاد میں ابھرتا گیا۔ ادھر کیفیت یہ کہ محبت اور شفقت تو بڑی چیز ہے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا کہ میاں کیسے ہو۔ والد کی زندگی میں جو سر چڑھاتے تھے، وہ کبھی کبھی الٹے کچوکے لگا دیتے تھے۔ غرض محبت اور شفقت کی تلاش تھی کہ ۱۹۰۰ء میں خواب دیکھا کہ مکان کے صحن میں لیٹا ہوں، اور چاند کا نظارہ کر رہا ہوں۔ چاند میں یکایک سمندر نمودار ہوا اور اس سمندر سے ایک غوطہ خور غوطہ لگا کر نکلا اور زمین پر اترنے لگا اور سمندر کی فتوحات سیدھا میرے مکان میں اتر پڑا۔

یہ خواجہ حسن نظامی کی تحریروں کی مسیں بھیگنے کا زمانہ تھا۔ تحریروں کے شباب کی ابتدا تھی۔ ان کے انوکھے تصورات اور تاثرات اور دلکش اور مستانہ انداز

کا میں غائبانہ گرویدہ تھا۔ لیکن ملنے جلنے کا شوق چوں کہ نہیں ہے، مشتاق ہونے اور بہ فقط تین میل کے فاصلے پر رہنے کے باوجود ان کے پاس جانے کا ارادہ نہیں کر سکا۔

میرے چچازاد بھائی سید منظور احمد (ابن حافظ محمد عمر) علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ وہ کرسمس کی تعطیلات میں دلی آئے اور اپنے کسی ہم جماعت کو ساتھ لائے۔ میں اور منظور احمد اس ہم جماعت کو چاندنی چوک کی سیر کراتے پھر رہے تھے کہ گوہرِ مقصود سامنے آ گیا۔ محمد مرتضیٰ مشتاق میرے استاد تھے، اور غلام نظام الدین عرف خاکسار، خواجہ صاحب کے مربی۔ چاندنی چوک میں مشتاق صاحب اور خاکسار صاحب کی دکانیں قریب قریب تھیں۔ میں مشتاق صاحب کی دکان پر رکا۔ خواجہ صاحب اس وقت خاکسار صاحب کے پاس بیٹھے تھے اور اتفاقاً کسی ضرورت سے مشتاق صاحب کی دکان پر تشریف لے آئے۔ میری تحریریں بھی اخبارات میں چھپنے لگی تھیں۔ مشتاق صاحب نے میرا اور خواجہ صاحب کا تعارف کرا دیا۔ اب جو شکل، قد و قامت اور جسم کی ساخت دیکھتا ہوں، تو ہو بہو وہی غوطہ خور، جنھیں چاند کے سمندر سے اپنے گھر میں اترتے خواب میں دیکھا تھا۔ (میرا خیال ہے کہ میں نے عمر بھر اس کے سوا خواب اور کوئی نہیں دیکھا۔ اور یہ ایسا خواب تھا کہ جس کی تعبیر بھی دیکھ لی۔ باقی جنھیں خواب سمجھا گیا، خواب نہ تھے، اضغاث احلام تھے)

خیر ملاقات ہو گئی، لیکن وہی بڑھ کر نہ ملنے کی طبیعت۔ فلا سفاپ نہیں، تو سیمی کولن لگا رہا۔ میں طبیعت سے مجبور تھا اور خواجہ صاحب کو کیا پڑی تھی جو یاد رکھتے۔ لیکن مشیتِ ایزدی کو ہم دونوں نہیں ٹال سکتے تھے۔ ایک لندن گھنٹہ گھر کے سامنے پھر آمنا سامنا ہو گیا۔ پہلی ملاقات ۱۹۰۷ء کے دسمبر میں ہوئی تھی۔ یہ دوسری ملاقات ۱۹۰۸ء کے مئی یا جون میں ہوئی۔ میں نے انٹرنس کا امتحان دیا تھا اور فیل ہو گیا تھا۔ خواجہ صاحب نے میرے چہرے

سے پڑھا کر میں غمگین ہوں۔ پوچھا "چہرے پر پریشانی کیوں ہے؟" میں نے بتایا کہ فیل ہو جانے کی پریشانی ہے۔ فرمایا "پھر کیا ہوا۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں۔" میں نے عرض کیا "تین سال سے متواتر گر رہا ہوں۔" بولے: "انٹرنس پاس کر کے کیا کرتے؟" میں نے کہا: "انگلستان جاتا۔" سوال کیا: "انگلستان جا کر کیا بنتے؟" جواب دیا: "بیرسٹر" فرمایا: "بیرسٹر مشو، چیزے دیگر بشو۔ آؤ، میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں اس عروج تک پہنچنے کا راستہ بتاؤنگا، جہاں بیرسٹر نہیں پہنچتے۔" خواجہ صاحب مجھے اپنی دلی کی قیامگاہ، نواب بڈھن کی محل سرا لے گئے۔ اور بہت دیر اس طرح سمجھاتے رہے کہ میرے دل نے اطمینان اور دماغ نے سکون محسوس کیا۔ والد کے انتقال کو ساڑھے چھ اور والدہ کے انتقال کو چار سال گذر چکے تھے۔ خواجہ صاحب کی پہلی گفتگو ایسی تھی، جیسے والد اور والدہ کا بدل مل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کے پردے میں میرا ہاتھ تھام رہا ہے۔

نظام المشائخ کا اجرا

خواجہ حسن نظامی صاحب سے دوسری دفعہ ملنے کے بعد میں نے ان کے ہاں اور انھوں نے میرے ہاں جانا آنا شروع کر دیا۔ نواب بڈھن کی محل سرا اور میرے مکان میں پون میل کا فاصلہ تھا، بلکہ اور کم۔ خواجہ صاحب حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین اور متوسلین میں سے تھے۔ سلطان المشائخ نے شادی نہیں کی تھی۔ حضرت کی درگاہ کی دیکھ بھال کرنے والے حضرت کے اولاد نہیں ہیں، حضرت کے قریبی عزیزوں اور ممتاز مریدوں کی اولاد ہیں۔ ان لوگوں کی حالت وہی ہے، جو ہندوستان اور پاکستان کی تمام درگاہوں کے متعلقین اور متوسلین کی ہے۔ نسل کے اعتبار سے یہ حضرات کتنے ہی اونچے ہوں، فقط نسل کا نام لینے سے اونچائی

پر ٹھہر نہیں سکتے۔ خواجہ صاحب کے جدِ اعلیٰ مولانا سید محمد حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی نواسے اور حضرت سلطان المشائخ کے منہ بولے بیٹے تھے۔ لیکن خواجہ صاحب کی ولادت سے بہت قبل خواجہ صاحب کا خاندان بھی درگاہِ حضرت سلطان المشائخ کے دوسرے خاندانوں کی طرح برگزیدگی کھو چکا تھا۔ پھر طرّہ یہ کہ بارہ سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے باپ اور ماں کے سایے سے محروم کر دیا۔ بڑے بھائی خواجہ سید حسن علی نے کچھ سنبھالا کچھ نہیں سنبھالا بچپن نہایت عسرت کے ساتھ کٹا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جانے کے بعد تو خواجہ صاحب کو درگاہ کی آمدنی کی حاجت کیا تھی، لیکن اس آمدنی نے ان کا ساتھ والدین کا انتقال ہوتے ہی چھوڑ دیا تھا۔ درگاہ کی آمدنی بڑے بھائی ہی کے واسطے کافی نہیں تھی۔

ایک مرتبہ خواجہ صاحب راجہ نوشاد علی خان، تعلقہ دار، جہانگیر آباد (اودھ) کو درگاہِ حضرت سلطان المشائخ کی زیارت کرانے لے گئے۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے بستی نظام الدین کی رہائش ترک کر رکھی تھی، اور دلی میں میرے پاس رہتے تھے۔ اس لیے میں بھی ساتھ تھا۔ درگاہ شریف کے دروازے پر جوتوں کی رکھوالی کرنے والے موجود ہوتے تھے۔ ہم سب نے جوتیاں ان کے سپرد کیں اور واپس آکر رکھوالوں کو کچھ دینے کی غرض سے خواجہ صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اکنّی یا دوئنّی دینی چاہتے تھے۔ ہاتھ میں روپیہ آگیا اور خواجہ صاحب نے روپیہ ہی دے دیا اور راجہ صاحب سے فرمایا کہ بچپن میں مجھے بھی یہاں بیٹھنا پڑتا تھا اور میں ایک ایک پیسہ انعام کا لیا کرتا تھا۔

میں جب ملا ہوں، تو خواجہ صاحب جوتوں کی رکھوالی سے ترقی کرتے کرتے اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے مدرسۂ دینیات میں پڑھ پڑھا کر اس درجے پر پہنچ گئے تھے کہ ان کے مضامین دلی کے رسالہ "زبان" کان پور کے رسالے "زمانہ" اور لاہور کے رسالہ "مخزن" جیسے بلند پایہ ماہناموں اور اودھ کے اخبار

"البشیر"، امرتسر کے اخبار "وکیل" اور لاہور کے اخبار "وطن" جیسے با اثر پرچوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ اور ملک میں خاص شہرت ہو چلی تھی۔ مولانا ابو الکلام، مولانا عبداللہ عمادی، میر بشارت علی جالب، مولوی انشاء اللہ خاںؒ میر غلام بھیک نیرنگ، علامہ اقبال، علامہ شبلی، اور مولانا شاہ سلیمان کے مرتبے کے حضرات ان سے ملاقات کرنے آتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں نواب محسن الملک نے امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان کے استقبال میں شرکت کے لیے علی گڑھ بلایا تھا۔

مئی/جون ۱۹۰۸ء سے مئی/جون ۱۹۰۹ء تک خواجہ صاحب نے مجھے زیرِ تربیت رکھا۔ میری عمر اکیس (۲۱) برس کی تھی اور خواجہ صاحب اکتیس (۳۱) برس کے تھے۔ بڑھاپے میں دس برس کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن اکتیس برس اور اکیس برس کی عمروں میں تراشیدہ انسان اور ناتراشیدہ نوجوان کا فرق تھا۔ اسی وقت کا اثر ہے کہ میں اپنے سے بتیس سال بڑے مولانا راشد الخیری کو تو اپنا دوست کہتا ہوں، مگر خواجہ صاحب کے صرف دس برس بڑے ہوتے سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ مجھے دوست ضرور کہا کرتے تھے، میں نے ان کے واسطے دوست کا لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا تھا، اور میرے سر پہ ہاتھ دھرا تھا۔ وہ مرتے دم تک میرے بزرگ ہی رہے۔

آخر ۱۹۰۸ء یا شروع ۱۹۰۹ء میں خواجہ صاحب نے حلقۂ نظام المشائخ یعنی مشائخ صوفیہ کی تنظیم کرنے والی انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اس انجمن کا پہلا جلسہ شہنشاہ شاہ جہان کے صوفی بیٹے داراشکوہ کی قبر پر ہوا تھا۔ یہ قبر مقبرۂ ہمایوں میں ہے۔ پہلے جلسے میں خواجہ صاحب کے ساتھ میں شریک تھا اور شاید تین نوجوان اور تھے، ضیاء الدین احمد برنی، مرزا نعیم اللہ بیگ، اور مرزا یعقوب بیگ نامی۔ تینوں خواجہ صاحب کے گردیدگان میں تھے۔ ہمارے علاوہ درگاہِ حضرت سلطان المشائخ کے پیرزادہ سید محمد صادق اور درگاہِ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی رحمۃ اللہ علیہ

کے پیرزادے علاؤالدین نصیری اور درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک پیرزادے نے قدم رنجہ فرمایا تھا جس کا نام یاد نہیں آرہا۔ غرض زیادہ سے زیادہ آٹھ آدمیوں کا اجتماع تھا۔ لیکن اردو کے تمام مسلم اخبارات نے حلقہ نظام المشائخ کا خیر مقدم کیا۔

اس اجتماع کے بعد خواجہ صاحب اجمیر، پاک پٹن اور پیران کلیر گئے اور وہاں کے سجادہ نشینوں کو حلقے کا ممبر بنایا۔ دلی کی قیامگاہ میں جو نمایاں آدمی آتا تھا اسے بھی ممبر بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے مولانا ابوالکلام سے ممبر بننے کو کہا گیا تو ممبری کے فارم میں حلقے کے اغراض و مقاصد اور شرائط ممبری درج تھے اور ایک شرط تھی کہ حلقے کے ممبر کو مسلم لیگ کی ہمنوائی کرنی ہوگی۔ مولانا ابوالکلام ممبر بن گئے، لیکن دستخط کے اوپر مندرجہ ذیل الفاظ لکھ دیے۔

"ذلک کذالک بہ استثنائے ہم نوائی مسلم لیگ"

مئی - جون ۱۹۰۹ء میں خواجہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ حلقہ نظام المشائخ کا آرگن "نظام المشائخ" کے نام سے جاری کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے پرچے کی لکھائی چھپائی اور کاغذ اور روانگی کے واسطے ڈیڑھ سو روپے کی ضرورت ہے پچھتر مجھ سے لو اور پچھتر تم لے آؤ۔ رسالے کے مالک ہم دونوں ہونگے۔ اور دوسرے پرچے کے واسطے انشاء اللہ روپے کی ضرورت نہیں پڑیگی۔ پہلا پرچہ اتنے خریدار مہیا کر دیگا کہ ان کے چندوں سے دوسرا پرچہ چھپ جائیگا۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہیگا۔ اپنی جیب سے پہلے ہی پرچے پر روپیہ لگانا ہے۔

میری بڑی پھوپی امتہ القدیر بیگم میری اور میرے بھائی بہن کی جائیداد کی گورنمنٹ کی طرف سے (GUARDIAN) تھیں۔ میں نے ان سے پچھتر روپے مانگے۔ پھوپی صاحبہ کے خسر میر مشتاق علی (دلی کے مشہور قدیم وکیل) کا خواجہ صاحب کے خاندان سے کچھ رشتہ تھا۔ خواجہ صاحب کے چچازاد بھائی پھوپی صاحبہ کے پاس تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کا نہ جانے خواجہ صاحب سے میل جول کیوں نہیں

تھا۔ پھوپی صاحبہ نے ممکن ہے خواجہ صاحب کے چچا زاد بھائی سے مشورہ کیا ہو۔ خواجہ صاحب کی تحریکات کے ان کے سارے عزیز خلاف تھے۔ ادھر میرے بعض کہنے والوں نے پھوپی صاحبہ کو بھڑکایا۔ المختصر پھوپی صاحبہ نے میری درخواست کا جواب دیا کہ "حسن نظامی تجھے تباہ کر دیگا۔ تیری جائداد بھی بکوائیگا اور تیرے ہاتھ میں ہتھکڑیاں بھی ڈلوائیگا۔" میرے بعض کہنے والوں نے پھوپی صاحبہ سے کہا تھا کہ اخبار والے جیل پہنچا دیے جاتے ہیں۔ میں نے اصرار کیا تو پھوپی صاحبہ نے فرمایا: "میں تیرے ساتھ تیرے بھائی بہن کو برباد نہیں ہونے دونگی۔ ماں کا جتنا زیور ہے، اور گھر میں جتنا سامان ہے، وہ بہن کے لکھ، اور پچھتر روپے لے جا اور پھونک دے، انھیں جس طرح جی چاہے۔" میں نے یہ شرط منظور کرلی اور تمام زیور اور تمام سامان سے دست برداری لکھ دی اور پچھتر روپے خرچ کر کے ایک ماہنامہ کا آدھا مالک اور اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گیا۔

خواجہ صاحب نے جو اندازہ کیا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ پہلے پرچے سے دوسرے پرچے کا خرچ اور دوسرے پرچے سے تیسرے پرچے کا خرچ ملنا شروع ہوگیا۔ اور مجھے اور خواجہ صاحب کو اپنی جیبوں سے نظام المشائخ پر مزید ایک پیسہ نہیں لگانا پڑا۔

خواجہ صاحب عجیب و غریب حوصلے کے انسان تھے۔ خواجہ صاحب کی مالی حالت اس وقت زیادہ بُری نہیں تھی، تو کچھ اچھی بھی نہیں تھی۔ لیکن دوستوں اور مہمانوں کی مدارات میں بیدریغ روپیہ صرف کرتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ خود انھیں بعض وقت فاقہ کرنا پڑ جاتا تھا۔ اور فاقے کا علم مجھے بھی نہیں ہونے دیتے تھے۔ خواجہ صاحب میں افلاس کو ظاہر نہ ہونے دینے کا بھی حوصلہ تھا اور عروج پا جانے کے بعد افلاس کے دور کی باتیں بیان کر دینے کا بھی حوصلہ تھا۔ فاقوں کا علم مجھے زمانۂ عروج میں ہوا۔ فاقے میں چہرے پر ذرہ برابر پژمردگی نہیں چھاتی تھی۔ چہرہ ہر حال میں شگفتہ رہتا تھا۔ دولتمند مفلس ہو جائے تو افلاس کی

رکاوٹیں اس میں آجاتی ہیں۔ مگر خواجہ صاحب مفلس گھر میں جنم لینے اور مفلس تر ہو جانے کے باوجود اتنے خوددار اور عالی ہمت تھے کہ پشتینی دولتمندوں میں اتنی خودداری اور عالی ہمتی میں نے نہیں دیکھی۔ جس فضا میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی تھی، اس کا ان پر قطعی اثر نہیں تھا۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ دولتمند ہوکر اور عروج پاکر بڑے لوگوں کے معائب بھی خواجہ صاحب میں نہیں پیدا ہوئے۔

۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء کا زمانہ خواجہ صاحب کی دولتمندی کا واقعی نہیں تھا۔ لیکن میں اسے ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں مطلق محسوس نہیں کر سکا۔ شام کو روزانہ ہم دونوں بازار جامع مسجد کی سیر کو جایا کرتے تھے، اور وہاں ایک مقررہ شربت والے کی دکان پر بیٹھتے تھے اور شربت اور لیمونیڈ وغیرہ پیتے تھے۔ اس کے پیسے ہمیشہ خواجہ صاحب نے ادا کیے۔ میں نے ہمیشہ پیسے دینے چاہے اور انھوں نے دینے نہیں دیے۔ خواجہ صاحب کی یہ طبیعت تھی، مگر پھوپی صاحبہ کے دماغ میں وہی سمایا رہا کہ "حسن نظامی تجھے لوٹ لیگا۔ تجھے تباہ کر دیگا۔" پھوپی صاحبہ کے بیٹے سید ابوالحسن نے کہا: "تمھارے ابا، تایا اور چچا کے محکمہ انہار پر حقوق ہیں۔ چلو، میں تمھیں چھوٹی موٹی نوکری ضرور دلوا دونگا۔" میں نے انکار کیا تو پھوپی صاحبہ خفا ہوکر اور ہمارے یہاں کی کھانا پکانے والی، بتول کی اماں کو ہمراہ لے کر مکۂ معظمہ ہجرت کر گئیں۔ وہیں انھوں نے وفات پائی۔ وہ بڑی نیک اور متقی خاتون تھیں۔ اہلِ خاندان انھیں حضرت رابعہ بصری سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔ وہ یقیناً میری دلی خیرخواہ تھیں[۵]۔ انھوں نے مجھ ہی کو نہیں سنبھالا تھا۔

۵ اس زمانے میں صحافت کو خطرناک پیشہ عام طور سے سمجھا جاتا تھا۔ پھوپی صاحبہ تو غیر تعلیم یافتہ تھیں اور پردہ نشین عورت، حکیم سید ناصر نذیر فراق جیسے پڑھے لکھے مرد ڈرتے تھے اور انھوں نے خواجہ صاحب کے بڑے بھائی سے کہا تھا کہ "بھائی کو روکو، یہ جیل کی طرف جا رہا ہے۔"

بچانے کتنے یتیموں اور کتنی بیواؤں کی وہ سرپرست رہی تھیں۔ خاندان میں جو لاوارث ہو جاتا تھا وہ اسے اپنے ہاں رکھ لیتی تھیں۔ ہم بھائی بہنوں پر تو ان کا روپیہ خرچ نہیں ہوا، لیکن دو مردوں پر وہ بیشمار روپیہ خرچ کر چکی تھیں۔ ان کے بیٹے سیّد ابوالحسن ہمارے خاندان میں سب سے زیادہ دولتمند تھے البتہ ہماری یتیمی کے وقت سیّد ابوالحسن کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ پھوپی صاحبہ میرے دادا کی پہلی اولاد تھیں۔ ۱۸۵۷ء سے قبل وہ بیاہی جا چکی تھیں۔ ان کے بیٹے سیّد ابوالحسن میرے والد سے صرف دس بارہ برس چھوٹے تھے، گویا میرے باپ کے ہمعمر تھے۔ پھوپی صاحبہ نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں میرے والد، تایا اور چچا کو بھی سنبھالا تھا۔

پھوپی صاحبہ کے ہجرت کر جانے کے بعد بتول کی اماں کی جگہ ہم نے درگاہ قطب صاحب کی رہنے والی ایک ضعیفہ جہانگیرہ کو مقرر کر لیا۔ جہانگیرہ مشہور قوال قمیتر کی ماں تھیں۔ ماموں ضمانت علی کو پھوپی صاحبہ کی ہجرت کی خبر ہوئی تو وہ فوراً دلّی تشریف لائے اور میری بہن گیتی آرا بیگم کو اپنی نوکری پر جمالپور ضلع مونگیر لے گئے۔

بچپن ہی میرا رشتہ چچا محمد عمر کی لڑکی حسن آرا بیگم سے ٹھہرا ہوا تھا۔ چچا محمد

(صفحہ ۶۹ سے آگے) جناب فراق خود مضمون نگار تھے لیکن ان کی مضمون نگاری خاص حدود میں محدود تھی۔ وہ حدود سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ بعد میں خواجہ صاحب سے نہیں، مجھ سے بھی ان کے اچھے مراسم ہو گئے تھے۔ فراق صاحب میرے ہم محلہ اور میرے کئی پرچوں کے قلمی معاون، اور نظام المشائخ میں تو ان کے بیشمار مضمون چھپے۔ میں انھیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔ اور خواجہ صاحب بھی ان سے جھک کر ملتے۔ فراق صاحب کا مکان بارہ دری خواجہ میر درد میں تھا۔ وہ خواجہ میر درد کی اولاد تھے اور خواجہ میر درد کے قدم بقدم۔ میں انھیں یادگار خواجہ میر درد لکھا کرتا۔ دلّی کے شرفا کا ایک نمونہ تھے۔

میرے والد کے تھوڑے ہی دن بعد انتقال کر گئے تھے حسن آرا بیگم کی والدہ بھی زندہ نہیں تھیں۔ حسن آرا اپنی سگی اور میری سوتیلی پھوپی ہرمزی بیگم کے پاس وردورہ ضلع چاندپور میں تھیں۔ پھوپی ہرمزی بیگم کے شوہر میر سید حسین وردورے میں محکمہ برکانکی کے آفس سپرنٹینڈنٹ تھے۔ ماموں ضمانت علی نے میری بہن کو لے جانے سے پہلے کوشش کی تھی کہ حسن آرا کا میرے ساتھ عقد ہو جائے لیکن پھوپی ہرمزی بیگم نے حسن آرا کے خالہ زاد بھائی محمود علی کو مجھ پر ترجیح دی اور ان سے حسن آرا کا نکاح کر دیا۔ اور مجھے دھتا بتائی۔ محمود علی ضلع حصار کی کچہری میں اہلمد تھے۔ اور برسرکار تھے اور میں بیکار۔ اس پر خواجہ صاحب نے پیشینگوئی کی تھی کہ گھبراؤ نہیں، ہرمزی بیگم نے بھتیجی نہیں دی، انشاء اللہ بیٹی دینگی۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں پھوپی ہرمزی بیگم کی بیٹی محمود جہان بیگم سے میرا عقد ہوا۔

خواجہ صاحب میرے رشتہ داروں کے واسطے وہی لفظ استعمال کرتے تھے، جو میں استعمال کرتا تھا۔ پھوپی ہرمزی بیگم کو پھوپی کہتے تھے، ان کے شوہر کو پھوپا۔ پھوپی امتہ القدیر بیگم کو پھوپی اماں۔ ان کے بیٹے سید ابوالحسن کو میں آ کا بھائی کہتا تھا، انھیں خواجہ صاحب بھی آ کا بھائی کہتے تھے۔ بھائی فضل احمد کو خواجہ صاحب نے ہمیشہ بھائی فضل احمد کہا۔

بہن کے ماموں کے ساتھ چلے جانے کے بعد اب میری تحویل میں فقط میرے چھوٹے بھائی محمد مرتضے تھے۔ میں دن بھر نظام المشائخ کے دفتر میں رہتا تھا اور بھائی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ جولائی ۱۹۰۹ء سے دسمبر ۱۹۰۹ء تک نظام المشائخ کا دفتر نواب بدھن کے کمرے واقع بازار چتلی قبر میں رہا، کوچہ چیلان سے پون میل دور۔ میں نے نظام المشائخ جاری کرتے ہی اس کا دفتر اپنے قدیم رہائشی مکان میں لے جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میرے کنبے کے ایک صاحب نے سال بھر مکان کو خالی نہیں ہونے دیا۔ مجبور ہو کر جنوری ۱۹۱۰ء میں دریا گنج کا

ایک مکان کرایہ لے کر دفتر منتقل کیا اور بھائی کے قریب آیا۔ اور جولائی ۱۹۱۰ء میں جب میرا مکان خالی ہوا تو وہاں گیا۔ ۱۹۰۹ء میں خواجہ صاحب کی پہلی اہلیہ (والدہ حور بانو) رحلت کر گئی تھیں۔ لہٰذا خواجہ صاحب اور حور بانو اور میں اور محمد مرتضےٰ چار آدمی اس مکان میں رہنے لگے۔ جہانگیرہ ہمارے کھانے پینے کا انتظام کرنے لگیں اور نظام المشائخ کا کام اطمینان کے ساتھ کیا جانے لگا۔ سال بھر میں نظام المشائخ اتنا مقبول ہو گیا تھا کہ اس کی آمدنی سے ہم چاروں کا کھانا پینا چلتا تھا۔ بلکہ ایک صاحبزادے اور ہمارے پاس رہنے لگے تھے، خواجہ صاحب نے اپنی مفلسی کے دور میں جن کی پڑھائی کا ذمہ لے لیا تھا ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب ممالکِ اسلامیہ مصر، شام اور حجاز کی سیاحت کو گئے، ان کی عدم موجودگی میں تین مہینے چونکہ میں نے نظام المشائخ کی تنہا خدمت کی تھی، خواجہ صاحب نے فرمایا: "تم نے نظام المشائخ کی ذمہ داری کامیابی اور خوبی کے ساتھ نبھائی، تم اسے زندہ رکھ سکتے ہو۔ آئندہ تم ہی اس کے ایڈیٹر رہو گے اور تم ہی اس کے مالک۔ میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ میرے پیشِ نظر اب دوسرے مشاغل ہیں۔

اس کے بعد خواجہ صاحب اور حور بانو نے میرے پاس ایک سال اور قیام کیا۔ ۱۹۱۲ء میں حور بانو کی پردے میں بیٹھانے کی عمر آ رہی تھی۔ نیز خواجہ صاحب نے پیرزادہ سید محمد صادق کی بیٹی محمودہ بیگم سے عقدِ ثانی کر لیا، جو خواجہ بانو کہلاتی ہیں، عقدِ ثانی کر کے خواجہ صاحب اور حور بانو دوبارہ بستی نظام الدین میں جا بسے۔ میں نے نظام المشائخ کو قریباً پچاس سال چلایا۔ نظام المشائخ کراچی پہنچ کر بند

سہ وحید الرحمٰن عرفانی ان کا نام تھا۔ عرفانی لقب، خواجہ صاحب نے دیا تھا۔ عرفانی نے انٹرنس ہمارے پاس رہ کر پاس کیا۔ پھر میرٹھ جا کر میرٹھ کالج میں داخل ہو گئے۔ ایم اے کر کے وہیں پروفیسر بن گئے، پھر شاید یورپ سے ڈاکٹری کی ڈگری لائے۔ میرٹھ جانے کے بعد میں نے ان کی صورت نہیں دیکھی، اس لیے حالات کا کم علم ہے۔

ہوا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان کے جملہ اخباروں اور رسالوں سے نئے ڈکلریشن طلب کیے گئے تھے۔ میں نے بھی نظام المشائخ کا ڈکلریشن دیا لیکن عرصۂ دراز سے اس کی ظاہری شکل وصورت اس قدر گر گئی تھی کہ میں بھی اسے قبر سے تعبیر کیا کرتا تھا۔ اور اپنے آپ کو اس کا ایڈیٹر نہیں، مجاور کہتا رہتا تھا۔ غالباً ظاہری حیثیت کا خیال کر کے ڈکلریشن نامنظور کر دیا گیا۔ میں ڈکلریشن نامنظور کرنے والوں کا شکر گذار ہوں کہ انھوں نے نظام المشائخ کو میرے ہاتھ سے بند نہیں کرایا۔ میں آج بھی نظام المشائخ کے نام کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہوں۔ میرا پتا آج بھی "نظام المشائخ، کراچی ۳" ہے اور کافی ہے۔ نظام المشائخ میرے اور خواجہ صاحب کے تعلق کی یادگار تھا اور یادگار رہیگا۔ ان شاء اللہ۔

ہندوستان اور پاکستان؛ دونوں جگہ نظام المشائخ یا میرے کسی پرچے کے سلسلے میں مجھ سے کبھی ضمانت نہیں لی گئی۔ مجھے کبھی وارننگ نہیں دی گئی۔ میں انگریزوں کی حکومت کا کھلم کھلا مخالف تھا۔ مگر دماغی توازن نہیں کھوتا تھا۔ انگریزوں سے دور بھاگتا تھا۔ لیکن انگریز میری متوازن طبیعت کی وجہ سے میرے مدّاح تھے۔

نظام المشائخ ۱۹۰۹ء میں جاری ہوا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کے ایما سے، جنھیں اس وقت حاذق الملک کا خطاب حاصل تھا۔ ہفت روزہ "طبیب" نکالا۔ حکیم صاحب نے "طبیب" کو آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کا آرگن قرار دے دیا۔ نظام المشائخ پر اب سرپرست "حضرت خواجہ حسن نظامی" لکھا جاتا تھا۔ اور طبیب پر "حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں" خواجہ صاحب بھی اس زمانے میں غیر معمولی متوازن الدّماغ تھے اور حکیم صاحب کے توازن کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ میں نے ان دو بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہے۔

۱۹۱۴ء میں ہفت روزہ "خطیب" جاری کیا۔ یہ مولانا ابوالکلام کے ہفت روزہ

الہلال کے پایے کا پرچہ تو نہیں تھا لیکن الہلال کا مثنیٰ تھا۔ مولانا نیاز فتح پوری اور مولانا عارف ہسوی جیسے ذی علم ادیب مستقل طور سے اس کی مدد کرتے تھے، اور اس کے لکھنے والوں میں خواجہ حسن نظامی، مولانا راشد الخیری، اکبر الٰہ آبادی، علامہ اقبال اور علامہ شبلی جیسے متعدد ممتاز حضرات شامل تھے ۱۹۱۹ء میں میرے پاس سے چار ماہنامے اور چار ہفت نامے بہ یک وقت نکل رہے تھے اور ایک روز نامہ۔

جبّے اور عمّامے کی کورنش

میں نے نظام المشائخ کے بند ہونے کے ذکر میں لکھا ہے کہ ساری عمر اخبار اور رسالے نکالنے کے باوجود مجھے انگریز حکومت کی طرف سے کبھی وارننگ نہیں دی گئی۔ یعنی تنبیہ نہیں کی گئی کہ خبردار آئندہ احتیاط سے کام لینا۔ ایک واقعہ بیان کر دینا چاہتا ہوں، اگرچہ اسے بھی وارننگ نہیں کہہ سکتے اس وقت تو محض دلچسپی کے خیال سے قلمبند کیا جا رہا ہے۔

۱۹۱۱ء میں موجودہ ملکۂ انگلستان الزبتھ کے دادا جارج پنجم نے دلّی میں بڑا شاندار دربار کیا تھا۔ اس دربار کی تیاری کے عملے میں ایک مغل شاہزادے بھی، مرزا خورشید عالم غالباً ان کا نام تھا۔ تمام نام اور سنہ بالکل صحیح یاد رکھنے اسّی برس کے بوڑھے کے لیے دشوار ہیں۔ مرزا صاحب رہنے والے میرے محلے ہی کے تھے۔ لیکن مرزا صاحب اکسٹرا اسسٹینٹ کمشنر تھے۔ اور پنجاب کہیں متعیّن تھے۔ پنجاب سے طلب کیے گئے تھے۔ اور علما و مشائخ اور پنڈتوں اور مہنتوں کو بلاوا دینے کی ڈیوٹی ان کے ذمّے لگائی گئی تھی۔ یعنی سلام کرنے کی تقریب کا بلاوا دینے کی ڈیوٹی۔ خواجہ حسن نظامی کو بھی بلاوا دینے تو لائے۔ خواجہ صاحب کے تعلّقات انگریزوں سے بعد میں تو بڑے خوشگوار رہے، لیکن اس زمانے میں نہ خوشگوار تھے اور نہ ناخوشگوار۔ خواجہ صا

نے فرمایا "صاحب عالم! سردی کیسی سخت پڑ رہی ہے۔ اس لحاف سے جو میں اوڑھے لیٹا ہوں جارج پنجم کا دربار زیادہ پُر لطف نہیں ہو سکتا۔ بندے کو تو معاف رکھیے" مرزا صاحب نے اصرار کیا تو خواجہ صاحب نے کہا "صاحبِ عالم! میں کیسے دیکھ سکتا ہوں کہ قلعہ معلّٰی کے جن جھروکوں میں سے آپ کے بزرگ رعایا کا سلام لیا کرتے تھے، وہاں جارج پنجم بیٹھ کر ہندوستان بھر کے علماء و مشائخ اور پنڈتوں اور مہنتوں کا سلام لیں گے" خواجہ صاحب نے تقریب میں شریک ہونے سے قطعی انکار کر دیا۔

یہ تقریب بہر حال ہوئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی شرکت کی تھی۔ شرکت کر کے مولانا سیدھے ہمارے ہاں تشریف لائے۔ اور انھوں نے تقریب کی روداد سنائی۔

علماء و مشائخ اور پنڈتوں اور مہنتوں کو ہاتھیوں پر بشکلِ جلوس دریائے جمنا کے کنارے قلعہ کے سامنے لے جایا گیا تھا۔ ہاتھی پر سے راستے میں الٰہ آباد کے ایک مولوی صاحب گر پڑے تھے۔ مولانا ابوالکلام نے ان کا گرنا بھی جتایا۔ مولانا چلے گئے، تو خواجہ صاحب نے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ جس کا عنوان تھا: "جبّے اور عمامے کی کورنش" یہ مضمون نظام المشائخ میں چھپا۔ دلّی کے ایک عالم نے دلّی کے ڈپٹی کمشنر بیجر یا کرنل بیڈن سے شکایت کر دی کہ یوں مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ ابھی آپ نے ہماری عزت کرائی۔ نظام المشائخ میں ایسا ایسا مضمون شائع ہوا ہے، جس میں ہمیں اصحاب فیل کا خطاب دیا گیا ہے۔

اتفاق کی بات ان ہی دنوں مجھے اخبار جاری کرنے کی سوجھی۔ میں خواجہ صاحب کو ساتھ لے کر اس کے متعلق بات کرنے بیڈن کی کوٹھی جا پہنچا۔ سوچا یہ تھا کہ بات کیے بغیر ڈکلریشن پیش کیا گیا تو ضمانت نہ معلوم کتنی طلب کر لی جائے، بات کریں گے، تو ممکن ہے، ضمانت معاف ہو جائے۔ لیکن گئے تھے نماز بخشوانے

۱؎ مغل شاہزادوں کو صاحبِ عالم کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

یہاں اپنے روزنے سے مجھے پڑ گئے۔ بیڈن سول سروس کا افسر نہیں تھا، فوجی آدمی تھا، مگر ڈپٹی کمشنر بن گیا تھا۔ یہ وہی بیڈن تھا جس نے مسٹر محمد علی کو مولانا محمد علی جوہر کی راہ دکھائی تھی۔ وہ اپنی میز کے آگے کرسیاں نہیں رکھتا تھا جو کرسی دینے، نہ دینے کا سوال پیدا ہوتا۔ مولانا محمد علی بھی میری طرح کا مر پڑا اور ہمدرد کے ڈکلریشن منظور کرانے گئے تھے۔ بیڈن نے عدالت میں نہیں، اپنے گھر میں مولانا محمد علی کو کرسی نہیں دی۔ خیر، مولانا محمد علی ملنے نہیں گئے تھے، ڈکلریشن پیش کرنے گئے تھے۔ امام صاحب جامع مسجد، شمس العلما مولوی سید احمد، جنھیں وائسرائے کے ہاں پرائیویٹ انٹری (PRIVATE ENTRY) کا اعزاز حاصل تھا۔ وہ محض ملنے گئے، تو بیڈن نے چاہا کہ وہ بھی کھڑے رہیں۔ مولانا محمد علی نے تو پھر بیڈن کی ساری قوم کو ہلا ڈالا تھا۔ امام صاحب نے بیڈن کو براہ راست ڈانٹا اور کہا کرسی منگاؤ، اور بیڈن نے امام صاحب کے لیے کرسی منگائی۔

خیر، ہم اس کے کمرے میں گھسے، تو اس نے اپنے قریب بھی پہنچنے کا انتظار نہیں کیا، فوراً بولا: "اوہ، یو، آپ نے جبہّ عمامہ کو نرشں لکھا، صاب فیل لکھا؟" ترجمہ پیش کرو۔ اس صورت میں ہم اخبار درویش کی بابت کیا بات کر سکتے تھے! واپس آ گئے۔ اور اپنے کرایہ دار صوبیدار عبدالغنی کے بیٹے فضل الٰہیؒ سے (جس سے میں نے مکان خالی کرایا تھا) مضمون کا انگریزی ترجمہ کرایا اور بیڈن کی خدمت میں پیش کیا۔

انگریزی ترجمے میں وہ چبھاؤ نہیں تھا، جو خواجہ صاحب کی اردو میں تھا۔ اصحابِ فیل اردو میں گالی تھی۔ انگریزی میں اصحاب فیل کا ترجمہ ہاتھی نشین ہوا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ اخبار درویش بیڈن کی ڈپٹی کمشنری کے دوران نہیں نکلا، کافی عرصے بعد نکلا۔

؎ خان بہادر فضل الٰہی، سکریٹری پبلک سروس کمیشن اور عظمت اللہ، ایڈووکیٹ کے برادرِ نسبتی۔

مجھے انگریز کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ یہ تو انگریزوں سے نفرت دلانے والا تجربہ تھا۔ دوسرا تجربہ، سر مالکم ہیلی چیف کمشنر دلی کا اس کے برعکس ہوا۔ سر مالکم کی ملاقات کا ذکر ان شاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گا۔ ایسے شستہ و شائستہ، خلیق و متواضع انگریز سے ملنا ایمان اور ضمیر کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر گرے، کٹتا خربوزہ ہی ہے، چھری سلامت رہتی ہے۔ دونوں تجربوں کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ حکام سے پینگ نہیں بڑھاؤں گا۔ چنانچہ میونسپل کمیٹی کی ممبری کے زمانے میں بھی میں ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر کے ہاں میٹنگز (MEETINGS) میں تو جاتا تھا، ان سے ملنے نہیں جاتا تھا۔ اور اس طبیعت کا ممبر میں واحد تھا۔

نظام المشائخ نے مجھے کن کن سے ملوایا!

ملوانے والا اور نہ ملوانے والا تو اللہ ہے، لیکن بظاہر ذریعہ مندرجہ ذیل حضرات سے ملاقات کا نظام المشائخ بنا۔ نظام المشائخ نہ نکلتا، اور خواجہ حسن نظامی میرے پاس نہ رہنے لگتے، تو ان حضرات تک میری رسائی شاید کبھی نہ ہوتی۔ یہ آتے تھے خواجہ صاحب کے پاس، لیکن میرے گھر پر آتے تھے۔ لہٰذا مجھ سے بھی مراسم بڑھتے تھے۔ یا جاتے تھے خواجہ صاحب ان کے پاس، مگر مجھے ساتھ لے لیتے تھے۔ اس لیے میری بھی ملاقات ہو جاتی تھی۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ انھیں مجھ سے اتنا تعلق ہو گیا کہ اتنا خواجہ صاحب سے نہیں تھا۔

دوسرے رسالے اور اخبار جو میں نے جاری کیے، وہ حقیقتاً نظام المشائخ کی کامیابی کے طفیل جاری ہوئے تھے۔ نظام المشائخ کی کامیابی سے اور رسالے اور اخبار نکالنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

---

۱ سر مالکم پھر پنجاب کے گورنر ہو گئے تھے اور یو پی کے بھی گورنر رہے تھے۔ اور انگلستان واپس پہنچنے پر انھیں لارڈ بنا دیا گیا تھا۔

خود خواجہ صاحب کے اور میرے تعلقات نظام المشائخ نے استوار کیے تھے۔

نواب عبداللہ کسمنڈوی

نواب عبداللہ کسمنڈوی کا گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے۔ عوام نواب کسمنڈوی سے زیادہ واقف نہیں تھے، لیکن خواص میں انھیں بہت اہمیت حاصل رہی۔ نواب کسمنڈوی پُراسرار آدمی تھے۔ دینی اعتبار سے بھی سمجھنا مشکل تھا کہ ان کا کیا مقام ہے اور دنیاوی اعتبار سے بھی انہیں محض اخبار نویس کہنا درست نہیں تھا۔ اخبار نویس اردو کے ان سے اونچے اور موجود تھے۔ لیکن نواب کسمنڈوی کا اثر ہندوستان کی ریاستوں اور ہندوستان کے انگریز حاکموں پر بلا کا تھا۔ راجہ، نواب گمان کرتے تھے کہ نواب کسمنڈوی کے توسّل سے حکومتِ ہندوستان کو راضی رکھا جاسکتا ہے اور حکومتِ ہندوستان کو حسنِ ظن تھا کہ ہم نواب کسمنڈوی کی معرفت ریاستوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرا سکتے ہیں۔

علاّمہ شبلی نعمانی

نظام المشائخ کے اجرا کے بعد سب سے پہلے مولانا شبلی نعمانی ہمارے ہاں تشریف لائے تھے اور تقریباً مہینا بھر ٹھہرے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کو مولانا شبلی نے کسی خط میں لکھا تھا کہ کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ مہینا بھر کے لیے کہیں باہر چلا جاؤں۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ اور کہیں نہ جائیے، یہاں تشریف لے آئیے، سکون کا پورا بندوبست کر دیا جائیگا۔ مولانا نے یہ تجویز بہ ایں شرط منظور فرمائی کہ آپ صرف قیام کا انتظام کریں، طعام کا انتظام میرا باورچی کریگا، باورچی کو لاؤنگا۔

خواجہ صاحب نے نواب بدّھو کی پوری محل سرا مولانا کے سپرد کر دی، جہاں وہ

باورچی سے الگ مزدور سلواتے تھے اور چپاتیاں پکواتے تھے، باقی سالن اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔ یہ نظام المشائخ کا بالکل ابتدائی زمانہ تھا۔ نظام المشائخ کا دفتر ابھی نواب بدھن کے مردانہ مکان میں تھا۔ جو نواب بدھن کا کمرہ کہلاتا تھا۔

مولانا ابوالکلام اور نواب بہادر یار جنگ

مولانا ابوالکلام آزاد اور نواب بہادر یار جنگ سے بھی نظام المشائخ کے ابتدائی زمانے میں نواب بدھن کے کمرے ہی پر ملاقات ہو گئی تھی۔ یہ دونوں میرے ہم عمر تھے۔ مولانا ابوالکلام سے میں ایک دفعہ پہلے بھی مل چکا تھا۔ خواجہ حسن نظامی کے ساتھ کان پور کے اسٹیشن پر اور حافظ محمد حلیم، تاجر چرم کانپور کی کوٹھی میں۔ اور پھر ۱۹۴۷ء تک ملتا رہا۔ وہ میرے ہاں بیسیوں مرتبہ تشریف لائے۔ اور آخر میں تو مسٹر آصف علی کا گھر ان کا گھر بن گیا تھا۔ نواب بہادر یار جنگ سے جہاں تک یاد پڑتا ہے، دوبارہ ملنا نہیں ہوا۔ البتہ ان کی دینداری اور ان کے اخلاص کی تعریفیں ہر شخص سے سنتا رہا۔

مولانا ابوالکلام کو تو اللہ تعالیٰ نے لکھنے کا بھی کمال دیا تھا اور بولنے کا بھی۔ نواب بہادر جنگ کی تحریر کیسی تھی اس کا علم نہیں ہے۔ تقریر میں وہ مولانا ابوالکلام کے مقابلے کے بتائے جاتے تھے۔ گویا اردو زبان کے مقرروں میں صف اوّل کے مقرر تھے۔

مولانا ابوالکلام کو انڈین نیشنل کانگریس میں جو مقام حاصل تھا، وہی مقام آل انڈیا مسلم لیگ میں نواب بہادر یار جنگ کا تھا۔

مولانا ابوالکلام اور نواب بہادر یار جنگ کی بات چیت بھی غیر معمولی پُرکشش ہوتی تھی۔ مولانا ابوالکلام اپنی مشہور "انا" کے باوجود مخاطب کو متاثر کر لیتے تھے اور نواب بہادر یار جنگ کی زبان کا جادو بھی مجھے یاد ہے۔ ۱۹۱۱ء میں نواب صاحب نواب بہادر خان تھے۔ نواب بہادر یار جنگ کا خطاب بعد میں ملا تھا۔

مولانا ابوالکلام کی "انا" مغروروں اور متکبروں کی سی "انا" نہیں تھی۔ وہ بس اللہ کے سوا کسی کے آگے جھکتے نہیں تھے۔ تو یہ تو قابلِ ستائش "انا" ہے۔ یا اپنے علم و فضل اور اپنی ذہانت و طباعی کا انہیں احساس تھا، تو اس میں کیا برائی ہے۔ تھے ہی مولانا واقعی جینئس۔ مغرور اور متکبر وہ قطعی نہیں تھے۔ میں نے ان کی حالت میں کبھی فرق نہیں پایا۔ مولانا ابوالکلام جیسے ۱۹۱۰ء میں تھے، ۴۷ء تک مجھے تو ویسے ہی نظر آئے۔ اقتدار نے ان کے دماغ اور زبان پر کوئی خراب اثر نہیں کیا تھا۔ وہ گاندھی اور جواہر لال کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، لیکن ہم معمولی ملنے والوں پر وصونس نہیں جماتے تھے۔

مولانا شاہ سلیمان پھلواری

مولانا شاہ سلیمان کی زیارت متعدد بار اپنے مکان میں ہوئی۔ ان کے فرزند اکبر مولانا شاہ حسن میاں میرے ہمعمر اور میرے دوست تھے۔ مولانا شاہ سلیمان مجھ پر باپ کی طرح کرم فرماتے تھے۔ ان کے خاندان سے مجھے اور ان کے خاندان کو مجھ سے اب بھی تعلق ہے۔

مولانا شاہ سلیمان پھلواری مشائخ ہند میں پہلے شخص تھے جنھوں نے سر سید احمد خان کی تحریک کا ساتھ دیا تھا۔ امیر حبیب اللہ خان والیِ افغانستان ۱۹۰۵ء میں ہندوستان آئے ہیں، اور علی گڑھ کالج دیکھنے گئے ہیں، تو نواب محسن الملک، سکریٹری علی گڑھ کالج نے اس موقع پر خواجہ حسن نظامی کو مولانا شاہ سلیمان ہی کے کہنے سے علی گڑھ بلایا تھا۔ خواجہ صاحب، شاہ صاحب کو اپنا بزرگ اور سرپرست سمجھتے تھے۔

شاہ صاحب اپنے دور کے ممتاز مقرروں میں تھے۔ تقریر میں مثنوی مولانا روم زور پر پڑھتے تھے۔ اور ایسی خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ کہ سماں بندھ جاتا تھا۔

میر غلام بھیک نیرنگ

میر غلام بھیک نیرنگ انبالے کے ممتاز وکیل تھے۔ بہت اچھے شاعر، بہت اچھے انشا پرداز، بہت اچھے نقاد اور بہت اچھے مسلمان۔ ان کے میں نے بچپن سے دیکھا ہے۔ میر صاحب حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امیر خسرو کے عرسوں میں آیا کرتے تھے۔ اور خواجہ حسن نظامی کے ہاں کی مجلس اور محافل میں شریک ہوتے تھے۔ بڑی نورانی شکل تھی۔ انھیں دیکھ کر میرا تصور قدیم مشائخ کی طرف چلا جاتا تھا۔

شیخ (سر) عبدالقادر نے اپنے ماہنامہ "مخزن" کی تنقید میر نیرنگ کے سپرد کر رکھی تھی۔ میر نیرنگ، شیخ عبدالقادر، علامہ اقبال اور مسٹر محمد العزیز (فلک پیما وغیرہ) ایک دوسرے کے دوست اور معاون تھے۔ "مخزن" جاری کرانے میں ان سب کا ہاتھ تھا۔

میر نیرنگ کے مقدمات دلّی کی عدالتوں میں بھی رہتے تھے۔ مقدمات کی پیروی کے لیے دلّی تشریف لاتے تھے، تو میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔

شیخ عبدالقادر

شیخ عبدالقادر کا نام سامنے آگیا ہے، تو کیوں نہ ان کا بھی تذکرہ کر دوں۔ میں بڑا آدمی نہیں ہوں، لیکن اس عیسوی صدی کے ربع اوّل کے بیشمار بڑے آدمیوں سے مجھے قریب کی یا بعید کی نسبت ضرور ہے۔

شیخ عبدالقادر کی خدمت میں نظام المشائخ سے پہلے ہی نیاز حاصل تھا۔ انھوں نے بیرسٹری پاس کر کے (غالباً ۱۹۰۷ء سے) دلّی میں پریکٹس شروع کی تھی، ماہنامہ مخزن کا دفتر بھی لاہور سے دلّی منتقل ہو گیا تھا۔ شیخ عبدالقادر خود کشمیری دروازے کی طرف کچہری کے قریب رہتے تھے۔ مخزن کا دفتر میرے مکان کے سامنے کوچہ چیلان میں تھا۔ مخزن کو شیخ محمد اکرام (معاون ایڈیٹر) نے سنبھال

رکھا تھا۔ لیکن شیخ عبدالقادر شام سے رات گئے تک کئی گھنٹے دفتر مخزن میں گزارتے تھے۔

دفتر مخزن اس عظیم الشان عمارت میں تھا، جسے بعد میں مولانا محمد علی نے دفتر ہمدرد اور کامریڈ بنایا۔ دفتر مخزن کے طویل و عریض صحن میں پھاٹک کے پاس والے چبوترے پر فرش بچھ جاتا تھا۔ وہاں شیخ عبدالقادر تشریف فرما ہوتے تھے، اور دلی کے تمام ادیب اور شعراء (بہ استثنائے چند) ان سے ملنے آتے تھے۔ مجھے اور آصف علی کو بھی ہم محلگی کی وجہ سے حاضری کی اجازت تھی۔

یہ دور گزر گیا تو دوبارہ شیخ عبدالقادر وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دلی پہنچے۔ کونسل کی ممبری کے دور میں بھی میرا ان کا ملنا جلنا رہا۔ اب وہ سر عبدالقادر تھے۔

سر عبدالقادر لاہور کے حکیم اجمل خاں تھے۔ ویسے ہی شستہ و شائستہ، ویسے ہی سنجیدہ اور متین۔ باتیں بھی حکیم اجمل خان کی طرح جچی تلی کرتے تھے لیکن حکیم صاحب مقرر نہیں تھے۔ سر عبدالقادر بلند پایہ مقرر بھی تھے۔ جیسا لکھتے تھے ویسا ہی بولتے تھے۔ زبان بالکل دلی والوں کی سی تھی، لہجہ بھی دلی والوں کا سا، حرکات و سکنات بھی دلی والوں کی سی۔

علامہ اقبال

علامہ اقبال اس زمانے میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کہلاتے تھے۔ خواجہ حسن نظامی شیخ عبدالقادر اور شیخ محمد اقبال کو شیخین پنجاب کہا کرتے تھے۔

علامہ اقبال سے میری پہلی ملاقات مسلم ہائی اسکول، انبالہ کے افتتاح کے موقع پر ہوئی تھی۔ مجھے اور خواجہ صاحب کو میر نیرنگ نے بلایا تھا۔ وہ بانی اسکول میں تھے۔ علامہ اقبال پٹیالے سے آئے تھے۔ پٹیالے میں ان کے بڑے بھائی

علی خان وزیر اعظم تھے۔ علامہ اقبال ان کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی علامہ اقبال نے خواجہ صاحب سے فرمایا: "خواجہ صاحب! ذوالفقار نے تاکید کر دی ہے کہ اکیلے واپس مت آنا، خواجہ حسن نظامی کو ساتھ لے کر آنا۔"

خواجہ صاحب نے میری معذوری بتائی کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے گارجین ہیں۔ انھیں فلاں تاریخ کو ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں جائداد کی آمدنی و خرچ کا حساب پیش کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے ڈسٹرکٹ جج دلی کے نام تار بھیج دیا اور تاریخ بدلوا دی۔ پھر میں اور خواجہ صاحب سات آٹھ دن نواب ذوالفقار علی خان کے ہاں دن رات علامہ اقبال کی صحبت میں رہے۔ علامہ اقبال نہایت سادہ مزاج اور بے تکلف انسان تھے۔ سات آٹھ ہی دن میں انھوں نے مجھے یہ بچگانہ اور گستاخانہ سوال کرنے کی جرأت بخش دی کہ "ڈاکٹر صاحب! کیا بات ہے آپ جیسا لکھتے ہیں، ویسا بولتے نہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے اس سوال پر منہ نہیں بگاڑا، میری طرف سے رخ نہیں پھیرا، بلکہ ہنس کر فرمایا: "جتنی محنت لکھنے میں کرنی پڑتی ہے، اتنی بولنے میں بھی کرنے لگوں تو دیوانہ ہو جاؤں۔ بولتا میں انگریزی بھی بے پروائی سے ہوں۔ مگر لکھتے وقت انگریزی اور اردو دونوں کے الفاظ کو اس طرح تراشتا ہوں جس طرح شیشے سے نگینہ تراشا جاتا ہے۔"

میں علامہ اقبال سے ایک دفعہ لاہور کی پرانی انارکلی میں بھی ملا تھا۔ جہاں ان کا وکالت کا دفتر تھا۔ ان دنوں شیخ عبدالقادر بھی کہیں نزدیک ہی رہتے تھے۔ دلی سے واپس آ چکے تھے۔ علامہ اقبال نے شیخ عبدالقادر کو اپنے دفتر بلوا لیا تھا۔ میں اور خواجہ صاحب، غلام غوث صمدانی؎ کی شادی سے فارغ ہو کر کھڑے کھڑے جالندھر سے شیخین پنجاب سے ملنے لاہور چلے گئے تھے۔ شام تک چاروں دفتر کے کمرے میں بیٹھے۔ شام کو شیخین پنجاب نے اسٹیشن پہنچا دیا، اور خدا حافظ کہا۔

؎ مسٹر غلام صمدانی اس زمانے میں علی گڑھ کالج کے طالب علم تھے، پھر بہاولپور میں اسسٹنٹ انجینیر رہے۔ اب موڈل ٹاؤن لاہور میں رہتے ہیں۔ مجھ سے خط و کتابت ہے

اس کے بعد میری ملاقات علامہ اقبال سے ہمیشہ اپنے ہی گھر پر ہوئی۔ ایک دفعہ وہ میرے ہاں مہمان بھی رہے تھے۔ ویسے دلی کا پھیرا کرتے تھے تو میرے ہاں آتے ضرور تھے۔

مولوی ظفر علی خان

مولانا روم کے بعد مولانا روم کی نوع کا شاعر علامہ اقبال کے سوا دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ شیخ سر عبدالقادر سے زیادہ علامہ اقبال سے اور علامہ اقبال سے زیادہ مولوی ظفر علی خان سے میرے مراسم رہے۔ جب تک مولوی ظفر علی خان کے بیٹے اختر علی خان اخبار زمیندار کے کام میں حصہ لینے کے قابل نہ ہو گئے، مولوی ظفر علی خان تب تک دلی بہت آتے تھے اور میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔ میں اخبار زمیندار میں اکثر لکھا بھی کرتا تھا۔ میرے لئے کس پرچے پر ضمانت یا دار و رسن کی بجلیاں نہیں گریں۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ زمیندار سے پہلی ضمانت میرے ہی مضمون پر لی گئی تھی۔ جس کا عنوان تھا: "اٹلی کے مال کو آگ لگا دو"۔ ضمانت طلب کی گئی تو مولوی ظفر علی خان نے وہ مضمون دوبارہ چھاپا تھا کہ دیکھیے ایسے معصوم مضمون پر ضمانت مانگی ہے۔

مولوی ظفر علی خان پنجاب کے مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام تھے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی مدد کے بغیر ہندوستان کے اور صوبوں کے مسلمان کیا کر سکتے تھے! پنجاب کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کا سہرا مولوی ظفر علی خان کے سر ہے۔ مولوی ظفر علی خان پنجابی تھے اور اہلِ پنجاب کے دل کی گہرائیوں میں پہنچ جاتے تھے۔ انہیں اللہ نے نثر لکھنے کا طریقہ دیا تھا اور نظم لکھنے کا بھی۔ بولتے بھی خوب تھے۔ ان کی تحریریں اور تقریریں اہلِ پنجاب کے ذوق کے بالکل مطابق ہوتی تھیں۔

مولوی ظفر علی خان نے تعلیم علی گڑھ کالج میں پائی تھی اور بلدۂ حیدرآباد، دکن میں کافی عرصہ گزارا تھا۔ علی گڑھ اور حیدرآباد کے ماحول کا ان پر غیر معمولی اثر تھا

مولوی محفوظ علی بدایونی مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی اور بیدل شاہجہان پوری

۱۹۱۱ء کے دربار میں جارج پنجم نے اعلان فرمایا تھا کہ آیندہ کلکتے کی بجائے دلی ہندوستان کا دارالسلطنت ہوگا۔ اس اعلان پر مولانا محمد علی اپنے انگریزی ہفت روزہ کامریڈ کا دفتر دلی لے آئے، جو سال ڈیڑھ سال سے کلکتے میں نکل رہا تھا۔ دلی میں مولانا نے کوچہ چیلان کے اس مکان کو اپنا دفتر بنایا، جس میں چار پانچ سال قبل تک مخزن کا دفتر تھا۔ اور مولانا نے طے کیا کہ اردو کا روزنامہ اخبار "ہمدرد" اور جاری کرو نگا۔ اس کی ایڈیٹری کے لیے مولانا عبدالحلیم لکھنوی اور منیجری کے لیے محفوظ علی بدایونی بلائے گئے، اور اسسٹینٹ منیجری کے لیے بیدل شاہ جہان پوری۔

مولانا محمد علی ابھی مسٹر محمد علی (آکسن) تھے۔ مجھ میں اور ان میں آگے چل کر تو خاص یگانگت ہو گئی تھی، لیکن شروع شروع میں ان کا رجحان وکیلوں اور بیرسٹروں کی جانب تھا۔ البتہ مولانا عبدالحکیم شرر اور مولوی محفوظ علی اور بیدل شاہ جہاں پوری کی نشست روز شام کو میرے ہاں رہتی تھی۔

میں مولانا عبدالحلیم شرر سے لکھنؤ میں ان کے گھر جا کر مل چکا تھا۔ مولوی محفوظ علی سے ملاقات ہمدرد ہی کے سلسلے میں ہوئی تھی اور بیدل شاہ جہاں پوری بالکل نئے تھے۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا شہرہ تھا، اور مولوی محفوظ علی کے مضامین کی دھوم تھی۔ مگر بیدل شاہ جہاں پوری کے اوصاف سے خاص خاص لوگ واقف تھے۔ عوام تک ان کا نام نہیں پہنچا تھا۔ مولانا محمد علی کے یہ تینوں حضرات دوست تھے۔ مولانا محمد علی نے ہمدرد کے اسٹاف میں دوستوں کو بھر لیا تھا۔ مولانا سمجھتے تھے کہ مولانا عبدالحلیم شرر اتنے عظیم ناول نویس ہیں، اور ماہنامہ "دلگداز" کے ایڈیٹر ہیں، روزانہ اخبار کی ایڈیٹری کیوں نہ کر سکینگے؟ اور مولوی محفوظ علی نے مولانا ظفر علی خان کی شرکت میں کاروبار کھولا تھا۔ وہ اگرچہ چاہیں، تاہم مولوی محفوظ علی انتظامی قابلیت رکھتے ہیں اور ہمدرد کا انتظام سنبھال لینگے۔ خیر ہمدرد کے جاری ہونے میں کئی مہینے

لگ گئے۔ اور مولانا عبدالحلیم شرؔ اور مولوی محفوظ علی اپنے اپنے شہر واپس چلے گئے۔ ان کا تجربہ نہیں ہو سکا۔ بیدل صاحب ہمدرد کے اجرا تک منسلک رہے۔ وہ کام خوش اسلوبی سے انجام نہ دے سکے اور ان کی اور مولانا محمد علی کی چخ چخ ہوگئی۔ بیدل صاحب ہمدرد سے رخصت کر دیے گئے۔ میرے ہاں چونکہ آنا جانا ہو چکا تھا۔ بیدل صاحب میرے ہاں آگئے، اور بحیثیت دوست اور مہمان رہنے لگے۔ کام دو انھوں نے ماشاءاللہ نہ ملیں نے دیا۔

بیدل صاحب کا نام سیّد حامد حسین تھا۔ بیدل صاحب کس کام کے واسطے دنیا میں بھیجے گئے تھے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ انھیں تا دمِ مرگ ایسا کام میسّر نہیں آیا۔ جو ان کی طبیعت سے مناسبت کھاتا۔ گاڑی آدمیوں کو مناسبِ طبع کام میسر آجاتا ہے، تو وہ اسے آسانی سے انجام دے لیتے ہیں، اور ہوشمند آدمیوں کو مناسبِ طبع کام میسر نہیں آتا، تو وہ بیدل صاحب کی طرح ناکام رہتے ہیں۔

بیدل صاحب کی زبان میں موہنی تھی اور علمِ مجلسی کے ماہر تھے۔ ان دو صفتوں کے ساتھ تنک مزاجی کا نقص نہ چمٹا ہوتا، تو ممکن تھا کہ بیدل شاہ جہان پوری، دوسرے ہوشؔ بلگرامی؎ بن جاتے اور اچھی اچھی پوزیشن والے ان کے پیچھے ہوتے۔ مگر اس کے واسطے بیدل صاحب کو اول خود ما خدا جانے کتنوں کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑتا۔ یہ بیدل صاحب کے بس کا نہیں تھا۔

بیدل صاحب رئیسوں اور امیروں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کے مراسم اہلِ قلم سے تھے اور اہلِ قلم رئیس اور امیر نہیں ہوتے۔ ملک کا ایک ایک شخص جسے اردو لکھنی آتی تھی، بیدل صاحب کا شناسا تھا۔ بیدل صاحب اردو کے ہر شاعر اور ادیب کی طرف دل کا تحفہ لے کر بڑھتے تھے، اور اردو کا ہر شاعر اور ادیب ان کی قدر کرتا تھا، ویسی قدر جیسی بیدل صاحب چاہتے تھے اہلِ قلم اور اہلِ علم کر سکتے ہیں، اہلِ دولت نہیں کر سکتے۔ حکیم محمد احمد خاں جو دلی کے اطبا اور رؤسا میں خود بہت تنک

؎ ہوش بلگرامی، نظامِ دکن کے مصاحب تھے۔

تھے۔ بیدل صاحب کی تنک مزاجی سے پناہ مانگتے تھے۔

۱۹۱۴ء میں مولانا نیاز فتح پوری اور بیدل شاہ جہان پوری، مولانا ابو الکلام آزاد سے ملنے گئے۔ مولانا ابو الکلام دلّی میں حکیم بھورے میاں کے ہاں مقیم تھے۔ بیدل صاحب دس بیس منٹ بیٹھ کر اٹھ آئے، نیاز صاحب بیٹھے رہے۔ مولانا ابو الکلام نے پوچھا، آپ کا بیدل صاحب سے ملنا کہاں ہوا؟ نیاز صاحب نے کہا: "ہم دونوں واحدی صاحب کے مہمان ہیں۔" مولانا ابو الکلام نے پوچھا: "واحدی صاحب سے بیدل صاحب کی ملاقات کب سے ہے؟" نیاز صاحب نے کہا: "تین سال سے" مولانا اپنے مخصوص انداز میں بولے: "بیدل صاحب سے ملاقات کی مدّت تین سال؟" جس کے معنی یہ تھے کہ مولانا ابو الکلام بھی بیدل صاحب کی تنک مزاجی کو جانتے تھے۔ المختصر بیدل صاحب شگفتگی اور تنک مزاجی کا عجیب و غریب مجموعہ تھے۔

تحریر اور تقریر کی مانند گفتگو کرنے کی صلاحیت بھی اللہ تعالیٰ کسی کسی ہی کو دیتا ہے۔ ہر شخص نذیر احمد، محمد حسین آزاد، حسن نظامی اور راشد الخیری جیسا انشاپرداز اور ابو الکلام، بہادر یار جنگ، احمد سعید اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا مقرر نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہذا مزہ لینے والی باتیں کرنے کے مشّاق میں نے بیدل صاحب جیسے کم دیکھے ہیں۔

میرا اور بیدل صاحب کا ۱۹۱۲ء سے تا دمِ مرگ ہیڈ کوارٹر رہا۔ دن آج اِس دوست کے ساتھ اور کل اُس دوست کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ رات کو سونے میرے ہاں آجاتے تھے۔ دلّی سے باہر کی بھی یہی صورت تھی باہر کے پھیرے لگاتے رہتے تھے اور پھر پھرا کر دلّی پہنچ جاتے تھے۔

ایک لطیفہ سنو! ایک مرتبہ بمبئی سے دلّی تشریف لا رہے تھے۔ ٹکٹ خریدا نہیں تھا یا کھو گیا تھا۔ راستے میں ایک دیہاتی اسٹیشن پر پکڑ لیے گئے۔ اسٹیشن ماسٹر یو پی کا مسلمان تھا۔ بیدل صاحب کے منہ سے پھول جھڑے، تو وہ ٹکٹ کو بھول گیا اور بولا آپ کی سزا یہ ہے کہ پندرہ دن اس جنگل میں میرے مہمان رہیئے۔ سولھویں

دن کوئی گارڈ دلّی پہنچا دیگا۔

غلام محمد طور اور نیاز فتح پوری

مسٹر غلام محمد طور، ایم۔ اے (پنجاب) کے بڑے ہونہار شاعر تھے۔ زندہ رہتے، تو علّامہ اقبال کے بعد غالباً ان ہی کا نام چمکتا۔ پنجاب کے کسی کالج میں پروفیسر بھی تھے۔ ان کی شادی دلّی میں مولانا ناصر جلالی کی ماموں زاد بہن سے ہوئی تھی۔ سسرال آتے تھے، تو مجھ سے ضرور ملتے تھے۔

مولانا نیاز فتح پوری کی شہرت کا آغاز تھا۔ ۱۹۱۲ء میں خواجہ حسن نظامی انھیں میرے پاس لائے اور بتایا کہ انھیں میں نے اخبار توحید کے کام میں اپنا مددگار بنایا ہے۔ توحید ہفتہ وار اخبار تھا، میرٹھ سے بھیّا احسان الحق شائع کرتے تھے۔ خواجہ صاحب اس کے ایڈیٹر تھے۔

۱۹۱۶ء میں نیاز صاحب حکیم اجمل خان کے بیٹے حکیم جمیل خان کو انگریزی پڑھانے تشریف لائے اور میرے پاس ٹھہرے۔ میرا ہفت روزہ خطیب جاری تھا۔ نیاز صاحب خطیب کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے۔

نیاز صاحب کم آمیز آدمی ہیں۔ ہر کس و ناکس کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن جس سے کھل جاتے ہیں، اس کے حق میں باغ و بہار بن جاتے ہیں۔ ان کی مجلس خالص ادبی مجلس ہوتی تھی۔ منشی محمد الدین خلیقی، مولانا عارف ہسوی، سیّد ظفر الحسن علوی اور حکیم مجیب الدین بقائی ان کے ساتھ جمع ہو جاتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے گھر کے چمن میں مہکتے پھول کھل گئے۔

نیاز صاحب کے ذریعہ مندرجۂ بالا چار آدمیوں سے ۱۹۱۶ء میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں نیاز صاحب کو میں نے روزنامہ رعیّت کی ادارت سپرد کی۔ نیاز صاحب بھوپال میں تھے۔ وہاں سے بلایا۔ ۱۹۱۹ء میں ان کے طفیل مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مسٹر عبدالرؤف، مسٹر نور الرحمٰن اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

کو دیکھا۔
مولانا دریابادی سینٹ اسٹیفنز مشن کالج دلی میں ایم۔ اے کا داخلہ لینے کے خیال سے آئے تھے۔ ذاکر صاحب، عبدالرؤف اور نورالرحمٰن علی گڈھ کالج میں پڑھ رہے تھے اور نیاز صاحب کے ادبی معتقد تھے۔
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اخبار نویسی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ وہ نیاز صاحب سے اخبار نویسی سیکھتے تھے اور روز نامہ رعیت کی بغیر معاوضے کے مدد کرتے تھے۔
ڈاکٹر ذاکر حسین، نائب صدر جمہوریۂ ہند اور مولا ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعتِ اسلامی سے اب ساری دنیا آشنا ہے۔ عبدالرؤف ڈپٹی کلکٹر ہوگئے تھے۔ نورالرحمٰن کا انشورنس سے تعلق تھے۔ مشرقی پاکستان میں ہیں۔ ایک دفعہ خط آیا تھا۔
ڈاکٹر ذاکر حسین دلّی میں برابر ملتے رہے۔ جس دن ہم نے دلّی کو خیرباد کہا ہے، اس سے ہفتہ قبل تک تشریف لائے تھے۔
روزنامہ رعیت نے زیادہ عمر نہیں پائی۔ دو مہینے سردار دیوان سنگھ مفتون کی ملکیت رہا اور خواجہ حسن نظامی کی زیرِ ادارت، اور تین مہینے میری اور بھیّا احسان الحق کی ملکیت اور مولانا نیاز فتح پوری کی ادارت۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ہمارے دور میں بھی "رعیت" کے منیجر تھے اور بھیّا احسان الحق سلیپنگ پارٹنر (SLEEPING PARTNER) رعیت بند ہوگیا تو نیاز صاحب پھر بھوپال چلے گئے۔ وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ لکھنؤ سے ماہنامہ "نگار" نکالا۔ اب کراچی میں ہیں اور نگار کراچی سے نکلتا ہے۔ ہمت کے آدمی ہیں۔ اسّی سے اوپر عمر تھے۔ حال میں کینسر کا آپریشن کرایا ہے، لیکن لکھنا پڑھنا نہیں چھوڑا۔ لکھنے پڑھنے کا مرض کینسر کے مرض پر غالب ہے

حاجی ریاض الدین بریلوی اور مولوی حسن الدین خاموش

حاجی ریاض الدین بریلوی اور مولوی حسن الدین خاموش اپنے زمانے کے ممتاز صحافی تھے۔ حاجی ریاض الدین کی عمر ۱۹۱۹ء میں ستر بہتر سے اوپر تھی اور ایسی ہی عمر مولوی

حسن الدین خاموش کی ہوگی۔ اب ان دونوں کے جاننے والے بھی دنیا میں تھوڑے ہیں۔ حاجی ریاض الدین نے خدا جانے کس کس اخبار کی ایڈیٹری اور سب ایڈیٹری کی تھی۔ آخری سب ایڈیٹر وہ ۱۹۱۹ء میں میرے روزنامہ "رعیت" کے تھے۔ اور مولانا نیاز فتح پوری کی طرح میرے ساتھ رہتے تھے۔ صحافی اتنے مسکین اور سیدھے عموماً نہیں ہوتے جتنے حاجی ریاض الدین تھے۔

مولوی حسن الدین خاموش میں حاجی صاحب کی نسبت زندگی باقی تھی۔ لیکن اللہ سے ڈرنے والے آدمی تھے۔ صرف نماز روزے ہی کے پابند نہیں، دین کی تمام باتوں پر عمل کرنے والے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ لکھتا ہوں۔ اس سے ان کا اندازہ لگالو۔

جس زمانے میں خاموش صاحب میرے اور خواجہ حسن نظامی کے پاس بہت تشریف لایا کرتے تھے، اس زمانے میں ایک صاحب عبدالنعیم خواجہ صاحب کے دفتر میں ملازم تھے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک دفعہ نعیم صاحب، خاموش صاحب سے ملنے گئے۔ خاموش صاحب نے ریاست بھوپال کے کسی گاؤں میں اپنے لیے مکان تعمیر کرا لیا تھا۔ نعیم صاحب وہاں پہنچے۔ آواز دی۔ آٹھ دس برس کا بچہ نکلا اور بولا "دادا ابّا بھوپال گئے ہوئے ہیں۔ پرسوں چار بجے انشاءاللہ آجائیں گے۔" نعیم صاحب نے کہا "میں دوبارہ پھیرا کر تو سکتا ہوں لیکن پھیرا پھر کہیں خالی نہ جائے۔ تم ان کا بھوپال کا پتا بتا دو۔ بھوپال میں ڈھونڈ لوں گا۔ بھوپال سے یہاں تک سفر کرنا ہے۔" بچے نے کہا "بھوپال کا پتا کوئی بڑا بتا سکتا ہے۔ بڑا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔ آپ اطمینان رکھیے۔ دادا ابا جھوٹ نہیں بولتے۔ پرسوں چار بجے ضرور آجائیں گے۔" "دادا ابّا جھوٹ نہیں بولتے" یہ فقرہ خاموش صاحب اور ان کے گھر کے ماحول کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

ماسٹر احمد حسین فرید آبادی اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی

ماسٹر احمد حسین فرید آبادی کا تذکرہ مجھے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ ۱۹۱۳ء میں وہ میرے

ہفت روزہ "طبیب" کے ایڈیٹر تھے۔ طبیب کو حکیم احمد حسین الہ آبادی ایڈٹ کرنے والے تھے۔ حکیم اجمل خاں نے ان سے لے کر لیا تھا۔ مگر انھیں خدا جانے کیا ہوا کہ لے کر کے نہیں آئے۔ میں نے حکیم اجمل خاں کی اجازت سے حکیم احمد حسین کے ہمنام ماسٹر احمد حسین کو لگا لیا۔ ماسٹر صاحب اخبار وکیل امرتسر کے ایڈیٹر رہے تھے۔ انھیں ایڈیٹری کا تجربہ تھا۔ طبیب طبّی پرچہ نہیں تھا طبّی کانفرنس کا آرگن تھا۔ اسے ماسٹر صاحب نے کامیابی سے ایڈٹ کیا۔

ماسٹر احمد حسین احمدی تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے عاشق۔ جب کام کا وقت گزر جاتا تھا، تو ماسٹر احمد حسین مجھے احمدی ہو جانے کی دعوت دیا کرتے تھے۔ میں نے ایک دن کہا "ماسٹر صاحب! میں خواجہ حسن نظامی کا مرید نہ ہو گیا ہوتا، تو آپ کا مرید ہو جاتا۔ مگر مرزا غلام احمد کی طرف میری طبیعت نہیں کھنچتی"۔ ماسٹر صاحب بیحد نیک انسان تھے۔

ڈاکٹر سعید احمد بریلوی، مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھے۔ میرے مکان کے برابر ان کا مکان تھا۔ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مطب بھی کرتے تھے۔ لیکن رجحانِ طبع شاعری، ادب اور صحافت کی طرف تھا۔ حاجی ریاض الدین بریلوی، مولوی حسن الدین اور ماسٹر احمد حسین کی طرح مقدس قسم کے صحافی تھے۔

مولانا محمد علی جوہر

مولانا محمد علی سے تعارف لکھنؤ میں، مولوی عزیز مرزا، آل انڈیا مسلم لیگ کے پہلے سکریٹری کے ہاں ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۲ء سے مولانا دلّی میں رہنے لگے، تو ملاقاتوں کے مواقع بھی میسر آئے۔ لیکن قابلِ ذکر تعلق عرصے کے بعد ہوا۔ پھر تو صحبتوں کی انتہا نہ رہی۔ میں ان کے ہاں اکثر جاتا تھا، اور وہ ہر جمعہ کو جامع مسجد سے سیدھے میرے ہاں تشریف لاتے تھے، اور عصر و مغرب کی نمازیں میرے ساتھ پڑھتے تھے، اور چونکہ

زیابیطس کا مرض تھا، پرہیزی کھانا اپنے گھر سے منگاتے تھے اور میرے دسترخوان پر رکھ کر کھاتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو مجھ پر مہربان مولانا محمد علی ہی نے کیا تھا۔

مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کا جھگڑا اٹھا، تو مولانا محمد علی مجھ سے بھی خفا ہو گئے۔ مولانا محمد علی نے مولانا راشد الخیری سے شکایت کی کہ مجھے توقع تھی، واحدی حق کا ساتھ دیگا۔ میں نے مولانا راشد الخیری ہی کی معرفت جواب بھیجا کہ "خواجہ صاحب اور آپ مجھ سے صرف دس دس برس بڑے ہیں۔ لیکن میں خواجہ صاحب کو مثل باپ کے اور آپ کو مثل چچا کے خیال کرتا ہوں۔ میرا فرض یہ تھا کہ باپ اور چچا کی لڑائی نہ ہونے دوں۔ یہ فرض میں نے ادا کیا۔ خواجہ صاحب میرا کہنا مان لیتے تو مجھے یقین تھا کہ آپ میری گواہی کا یقین کرینگے اور میری بات مان جائینگے۔ مگر تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ اب باپ اور چچا لڑ رہے ہیں۔ مجھے یہ زیب نہیں دیتا کہ کسی کا بھی ساتھ دوں۔ میں خواجہ صاحب کا بھی ساتھ نہیں دے رہا۔ اس قدر بے تعلق ہوں کہ اس قصے کو اخباروں میں پڑھتا تک نہیں" میرے جواب کے بعد بھی مولانا محمد علی غالباً مطمئن نہیں ہوئے، خفگی قائم رہی۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی

مولانا عبدالماجد دریا بادی مجھے جانتے تھے اور میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کو جانتا تھا۔ ہم دونوں نیاز فتح پوری کے ذریعہ بھی مل چکے تھے اور خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ بھی۔ لیکن تعلقات میرے اور ان کے مولانا محمد علی کی وجہ سے استوار ہوئے اور بڑھے۔ مولانا محمد علی روزنامہ ہمدرد کے معاملات میں مولانا دریابادی سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ مولانا دریا بادی مہینے کے مہینے دلی آتے تھے اور میرے ہاں بھی تشریف لاتے تھے۔ اس وقت سے انھیں میرے ساتھ اور مجھے ان کے ساتھ اخلاص ہے۔ اٹھارہ برس کی مفارقت کے باوجود اخلاص میں کمی نہیں ہوئی

ہے۔
مولانا دریاآبادی دینی اور دنیاوی علوم سے مالا مال ہیں۔ اللہ دنیاوی علم سے بھی دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ صرف زبان اور قلم ہی ان کی دیندار نہیں ہیں، عمل بھی کامل دیندار ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے صدقے میں میرا بھی انجام بخیر کرے!

اکبر الٰہ آبادی

خان بہادر سید اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی کی اور خواجہ حسن نظامی کی بڑی یاد اللہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے مسلسل خط و کتابت کرتے تھے۔ میں بھی گاہے گاہے خط لکھ دیتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں میری پہلی شادی کے موقع پر خواجہ صاحب نے حضرت اکبر کو بھی دعوتنامہ بھیجا تھا اور ان دو مصرعوں میں مبارکباد آئی تھی ——

واحدی کو دولہ مبارک ہو ۔۔۔ یعنی شادی نئی مبارک ہو

میں نے دیکھا حضرت اکبر کو فقط ایک مرتبہ مہینہ بھر، اور ایک دو دن وہ میرے ہاں مہمان بھی رہے۔ البتہ حضرت اکبر کے چھوٹے بیٹے سید ہاشم پہلے آچکے تھے اور کافی دن میرے ہاں ٹھہرے تھے۔ حضرت اکبر ہاشم کے انتقال کے بعد تشریف لائے تھے۔ اور خواجہ صاحب کے ہاں مہینہ سوا مہینہ رہے تھے۔ ارادہ واپس جانے کا نہیں تھا، درگاہ سلطان نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ میں دفن ہونے کا تھا لیکن اتفاق سے خواجہ صاحب کی بیٹی حور بانو کی شادی اس زمانے میں ٹھہر گئی۔ حضرت اکبر حور بانو کو ہاشم سے بیاہنے کی نیت رکھتے تھے۔ حور بانو کی شادی ٹھہرنے سے ہاشم کی یاد ستانے لگی اور وہ یہ کہہ کر الٰہ آباد چلے گئے کہ میں شادی کا منظر برداشت نہیں کر سکونگا۔ شادی ہو جائے تو پھر آجاونگا۔ مگر موت نے دوبارہ آنے نہ دیا۔ خواجہ صاحب موت کے وقت الٰہ آباد پہنچ گئے تھے۔ خواجہ صاحب کی گود میں حضرت اکبر نے جان، جان آفرین کو سپرد کی تھی۔

جس طرح علامہ اقبال کی شاعری کا جواب نہیں ہے، اسی طرح حضرت اکبر کی شاعری

بھی بینظیر ہے ۔ آج جو ہو رہا ہے اسے حضرت اکبر پون صدی پہلے لکھ گئے ہیں۔
"نظام المشائخ" میں علامہ اقبال کا کلام بہت چھپا کرتا تھا۔ "مخزن" کے بعد ان کا کلام "نظام المشائخ" ہی کے لیے وقف تھا۔ لیکن حضرت اکبر کا کلام "نظام المشائخ" میں اتنا چھپا کہ "کلیات اکبر" میں ایک عنوان ہے "نظام المشائخ کے لیے"۔

سردار دیوان سنگھ مفتون

سردار دیوان سنگھ مفتون بھی "نظام المشائخ" اور خواجہ حسن نظامی ہی کے ذریعہ ملے ہیں۔ اگرچہ آخر میں سردار صاحب کی اور خواجہ صاحب کی بگڑ گئی تھی، لیکن سردار صاحب نے مجھ سے تعلق ترک نہیں کیا تھا اور میں نے بھی وضع کو نہیں بدلا تھا۔ اور خواجہ صاحب اس میں کبھی مزاحم نہیں ہوئے۔ میری ان کی خط و کتابت اب بھی جاری ہے۔ سردار صاحب جس کے دوست ہیں، اس پر اپنا سب کچھ نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں اور جس کے دشمن ہو جاتے ہیں، اس کے بری طرح پیچھے پڑتے ہیں۔
سردار صاحب کا ہفت روزہ "ریاست" بڑا شاندار اور زوردار پرچہ تھا۔ بحیثیت اخبار نویس سردار صاحب کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔
"نظام المشائخ" نے مجھے کن کن کی ملاقات کا شرف بخشا، یہ میں لکھ سکتا تھا۔ "نظام المشائخ" نے کیا خدمت انجام دی، اور کیسا ادب پیش کیا، اسے لکھنا میرا کام نہیں ہے۔ صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ دینی مضامین ادبی چاشنی کے ساتھ پیش کرنے کی "نظام المشائخ" نے ابتدا کی تھی۔

میری خانگی زندگی

زندگی کا دوسرا نام اور ایک حد تک حقیقی نام خانگی زندگی ہے۔ یعنی شادی شدہ زندگی، بیوی بچوں کے ساتھ کی زندگی، خصوصاً بیوی کے ساتھ کی زندگی ——— "زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی" کا اسلام قائل نہیں ہے۔ زندگی کو یوں ہی گزار دینا رہبانیت ہے۔

اور اسلام میں رہبانیت ممنوع ہے۔ امتحانوں اور آزمائشوں سے بے شادی شدہ زندگی بھی خالی نہیں ہوتی۔ لہٰذا شادی شدہ زندگی کے امتحانوں اور آزمائشوں سے ڈرنے اور بچنے کے کیا معنی ہیں!

شادی شدہ زندگی دوزخ بن سکتی ہے، تو بے شادی شدہ زندگی اصلی دوزخ میں پہنچا سکتی ہے۔ اور شادی شدہ زندگی جنت بھی تو بن سکتی ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی اگر ایسی نابکار تھی کہ اللہ نے اسے اپنے معتوبین میں شامل کر دیا تھا تو حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی ازواجِ مطہرات کا بھی تو تصور کرو۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا وہ ہیں، جنھوں نے اشاعتِ اسلام میں حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہٗ کی مانند حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ہاتھ بٹایا تھا۔ حضرت خدیجہ نے اپنا سارا جاہ وحشم اسلام پر نثار کر دیا تھا۔ حضور کو اسلام کی اشاعت میں جو اذیتیں پہنچی تھیں، ان کا اثر حضرت خدیجہ جیسی مددگار اسلام بیوی کو دیکھ کر جاتا رہتا تھا۔ اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا وہ ہیں، جن کے برابر اسلام کا سمجھنے والا اسلام کا فقیہہ مردوں میں بھی اِکّا دُکّا تھا۔

میری پہلی شادی ۱۹۱۲ء میں محمود جہاں بیگم سے ہوئی تھی، ان پھوپی کی بیٹی سے جنھوں نے مجھے بھتیجی دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلی بیوی سے دو لڑکیاں ہیں، زاہدہ خاتون اور رابعہ خاتون۔ دونوں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں، اور میں ان کی خوشی سے خوش ہوں۔ زاہدہ چھوٹی سی تھیں، تو میں سوچا کرتا تھا کہ انھیں انگلستان بھیجونگا اور ڈاکٹری پڑھواؤنگا اور مولانا عارف ہسوی میرا مذاق اڑایا کرتے تھے کہ زاہدہ سے ذرا کی ذرا جدا نہیں رہ سکتے، انگلستان کیسے بھیجینگے! خیر انگلستان نہ بھیجا سا جا سکا۔ لیکن جدائی بہر حال ہو گئی۔ اسی لیے میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کی زندگی کو خاص طور سے خانگی زندگی لکھا ہے۔ یورپ کے ایک سے زاہدہ کو تو ڈاکٹر نہیں بنوا سکا، لیکن پڑھی پڑھائی اور بڑی کامیاب ڈاکٹر بیٹی مل گئی ہیں۔ ڈاکٹر زینب عبداللہ کو میں بیٹی کہتا ہوں، اور وہ مجھے باپ کہتی ہیں۔

علیم المرتبہ شخص کا قول ہے کہ جسے دو چیزیں میسر آجائیں، اس کی زندگی، زندگی ہے۔ ایک تو ایسا شغل، جس سے اس کی طبیعت کو مناسبت ہو، دوسرے ایسی بیوی جو اسے پسند کرتی ہو۔ بچے ہمیشہ کس کے ساتھ رہتے ہیں۔" دھی جنوائی لے گئے اور بہویں لے گئیں پوت۔ نہ خانگی زندگی بچوں کو بھی تو گزارنی چاہیے اور خانگی زندگی بیوی کے ساتھ یا خاوند کے ساتھ ہی گزرتی ہے۔ بیوی اور خاوند کا رشتہ سارے رشتوں کو پرے بیٹھاتا ہے۔ اتنی پائیداری نہ ماں باپ کے رشتے میں ہے۔ اور نہ اولاد کے رشتے میں، جتنی خاوند اور بیوی کے رشتے میں ہے۔ ماں باپ پال پوس کر دوسروں کے حوالے کر دیتے ہیں، اور بچے ماں باپ کو چھوڑ، دوسروں کے ہو جاتے ہیں۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ دنیا اسی طرح چل رہی ہے اور اسی دستور کی وجہ سے قائم ہے۔ ناپائیداری خاوند اور بیوی کے رشتے میں صرف ایک ہے کہ ماں باپ اور بچے بدلے نہیں جا سکتے، خاوند اور بیوی بدلے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ محمود جہاں بیگم ۱۹۱۲ء میں میرے ہاں آئی تھیں، ۲۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو اللہ کے ہاں چلی گئیں۔ سال ڈیڑھ سال میں نے انھیں یاد رکھا، ۱۹۲۱ء میں دوسری شادی کر لی۔ سال ڈیڑھ سال اتنا یاد رکھا کہ گویا دوسری شادی نہیں کرونگا۔ رابعہ جن کے پیدا ہونے میں محمود جہاں بیمار پڑی تھیں، تین مہینے بے غوری کا شکار رہی تھیں۔ محمود جہاں کے انتقال کے بعد رابعہ پر بے دریغ روپیہ لٹایا۔ اَنّا بھی مقرر کی اور آیا بھی۔ ڈاکٹر آئی جی۔ بی لِسٹر ا ضرورت پر تو آتے ہی تھے۔ ویسے بھی ان سے طے تھا کہ ہفتہ وار پھیرا کریں۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن (جو آخر میں قائدِ اعظم مسٹر محمد علی جناح کے معالج تھے) انھیں مہینے کے مہینے دکھلایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر مسز رینگ (دلی زنانہ میڈیکل کالج کی پرنسپل) تیسرے مہینے معائنہ کرتی تھیں۔ ان صاحبزادی کے متعلق ڈاکٹر کرنل عبدالرحمٰن فرمایا کرتے تھے کہ اس پر روپیہ اور انرجی فضول کھو رہے ہو۔ یہ جیسے گی نہیں۔ مگر اللہ کے فضل و کرم سے رابعہ اب چھیالیس برس کی ہیں۔ غرض رابعہ کے خاصے ٹھاٹ رہے۔ زاہدہ کی پرورش بھی امیرانہ شان سے ہوئی تھی۔ مولانا راشد الخیری نے

یری اس کیفیت سے کام لیا اور رہائشی مکان جس کا معاوضہ پاکستان میں پچاس ہزار
روپے ملا ہے ان دونوں بچیوں کے نام کرادیا۔ مولانا نے کہا "تم اور تمام جائداد
باوا کی ختم کر چکے ہو، رہائشی مکان بھی ٹھکانے لگا دوگے۔"

نے پہلی بیوی کے دور میں روپے سے کھیلا تھا۔ اس دور میں ہفتہ وار طبیب، ہفتہ وار
قطیب، ہفتہ وار انقلاب، ہفتہ وار درویش، ماہنامہ نظام المشائخ، ماہنامہ
استانی، ماہنامہ گلچیں، ماہنامہ بیداری، روزنامہ رعیت، نو پرچے میرے اہتمام
میں شائع ہوتے تھے۔ کتابوں کا کاروبار الگ تھا۔ یہی دور تھا کہ میں شام کو آمدنی کا
بچا ہوا روپیہ لے کر مردانے سے زنانے میں جاتا تھا تو روپے کی تھیلی بوجھل معلوم
دیتی تھی۔ یہ چاندی کے روپوں کا زمانہ تھا، روپے کے نوٹوں کا زمانہ نہیں تھا۔ اخراجات
آمدنی سے بھی زیادہ تھے۔ خرچ روکنے کی طبیعت میں نے نہیں پائی۔ الٹے سیدھے خرچ
کرتا تھا۔ خرچ کرنے کی طبیعت نے جائداد ختم کرادی تھی۔

اخراجات ناجائز نہیں تھے۔ بس اچھا کھاتا تھا، اچھا پہنتا تھا، اور آسائش و آرام اور
ٹھاٹ سے رہتا تھا۔ مہمانداری کا بھی شوق تھا۔ مجھے علامہ شبلی نعمانی، مولانا سلیمان
پھلواری، علامہ اقبال جیسے بلند مرتبہ حضرات کو مہمان بنانے کا شرف نصیب ہوا
ہے۔ میر غلام بھیک نیرنگ مقدمات کی پیروی کرنے مہینے میں ایک دو دفعہ
انبالہ سے آیا کرتے تھے اور میرے ہاں ٹھہرتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں دوسرے
تیسرے مہینے دلی تشریف لاتے تھے اور میرے مہمان ہوتے تھے۔ مولانا نیاز
فتح پوری چھ مہینے مسلسل مہمان رہے اور مولانا عارف ہسوی بیس برس۔ ویسے
بھی دوپہر اور شام کے کھانوں میں کوئی نہ کوئی مدعو ہوتا تھا۔ میں نے اس دور میں کھانا
تنہا کبھی نہیں کھایا۔ جب ہی سے مردانے میں کھانا کھلانے کی عادت ہے۔

جائداد بیچ کر روپیہ کاروبار پر خرچ کیا جاتا تھا۔ کاروبار کی آمدنی جائداد کے کرایہ سے
پچاس گنی بڑھ گئی تھی۔ روپیہ خرچ کرکے کاروبار ایسی منزل پر پہنچا دیا تھا کہ روپے
کو واقعی ہاتھ کا میل خیال کرتا تھا اور روپے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ میرے چچازاد بھائی

سید مسعود احمد کا انتقال ہوا، تو انھوں نے فقط ایک لڑکی چھوڑی تھی۔ اس لیے میں بھی شرعاً ان کی جائیداد کے ورثا میں تھا۔ میں نے یتیم بھتیجی کی جائیداد کو نہیں کترا اور اس کا نوالہ نہیں چھینا۔ روپے پیسے سے بے نیازی کی متعدد مثالیں ہیں۔ سب بے نیازی سے مجھے نقصان نہیں پہنچا۔ مگر میں اپنی اولاد کو بے نیازی میں اعتدال رکھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ میری طبیعت میں جہاں تک روپے سے بے نیازی کا تعلق ہے، اعتدال نہیں تھا، حالانکہ عام اعتبار سے میں سراپا اعتدال ہوں۔ پیسے سے بے نیازی مجھے راس آ گئی تھی، سب کو راس نہیں آتی۔

دوسری شادی میں نے ۱۹۲۱ء میں امام صاحب، عید گاہ فرید آباد، ضلع گوڑگانوں (سید عبدالمجید) کی بیٹی سیدۃ النساء بیگم سے کی۔ سیدہ کے بڑے بھائی سید صغیر علی ایم۔ اے اپنی طالب علمی کے زمانے میں میرے استاد رہے تھے۔ وہ اردو مڈل پاس کر کے دلی آ گئے تھے اور دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اردو مڈل پاس کرنے والوں کا حساب اعلیٰ درجے کا ہوتا تھا۔ میں آٹھویں جماعت میں سید صغیر علی سے حساب سیکھتا تھا۔ میری شادی کے وقت سید صغیر علی کافی عرصے سے ہلکر کالج اندور میں پروفیسر تھے۔ سیدۃ النساء کے دوسرے بھائی سید بشیر علی ایم۔ ایس سی مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں سائنس پڑھاتے تھے۔ بعد میں پروفیسر بشیر علی سے میری ماموں زاد بہن حسن جہان بیگم بیاہی گئیں۔

میں سال ڈیڑھ سال جو پہلی بیوی کا سوگ مناتا رہا، اس سے میرا کاروبار بگڑ گیا تھا۔ نظام المشائخ کے سوا کل پرچے بند ہو گئے تھے۔ سردار دیوان سنگھ مفتون کوچہ چیلان کو رسالوں اور اخباروں کا قبرستان کہا کرتے تھے۔ اس قبرستان میں میرے پرچوں سے زیادہ کسی کے پرچے دفن نہیں ہیں۔ کاروبار سے جی ہٹ گیا تھا اور اخراجات اس سال ڈیڑھ سال کے آخیر میں بالکل بحالتِ مجبوری کم ہوئے تھے دوسری شادی کے وقت میں کھٹک تھا۔ اور دوسری بیوی کا پورا دور رسالی دشواریوں میں گزرا۔ دوسری بیوی نے میرے گھر میں عیش نہیں دیکھا۔ مگر سیدۃ النساء نہایت

بیوی تھیں۔ میرے گھر میں پہنچتے ہی انھوں نے عشا کی نماز پڑھی تھی۔ جو بیوی اتنی خدا پرست ہو کہ دلہن بنے میں بھی نماز سے غفلت نہ برتے، وہ حرفِ شکایت زبان پر کیسے لا سکتی تھی؟ سیدۃ النساء کا انتقال ۱۹۲۴ء میں ہوا تھا۔ مرض الموت میں پروفیسر بشیر علی انھیں فرید آباد لے گئے تھے۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان وہ دو لڑکوں کی ماں بن چکی تھیں۔ ایک لڑکا حسین مصطفے ان کے سامنے مر گیا تھا۔ دوسرا حسن مصطفے ان کے پاس تھا۔ رابعہ بھی سوتیلی ماں کی گود میں پلی تھیں۔ سوتیلی ماں دم توڑنے لگیں، تو انھیں رابعہ کی یاد آ گئی، جو دلی میں میرے پاس تھیں۔ سیدۃ النساؒ کے کسی عزیز نے پوچھا۔ سیدۃ! تمھیں حسن مصطفے زیادہ عزیز ہے، یا رابعہ؟ سیدۃ النسا نے جواب دیا، رابعہ۔ سیدۃ النساؒ اس طبیعت کی بیوی تھیں۔

حسن مصطفے بھی ماں کے انتقال کے بعد بیمار پڑ گئے۔ ان کے لیے انّا اور آیا رکھنے کی طاقت نہیں تھی۔ ان کی خدمت میں نے خود کی۔ اپنی میز کرسی کے پاس ان کا پنگھوڑا رکھوا لیا تھا۔ لکھنا پڑھنا بھی کرتا رہتا تھا اور انھیں بھی سنبھالتا رہتا تھا۔ مگر وہ بچے نہیں، اللہ کو پیارے ہو گئے۔

شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے بیٹے ماسٹر رضاء اللہ، اسسٹنٹ انجینیر، ریاست بہاولپور اس زمانے میں پنشن لے کر آئے تھے۔ انھوں نے میرے ہاں تشریف لانا شروع کیا اور کہا، یہ انہماک جو تم اس معصوم کے ساتھ برت رہے ہو، مجھے تمھارے قریب کھینچ لایا ہے۔

میری تیسری بیوی کے والد میرے والد کے ہمنام تھے۔ میرے والد کا نام سید محمد مصطفے تھا، بیوی کے والد کا نام محمد مصطفے خاں۔ بیوی کا نام منظور فاطمہ ہے۔ منظور فاطمہ کے بھائی محمد نبی خاں ریاست دتیا میں ملازم تھے۔ منظور فاطمہ ان ہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ منظور فاطمہ کے پھوپی زاد بھائی مسٹر حشمت علی الہ آباد میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ پھوپی زاد بہن والدۂ احتشام علی فیض آبادی میں تھیں۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر احتشام علی جن کا ۱۹۴۶ء سے قبل گورنمنٹ ٹریننگ کالج

علی گڑھ میں بحیثیت پرنسپل تقرر ہوگیا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں فیض آباد کے کسی کالج میں پروفیسر تھے۔ والد ڈاکٹر احتشام علی کے ذریعہ منظور فاطمہ سے میرا رشتہ ٹھہرا تھا۔ وہ اخبارات اور ماہنامے پڑھتی رہتی تھیں، اور مجھے جانتی تھیں۔ محمد نبی خان، منظور فاطمہ اور اپنی والدہ کو لے کر فیض آباد آگئے تھے۔ ڈاکٹر احتشام علی کے مکان پر میرا نکاح ہوا۔ میں نکاح ثانی کی طرح ثالث کرنے کے معاملے میں ڈانوا ڈول نہیں رہا۔ ۱۹۲۴ء میں دوسری بیوی نے رحلت کی تھی۔ ۱۹۲۴ء ہی میں نکاح کر لیا۔

پہلی شادی کے وقت میری عمر تیئیس (۲۳) سال تھی۔ دوسری شادی کے وقت اکتیس (۳۱) سے کچھ اوپر۔ اور تیسری شادی کے وقت پینتیس (۳۵) اور چھتیس (۳۶) کے درمیان۔ پہلی بیوی کے انتقال سے کاروبار کو جو زخم لگا تھا۔ اس کے اندمال کی قابلیت باقی تھی۔ کاروبار دوسری بیوی ہی کے سامنے پنپ چلا تھا۔ تیسری بیوی کے دور میں ابھر عود کر آئی۔ پچھلے پرچے تو دوبارہ نہیں نکلے۔ ماہنامہ ادیب اور ماہنامہ فردوس اس دور میں جاری ہوئے۔ لیکن ان کا میں صرف ایڈیٹر تھا، مالک نہیں تھا۔ مالک ادیب کے مسٹر فصیح الدین ایم، اے، سکریٹری ہارڈنگ لائبریری، دہلی تھے۔ اور فردوس کے مالک خان بہادر حبیب الرحمن اور بی، اے مینجنگ ڈائرکٹر ایلائڈ ٹریڈنگ کارپوریشن، کراچی۔ البتہ کتابوں کی تجارت نے خوب ترقی کی اور معجون اکسیر دنداں کا اشتہار دے کر کتابوں کے ساتھ دواؤں کی تجارت کی بلیا ڈال دی گئی۔ معجون کا نسخہ ۱۹۱۲ء سے موجود تھا، مگر اس سے فائدہ اٹھانے کا خیال منظور فاطمہ کے دور میں پیدا ہوا۔

کتابوں کا میں پبلشر تھا۔ مصنفوں سے کتابیں لکھواتا تھا، اور شائع کرتا تھا۔ مولانا راشد الخیری کی تصنیف شام زندگی کے میں نے اٹھارہ ایڈیشن شائع کیے۔ اور بھی متعدد تصانیف شائع کیں۔ خواجہ حسن نظامی کی عام فہم تفسیر القرآن کے حقوق اشاعت مجھے حاصل ہیں۔

روپے پیسے سے بے نیازی کا عالم منظور فاطمہ کے دور میں بھی حسب سابق رہا۔ روپیہ ادھر آیا، ادھر گیا۔ روپے کو سینت کر رکھنا نہیں جانتا۔ طبیعت اور فطرت سے مجبور تھا۔ اور

چونکہ خرچ کم کرنے سے ضروریات رکتی نہیں تھیں، طبیعت پر قابو پانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسری بیوی کے دور میں جو جھٹکا لگا تھا، وہ کاروبار سے غافل ہو جانے کے باعث لگا تھا۔ محنت کرتا رہوں تو اللہ میری ضرورتیں ضرور پوری کر دیتا ہے، اور ہاتھ تنگ نہیں ہونے دیتا۔ یہ طبیعت آج تک نہیں بدلی ہے۔ ابتدائے عمر میں بدل جاتی تو شاید بدل جاتی۔ بوڑھے طوطے سبق کہاں سیکھتے ہیں! طبیعت بدل بھی لیتا، مگر تقدیر تو نہیں بدل سکتا تھا۔ میری تقدیر یہ تھی کہ تانبے کا چمچہ لیے پیدا ہوا تھا۔ تانبے کا چمچہ منہ سے کبھی نہیں چھٹا، اور چاندی کا چمچہ منہ کو کبھی نہیں ملا۔

روپے کو سینت کر نہ رکھنے سے لوگ عموماً تکلیفوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مجھ پر اللہ تعالیٰ کا غیر معمولی کرم تھا۔ مدّ و جزر، اتار چڑھاؤ سے مجھے زیادہ سابقہ نہیں پڑا۔ شمسی حساب سے اٹھتر اور قمری حساب سے اسّی برس یکساں زندگی بسر کر چکا۔ اور آئندہ بھی اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اپنے فضل و کرم سے محروم نہیں فرمائیگا۔ میں مدت العمر اللہ کا شکر گزار بندہ رہا ہوں۔ مگر حقِ شکر گزاری ادا نہیں کر سکا۔

منظور فاطمہ کثیر الاولاد رہیں۔ ماشاء اللہ چار لڑکوں اور سات لڑکیوں کی ماں۔ موروثی جائداد ان بچوں نے نہیں پائی۔ مگر جائداد نہ پانے سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ سب الحمد للہ اتنے کامیاب ہیں کہ انھوں نے مجھے ایسے مکان میں لا بٹھایا ہے، جو میرے دلّی کے رہائشی مکان سے بہتر اور آرام دہ ہے۔ اولاد کی کثرت سے میں نالاں نہیں ہوں، شادماں ہوں۔

منظور فاطمہ کی اولاد میں سب سے بڑے احمد مجتبےٰ واحدی ہیں۔ مجتبےٰ کی ملازمت دو سال کے اندر پنشن کے لائق ہو جائیگی۔ پھر وہ انشاء اللہ کاروبار کرینگے۔ کاروبار میں مجتبےٰ کی طبیعت خاصی لڑتی ہے۔ مجتبےٰ سے چھوٹے علی مقتدےٰ واحدی سنٹرل لیبر اینڈ ہیلتھ منسٹری میں سکشن افسر ہیں۔ تیسرے موسےٰ رضا واحدی آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ کارپوریشن میں اسسٹنٹ انجینئر ہیں۔ چوتھے عیسےٰ رضا واحدی بھی موسیٰ رضا کی لائن اختیار کرنے والے ہیں۔ لڑکیوں میں شاکرہ خاتون کے شوہر محمد شریف خاں

بی اے سنٹرل فائننس منسٹری میں سکشن افسر ہیں۔ حامدہ خاتون کے شوہر مرتضےٰ حسن ایم، اے پاکستان کیبلز میں اونچے عہدہ دار ہیں۔ حامدہ خود بی اے، بی ٹی، بی پی اور گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول میں ریاضی سکھاتی ہیں۔ ساجدہ خاتون کے شوہر محمد عامر صدیقی ایم، کام سینٹ پیٹرک کالج میں پروفیسر ہیں۔ ساجدہ بھی ایم، اے ہیں اور کراچی زنانہ کالج میں لیکچرار ہیں۔ عابدہ واحدی بی، ایس، سی، بی ٹی ہیں اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں سائنس پڑھاتی ہیں۔ (عابدہ کی شادی مسٹر شاکرالدین بی اے سے ہوئی۔ مسٹر شاکر کو کسی برٹش فرم میں ملازم ہیں) صالحہ واحدی اس سال بی، اے فائنل کا امتحان دینے والی ہیں (صالحہ نے بی، کر لیا) صالحہ سے چھوٹی تسنیمہ واحدی بی، اے ہو چکی ہیں۔ سب سے چھوٹی سنجیدہ واحدی اس سال ایف اے (فائنل) کا امتحان دے رہی ہیں (سنجیدہ بھی بی۔ اے پاس کر چکیں) جو لڑکیاں ابھی غیر شادی شدہ ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انھیں بھی قیسی رامپوری، جمیلہ شاہ خان، محمد شریف خان، مرتضےٰ حسن اور محمد عامر صدیقی اور شاکرالدین جیسے شوہر ملیں۔ میری شادی شدہ لڑکیاں اپنے اپنے گھروں میں الحمد للہ مطمئن ہیں اور میرے شادی شدہ لڑکے اپنی اپنی بیویوں سے خوش ہیں۔

بچے جب تک چھوٹے رہتے ہیں اور میرے پاس بےتکلف آتے ہیں، میں ان سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں اور تکلف برتنا شروع کر دیتے ہیں، تو پھر میں ان کی بجائے ان کے بچوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہوں۔ بچے اپنے کمروں میں خوش، میں اپنے کمرے میں خوش۔ سب بچے آپس میں ہنستے بولتے سنائی دیتے ہیں، تو میری روح میں تازگی آتی ہے۔ ان میں سے کسی کو کسی سے منہ پھلائے دیکھتا ہوں، تو روح مضمحل ہو جاتی ہے۔ ان کا ایک دوسرے سے بات نہ کرنا یا ماں سے روٹھ جانا میرے سکون کو کھو دیتا ہے۔

یہ تحریر ممکن ہے بچوں کی نظر سے میرے مرنے کے بعد گزرے۔ میری موت سر پہ منڈلا رہی ہے۔ اس تحریر کو Death-bed Declaration Dying (مرتے وقت کی وصیت)

سمجھنا چاہیے۔ میری تمنا ہے کہ میرے بچے جس طرح مجھ سے کبھی نہیں روٹھے اسی طرح آپس میں نہ روٹھا کریں۔ اور ماں سے روٹھنے کا تو اسلام نے حق ہی نہیں دیا ہے اور بھائی بہن سے بھی حسنِ سلوک کی اسلام نے تاکید کی ہے۔ (افسوس ۲۱ فروری ۱۹۷۶ء کو ان بچوں کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا)

میں بچوں کو ڈائرکٹ (DIRECT) نصیحتیں کرنی نہیں جانتا بچے مجھ سے کچھ حاصل کر سکتے ہیں تو صرف اس وقت جب وہ کچھ پوچھیں۔ یا اس وقت جب میرے ملنے والے جمع ہوں اور میں ان کے سوالوں کے جواب دے رہا ہوں۔ میں اپنے ملنے والوں سے ایسی باتیں نہیں کرتا جنھیں بچوں سے چھپایا جائے۔ مجھلے اور منجھلے چار پانچ برس سے تو چک لالہ اور اسلام آباد میں ہیں۔ دلی اور کراچی میں تھے تو اس قسم کی مجالس میں خود پہنچ جایا کرتے تھے۔ عیسیٰ رضا گاہے گاہے آ بیٹھتے ہیں۔ میں نے بچوں کے سامنے ایک تو اپنا نمونہ برا نہیں پیش کیا۔ دوسرے جو مضامین اور تاثرات لکھتا رہتا ہوں ان کے حقیقی مخاطب میرے بچے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہ کبھی ان سے فائدہ اٹھائیں گے اتنی نصیحتیں زبانی کر ہی نہیں سکتا تھا، جتنی تحریروں میں آگئی ہیں۔ یہ مضامین اور تاثرات میں نے ساٹھ سال کی عمر ہو جانے کے بعد لکھے ہیں اور میری معلومات اور میرے تجربات کا نچوڑ ہیں، اور میری بصیرت اور میرے وجدان کا عطر ہیں۔

میرے سب لڑکے لڑکیاں بفضلہ تعالیٰ دیندار اور پابندِ مذہب ہیں۔ یہاں منجھلے کا ایک واقعہ بیان کر دوں تو غالباً برمحل ہوگا۔ مجھلے موسیٰ رضا اور عیسیٰ رضا داڑھی مونچھیں نہیں رکھتے، مگر منجھلے کی داڑھی مونچھیں شروع سے سلامت ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں دلی کے مسلمانوں کا گھروں سے نکلنا دشوار ہو گیا تھا۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر برہان، جو ایم۔ اے ہونے کے ساتھ مدرسۂ دیوبند کے سند یافتہ مولوی بھی ہیں، اس زمانے میں مجبور تھے کہ داڑھی منڈوا دیں اور کوٹ پتلون پہن لیں، یا پھر گھر سے کالج پڑھانے نہ جائیں۔ میں نے منجھلے سے کہا کہ تم بھی داڑھی منڈوا دو۔ لیکن انھوں نے صاف انکار کیا اور داڑھی نہیں منڈوائی۔ ۱۹۴۷ء میں تو

اس انکشاف سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ اب فخر کرتا ہوں جو متفقہ طور ۱۹۴۷ء میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔

بچوں سے اپنے تعلق خاطر کا اندازہ خود مجھے صرف دو مواقع پر ہوتا ہے۔ ایک جب بچہ بیمار ہو، دوسرے جب بچہ رات کو گھر دیر میں آئے۔ بچوں کی بیماری سے میں حواس باختہ ہو جاتا ہوں اور بچوں کا دیر میں آنا میری نیند اڑا دیتا ہے۔ حواس باختگی اتنی بڑھتی ہے کہ مجھے لکھنے پڑھنے سے معذور کر دیتی ہے اور نیند کا اڑنا بھی کم از کم ایک دو دن لکھنے پڑھنے قابل نہیں رہنے دیتا۔ گویا نیم مردہ ہو جاتا ہوں۔ اب لکھنا پڑھنا ہی میری زندگی ہے۔

میری بیویوں میں کوئی بیوی بھی لکھنے پڑھنے میں میری معاون نہیں ہو سکتی تھیں۔ البتہ منظور فاطمہ نے کراچی پہنچنے کے بعد سے لکھنے پڑھنے کی فرصت مجھے دے دی ہے۔ میں نے کراچی کے اٹھارہ سال میں جتنا لکھا پڑھا ہے، اتنا دلی کے ساٹھ سال میں نہیں لکھا پڑھا۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا تھا اور وہ حکم قیامت تک برقرار رہیگا اور وہ حکم قیامت تک مسلمانوں کے لیے سبق ہے۔ سورہ ۴۲ کی ۲۳ ویں آیت میں ارشاد ہے: قُل لَّا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبَىٰ (لوگوں سے) کہیے کہ میں (تمہارے ساتھ جو بھلائی کر رہا ہوں) اس کا تم سے بدلہ نہیں چاہتا ہاں یہ (ضرور میری خواہش ہے) کہ تم قرابتداروں سے محبت رکھو۔ (حق قرابت کو پہچانو، ان کے ساتھ سلوک سے رہو)

میری بھی بس یہی تمنا ہے کہ میرے بچوں کا آپس میں برتاؤ کبھی خراب نہ ہو اور وہ باقی کنبے کے ساتھ بھی شریفانہ زندگی گزاریں ورنہ نہ دنیا میں عزت پا سکینگے اور نہ عقبیٰ میں۔ دنیا میں ان کی ہوا اکھڑ جائیگی اور عقبےٰ میں سزا ملیگی۔

کنبے سے تعلّق

بہت سی باتیں ہیں جنھیں سمجھا جاتا ہے کہ ہم ان کی تہ کو پہنچے ہوئے ہیں، لیکن تہ تو دور کی چیز ہے، حقیقتاً صرف سطح ہمارے پیش نظر ہوتی ہے اور اکثر تو سطح پر بھی نظر ٹھہرائے

نہیں رکھتے۔

مسلمانوں میں جو چوٹی کے علما گزرے ہیں، حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ان میں سے ہیں۔ علم کے امام مانے جاتے ہیں۔ اپنے زمانے کے عظیم ترین دار العلوم کے صدر مدرس تھے۔ بیشمار علماء کے استاد۔ لوگ خلیفۂ وقت سے زیادہ حضرت امام غزالی کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ علم و فضل کی بدولت حضرت امام غزالی کی جتنی قدر و منزلت تھی اتنی خلیفہ کی نہیں تھی۔

حضرت امام غزالی کا یکایک جی پوکا یا۔ درس و تدریس ترک فرمایا، شہر چھوڑ دیا، اور جنگلوں ویرانوں میں پھرنے لگے۔ کئی سال دنیا اور اہلِ دنیا سے الگ رہے۔ سال بھر کسی مسجد کے مینار میں اعتکاف کیا۔ اس ایک سال کے اعتکاف کے بعد حضرت امام غزالی کہا کرتے تھے کہ تین باتیں معلوم ہوئی ہیں:

۱۔ اللہ ہے اور واحد ہے۔
۲۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی اللہ کے رسول ہیں۔
۳۔ قیامت ضرور قائم ہوگی۔

حضرت امام غزالی نے علم و فضل کی زندگی چھوڑ کر یہ مجاہدہ اختیار کیا تھا۔ مجاہدے سے پہلے بھی وہ اللہ اور اللہ کی وحدانیت کو، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کو اور قیامت کے قائم ہونے کو جانتے تھے۔ مگر اس جاننے اور مجاہدے کے بعد جاننے میں فرق تھا۔

قریب قریب اس سے ملتا جلتا علم مجھے ۱۹۵۸ء میں کینسر سے تعلق کی بابت ہوا۔ میں نے ۱۹۴۷ء میں دلّی کو الوداع کہا تھا اور پھر میں ایک دفعہ ۱۹۵۸ء میں دلّی گیا تھا۔ وہاں اسٹیشن پر جو صاحبان مجھے لینے آئے تھے، ان میں میرے پھوپی زاد بھائی قاری سرفراز حسین مرحوم کے فرزند قاری اخلاق حسین بھی تھے۔ انھوں نے دو لڑکوں سے تعارف کرایا کہ یہ آپ کے حقیقی خالہ زاد بھائی سیّد محمد ادریس صاحب کے بیٹے مطیع احمد ہیں، اور یہ دوسرے خالہ زاد بھائی سیّد محمد اسحٰق صاحب کے بیٹے رئیس احمد ہیں۔ ددھیالی عزیز کا ننھیالی

عزیزوں سے تعارف کرانا تھا کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ قاری اخلاق حسین کا مطبوع احمد اور رئیس احمد سے مطلق رشتہ نہیں ہے اور میرے وہ دونوں لڑکے انتہائی قریبی عزیز ہیں۔ دونوں ۱۹۴۷ء میں آٹھ آٹھ دس دس برس کے تھے، ۱۹۵۸ء میں ماشاءاللہ جوان ہو گئے۔ میں انھیں نہیں پہچان سکا، حال آنکہ قیام ان ہی میں سے ایک کے ہاں کرتا تھا رشتے کیوں کر بڑھتے ہیں اور کیوں کر بگڑتے ہیں، اس کا فلم (FILM) سا آنکھوں کے سامنے چلنے لگا۔ سب انسان کبھی نہ کبھی ایک دوسرے کے رشتہ دار اور کنبہ دار تھے ۵۸ء سے پہلے کے احساس میں اور ۱۹۵۸ء کے بعد کے احساس میں زمین اور آسمان کا فرق ہو گیا۔ مجھ میں ایک مستقل نقص ہے کہ میں تعلقات قائم کرنے میں پہل اور تقدیم نہیں کر سکتا۔ جو میری طرف بڑھتا ہے، اس سے میں دس قدم بڑھ کر ملتا ہوں، اور جو نہیں بڑھتا اس سے ملنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ سیٹھ محمد ادریس صاحب کا اور میرا بچپن سے ساتھ تھا، انھوں نے بھی تا دم مرگ نبھایا اور میں بھی نبھاتا رہا۔ بچے ان کے کیا، میرے اپنے بچے کنترائیں، تو فطری محبت تو خیر کہیں جاتی نہیں ہے، لیکن بات کرنے میں پہل ان سے بھی اس عمر تک ہی کر سکا ہوں، جس عمر تک وہ میرا سہارا ڈھونڈیں۔ اُدھر بچے بے نیاز ہوئے، اِدھر میں بے نیاز ہوا۔ پھر میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی طرف بڑھتا ہوں۔

یہ بڑا خراب نقص ہے۔ اس کے نقص ہونے کو تو میں سمجھ گیا، مگر یہ نقص مجھ سے جدا کسی طرح نہیں ہوتا، حال آنکہ اسلام کا حکم ہے کہ اہل خاندان تیری طرف بڑھیں یا نہ بڑھیں تو ان کی طرف ضرور بڑھو۔

میرا بگاڑ کسی سے نہیں ہے۔ عمر کے کسی دور میں بگاڑ کا اور معاملہ خراب کرنے کا، تو میں نے تصور تک نہیں کیا۔ بغض و حسد اور کینہ و نفرت کے خانے میرے دماغ میں نہیں ہیں۔ البتہ جو عزیز میری طرف نہیں بڑھتے، ان سے دور دور اور بے تعلق سا ہیں ضرور، یا خواجہ حسن نظامی جیسے ملنے جلنے والے انسان کی ہمنشینی کا پچاس سال مسلسل شرف حاصل ہونے کے باوجود ملنے جلنے میں پہل اور تقدیم کرنا میں نہیں سیکھا۔ کوشش کرتا ہوں۔

ہ تمام ماں باپوں کی طرح بچوں کا دکھ نہ دیکھے بھی محسوس ہوتا ہے بلکہ کچھ زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

لیکن طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ کچھ قرآنی آیات اس مضمون کی نکالی ہیں۔ شاید ان کا اثر ہو جائے۔ میں نہ سہی، پڑھنے والے تو اثر قبول کریں گے۔ آیات کا مفہوم لکھتا ہوں۔ اگرچہ عمل کے لیے کہنے والے کی زبان میں عمل کی قوت اور سننے والے یا پڑھنے والے قلب میں قبولیت کی صلاحیت لازمی ہے

انسان کا اللہ کے بندوں سے اللہ کے حکم کے مطابق معاملہ رکھنا یہی اسلام ہے قرآن میں عبادات کی فہرست قلیل ہے، اور معاملات کی فہرست طویل۔ مختصراً بیان کرتا ہوں۔ سورہ ۴ (النساء) کی پہلی آیت ہے۔

> اے لوگو! اپنے پروردگار (اور نشوونما دینے والے) کا خوف دل میں رکھو (اس سے بے نیازی نہ برتو) جس نے شخصِ واحد (یعنی آدم) سے تمھیں (امتوں کو) جنم دے دیا۔ اور (وہ اس طرح کہ اوّل آدم (کی پسلی) سے ان کی بیوی (حوّا) کو نکالا۔ اور (پھر) ان دونوں (کے اختلاط) سے بکثرت مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔ (لوگو! جو تمھیں عدم سے وجود میں لایا ہے، اس کا خوف انسانیت اور سعادت ہے)۔ لہٰذا (جیسے ماں باپ سے خوف کھاتے ہو اس سے زیادہ) اللہ سے خوف کھاتے رہو کہ (اس نے محض وجود ہی نہیں بخشا ہے وجود کی بقا میں بھی اس کی مدد کی حاجت ہے) تم اس کے نام کا واسطہ دیتے رہے ہو (اور اس کے نام سے) آپس میں (کاروبار اور معاملے کرتے ہو) اور (اللہ کے بعد) قرابتداروں (کے حقوق ادا نہ کرنے سے بھی خوف کھاؤ۔ ان کے حقوق) کا (بھی) دھیان رہے۔ اللہ تمھارے حال کا نگراں ہے۔ (تمھارا اعمال دیکھ رہا ہے)

آیت کے پہلے حصّے میں جملہ نوعِ انسان کے ساتھ ٹھیک برتاؤ اور معاملہ کرنے کا حکم ہے اور آیت کے دوسرے حصّے میں قرابتداروں کا خاص طور سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے ٹھیک برتاؤ اور ٹھیک معاملہ نہ کرنے سے خصوصیت کے ساتھ ڈرایا گیا ہے۔

جو مسلمان اپنے گھروں اور وطن سے ہجرت کر کے مدینے میں جا بسے تھے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ان مہاجرین کا اور مدینے کے مسلمانوں، یعنی انصار کا ایسا بھائی چارہ کرا دیا تھا کہ ان میں تقسیمِ میراث بھی ہوتی تھی۔ مگر جب مہاجرین اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور انصار کی امداد کے مزید محتاج نہیں رہے، تو حکم نازل ہوا کہ مہاجرین اور انصار میں تقسیمِ میراث موقوف۔ میراث کے حقدار فقط رشتہ دار ہیں۔ ارشاد فرمایا:

> اور ان میں وہ لوگ جو تمہارے رشتہ دار ہیں (وہ اللہ کے حکم کے مطابق) آپس میں ایک دوسرے کا ترکہ لینے کے زیادہ مستحق ہیں۔ (اگر چہ مرتبے اور فضیلت میں وہی لوگ بڑھے ہوئے ہیں، جنھوں نے ایمان لانے میں سبقت کی تھی۔ لیکن جہاں تک قانون کا تعلق ہے وراثت قرابتداروں کا حق ہے) (سورہ ۸ آیت ۷۵)

ذرا دیکھیے، قرابت کا نام کس کس کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔ سورہ ۳۳ کی آیت ۶ میں ارشاد ہے:

> (مسلمانوں کے پیشوا) نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کے ساتھ اتنا لگاؤ رکھتے ہیں کہ خود کوئی مسلمان اتنا لگاؤ اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ (مرتبے میں تو باپ دادا سے بڑھ کر ہیں ہی، شفقت اور رحمت میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب نہیں ہے۔ نیز) ان کی ازواج ان کے امتیوں کی مائیں ہیں، اور قرابتدار مسلمان کتاب اللہ کی بموجب عام مومنوں اور مہاجروں کی نسبت ایک دوسرے سے زیادہ لگاؤ رکھتے ہیں۔ (قرابتداروں کی موجودگی میں غیروں کو متروکہ مال نہیں دیا جا سکتا، مگر ہاں) اتنا (جائز ہے) کہ تم اپنے دوستوں کے ساتھ سلوک کر دو (اور مرتے وقت اپنے مال میں سے تھوڑا بہت انھیں دینے کی وصیت کر دو)۔

قرابت قطع کرنے کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی شان کے خلاف بتایا ہے منافق قسم کے لوگوں سے فرمایا ہے:

تم سے یہ بھی تو توقع ہے کہ اگر تمہیں حکومت (اور اقتدار) مل جائے تو تم ملک میں تباہی مچادو اور (حکومت و اقتدار کے نشے میں اپنے قرابتداروں کو بھی بھول جاؤ) قرابتیں قطع کر لو۔ (سورہ ۴۷ آیت ۲۲)

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے (اجداد) بنی اسرائیل سے (تورات کے ذریعہ) اقرار لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت (اور اطاعت) مت کرنا اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا اور قرابتداروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آنا۔ (سورہ ۲ آیت ۸۳)

نیکی (خالی) یہی نہیں کہ تم (نماز میں) اپنا منہ مشرق کی سمت کر لو یا مغرب کی سمت۔ (نماز کے واسطے اللہ کی مقرر کردہ سمت قبول کرنا اور کل مسلمانوں کا یک سمت اور یک جہت رہنا بھی یقیناً نیکی ہے) لیکن (مقصود بالذات اور) اہم تر نیکی ان کی ہے جو اللہ اور روز قیامت اور ملائکہ اور (تمام آسمانی) کتابوں اور تمام نبیوں پر (کامل) یقین اور ایمان رکھیں اور (اپنا) مال اللہ کی محبت میں قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں مسافروں اور سائلوں (کی ضروریات، اور غلامی وغیرہ سے مظلوموں کی گردنوں کے چھڑانے میں لگائیں۔ اور (ان سب باتوں کے ساتھ) نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں۔ اور جو عہد کر کے اپنے عہد کو پورا کریں اور مفلسی، بیماری، اور حالت جنگ میں صبر و ضبط دکھائیں، یہ لوگ

ہیں (جنھیں کہنا چاہیے کہ) صادق (مسلمان ہیں) اور یہی لوگ ہیں جو اصلی معنوں میں نیک اور پرہیزگار (کہلانے کے مستحق) ہیں (سورہ ۲- آیت ۱۷۷)-

اے مسلمانو! فقط) اللہ (واحد) کی عبادت (اور اطاعت) کرو اور غیر اللہ کو اللہ کا شریک نہ سمجھو- (نیک اعمال بھی اللہ کی خوشنودی کی بجائے فخر اور دکھاوے کے لیے کیے جائیں، تو یہ بھی ایک نوع کا شرک ہے- لہٰذا اس سے بچو) اور (ہر عمل کے وقت اللہ کی خوشنودی کا خیال اور دھیان رکھو) اور (اہل دنیا کے ساتھ اللہ کی حسب منشا معاملہ کرنا بھی عبادت ہے- درجہ بدرجہ سب کے حقوق ادا کرو) ماں باپ، قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں، قریب کے پڑوسیوں اور بعید کے پڑوسیوں، پاس اٹھنے بیٹھنے والوں، مسافروں اور (لونڈی غلام حتٰی کہ حیوان) جو تمھارے قبضے میں ہوں، توان سب سے احسان کے ساتھ پیش آؤ- اللہ اینٹھنے اور اترانے والوں (اور اپنے آپ کو بڑا (اور برتر) تصوّر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا- سورہ ۴- ۳۶

لاریب اللہ (تمھیں) سب کے ساتھ (عدل اور) انصاف اور (سب کے ساتھ) بھلائی کرنے کا حکم دیتا ہے- اور قرابتداروں کو (انصاف اور بھلائی کے علاوہ جائز) مدد بھی دینے کا (حکم فرماتا ہے) (سورہ ۱۶، آیت ۹۰)

اس مضمون کی متعدد آیتیں قرآن مجید میں اور بھی ہیں- احادیث تو بیشمار ہیں- لیکن میں قرآن مجید کی بس ایک آیت اور لکھ کر یہ بیان ختم کرتا ہوں- اس آیت

میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم کیا ہے کہ مسلمانوں سے کہو کہ میں تم سے پیغامِ حق پہنچانے کا کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ سوائے ایک صلے کے کہ تم اپنے قرابتداروں سے دوستی اور میل ملاپ رکھو۔ (آپس میں لڑو جھگڑو نہیں) (سورہ ۴۲ آیت ۲۳)

قرآن مجید کی اس آیت سے قرابتداری کی اہمیت کی حد ہو گئی۔

میں مندرجہ بالا آیات کی کسوٹی پر کستا ہوں، تو اپنے کو ناقص مسلمان پاتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ بچّے کنبے سے تعلق کے معاملہ میں صرف یہی نہ کریں کہ ملنے والوں سے ملیں، بلکہ نہ ملنے والوں سے بھی ملیں، اور زیادہ ملنے جلنے میں عموماً شکایتیں پیدا ہو جایا کرتی ہیں، میرے بچّے شکایتوں کو کبھی زبان پر نہ لائیں، غیبتیں کرتے نہ پھریں۔

ہاں، آخر میں یہ لکھ دینا مناسب ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول قرابتداروں میں ویسا میل ملاپ نہیں چاہتے، جیسا میل ملاپ قبلِ اسلام عرب جہلا میں تھا کہ قرابتدار کسی قبیلے کا مارا جاتا تھا تو وہ قبیلہ قاتل ہی کا نہیں، قاتل کے سارے قبیلے کا دشمن ہو جاتا تھا اور پھر دشمنی صدیوں چلتی تھی۔

قرآن مجید میں جہاں مندرجہ بالا آیتیں ہیں، وہیں اس نوع کی آیتیں بھی موجود ہیں کہ جب بات کہو، حق و انصاف کی کہو خواہ وہ کسی اپنے عزیز قریب ہی کے متعلق (کیوں نہ) ہو۔ (حق و انصاف کی بات کہنے میں کسی کی قرابت مانع نہیں ہونی چاہیے۔ کرا ذا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ (سورہ ۶۔ آیت ۱۵۲)

دوستوں سے تعلق

کنبہ دار کے مقابلے میں دوستدار بہت کامیاب اور خدا و اسلام کے معیار کے مطابق رہا۔ دوست عموماً ہم مذاق اور ہم طبع ہوتے ہیں۔ پورے کنبے کا ہم مذاق اور ہم طبع ہونا ممکن نہیں ہے۔ کنبے میں بھی میرے تعلقات ناخوشگوار کسی سے نہیں تھے، اور قریبی عزیزوں مثلاً بڑی پھوپی کے بیٹے سید ابوالحسن اور پوتی فخر جہاں اور دوسرے

رشتے کی پھوپی کے بیٹے قاری سرفراز حسین اور پوتے قاری عباس حسین اور تیسرے رشتے کی پھوپی کے بیٹے مولوی امیر حمزہ اور پوتوں مولانا ناصر جلالی اور مولانا حامد جلالی اور چچا زاد بھائیوں، سیّد منظور احمد، سیّد مسعود احمد، میر سیّد علی، میر سلطان علی اور سلطان علی کے بیٹے سیّد محمد احمد عرف بادشاہ سے تو تعلقات خوشگوار رہے۔ اور بھائی فضل احمد خان شیدا تو دوست ہی بن گئے۔ بہنوئی خان صاحب سیّد احمد اور ان کے بڑے بھائی خان بہادر سیّد محمد سے ایسا نباہ ہوا کہ سمدھیانے والوں سے ایسا نباہ کم ہوتا ہے۔ سیّد احمد اور سیّد محمد سے میرا پہلے کا رشتہ بھی تھا۔ ان کے والد میر جعفر علی میرے چچا تھے۔ ہاں، میرے خسر میر محمد سیّد حسین مجھے بیحد عزیز رکھتے تھے اور میں انھیں عزیز رکھتا تھا۔ اور اعزّا مثلاً میر بادشاہ، میر اقبال حسین (سپرنٹنڈنٹ پولیس) اور ڈاکٹر میر مقبول حسین اور اقبال، مقبول کے بہنوئی، ڈاکٹر سیّد اظہر علی٭ (پروفیسر) اور خواجہ فضل احمد خان کے چھوٹے بھائی خواجہ محمد احمد خان سے تعلقات بہت اچھے رہے۔ خواجہ محمد احمد خان کی اولاد مجھ سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح خواجہ فضل احمد صاحب کی اولاد ملتی ہے۔

ننھیال میں بڑی خالہ، نور جہاں بیگم اور ماموں سیّد ضمانت علی، دونوں میرے سرپرست تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد ان دونوں نے میرا اور میرے بھائی بہن کا بڑا ساتھ دیا۔ میری بہن کو اپنے ہاں لے جا کر ان دونوں نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ والدین کے انتقال کے بعد اوّل بڑی پھوپی امۃ القدیر بیگم نے مدد کی تھی۔ وہ ہمارے گھر آ گئی تھیں اور انھوں نے میرے بھائی بہن کو سنبھال لیا تھا۔ وہ مکّہ معظمہ ہجرت کر گئیں، تو پھر خالہ اور ماموں بہن کو اپنے یہاں لے گئے۔ میں خود کم عمر تھا۔ بھائی بہن کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا تھا۔ میری بہن کو بڑی خالہ اور ماموں نے انسانیت سکھائی

٭ یہ تینوں شیعہ ہیں۔ ڈاکٹر اظہر علی کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے خاندان میں چند حضرات شیعہ بھی ہیں۔

اور انھوں نے ہی بہن کی شادی کا انتظام کیا۔ میری پہلی شادی بھی خالہ اور ماموں کی زیرِ سرپرستی ہوئی تھی، اور میرے چھوٹے بھائی سید محمد مرتضیٰ تو ماموں ضمانت علی کے داماد تھے۔

دوسری دونوں خالاؤں سے بھی تعلّقات اور مراسم رہے۔ سیّد محمد ادریس میرے ابتدائے عمر کے دوست بڑی خالہ کے بیٹے تھے۔ ان کے ساتھ میری ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۹ء تک خوب گزری۔ دوسرے دوست خواجہ فضل احمد کے ساتھ ۱۸۹۸ء سے تا ایں دم نبھو رہی ہے۔ رشید صاحب لاہور میں ہیں۔ دلّی میں ہر وقت کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ لاہور سے ہر ہفتے خط آجاتا ہے، اور میرا جواب چلا جاتا ہے۔

رشید صاحب چیزوں کو سینت کر رکھنے کے شوقین ہیں۔ میرے سینکڑوں خطوط ان کے پاس جمع ہیں۔ میرا ایک خط فروری ۱۹۰۰ء کا لکھا ہوا اور میرے والد کا ایک فروری ۱۹۰۱ء کا لکھا ہوا ان کے پاس محفوظ تھا۔ یہ دونوں خط انھوں نے میرے منجھلے لڑکے سیّد علی مقتدیٰ واحدی کو بطور تحفہ دے دیے ہیں۔ والد ماجد کے خط کی دو چار سطریں نقل کرتا ہوں۔ تحریر فرماتے ہیں:

عزیزم محمد الفضل احمد صاحب سلمہٗ

بعد دعا درازیِ عمر کے معلوم کر دو کہ میں بخیریت ہوں اور تم سب کی خیریت کا خواستگار ہوں۔ آج خط مرسلہ آں عزیز کوٹھی جھینک کہ جس جگہ میں عرصہ ہفتہ تک رہونگا، پہونچا۔ حالِ مندرجہ معلوم ہوا۔

کوئی وقت رات میں اپنی نوشت و خواند کا مقرر رکھو کہ جس میں سیّد محمد ارتضیٰ بھی تمھارے ساتھ اپنی خواندگی کیا کریں۔ برخوردار مذکور کے ماسٹر صاحب سے کہہ دو کہ یہ اردو تحریر میں بہت کمزور ہے۔ بعض وقت برخوردار کی تحریر سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

جس وقت تنخواہ ملیگی بخود آ ماسٹر صاحب کی تنخواہ دینا مناسب ہوگا۔ بلکہ ماسٹر عبد القیوم صاحب کو بھی فوراً دی جاوے۔ بوجہ کمی خرچ دیر لگی

ورنہ معمولی وقت پر دے دی جاتی۔

سید محمد مصطفیٰ

از کوٹلی جھنگ

۲۶ فروری ۱۹۰۱ء

مولانا احمد سعید والے گروپ میں مولانا احمد سعید اور مسٹر آصف علی نے مرتے مرتے دوستی قائم رکھی، اور گروپ کے تیسرے صاحب قاضی لطیف الحق حقی اب تک قائم رکھے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب راولپنڈی میں ہیں۔ ان سے خط و کتابت جاری ہے۔ اور خواجہ حسن نظامی والے گروپ کا تو کہنا کیا ہے! خواجہ صاحب میرے دوست ہی نہیں تھے، پیر بھی تھے۔ پیر ہو کر خواجہ صاحب نے میرے ناز اٹھائے اور میں نے ان پر جان چھڑکی۔ میں دوستی کا کریڈیٹ دوسروں کو دے رہا ہوں اور اس میں شک نہیں کہ سبقت عنایتوں میں دوسرے ہی کرتے تھے۔ مگر وہ میری طرف ایک قدم بڑھتے تھے، تو میں ان کی طرف دس قدم بڑھتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں جب میں حکیم اجمل خان صاحب کے ہمراہ بہ حیثیت ایڈیٹر اخبار طبیب آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی شرکت کے واسطے امرتسر گیا، تو خواجہ صاحب میری چند روزہ جدائی سے بےچین رہے، اور ۱۹۱۱ء میں خواجہ صاحب جب مصر و شام و حجاز کی سیاحت کرنے گئے، تو میں نے تین مہینے مسلسل ایک وقت کھانا کھایا، اور وہ بھی پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔

خواجہ صاحب کو ایک دفعہ ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر سراج الدین نے ٹی بی بتا دی تھی۔ میں اور خواجہ صاحب ڈاکٹر سراج الدین کے ہاں کوچہ چیلان سے پھاٹک حبش خان تین ساڑھے تین میل ٹہلتے ہوئے پہنچے تھے۔ خواجہ صاحب اس زمانے میں میرے ساتھ رہتے تھے، اور پھاٹک حبش خان میں ڈاکٹر سراج الدین کا مطب تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ٹی۔ بی بتائی تو خواجہ صاحب کو سواری میں بٹھا کر لانا بھی مشکل ہو گیا۔ خواجہ صاحب اتنے متاثر تھے کہ واپس آکر ناشتہ نہیں کیا، دوپہر کا کھانا نہیں کھایا، دن

بھر پانی نہیں پیا۔ ڈاکٹر سراج الدین دراصل جراح تھے۔ ڈاکٹروں کی صحبت میں رہتے رہتے تھوڑی بہت ڈاکٹری آگئی تھی سب پڑھے لکھے ڈاکٹر تھے۔ جراحی میں البتہ کمال حاصل تھا۔ خواجہ صاحب نے تین ساڑھے تین میل پیدل چل کر تکان محسوس نہیں کی تھی، اس لیے مجھے ڈاکٹر صاحب کی تشخیص کا یقین نہیں تھا۔ معمولی زکام تھا، جسے ڈاکٹر صاحب نے ٹی۔ بی کہہ دیا تھا۔ ٹی۔ بی کا مریض بھلا تین ساڑھے تین میل پیدل چل سکتا ہے! شام کا کھانا کھانے سے بھی انکار کیا تو میں نے کہا، اچھا پانی تو پی لیجیے، فرمایا، ہاں پانی پی لونگا۔ میں نے گلاس بھر کر پانی دیا۔ خواجہ صاحب دو تین گھونٹ پینے پائے تھے کہ میں نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا، اور ان کا جھوٹا پانی خود پی گیا۔ خواجہ صاحب واقف تھے کہ میں محتاط آدمی ہوں۔ ٹی۔ بی کا ذرا سا بھی شبہہ ہوتا تو جھوٹا پانی نہ پیتا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے اس ذرا سے عمل سے خواجہ صاحب کو تندرست کر دیا۔ خواجہ صاحب کا وہم فوراً جاتا رہا۔ پہلے بھی ڈاکٹر صاحبان دو مرتبہ انھیں ٹی۔ بی کا وہم دلا چکے تھے۔ میرے اس عمل کے بعد خواجہ صاحب چوالیس پینتالیس برس جیے۔

ایسے نہ جانے کتنے واقعے اور ہیں۔ خواجہ صاحب کو میرا اور مجھے خواجہ صاحب کا حاضر وغائب خیال رہتا تھا۔ ایک دفعہ خواجہ صاحب نے مہاراجہ سر کشن پرشاد وزیر اعظم ریاستِ حیدر آباد (دکن) سے فرمایا کہ میں واحدی صاحب کا منصب مقرر کرانا چاہتا ہوں۔ مہاراجہ نے کہا، درخواست دے دیجیے۔ میرے فرشتوں کو خبر نہیں۔ خواجہ صاحب میری طرف سے درخواست دے کر دلی آگئے لیکن مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ درخواست منظور ہو گئی، تو ایک روز مہاراجہ کا تار لیے تشریف لائے۔ مہاراجہ نے لکھا تھا کہ واحدی صاحب کا پچیس روپیہ ماہوار منصب مقرر ہو گیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پچیس روپے ماہوار دوسروں کے میں مقرر کر سکتا تھا۔ میں نے تار پڑھا تو میرا چہرہ متغیر ہو گیا۔ شکریے کی بجائے غصے کے آثار دیکھ کر خواجہ صاحب نے صفائی کی کہ درخواست سو روپے ماہوار کے لیے دی گئی تھی اور سو روپے مہاراجہ نے خود تجویز کیے تھے۔ لیکن ان کے پرائیویٹ سکریٹری فلاں جنگ نے بھانجی مار دی۔

مہاراجہ کو بتایا کہ آج کل خواجہ صاحب کے ۲۰۰ روپے حضور نظام نے بند کر رکھے ہیں۔ حضور نظام سمجھیں گے کہ واحدی صاحب کے پردے میں خواجہ صاحب نے ۱۰۰ روپے تو وصول کر ہی لیے۔ واحدی صاحب کے اور خواجہ صاحب کے تعلقات حضور نظام سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ایسی رقم مقرر کیجیے، جس سے ذہن اُدھر نہ جائے۔ اپنے پرائیویٹ سکریٹری کے بہکانے سے مہاراجہ نے ۱۰۰ کے ۲۵ کر دیے ہیں۔ ان پچیس روپوں کو میں اُس وقت خاطر میں نہیں لایا تھا۔ مگر وہ پچیس روپے دلّی سے کراچی پہنچنے کے بعد پچیس اشرفی بن گئے تھے۔ حیدرآباد پر ہندوستان کا قبضہ ہونے سے پہلے کراچی میں بزرٹا لائنز سے بولٹن مارکیٹ تک بارہ تیرہ میل کا سفر کر کے حیدرآباد بینک سے یہ پچیس روپے وصول کرتا تھا اور خواجہ صاحب کو دعائیں دیتا تھا۔

خواجہ صاحب کے گروپ کے ساتھی دیوان سنگھ مفتون نے بھی مجھے مالی امداد سے نوازا۔ سردار صاحب اپنے اخبار ریاست میں میرے منجن کا اشتہار بغیر اجرت لیے چھاپا کرتے تھے۔ کراچی آئے ہمیں شاید دو تین دن گزرے ہوں گے کہ ریاست اخبار میرے منجھلے لڑکے سیّد علی مقتدی واحدی کو کسی جگہ دکھائی دے گیا۔ اس میں منجن کا اشتہار موجود تھا اور پتا وہی کوچہ چیلان دہلی درج تھا۔ مقتدی نے سردار صاحب کو خط لکھا کہ ہم تو کراچی پہنچ گئے ہیں۔ سردار صاحب کا مقتدی ہی کے نام جواب آگیا کہ تمھارا خط جس وقت ملا، اس وقت بھیّا احسان الحق صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ہم دونوں رونے لگے۔ پھر اور بہت کچھ تحریر کرنے کے بعد آخر میں لکھا کہ میرے ذمے تمھارے ابا کے تھوڑے سے روپے ہیں جب تک وہ پورے ادا نہ ہوں، تم میرے کراچی کے نیوز پیپر ایجنٹ سے ریاست کی قیمت وصول کرتے رہو۔ میں نے ایجنٹ کے نام خط بھیج دیا ہے کہ روپے تمھیں دے دے، دلّی ارسال نہ کرے:

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست — در پریشاں حالی و درماندگی

روپے وہ پے سردار صاحب کے ذمے نہیں تھے۔ مدد کرنے کا ایک بہانہ تراش لیا تھا۔

راجہ صاحب کے گروپ کے تیسرے ساتھی بھیا احسان الحق کے اخلاص کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ ان سا کہوں جسے

۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک میرے تعلقات مولانا راشد الخیری اور مولانا عارف ہسوی سے بحال رہے۔ ۱۹۳۶ء میں دونوں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس گروپ میں خواجہ فضل احمد شیدا، میرے چچا اور قاری عباس حسین، میرے بھتیجے شامل تھے۔ دادا اور پوتے کی عمر میں صرف بارہ برس کا تفاوت ہے۔ رشتے میں شیدا صاحب دادا ہیں اور قاری صاحب پوتے۔

مولانا راشد الخیری صاحب کے صاحبزادگان، مولانا رازق الخیری اور مسٹر صادق الخیری مجھ سے خواجہ حسن نظامی صاحب کے صاحبزادے علی نظامی کی طرح ملتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے لڑکے خواجہ حسن ثانی نظامی جو دلی میں ہیں، ان سے خط و کتابت ہے۔

ایک دوست میونسپل کمیٹی کی ممبری کے زمانے کی یادگار ہیں۔ خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن او۔ بی۔ ای۔ ۱۹۳۴ء سے آج تک ان سے بھی نبھ رہی ہے اور خوب نبھ رہی ہے۔

مسٹر ضیاء الدین احمد برنی طالب علمی کے زمانے کے دوست ہیں۔ انھیں بھی اتنا تعلق ہے کہ دوسرے تیسرے مہینے صورت دکھا جاتے ہیں۔

میں نے اپنے ملازموں اور خدمتگاروں کو بھی کبھی خفا نہیں کیا، دوست تو مجھ سے کیا خفا ہوں گے۔

دوستوں اور کرم فرماؤں کی فہرست طویل ہے۔ یہاں میں فہرست نہیں دے رہا۔ فقط ان کا ذکر کیا ہے جن سے چوبیس گھنٹے کا ملنا جلنا تھا اور جن سے کھٹکنے اور

اور بدمزہ ہو جانے کا امکان تھا۔ مگر اللہ کا فضل رہا۔

دوست اللہ نے مجھے بے مثل عطا فرمائے۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے لکھا ہے کہ "آدمی نہیں ملتا" مجھ گدا کو جو ملا آدمی ملا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

بھائی ادریس تو دوست ہو سے کہ ساتھ بھائی تھے ہی اور بھائی فضل احمد بھی بھائی ہیں۔ رشتہ داروں میں قاری عباس حسین سے بھی دوستی رہی۔ وہ بھی بڑے مخلص تھے۔ خواجہ حسن نظامی کی بابت کچھ کہنا فضول ہے۔ ان کا سا تعلق مجھ سے کسی کا نہیں رہا۔ خواجہ صاحب کا ذکر پچھلے صفحات میں کافی آچکا ہے اور ان کی سوانح عمری میں نے الگ شائع کردی ہے۔ یہاں صرف بھیا احسان الحق، مولانا عارف ہسوی اور مولانا راشد الخیری کی بابت ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تینوں صاحبان بھائیوں سے بڑھ کر مجھ پر مہربان تھے۔

بھیا احسان الحق سے میری دوستی نے اتنی طویل عمر پائی جتنی خواجہ حسن نظامی کی کرم فرمائیوں کی عمر تھی، بلکہ دو تین سال زیادہ۔

میں اور بھیا ایک سنہ اور ایک مہینے میں خواجہ صاحب سے ملے تھے۔ اور خواجہ صاحب کے دل میں بالکل میرا جیسا بھیا کا بھی گھر ہو گیا تھا۔

بھیا احسان الحق

بھیا احسان الحق، خان بہادر شیخ وحید الدین، سی۔ آئی۔ ای رئیس اعظم میرٹھ کے بھانجے اور داماد تھے۔ بھیا کے والد شیخ سبحان بخش کو دلی کی حکومت نے

۱۔ ۱۷ رمضان ۱۳۷۵ ہجری کو قاری عباس حسین کا انتقال ہو گیا۔

۲۔ خواجہ صاحب کا صرف ایک واقعہ اور ایک فقرہ ان کے اور میرے تعلقات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ میرے کراچی آنے کے بعد بھی وہ عید کے دن میرے دلی کے مکان پر ضرور جاتے تھے اور مکان کے پھاٹک سے رو رو کر گلے ملتے تھے۔ اور بستر مرگ پر جو آخری عید آئی تھی اس کی بہار کباد انھوں نے مجھے ان الفاظ میں بھیجی: "دل کے دیس میں بسنے والے پردیسی واحدی کو عید مبارک ہو"۔

آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا۔ اس زمانے میں ممبر نامزد ہی ہوا کرتے تھے، انتخاب کا دستور بعد میں چلا ہے۔ بھیّا احسان الحق خود دلّی میونسپل کمیٹی کے منتخب ممبر رہے۔ بھیّا اس طبیعت اور کردار کے آدمی تھے کہ مسٹر تمیز الدین خاں، ممبر میونسپل کمیٹی دلّی ملازم ہو کر کابل جانے لگے تو بھیّا نے ممبری قبول کر لی۔ اور مسٹر تمیز الدین خان کابل کی ملازمت چھوڑ کر دلّی واپس آ گئے تو ممبری ان کے حوالے کر دی۔ ممبری کی کرسی پر بیٹھ کر کرسی سے دستبردار ہو جانا معمولی بات نہیں ہے۔

میرے ساتھ بھیّا کا معاملہ یہ تھا کہ میرا ایک کام کرنے کے لیے انھوں نے بیوی بچوں سے دور علی گڑھ میں مسلسل تین مہینے قیام کیا تھا۔ میں اپنا وہ کام خود انجام نہیں دے سکتا تھا۔ بھیّا اسے انجام دے سکتے تھے۔

یہ ایک واقعہ ہے۔ بھیّا ہر وقت میری مدد کو تیار رہتے تھے۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد بھیّا نے دلّی کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ ماموں یا خسر کا احسان لینا نہیں چاہتے تھے اور ان کا زیر بارِ احسان ہوئے بغیر شان ریاست باقی نہیں رکھ سکتے تھے، جو میرٹھ میں رکھنی ضروری تھی۔ لہٰذا میرٹھ کو خیرباد کہا اور دلّی اپنے والد کے مکان میں آ بسے۔ والد کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

میرٹھ میں بھیّا کا خاندان گھر سے باہر نکلتا تھا، تو گاڑیوں میں نکلتا تھا۔ میرٹھ میں بھیّا بھی پیدل نہیں پھر سکتے تھے۔ دلّی میں پھر سکتے تھے اور پھرتے تھے۔

مولانا عارف ہسوی

مولانا عارف ہسوی دلّی میں مولانا نیاز فتح پوری کے بیوی بچوں کو پہنچانے تشریف لائے تھے۔ لیکن دلّی ایسی بھائی کہ پھر واپس نہیں گئے۔ چھ مہینے نیاز صاحب کے پاس رہے اور جب نیاز صاحب بھوپال چلے گئے، تو میرے ہاں آ گئے۔ اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۰ء تک میرے ہاں رہے۔ ۱۹۳۰ء میں میرے ہاں جگہ کی قلت ہو گئی تھی، اس لیے انھیں منشی عبدالحمید ایڈیٹر رسالہ مولوی کے گھر میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۷ء

میں رحلت سے ڈیڑھ ماہ قبل انھوں نے کہا کہ میں اسی کمرے میں مرنا چاہتا ہوں جس میں اوّل روز آپ سے ملا تھا۔ اب وہ کمرہ ہی نہیں، وہ مکان کا مکان خالی تھا۔ اپنے واسطے میں نے اس کے اوپر مکان بنا لیا تھا۔ نیچے کا وہ کمرہ اور پورا مکان انھیں دے دیا گیا۔ ان کی والدہ اور بیوی اور دو تین عزیز مرد دہسوے سے آ گئے۔ والدہ کی گود میں عارف صاحب نے انتقال کیا۔

عارف صاحب اخلاص مجسّم انسان تھے، اور انسانیت کا بیحد اچھا نمونہ۔ نیاز صاحب کے بعد عارف صاحب نے خطیب میں مضامین دینے شروع کیے۔ وہ تمام قسم کے مضامین لکھ سکتے تھے، لیکن غیر معمولی دلچسپی انھیں سیاست سے تھی، اتنی دلچسپی کہ خطیب ان کے مضامین کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انقلاب کے نام سے ایک اور ہفتہ وار پرچہ نکال دیا اور عارف صاحب کا نام اس پر بحیثیت ایڈیٹر ڈال دیا۔ عارف صاحب کے بھائی ابراہیم صاحب انقلاب کے پبلشر تھے، اور حافظ عزیز حسین بقائی پرنٹر۔ انقلاب کا دفتر بھی الگ مکان میں تھا، میرے مکان سے میل بھر پرے۔ میں نے روپیہ لگا کر انقلاب صرف جاری کرا دیا تھا۔

انقلاب میں عارف صاحب نے دل کھول کر اور کفن باندھ کر لکھا۔ مگر ابھی انقلاب کو جاری ہوئے تین ہی مہینے گزرے تھے کہ حکومت پنجاب نے اس کا داخلہ بند کر دیا اور وہ بیٹھ گیا۔ ادھر بابو عبدالقیوم فرید آبادی[۱]، ڈپٹی کمشنر دلّی کے دفتر اردو کے سپرنٹنڈنٹ نے اطلاع دی کہ انقلاب کی ضمانت ضبط کی جانے کی تجویز ہے، اگر روپے بچانے ہوں، تو فوراً بچا لو۔ میں نے ضمانت کی رقم نکلوا لی اور انقلاب بند ہو گیا۔

انقلاب کا اور انقلاب کے ایڈیٹر، عارف صاحب کا ڈنکا بج چکا تھا، مگر پیسیوں نے عارف صاحب کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کی ایڈیٹری میں اخبار پر اخبار نکلے اور بند کرائے۔ جیل یاترا بھی ہونے لگی۔ اس وقت لے اور بی کلاسیں نہیں تھیں۔

۱؎ یہ وہی صاحب تھے جن کا نام میرے والد کے خط میں آیا ہے اور جو بچپن میں مجھے پڑھاتے تھے۔

سیاسی قیدیوں سے اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک ہوتا تھا۔ عارف صاحب نے گندی اور تاریک کوٹھریوں میں راتیں بسر کیں، چکیاں پیسیں، رسیاں بٹیں اور گوبر کے تسلے سر پر اٹھائے۔

رفتہ رفتہ سیاسی قیدیوں کو امتیاز حاصل ہوا۔ بعض جیل مخصوص کر دیے گئے کہ ان میں سیاسی قیدی رہینگے اور سیاسی قیدی آرام سے رہنے لگے۔ عارف صاحب نے مجھے لکھا کہ زاہدہ خاتون کو لائیے۔ زاہدہ میری سب سے بڑی بیٹی، اہلیہ قیسی رام پوری کو عارف صاحب نے گودوں میں کھلایا تھا۔ میں اور قاری عباس حسین مرحوم زاہدہ کو لے کر آگرہ جیل پہنچے اور سیاسی قیدیوں نے زاہدہ (عارف صاحب کی منہ بولی بیٹی) کو اتنے تحائف دیے کہ مجھے اور قاری صاحب کو ان تحائف کا لانا دشوار ہو گیا۔

عارف صاحب اپنے اخلاص اور اپنی بردباری، کم گوئی اور ہیلوٹی کے باعث سیاسی قیدیوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ نہرو رپورٹ نے رئیس الاحرار مولانا محمد علی کو کانگریس سے متنفر کر دیا تھا۔ اور مسلمانوں کی اکثریت کانگریس سے بیزار ہو گئی تھی۔ مگر عارف صاحب، ڈاکٹر انصاری اور مولانا ابو الکلام کے مقلد تھے۔ انھیں تا دمِ آخر ایک ہی دُھن رہی کہ انگریزوں کو ہندوستان سے ہر قیمت پر رخصت کرنا چاہیے۔ انتقال سے چھ دن پہلے کسی سیاسی تقریب کے سلسلہ میں عارف نے ایک پیغام دیا تھا جسے مرتے وقت کا پیغام (DYING DECLARATION) سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں بھی عارف صاحب اپنے مسلک سے نہیں ہٹے تھے۔

عارف صاحب جیتے رہتے، تو خدا معلوم ہندو مسلم اتحاد کی بربادی سے ان پر کیا بیت جاتی۔ ان کے سامنے اتحاد کی دیوار میں دراڑیں پڑ گئی تھیں، لیکن خیال تھا کہ چھل بھری جا سکینگی، مگر اب تو دیوار ڈھے چکی ہے۔

عارف صاحب انتقال کے وقت کئی سال سے صوبہ کانگریس کمیٹی کے صدر تھے۔

مولانا راشد الخیری

تعارف کے محتاج بھیا احسان الحق اور مولانا عارف ہسوی بھی نہیں تھے لیکن بھیا نے باوجود اس کے کہ خواجہ حسن نظامی کے قریبی احباب میں وہ سب سے زیادہ ذی علم تھے، کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ چند کتابیں لکھی تھیں مگر ابھی چھپنے نہ پائی تھیں کہ ۱۹۴۷ء کا ہنگامہ مچ گیا، اور کتابوں کے مسودات جل کے راکھ ہو گئے۔ علیٰ ہذا عارف صاحب کی شہرت اور عظمت بھی وقتی رہی۔ دنیا دونوں کو بھولتی جاتی ہے۔ البتہ مولانا راشد الخیری کا نام زندہ ہے اور جب تک ان کی تصانیف زندہ ہیں، زندہ رہیگا وہ تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ میں اپنے حالات کی تکمیل کی غرض سے ان کا مختصر سا حال لکھ رہا ہوں۔

مولانا راشد الخیری بڑی بے نیاز طبیعت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ علم وادب کے جوہری شیخ عبد القادر، ایڈیٹر "مخزن"، کی نظر مولانا پر پڑی اور انھیں گوشۂ گمنامی سے شہرت کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ شیخ صاحب نے مولانا کے مضامین مخزن میں تابڑ توڑ چھاپے اور مولانا سے کتاب "صبحِ زندگی" لکھوائی اور شائع کی۔ مولانا بغیر اصرار کے نہیں لکھا کرتے تھے۔ شیخ عبد القادر نے اور میں نے ان سے جتنا لکھوایا، سر ہو کر لکھوایا۔ پھر ماشاء اللہ ان کے فرزندِ اکبر مولانا رازق الخیری نے ہم دونوں کی جگہ سنبھال لی۔

شیخ عبد القادر کے دلی سے لاہور چلے جانے کے بعد آٹھ برس مولانا پھر خاموش رہے بس رسالہ عصمت جاری تھا، کتاب لکھنے کی طرف توجہ نہیں تھی۔ میں نے ایک دن کہا: "مولانا! میری بیٹی زاہدہ خاتون کے واسطے "صبحِ زندگی" کا دوسرا حصہ "شامِ زندگی" لکھ دیجیے۔" زاہدہ اس وقت دو ڈھائی برس کی تھیں۔ یہ ۱۹۱۷ء کی بات ہے مولانا میرے قابو میں تو کیا آتے۔ لیکن بچی کا نام سن کر راضی ہو گئے۔ وعدہ کر لیا۔ مگر حسبِ عادت کئی مہینے اڑان گھائیاں دیں۔ آخر میں نے اور عارف نے سازش کی۔ اور مولانا میرے ہاں تشریف لائے تو انھیں ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی اور کہہ دیا کہ چاہے لکھو چاہے نہ لکھو، کنڈی دو گھنٹے

میں کھینگی۔

لکھنے کا سامان کمرے میں موجود تھا۔ دو گھنٹے گزار کر مولانا برآمد ہوئے۔ پسینے میں ڈوبے مگر شگفتہ۔ ہم نے کہا: سنایئے کیا لکھا ہے؟ مولانا نے اوّل زاہدہ سے خطاب کیا تھا کہ یہ کتاب میں تیرے واسطے لکھ رہا ہوں۔ تجھے اس سے فائدہ اٹھانا نصیب ہو۔ تو اس سے یہ فائدہ اٹھائے اور وہ فائدہ اٹھائے۔ اس کے آگے کتاب شروع کی تھی۔ مولانا راز ق الخیری کو "شامِ زندگی" وغیرہ کے حقوقِ اشاعت واپس کیے گئے، تو انھوں نے وہ خطاب 'خدا جانے کیوں' حذف کر دیا۔ وہ تو ایک تاریخی چیز تھی۔ افسوس میرے پاس بھی اب وہ محفوظ نہیں ہے۔ لیکن بیشمار لوگوں کے پاس ہوگا۔ میں نے "شامِ زندگی" کے اٹھارہ ایڈیشن شائع کیے تھے! سب میں وہ درج تھا۔ "شامِ زندگی" مولانا کی کتابوں میں بے نظیر کتاب ہے۔

خیر "شامِ زندگی" اس زبردستی سے پوری کرائی گئی کہ مولانا کو دو گھنٹے روزانہ مقید رکھا جاتا تھا۔ "شامِ زندگی" کے لکھنے میں مولانا نے بائیس دن یا چوالیس گھنٹے صرف فرمائے تھے۔ مولانا لکھ کر خوش بھی ہوتے تھے اور بگڑتے بھی تھے۔ ڈراوے دیتے تھے کہ آیندہ تمھارے گھر میں قدم نہیں رکھونگا! مگر قدم رکھتے تھے۔ آج کل کی مخلوق ان حضرات کی محبت کا اندازہ نہیں کر سکتی۔

بھیّا احسان الحق اور مولانا عارف ہسوی میرے ہم عمر تھے۔ اور مولانا راشد الخیری مجھ سے قریباً بیس برس بڑے۔ میں نے ایک دفعہ بیس برس چھوٹے ہونے کی وجہ سے مولانا کو ایسا خفا کر دیا کہ ملنا جلنا رک گیا۔ اس زمانے میں میرے چھوٹے بھائی محمد مرتضیٰ مرحوم کی شادی طے پائی۔ مولانا کو بلاوا نہیں بھیجا گیا لیکن مولانا نے بڑے پن کا ثبوت دیا اور بغیر بلائے نکاح کی محفل میں شریک ہو گئے اور مجھے پانی پانی کر دیا۔ بتاؤ۔ ہیں کہیں آج کل ایسے لوگ! اور مولانا کے مرتبے کے لوگ! جن کے دیدار کی دلّی کا ادب نواز چیف کمشنر، سر جان طامسن آرزو کرتا رہا اور مولانا نے اسے صورت نہ دکھائی۔ مولانا، حکیم دیوجانس کلبی کی قسم کے

آدمی تھے۔ بادشاہوں سے کہہ سکتے تھے کہ تمہارے کھڑے ہونے نے مجھے دھوپ سے محروم کر دیا ہے، تم تشریف لے جاؤ۔ ملنے سے بہت گھبراتے تھے، لیکن جس سے ملتے اس سے اس طرح ملتے تھے، جس طرح مجھ سے ملے۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۶ء تک قریب کوئی دن میری ان کی ملاقات سے خالی نہیں گیا۔ دن میں کئی کئی بار ملاقات ہوتی تھی۔

دنیا شاید خیال کرتی ہو کہ مولانا کو رونے رلانے کے سوا اور کام نہیں آتا تھا مولانا ردنی شکل کے انسان ہونگے لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ مولانا کتاب میں غم کی تصویر کھینچتے تھے، لیکن دوستوں میں بیٹھ کر دوستوں کی روح خوش کر دیتے تھے۔ جس سے نہیں ملتے تھے، اس کے لیے واقعی بہت روکھے تھے مگر ان ہی روکھے مولانا کو اطلاع ہوئی کہ ملازمہ کا شوہر دم توڑ رہا ہے تو بیوی کو ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچے اور مرنے والے کے سرہانے بیٹھ کر شام سے صبح کر دی۔ انھیں جس طرح نئے آدمیوں سے ملنے میں تکلّف ہوتا تھا، اسی طرح جاننے والوں سے تکلّف برتنا اور رنجیدہ ہونا ان کے نزدیک حرام تھا۔ اہلِ دول اور اہلِ اقتدار کو وہ ٹھکرا دیتے تھے۔ مگر پڑوس کے مفلسوں اور قلّاشوں کی مزاج پرسی اور خبرگیری کرتے پھرتے تھے۔

خواجہ فضل احمد، عارف ہسوی اور مولانا راشد الخیری اور میرے درمیان جیسا دلی لگاؤ تھا، ویسا ہم میں سے کسی کا کسی اور سے نہیں تھا۔ میں جس طرح خواجہ حسن نظامی کی جگہ دوسرے کو نہیں دے سکتا، اسی طرح ان تینوں کی جگہ بھی خالی ہی رہیگی۔

میرے خسر۔ میر محمد سید حسین

یہ میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے کہ آٹھ سال کی عمر سے میرا رشتہ چچا محمد عمر کی لڑکی حسن آرا سے ٹھہرا ہوا تھا۔ لیکن صحافت کا پیشہ اختیار کر لینے کے باعث ایک

پھوپی (امۃ القدیر بیگم) روٹھ کر مکۂ معظمہ چلی گئیں اور دوسری پھوپی (ہرمزی بیگم) نے بھتیجی دینے سے انکار کردیا چچا محمد عمر کا انتقال ہوچکا تھا۔ پھوپی ہرمزی بیگم ان کی اولاد کی سرپرست تھیں۔ لیکن پھوپی ہرمزی بیگم کے شوہر میر محمد سیّد حسین کچھ دن بعد پلٹن سے کردلی آئے تو ان کی رائے میرے موافق ہوگئی اور انھوں نے بیوی کو راضی کرلیا اور پھر میرا نکاح پھوپی ہرمزی بیگم کی بیٹی محمود جہاں بیگم سے بندھا۔

پھوپی ہرمزی بیگم تو ویسی ہی ساس تھیں، جیسی ساسیں عموماً ہوتی ہیں، مگر میرے خسر۔ پھوپھا سیّد حسین غیر معمولی خوبیوں کے انسان تھے۔ ان کا کردار ریکارڈ کردینے اور یاد رکھنے کے لائق ہے۔

پھوپی ہرمزی بیگم میری شادی کے بعد دو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہیں۔ پھوپھا سیّد حسین میری بیوی محمود جہاں بیگم کی رحلت کے بعد بھی کئی برس جیے۔

پھوپی ہرمزی بیگم نے محمود جہاں بیگم سے چھوٹی دو لڑکیاں اختر جہاں بیگم اور مسرت جہاں بیگم چھوڑی تھیں۔ وہ دونوں میرے ہاں رہنے لگی تھیں اور پھوپھا سیّد حسین تنہا اپنے بھتیجے نواب سیّد محمد علی (مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے آخری سکریٹری) کے مکان میں رہتے تھے، جو خالی پڑا تھا اور میرے مکان سے پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔

پھوپھا سیّد حسین کنبے میں پہلے شخص تھے، جنھوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کی حمایت کی اور مجھے دل شکستہ نہیں رہنے دیا۔ انھوں نے میری صحافت اور میرے کاروبار کو پھلتے پھولتے بھی دیکھا۔ ان کی زندگی میں مجھے گھر کے کاموں کی طرف سے کامل بےفکری رہی کیونکہ بیماری اور تمام ضروریات خانہ داری کی دیکھ بھال پھوپھا سیّد حسین کے ذمے تھی۔ اور میں ہمہ تن کاروبار کی طرف متوجہ تھا۔ اس عنایت سے پھوپھا سیّد حسین نے بیٹی کے مرجانے پر بھی محروم نہیں فرمایا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ محمود جہاں بیگم کی زچگی کے وقت لیڈی ڈاکٹر کا انتظام کرتے تھے۔ اور ہفتہ

جمعرات کو میرے یہاں سوتے تھے۔ میں نے دوسری شادی کرلی اور دوسری بیوی کی زچگی کا وقت قریب پہنچا، تو وہی سب انتظام اب بھی کیے اور ہفتہ بھر میرے ہاں سوئے بھی۔ اپنی بیٹی کے بچے کے ہاتھ میں ایک اشرفی دیا کرتے تھے۔ وہی ایک اشرفی میری دوسری بیوی کے بچے کے ہاتھ میں بھی دی۔ غرض کہ اپنی بیٹی اور میری دوسری بیوی میں فرق نہیں رکھا۔

پھوپھا سید حسین کی زندگی کا آخری واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب اور حیرتناک ہے۔ پھوپی ہرمزی بیگم سے ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ تینوں یکے بعد دیگرے انہیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ ۱۹۱۷ء میں منجھلی لڑکی مری، ۱۹۱۸ء میں چھوٹی اور ۱۹۱۹ء میں بڑی، یعنی میری بیوی محمود جہاں بیگم۔ ہر بارھویں مہینے موت ایک بیٹی چھین لیتی تھی۔

چھوٹی لڑکی مسرت جہاں بیگم کا عقد میر الطاف حسین، مالک حسین بخش اینڈ کمپنی شملہ کے لڑکے سعید حسین سے ہونے والا تھا کہ عالمگیر انفلوئنزا پھیلا اور مسرت جہاں بیگم کو لے گیا۔

سعید حسین کی والدہ فخر جہاں بیگم پھوپی امۃ القدیر بیگم کی پوتی تھیں۔ مسرت جہاں بیگم کو مرے ہوئے چھ سات مہینے گزر گئے، تو فخر جہاں بیگم نے پھوپھا سید حسین سے کہا: دادا ابا! سعید کہتا ہے کہ میں شادی وہاں کرونگا، جہاں آپ کرا دینگے، ورنہ شادی ہی نہیں کرونگا۔ پھوپھا سید حسین نے فرمایا، اچھا بھئی میں سوچونگا۔ اور سوچ کر وہ اپنی بھتیجی (نواب سید محمد علی کی بہن) کے پاس امروہے گئے اور ان کی بیٹی سے رشتہ طے کرا آئے۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ بھتیجی بیٹی کو لے کر امروہے سے دلی پہنچ گئیں اور نواب سید محمد علی کے دوسرے مکان میں شادی کی دھوم دھڑکا شروع کردی۔ پھوپھا سید حسین نکاح سے ایک روز قبل تک ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ عین نکاح کے دن صبح کو پیمانۂ صبر و ضبط چھلکا اور بائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر فالج گرا۔ شام کو

نکاح تھا۔ لوگ انھیں تکلفاً زبردستی آرام کرسی میں ڈال کر نکاح کی محفل میں لے گئے۔ اسے بھی قبول کر لیا۔ محفلِ نکاح سے پلٹے تو فالج کا دوسرا حملہ ہوا۔ تیسرے حملے میں شاید ڈھائی تین مہینے لگے۔ تیسرے حملے نے ختم کر دیا۔

اپنا یا پرایا، کوئی بھی ان سے کام کے لیے کہتا تھا، تو پھوپا سید حسین اسے ضرور انجام دیتے تھے۔ اور میرا تو اتنا خیال رکھتے تھے کہ میں شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔ ایک دفعہ میری دوسری بیوی کو بخار تھا اور مجھے بیوی کی بےچینی کی وجہ سے رات بھر جاگنا پڑا۔ پھوپا سید حسین روز صبح میرے ہاں تشریف لاتے تھے۔ انھوں نے سنا کہ میں رات بھر جاگا ہوں، تو انھیں علم تھا کہ جاگنے کا میری صحت پر غیر معمولی خراب اثر ہوتا ہے، فوراً میری بیوی کو اپنے ہاں لے گئے، اور جب تک وہ اچھی نہیں ہوئیں، ان کی تیمارداری کرتے رہے۔ تیمارداری کا پھوپا سید حسین کو ملکہ تھا۔ جس کی بابت سنتے کہ بیمار ہے اور تیمارداری ٹھیک نہیں ہو رہی، اس کی تیمارداری اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے۔ ہسپتالوں میں نرسیں کیا تیمارداری کریںگی، جیسی پھوپا سید حسین تیمارداری کرتے تھے۔

ماہنامہ ادیب

نظام المشائخ، استانی، قلیبیں اور بیداری: چار ماہنامے؛ اور طبیب، خطیب، انقلاب اور درویش، چار ہفت نامے؛ اور روزنامہ رعیت شائع کرتے کرتے میں کچھ تھک گیا۔ یا تو وہ ہمت تھی کہ ہر سال جنوری کے پہلے ہفتے میں نیا پرچہ نکال دیتا تھا اور بہ یک وقت اتنے پرچوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا، یا ایسا زوال آیا کہ نظام المشائخ کے سوا سارے پرچے یکے بعد دیگرے بند ہو گئے۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں مسٹر فصیح الدین نے مجھے پھر مجبور کر دیا کہ ایک ماہنامہ کی ایڈیٹری اور کر لوں۔

مسٹر فصیح الدین ایم اے دلّی کی سب سے بڑی پبلک لائبریری کے آنریری

سکریٹری تھے۔ ہارڈنگ لائبریری اس کا نام تھا۔ اب نام شاید بدل گیا ہے۔ میں بھی ہارڈنگ لائبریری کی مجلسِ منتظمہ کا ممبر تھا۔ فصیح الدّین کوچہ چیلان کے قریب پھاٹک مفتی والاں میں رہتے تھے، اور ان کی وضع تھی کہ لائبریری جاتے ہوئے میرے ہاں تھوڑی دیر بیٹھتے تھے۔ میرا مکان راستے میں تھا۔ ایک دن کہنے لگے کہ فلاں شخص پڑھا لکھا نہیں ہے، اس کا رسالہ خاصا چل رہا ہے۔ میں اگر رسالہ جاری کردوں تو کیوں نہیں چلیگا: واحدی صاحب! آپ میرے ساتھ شریک ہو جائیے میں رسالہ جاری کرتا ہوں۔

مجھے نظام المشائخ کے اجرا کا زمانہ یاد آگیا کہ خواجہ حسن نظامی کے متعلق بدگمانی کی جاتی تھی کہ واحدی کو اسامی بنایا جا رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میری اور خواجہ صاحب کی عمر میں صرف دس برس کا فرق تھا۔ فصیح الدین مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ اور کچھ نہیں، تو لوگ اتنا ضرور کہیںگے کہ واحدی نے اپنے شوقِ صحافت کی خاطر فصیح الدین کا روپیہ برباد کرا دیا۔

میں نے فصیح الدّین کو سمجھایا کہ جنگ کا زمانہ رسالوں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ فصیح الدّین اصرار کرنے لگے تو میں انھیں سردار دیوان سنگھ مفتون، ایڈیٹر ریاست کے پاس لے گیا۔ سردار صاحب نے میری رائے سنے بغیر وہی بات کہی، جو میں نے کہی تھی۔ جنگ عالمگیر کا اثر بڑے اچھے ماہناموں اور ہفت ناموں پر بُرا پڑ رہا تھا۔ نئے پرچے تو چلتے چلتے ہی چلتے ہیں۔ مگر فصیح الدّین دُھن کے بڑے پکّے تھے۔ انھوں نے نہ میری سنی، نہ سردار صاحب کی، اور رسالہ ادیب جاری کر دیا۔ ادیب ایک الٰہ آباد سے بھی نکلا تھا، مگر وہ عرصۂ دراز سے بند تھا۔

میں نے اب بھی احتیاط برتی، ملکیت میں شرکت نہیں کی، فقط پرچہ مرتب کرنے کی ذمہ داری لی، اور ادیب کے آخری وقت تک اس کا فقط ایڈیٹر رہا۔

فصیح الدّین خالی دُھن کے پکّے تھے، بھاگ دوڑ کرنے والے اور منتظم بے مثل تھے۔ ہارڈنگ لائبریری کو انھوں نے اتنی ترقی دی کہ لائبریری کی منتظمہ کمیٹی نے خود تجویز کیا کہ آپ ڈیڑھ سو روپیہ

ماہوار سواری الاؤنس لے لیا کیجیے۔ بانڈنگ لائبریری ۱۸۶۲ء سے قائم تھی لیکن جیسی رونق اور چمک لائبریری میں فصیح الدّین نے پیدا کی ویسی پہلے نہیں تھی۔ رسالہ ادیب کو بھی انھوں نے کامیاب کر لیا بلکہ ایک انگریزی زبان کا رسالہ اور نکال دیا۔ رسالہ ادیب نکالتے وقت ڈکلریشن منظور ہونے میں رکاوٹ نہیں تھی۔ انگریزی زبان کا رسالہ فصیح الدّین نے ایسے وقت نکالا کہ اعلان ہو گیا تھا کہ نئے پرچوں کے ڈکلریشن منظور نہیں کیے جائیں گے۔

میں ماہنامہ "بیداری" بند کر چکا تھا لیکن ابھی بند کرنے کی اطلاع حکومت کو نہیں دی تھی۔ فصیح الدّین نے مسٹر لابیلی دلّی کے آخری انگریز ڈپٹی کمشنر کو اس پر راضی کر لیا کہ بیداری کا نام دی لائٹ (THELJGHT) رکھنے کی اجازت دے دی جائے۔

فصیح الدّین ادیب اتنا شاندار شائع کرتے تھے کہ اتنا شاندار رسالہ مولانا تاجور نجیب آبادی کے ادبی دنیا، لاہور کے سوا آج تک اور کوئی نہیں شائع ہوا۔ دی لائٹ فصیح الدّین نے آرٹ پیپر پر نکالا۔ فصیح الدّین نے دونوں پرچے اس طرح چلائے کہ میں بھی حیران رہ گیا اور سردار دیوان سنگھ بھی حیران رہ گئے۔

فصیح الدّین ٹھنڈے دماغ کے اور مشکلات سے نمٹ سکنے والے آدمی تھے۔ نہایت بُردبار، سنجیدہ اور سلجھی طبیعت پائی تھی۔ خود آگے بڑھ رہے تھے اور دوسروں کو آگے بڑھا رہے تھے کہ اچانک حضرت ملک الموت پہنچ گئے۔ شام کو میں نے دیکھا کہ تانگے میں لائبریری سے چلے آ رہے ہیں۔ برابر فیروز الدّین، بڑے صاحبزادے پھل لیے بیٹھے ہیں۔ فیروز الدّین اس وقت آٹھ نو برس کے تھے؎۔ صبح کسی نے کنڈی کھٹکھٹائی اور پکارا کہ فصیح الدّین کا انتقال ہو گیا۔

فصیح الدّین کی موروثی جائداد کا کرایہ دو سو روپے ماہوار تھا۔ سات سو کے لگ بھگ ادیب اور لائٹ دینے لگے تھے۔ ڈیڑھ سو سواری الاؤنس والے۔ ہزار گیارہ سو کی آمدنی تھی اور یہی خرچ۔ خاندان کا معیارِ زندگی بلند سے بلند تر ہوتا جاتا تھا فصیح الدین کے انتقال سے آمدنی دو سو روپے کرایے کی رہ گئی۔ فصیح الدّین کے خالہ زاد بھائی خواجہ محمد شفیع خالہ کی خدمت کرنے کے قابل تھے اور خدمت کرتے بھی

؎ فیروز الدین اب ایم اے اور سی۔ ایس۔ پی ہیں اور یہاں لاہور ڈویژن میں اسسٹنٹ کلکٹر ہیں۔

آمادہ تھے، لیکن خالہ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ یہ دشواری اس کے لیے تیار ہو گئیں کہ خواجہ محمد شفیع ہارڈنگ لائبریری کے سکریٹری بن جائیں، تو سواری الاؤنس کے ڈیڑھ سو روپے قبول کر لینگی۔

یہ کام میرے سپرد کیا گیا کہ میں مسٹر لا بیلی، ڈپٹی کمشنر و صدر ہارڈنگ لائبریری سے کہوں کہ خواجہ محمد شفیع کو سکریٹری بنوانے میں مدد کیجیے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی حاکم کے ہاں ملاقات کی غرض سے گیا تھا۔ اس کے علاوہ دو مرتبہ ضرورتاً اور مجبوراً اور گیا ہوں۔ ورنہ میں حکّام کے ہاں نہیں جاتا تھا۔ میں اس وقت میونسپل کمیٹی کا ممبر نہیں تھا۔ ۱۹۴۵ میں میونسپل کمیٹی کی ممبری ترک کر دی تھی، لیکن فصیح الدین کے گھر کے حالات نے مسٹر لا بیلی کو متاثر کیا اور انھوں نے مجھ سے مدد کا وعدہ کر لیا اور پھر ہارڈنگ لائبریری اور میونسپل کمیٹی کے مشترک ممبروں کے مقابلہ میں میرا ساتھ دیا۔

یہ داستان اگرچہ ماہنامہ ادیب سے تعلق نہیں رکھتی، مگر ادیب کے مالک اور جوائنٹ ایڈیٹر سے اور مجھ سے تعلّق رکھتی ہے اور دلچسپ ہے، اور اس سے انگریز کے انفرادی کیریکٹر کا اظہار ہوتا ہے۔

ہوا یہ کہ ہارڈنگ لائبریری کے سکریٹری کے انتخاب کے جلسے میں خواجہ محمد شفیع کو سکریٹری منتخب کے لیے میں نے پیش کیا اور ہارڈنگ لائبریری اور میونسپل کمیٹی کے مشترک ممبروں نے مسٹر ہلال احمد زبیری کو۔ ہارڈنگ لائبریری کی مجلسِ منتظمہ میں میونسپل کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت تھی۔ مسٹر لا بیلی نے کہا: "دوٹنگ نہیں ہونے دونگا۔ دونوں امیدوار دوسرے کمرے میں جاؤ اور آپس میں فیصلہ کر لو۔" دونوں امیدوار دوسرے کمرے میں گئے۔ لیکن اپنے آپ کو منتخب کرانے پر اڑے رہے۔ آخر مسٹر لا بیلی نے فیصلہ کر دیا کہ اچھا مسٹر ہلال احمد زبیری سکریٹری اور خواجہ محمد شفیع جوائنٹ سکریٹری۔

جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ ہارڈنگ لائبریری میں نہیں تھا، مگر ڈپٹی کمشنر کی تجویز کون مسترد کر سکتا تھا! تجویز منظور ہو گئی۔ دوسرے سانس میں مسٹر لا بیلی نے کہا:

ہ سواری الاؤنس مسٹر فصیح الدین کے ساتھ مختص تھا۔ مسٹر ہلال احمد زبیری اپنے تئیں اس کا مستحق ثابت کر سکے تو دوبارہ غور کیا جائیگا۔ فی الحال موقوف۔ اسے بھی سب نے منظور کر لیا۔ اب مسٹر لا ئیبلی بولے کہ مسٹر فصیح الدین کی خدمات کا ہمیں عملی اعتراف کرنا چاہیے۔ میری تجویز ہے کہ ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے حساب سے سال بھر کے اٹھارہ سو روپے مسٹر فصیح الدین کی بیوہ کو بطور اعترافِ خدمات دیے جائیں۔

یہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں سے تین مہینے قبل کا واقعہ ہے۔ میری تجویز کے مطابق خواجہ محمد شفیع سکریٹری ہو جاتے تو تین مہینے کے ساڑھے چار سو روپے مسٹر فصیح الدین کی والدہ یا بیوہ کو ملتے۔ مسٹر لا ئیبلی نے یکمشت اٹھارہ سو دلوائے۔

افسوس "میرا افسانہ" مکمل نہ ہو سکا

"میرا افسانہ" میں نے یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو لکھنا شروع کیا تھا۔ ۲ فروری تک کچھ مسلسل اور کچھ متفرق لکھ چکا تھا۔ متفرق سے ایسے مضامین مراد ہیں جو جگہ پاتے کہیں آگے جا کر درمیانی یا آخری صفحات میں، لیکن لکھ لیے گئے پہلے ہی۔ ادھر کسی بات کا خیال آتا تھا، ادھر اسے لکھ ڈالتا تھا۔ چنانچہ مسلسل اور متفرق سارا مسودہ یہ موجود ہے۔

۲ فروری کی صبح پھر لکھنے بیٹھا تھا۔ سات یا نو سلیپیں لکھی تھیں، تمہید ہی اٹھا رہا تھا کہ یکایک بائیں ٹانگ اور بائیں دست و بازو پر فالج گرا۔

اس بات کو اٹھارہ مہینے ہو گئے۔ آج ۲۰ اگست ۱۹۶۷ء ہے۔ الحمدللہ اب اچھا ہوں۔ جتنا فالج کا مریض اچھا ہوا کرتا ہے، اس سے زیادہ اچھا۔ اللہ تعالیٰ نے بچا بھی لیا ہے اور اپاہج پن بھی بہت کم رکھا ہے، ورنہ عموماً تو فالج کے مریض مر جاتے ہیں اور جو بچتے ہیں،

وہ بس رینگتے ہیں اور ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا رحم فرمایا ہے۔

جہاں تک لکھنے کا تعلق ہے۔ داہاں ہاتھ مفلوج نہیں ہے۔ میں دن بھر لکھتا ہوں، مگر فقط دینی تاثرات۔ "میرا افسانہ" لکھنے کی طرف طبیعت اب مائل نہیں ہوتی۔ میرے افسانے پر وقت صرف کرنا فضول معلوم دیتا ہے۔

"میرا افسانہ" ایک چوتھائی لکھا گیا ہے۔ تین چوتھائی باقی ہے۔ بہتیرا چاہتا ہوں کہ اسے پورا کر دوں، لیکن قلم نہیں چلتا۔ طبیعت ساتھ نہیں دیتی۔ امنگ بالکل مر گئی ہے۔ خدا حافظ

واحدی

۲۰ اگست ۱۹۶۷ء

میونسپل کمیٹی کی ممبری

دلّی کے محلہ کھڑکی تفضّل خاں والے میر تفضّل حسین کے پوتے اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بہو (والدہ آغا محمد اشرف) کے سگے بھائی، میر محمد حسین محکمۂ نمک میں انسپکٹر تھے۔ میر تفضّل حسین کو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد پھانسی ہوئی تھی اور ان کا رہنے کا مکان، کلاں محل چھنّا مل کے نام بیس روپیوں کی بولی پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میر محمد حسین تحریکِ خلافت اور تحریکِ عدم تعاون کے زمانے میں انگریز سرکار کی ملازمت چھوڑ آئے۔ حکیم اجمل خاں نے انھیں میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لیے کھڑا کیا اور ممبر بنوایا۔

میرا اور میر محمد حسین کا لڑکپن سے دوستانہ تھا۔ آخر عمر میں وہ بالکل میرے پڑوس میں رہنے لگے تھے اور میرے ہاں گھنٹہ آدھ گھنٹہ روزانہ بیٹھتے تھے۔ ۱۹۲۸ء میں میونسپل کمیٹی کا الیکشن ہونے والا تھا۔ ایک دن میر صاحب نے مجھ سے کہا: "اب کے تو آپ بھی ممبری کے لیے کھڑے ہو جائیے۔" میں راضی نہ ہوا۔ تو تیسرے سال ۱۹۳۱ء میں میر صاحب نے مولانا عارف ہسوی کو میرے پیچھے لگا دیا اور مولانا احمد سعید وغیرہ سے زور ڈلوایا۔ میں نے نامی نیشن پیپر پر اس شرط کے ساتھ دستخط کر دیے کہ ایک شخص سے بھی نہیں کہوں گا کہ مجھے ووٹ دو۔ اور ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا۔ حتیٰ کہ ضمانت کے روپے بھی آپ لوگوں کو داخل کرنے ہوں گے۔ میں دستخط کر دینے کے سوا الکشن میں کوئی حصہ نہیں لوں گا۔ الکشن جانے اور آپ حضرات جانیں۔ منتخب کرنا اہلِ علاقہ کا کام ہے، میرا کام نہیں ہے۔

نامی نیشن پیپر داخل ہو گیا۔ ضمانت کے روپے دوسرے علاقے کے ایک کرم فرما حاجی عبدالمنان (چیف جسٹس مغربی پاکستان مسٹر طفیل وحیدالدین کے سمدھی) نے بھر دیے

بہت سی ٹولیاں پروپیگنڈا کرنے کے لیے پھرنے لگیں۔ ایک ٹولی کے لیڈر بھیا شیخ احسان الحق تھے۔ بھیا مات سے گیارہ بجے اپنی ٹولی کے ہمراہ پروپیگنڈا کرتے محلّہ حویلی اعظم خاں تک پہنچے اور بولے: "اچھا بھئی! اب کل" حویلی اعظم خاں کے دروازے پر چار پانچ نوجوان بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھیا سے پوچھا "کل آپ ہمارے محلّے میں آئینگے؟" بھیا نے جواب دیا: "جی ہاں" نوجوانوں نے کہا، اعظم خاں کی حویلی میں ذرا سنبھل کر قدم رکھیے گا۔ بھیا میری ہی طبیعت کے آدمی تھے، گھبرا گئے اور حافظ عزیز حسن بقائی (ایڈیٹر پیشوا) سے ذکر کر بیٹھے کہ کل یہ گفتگو ہوئی تھی۔

دوسرے دن گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر محمد عمر نے اپنے مکان واقع مٹیا محل سے ٹیلیفون کیا کہ آپ نے مجھ پر کیا مصیبت ڈال دی۔ چالیس پہلوان میرے گھر میں گھس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیر جی مظفر علی (سجّادہ نشین درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ) نے ہمیں واحدی صاحب کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ بقائی نے ان پہلوانوں کو بلوایا ہے۔ سجّادہ نشین صاحب دنگل کرنے کے شوقین تھے اور شہر کے سارے پہلوان ان کے زیرِ اثر تھے۔ سجّادہ نشین صاحب میرے بھی بزرگ تھے اور بقائی صاحب سے ان کی کچھ رشتہ داری تھی۔ میں نے ڈاکٹر محمد عمر صاحب کو اطمینان دلایا کہ گھنٹہ بھر میں پہلوان آپ کے گھر سے چلے جائینگے۔ میں بقائی صاحب کے ہاں پہنچا اور انھیں سمجھایا کہ آپ مجھے جانتے ہیں، میں خطرات مول نہیں لے سکتا۔ براہِ کرم پہلوانوں کو رخصت کر دیجیے، مگر وہ کیا ماننے والے تھے! کہنے لگے "یہ معاملہ صرف آپ کا نہیں ہے۔ ساری جماعت کا معاملہ ہے؛ میں توہین برداشت نہیں کرونگا۔ اہالیانِ حویلی اعظم خاں نے جماعت کی توہین کی ہے، جس میں میں بھی شامل ہوں" میں بقائی صاحب سے مایوس ہو کر پہلوانوں کی خدمت میں حاضر ہوا اور انھیں بتایا کہ واحدی میں ہوں۔ میں آپ سب کا اور سجّادہ نشین صاحب کا شکر گزار ہوں۔ فی الحال مدد کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ آپ سب تشریف لے جائیں۔ اور سجّادہ نشین صاحب کو میرا سلام کہیں۔ پھر ضرورت پڑیگی تو تکلیف دونگا۔"

تمیز الدین خاں صاحب سے مقابلہ تھا۔ تمیز الدین خاں قریباً بارہ برس سے میرے علاقے
کے ممبر تھے۔ میں نے سنا کہ اہالیانِ حویلی اعظم خاں کو مجھ سے شکایت ہے کہ میں مغرور
ہوں۔ تمیز الدین خاں تو پھیرے پر پھیرے کر رہے ہیں، اور میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔
میں نے بیٹا احسان کو لکھ بھیجا کہ آج آپ علاقے کے کسی اور محلے کی طرف جائیے
اور میں خود تنہا حویلی اعظم خاں چلا گیا۔ اہالیان حویلی اعظم خاں نے مجھے دیکھا تو
میرے پیچھے پیچھے ہو لیے، جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا مجمع بھی بڑھتا گیا۔ وہاں
فقط منشی محمد احمد صاحب خوشنویس سے میری ملاقات تھی۔ ان کے مکان پر رک
کر میں نے اہالیانِ حویلی اعظم خاں کی غلط فہمی دور کی۔ کہا کہ "میرا یا تمیز الدین خاں
کا انتخاب آپ کا کام ہے۔ میں آپ کے کام میں مداخلت کرنی نہیں چاہتا۔ آپ نے
مجھے منتخب کیا، تو میرا کام اس وقت سے شروع ہوگا اور میں تین سال مسلسل کام کرونگا
کام نہ کروں، تو پھر دوبارہ آپ کے کام کا وقت آئیگا۔ مجھے ہرگز منتخب نہ کیجیے گا"۔ اہالیانِ
حویلی اعظم خاں ہموار ہو گئے۔ لیکن پہلوانوں کا قصہ میرے بس کا نہیں تھا۔
میں علی الصباح مفتی کفایت اللہ صاحب سے ملا اور انھیں تمام ماجرا سنا کر اس
بات کا طالب ہوا کہ وہ مولانا احمد سعید اور مولانا عارف ہسوی کو مجبور کریں کہ
مجھے میونسپل کمیٹی کی ممبری کے جنجال میں نہ پھنسائیں۔ الکشن سے پہلے چالیس
پچاس پہلوان آ گئے تھے۔ تو الکشن کے دن تو غالباً چار سو پانچ سو پہلوان آ جائینگے۔
مفتی صاحب الکشنوں سے دور رہا کرتے تھے۔ لیکن میری درخواست ایسی نہ
تھی کہ اسے بھی ٹھکرا دیتے۔ دوسرے دن اتفاق سے حکیم علی رضا خاں کی لڑکی کی شادی
تھی۔ اس میں مولانا احمد سعید نے مفتی صاحب کی حسب ہدایت الکشن کا ذکر چھیڑا
اور حاجی عبد الغفار (حاجی علی جان والوں) کے سپرد کر دیا کہ جس طرح چاہیں فیصلہ
کر دیں۔ حاجی عبد الغفار نے فیصلہ کیا کہ ایک دفعہ تمیز الدین خاں کو ممبر
رہنے دیا جائے۔ اگلی دفعہ ۱۹۴۳ء میں تمیز الدین خاں مقابلہ نہیں کرینگے۔ چنانچہ
۱۹۴۳ء میں خاں صاحب نے وعدہ ایفا کیا، اور میں بغیر مقابلے کے ممبر ہو گیا، اور

۱۹۴۶ء تک ممبر رہا۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء میں تمیز الدین خان مقابلہ کرنے اٹھے، مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

ادھر جتنے نام آئے ہیں اب ان میں سے سوائے حاجی عبد المنان، جسٹس وحید الدین اور منشی محمد احمد خوشنویس کے کوئی زندہ نہیں ہے۔ اللہ سب کی مغفرت فرمائے۔ تمیز الدین خان کا اور میرا مقابلہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۰ء میں جس شان سے ہوا اس کی مثال شاید ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملیگی۔ میرے اور تمیز الدین خان کے کارکن آپس میں کبھی کبھی ضرور الجھتے تھے۔ لیکن تمیز الدین خان کے اور میرے تعلقات میں کبھی فرق نہیں آیا۔ تمیز الدین خان بیحد شیریں گفتار اور شریف الطبع انسان تھے۔ انھوں نے اپنے زمانۂ ممبری میں مجھ سے زیادہ محنت کی۔ الکشن ہو چکتا تھا، تو میں اور وہ حاجی عبد المنان کی کار میں دوٹوں کی پرچیاں گنوانے سکریٹری میونسپل کمیٹی کے دفتر میں ساتھ جاتے تھے اور میں جیتتا تھا، تو تمیز الدین خان مجھے مبارکباد دیتے تھے، اور تین سال تک برابر میرے ہاں آتے رہتے تھے، اور میں ان کے ہاں جاتا رہتا تھا ان کا انتقال ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں کراچی آکر ہوا ہے۔ یہاں بھی ملنا جلنا رہا۔

۱۹۳۴ء میں میں تو ممبر ہو گیا، لیکن میر محمد حسین ممبر نہیں رہے۔ میر صاحب ۱۹۲۵ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ممبر بنے تھے۔ مگر چونکہ وہ کانگریس پارٹی کی اکثر رایوں سے اختلاف کیا کرتے تھے اور اپنے ضمیر کے خلاف کانگریس پارٹی کی ہاں میں ہاں نہ ملاتے تھے، ۱۹۲۸ء میں کانگریس نے انھیں ٹکٹ نہیں دیا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر میونسپل کمیٹی دلی کا صدر تھا۔ وہ میر صاحب کا معقول رویہ دیکھتا تھا۔ اس نے چیف کمشنر سے کہہ کر سرکاری ممبر بنوا دیا۔ میر صاحب کا سرکاری ممبر بن کر بھی وہی رویہ رہا کبھی کبھی کانگریس پارٹی کے ساتھ ہاتھ اٹھا دیتے تھے، کبھی کبھی کانگریس پارٹی کے ساتھ واک آؤٹ بھی کر جاتے تھے۔ بایں ہمہ انگریز چیف کمشنر اور انگریز ڈپٹی کمشنر بڑے گمبھیر تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۱ء میں پھر نامزد کر دیا۔ لیکن ۱۹۳۴ء میں مسٹر آصف علی نے (جو کافی عرصے سے میونسپل کمیٹی کے ممبر تھے) ارادہ ظاہر کیا کہ اب کے میں منتخ

ا، تو تجویز پیش کرونگا کہ سرکاری صدر کی بجائے ممبروں میں سے کسی کو صدر بنایا جائے۔ چیف کمشنر نے میر صاحب سے دریافت کیا کہ اس تجویز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میر صاحب نے کہا کہ میں اسے صحیح اور مناسب سمجھتا ہوں، صدر غیر سرکاری ہی ہونا چاہیے۔ یہ کہہ کر میر صاحب سیدھے میرے ہاں آئے اور بولے: ہمارا پتّا تو کٹ گیا۔ چنانچہ چیف کمشنر نے ایک دوسرے شیعہ (خان صاحب فاضل مقبل) کو نامزد کر دیا۔ میر صاحب شیعہ تھے۔ مسلمانوں میں شیعہ کا اور ہندوؤں میں سکھ کا انتخاب دلّی میں مشکل تھا۔ وہ تو ۱۹۲۵ء میں کانگریس کا زور تھا اور مسلمان بھی کانگریس کے ہمنوا تھے، جو میر صاحب منتخب ہو گئے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں میر صاحب نے بطور خود انتخاب کی کوشش کی، مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم میر صاحب میونسپل کمیٹی کے علاوہ اور بہت سی کمیٹیوں اور انجمنوں کے ممبر تھے اور ان کی ہندو مسلمان عام طور قدر کرتے تھے۔ ان کی دیانت کے قائل تھے۔ چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر نے انھیں نامزد تو نہیں کیا، لیکن وہ میر صاحب کی بات کو وزن دیتے تھے۔ اور رؤسائے شہر کی بات ٹال جاتے تھے، میر صاحب کی بات نہیں ٹالتے تھے۔

ابھی میرے اور مسٹر آصف علی کے الکشن ختم نہیں ہوئے تھے، لیکن امید تھی کہ ہم دونوں منتخب ہو جائینگے۔ ہاں ابھی یہ بتانا بھول گیا کہ تمیز الدّین خان نے تو اپنا وعدہ ایفاء کیا تھا، مگر ان کے ہم نف مولوی عظمت اللہ وکیل مقابلہ کرنے کھڑے ہو گئے تھے۔ پھر انھوں نے بھی اپنا نام واپس لے لیا تھا۔ ابھی مولوی عظمت اللہ نے نام واپس نہیں لیا تھا کہ ایک روز مسٹر آصف علی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی پارٹی کا نام پیپلز پارٹی رکھونگا، آپ کو اس کی شرکت میں تو تامل نہ ہوگا۔ میں نے جواب دیا کہ میں کسی ٹکٹ پر نہیں کھڑا ہوا ہوں، آزاد کھڑا ہوا ہوں۔ منتخب ہونے تک مجھے آزاد رہنے دیجیے۔ اس کے بعد کسی نہ کسی کی شاگردی یقیناً کرنی ہے۔ اور آپ سے بہتر استاد میونسپل کمیٹی میں دوسرا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ انتخاب کے بعد

میں نے پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر دستخط کر دیے۔ الیکشن کے ختم ہوتے ہی مسٹر آصف علی کو ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں کراچی جانا پڑ گیا۔ چالیس ہزار روپے فیس کا مقرر تھا۔ ایک طرف چالیس ہزار روپے فیس اور دوسری طرف غیر سرکاری صدر والی تجویز اسے پیش کرنے کی اور ممبروں میں ہمت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ مسٹر ہریش چندر وکیل جنھیں مسٹر آصف علی کی پارٹی کے ہندو ممبروں نے میونسپل کمیٹی کا سینیر وائس پریزیڈنٹ بنوایا تھا بمشکل اس بات پر راضی ہوئے کہ تجویز کوئی اور پیش کر دے تو تائید میں کر دوں گا۔ لالہ دیش بندھو (ایڈیٹر تیج، جو اس وقت میونسپلٹی کے ممبر نہیں تھے) نے کہا: "اچھا تجویز واحدی صاحب پیش کریں گے"۔ مسٹر ہریش چندر پیپلز پارٹی کے ممبر نہیں تھے مگر پیپلز پارٹی کے مرہونِ منت تھے۔ وہ تجویز کی تائید کرنے پر آمادہ ہو گئے، تو میں تو پیپلز پارٹی کا ممبر بن چکا تھا، میں تجویز پیش کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مسٹر ہریش چندر کو آگے چل کر رائے بہادر بننا تھا مجھے کچھ نہیں بننا تھا۔ میں نے معتدل الفاظ میں تقریباً بیس منٹ تقریر کی اور تجویز پیش کر دی۔ جیتنے کا امکان ہی نہ تھا۔ زیادہ ووٹ سرکاری صدر کی طرف گئے۔ پیپلز پارٹی کے کل نو ممبر تھے: دو مسلمان اور سات ہندو۔ سو مسٹر آصف علی تو موجود نہ تھے۔ میرے ساتھ صرف آٹھ ہاتھ اٹھے، مسٹر ہریش چندر سمیت۔ مسٹر آصف علی یہ تجویز ہر سال خود پیش کرتے رہے، اور ہارتے رہے۔ یہ تجویز ہمیشہ ہار کو سامنے رکھ کر پیش کی جاتی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں (جب میں ممبری کے لیے کھڑا ہی نہیں ہوا) تو خان بہادر حبیب الرحمٰن او۔ بی۔ ای نے خدا جانے کیا جادو کیا کہ سو فی صد ووٹ انھیں مل گئے اور وہ میونسپل کمیٹی کے پہلے غیر سرکاری صدر ہو گئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں تک صدر رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ان کی حیثیت فرسٹ سٹیزن (CITTZEN) آف دہلی کی تھی۔

میں ۱۹۴۶ء میں یوں کھڑا نہیں ہوا تھا کہ اوّل تو مجھ پر بڑھاپا چھا گیا تھا۔ دوسرے میں نے ۱۹۴۰ء سے اپنے اور اپنے برابر کے علاقے کی راشننگ افسری بھی قبول کر لی تھی۔ اگرچہ مجھے قوانینِ ملازمت سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، میں ممبر میونسپل کمیٹی رہ

تا تھا اور نظام المشائخ کی ایڈیٹری وغیرہ کر سکتا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں تو جنگ عالمگیر
وجہ سے الکشن نہیں کرایا گیا اور میں ممبر رہا۔ ۱۹۴۴ء میں میں نے محسوس کیا کہ
ننگ افسری اور میونسپل کمیٹی کی ممبری دو دو کاموں کے بوجھ سے تھکنے لگا
ں، اب ممبری ترک کر دینی مناسب ہے۔

ں اور مسٹر آصف علی بچپن کے ساتھی تھے۔ مجھ سے پرانا ان کا کوئی ساتھی نہیں اور ان سے پرانا میرا کوئی ساتھی نہیں تھا، بجز مولانا احمد سعید اور قاضی لطف ت حق کے۔ ہم چاروں اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ قاضی صاحب حیات ہیں اور راولپنڈی ں مقیم ہیں۔ مسٹر آصف علی مجھ سے سات دن بڑے تھے۔ میری تاریخ پیدائش ۷ ا ۱۸۸۸ء مطابق ۱۷ رمضان ۱۳۰۵ھ اور مسٹر آصف علی کی تاریخ پیدائش ۱۰ مئی ۱۸۸۸ء۔ یہ تاریخ اس لیے حفظ ہے کہ وہ میرے نامینیشن فارم کی خانہ پری کیا تے تھے اور میں ان کا نامینیشن فارم بھرا کرتا تھا۔ بیس اکیس برس کی عمر سے ہم سب کی لائنیں الگ الگ ہو گئیں۔ کسی نے کوئی راستہ اختیار کر لیا، کسی نے وئی۔ مسٹر آصف علی بیرسٹر بن گئے، میں ملا بن گیا، لیکن ہمارے تعلقات اور ہماری وضعداری میں عمر بھر فرق نہیں آیا۔ میں مسٹر آصف علی سے کھل کر گفتگو کر سکتا تھا۔

۴ اپریل ۱۹۴۴ء کو میونسپل کمیٹی کا سیشن شروع ہوا تھا۔ اپریل کا سارا مہینہ تو مسٹر آصف علی نے کراچی میں گزارا۔ واپس لوٹے تو بھی میونسپل کمیٹی کے کاموں کے لیے وہ وقت نہیں نکال سکتے تھے۔ جون کے مہینے میں میں نے ان سے کہا کہ آپ کو فرصت نہیں ہے اور پیپلز پارٹی کے ہندو ممبروں کی طرف میرا دل نہیں کھنچتا، مجھے اجازت دیجیے گا کہ میں اپنی پارٹی الگ بنا لوں۔ آصف صاحب مسکرائے اور بولے: "واقعی میں عدیم الفرصت ہوں۔ ذرا میرے علاقے کا بھی خیال رکھیے گا۔ اپنے علاقے کے بڑے کارکن حاجی عبدالرشید سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ علاقے کا جو کام ہو مولانا صاحب کے پاس لے جائیں۔ آپ اپنی پارٹی بنا لیجیے اور بے تکلف بنا لیجیے"

میں نے پانچ مسلمان اور پانچ ہندوؤں کو جو اسی سال منتخب ہوئے تھے، ایک پرانے ممبر حافظ محمد سعید وکیل کے دفتر واقع محلہ بلّی ماران میں جمع کیا اور چھ مسلمانوں اور پانچ ہندوؤں کی ایک پارٹی بنالی۔ حافظ محمد سعید، حاجی حافظ عبد اللطیف کے برادرِ نسبتی اور سر عبد الرحمٰن مرحوم (جج، سپریم کورٹ، پاکستان) کے بھلنجے ہیں اور تا ایں دم دلّی میں ہیں۔

گیارہ آدمیوں کی یہ پارٹی، جس کا نام، میں نے نہیں، اخباروں نے "پروگریسو پارٹی" رکھ دیا تھا، میونسپل کمیٹی دلّی کی بیلنسنگ پارٹی تھی۔ جدھر یہ ہو جاتی تھی، ادھر کا پلڑا جھک جاتا تھا۔ اس پارٹی کی خصوصیات یہ تھیں کہ اس پارٹی میں لیڈر و یڈر کا قصہ نہیں تھا۔ پارٹی کے سب ممبر برابر تھے۔ چوپال کی طرح ہر ہفتے، کمیٹی کے اجلاس سے ایک دن پہلے سب سر جوڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اور طے کر لیتے تھے کہ ایجنڈے کے کس معاملے کی نسبت کیا کرنا ہے اور اس پر قائم رہتے تھے۔ چھ سات مہینے بعد پارٹی کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ شیخ حبیب الرحمٰن جو ۱۹۴۶ء میں پہلے غیر سرکاری صدر بنے، ہماری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء میں شیخ صاحب نے جونیئر وائس پریسیڈنٹ کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی۔ اب ہم نے شیخ صاحب کو پروگریسو پارٹی کا باقاعدہ لیڈر مقرر کر لیا اور پروگریسو پارٹی شیخ صاحب کی پارٹی کہلانے لگی۔ شیخ صاحب کی شمولیت سے پروگریسو پارٹی میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ پروگریسو پارٹی گیارہ ممبروں کی بیلنسنگ پارٹی نہیں رہی، مضبوط ترین پارٹی ہو گئی۔

جونیئر وائس پریسیڈنٹ کو، وہ ہندو ہوتا تو گورنمنٹ رائے صاحب کا خطاب دیا کرتی تھی، اور مسلمان ہوتا تو خان صاحب کا خطاب۔ شیخ حبیب الرحمٰن بھی ۱۹۲۸ء سے خان صاحب شیخ حبیب الرحمٰن بن گئے۔ ۱۹۴۰ء میں وہ سینیئر وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوئے، اور انھیں خان بہادر اور او۔ بی۔ ای کے خطاب مل گئے۔

شہر دہلی (شاہ جہان آباد) چودہ علاقوں میں تقسیم تھا۔ چودہ علاقوں سے چودہ مسلمان اور چودہ ہندو ممبر منتخب ہو کر آتے تھے۔ گویا شہر کے عوام کے نمائندے

کمیٹی میں اٹھائیس تھے۔ باقی بارہ میں ایک سکھ، ایک عیسائی، ایک اچھوت تین گورنمنٹ کے نامزد کردہ ہوتے تھے۔ سول سرجن اور سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن اپنے اپنے محکموں کی نمائندگی کرتا تھا، سات ملوں اور تجارتی اداروں کی طرف سے آجاتے تھے جن میں صرف ایک مسلمان ہوتا تھا، پنجابی سوداگران دہلی کی طرف سے آنے والا۔ گویا چالیس کی جمعیت میں سولہ مسلم تھے اور چوبیس غیر مسلم۔ اس کے باوجود میں نے اپنے زمانے میں ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۶ء تک دلی میونسپل کمیٹی پر اول خان بہادر ایس۔ ایم عبداللہ کا غلبہ پایا، اور پھر خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن۔ او۔ بی۔ ای کا۔ ایس۔ ایم عبداللہ شیخ حبیب الرحمٰن کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔ شیخ حبیب الرحمٰن نے انگریز ڈپٹی کمشنر پر بھی حکومت کی۔ اگزکٹو اینڈ فائننس (FINANCE) سب کمیٹی میونسپلٹی کی اہم ترین سب کمیٹی تھی۔ چار ہندو اور چار مسلمان اس سب کمیٹی کے ممبر تھے ڈپٹی کمشنر کسی سب کمیٹی کی صدارت نہیں کیا کرتا تھا صرف جنرل میٹنگ کی صدارت کرتا تھا، مگر اگزکٹو اینڈ فائننس سب کمیٹی کی صدارت کرنے ضرور آتا تھا۔ میں بھی پانچ برس اس سب کمیٹی کا ممبر رہا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسٹر لابیلی جیسا غصیل ڈپٹی کمشنر لالہ دیس راج چودھری سے الجھا۔ لالہ دیس راج نے مسٹر لابیلی کی رائے نہ مانی، تو بالآخر مسٹر لابیلی نے خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن سے پوچھا، آپ کیا کہتے ہیں، خان بہادر صاحب نے جواب دیا لالہ دیس راج کی رائے ٹھیک ہے۔ مسٹر لابیلی اس طرح چپ ہو گئے جس طرح بتاشہ پانی میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور بولے دوسرا معاملہ شروع کیجیے۔ ڈپٹی کمشنر کی مجال نہیں تھی کہ خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن کی رائے سے اختلاف کرے اور خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھائے۔ ایک مرتبہ مسٹر لابیلی ڈپٹی کمشنر و صدر میونسپل کمیٹی نے خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن نائب صدر میونسپل کمیٹی سے مشورہ کیے بغیر خان بہادر مرزا ممتاز حسین قزلباش سکریٹری میونسپل کمیٹی (جو اسکندر مرزا کے دور میں وزیر مغربی پاکستان تھے) کو حکم دیا کہ ممبران کمیٹی کی انفارمل میٹنگ کرنی ہے، اطلاع نامہ جاری کردو کہ فلاں دن فلاں وقت سب ممبر میری کوٹھی پر آجائیں۔ مرزا صاحب نے

صدر کے حکم کی تعمیل کر دی۔ لیکن صدر کا یہ حکم نائب صدر کے مشورے کے بغیر ما مطابق دستور نہیں تھا۔ خان بہادر شیخ حبیب الرحمن نے بھی تمام ممبروں کو اسی دن اور اسی وقت کھانا بھیج دیا کہ میری کوٹھی پر تشریف لائیے۔ تمام ممبر خان بہادر شیخ حبیب الرحمن کے پاس پہنچ گئے (سوائے سول سرجن اور سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن کے۔ یہ دونوں انفارمل میٹنگوں میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے)۔ مسٹر لا بیلی کے پاس کوئی ممبر نہیں گیا۔ سرکاری ممبر بھی خان بہادر شیخ حبیب الرحمن کے پاس گئے۔ چیف کمشنر کو حال معلوم ہوا، تو اس نے مسٹر لا بیلی سے کہا کہ خان بہادر شیخ حبیب الرحمن سے معافی مانگو اور مسٹر لا بیلی نے معافی مانگی۔ خان بہادر حبیب الرحمن مسٹر لا بیلی کی ہدایت پر نہیں چلتے تھے، مسٹر لا بیلی کو خان بہادر شیخ حبیب الرحمن کی ہدایت پر چلنا پڑتا تھا۔

خان بہادر شیخ حبیب الرحمن کو اللہ تعالےٰ نے بیحد متوازن دماغ عطا فرمایا ہے۔ وہ مسلمان ممبران کمیٹی میں سب سے زیادہ دولتمند تھے۔ ہندو ممبروں میں بھی ان کی ٹکر کا ایک آدھ ہی تھا۔ لیکن ان میں دولتمندی کی کوئی برائی نہیں تھی۔ ان کی جوانی میرے سامنے گزری ہے۔ جوانی میں گورنمنٹ دہلی نے انھیں آنریری مجسٹریٹی کی کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ اور طوائفوں کو جامع مسجد کی پشت کی آبادی سے نکلوانے اور شہر کے باہر بسوانے کی ڈیوٹی سپرد کی تھی۔ یہ ڈیوٹی انھوں نے ایسی خوبی سے انجام دی کہ خلقت واہ واہ کرنے لگی۔ انگریزوں کی قوم صحیح معنوں میں جمہوریت نواز ہے انگریز حکام معمولی ممبران کمیٹی کی بھی عزت کرتے تھے کہ یہ پبلک کے نمائندے ہیں۔ پھر خان بہادر شیخ حبیب الرحمن تو نمائندوں کے نمائندے تھے۔ اس پر ان کا کردار سونے پہ سہاگہ تھا۔ انگریز بیخبر نہ رہتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ جملہ ممبر ان کی بات مانتے ہیں۔ علاوہ ازیں خان بہادر شیخ حبیب الرحمن نے انگریزوں سے عدم تعاون نہیں کیا۔ انگریزوں کی معقول بات بے تامل مانی اور اپنی بات انگریزوں سے منوائی۔ میں خان بہادر شیخ حبیب الرحمن کی پارٹی میں تھا لیکن مجھے خان بہادر

صاحب نے اجازت دے رکھی تھی کہ جس معاملے کو اپنے نزدیک مناسب نہ سمجھوں، اس میں ان کے ساتھ ہاتھ نہ اٹھاؤں۔ تاہم کل کمیٹی سال میں ایک ہی دو موقعے اس نوع کے آتے تھے کہ میں ان کا ساتھ نہ دیتا تھا۔ دولتمند ممبر ٹیکس لگاتے تھے تو اپنا مفاد نہیں بھولتے تھے۔ خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن نے پہلا ٹیکس سگریٹوں پر لگایا، جس کے حاجی شیخ عطاء الرحمٰن صاحب (خان بہادر کے والد ماجد) ہندوستان میں سول ایجنٹ تھے اور دوسرا ٹیکس جائیداد کا بڑھایا، جو حاجی شیخ عطاء الرحمٰن صاحب کے پاس مسلمانوں میں نمبر اوّل کی تھی۔ یہ دوسرا ٹیکس اس خوش اسلوبی سے بڑھایا کہ عوام نے میٹنگ کے دوران میں خان بہادر شیخ حبیب الرحمٰن اور ان کی پارٹی پر بے تحاشہ پھول برسائے۔

میری ممبری کی خصوصیات یہ تھیں:۔

۱ میں ممبروں میں بہ اعتبارِ دولت سب سے زیادہ کم حیثیت تھا۔ اچھوت ممبر رام پرشاد (چمار) بھی میری نسبت دولتمند تھا۔

۲ میں نے الکشنوں میں مطلق پیسہ خرچ نہیں کیا۔ مولوی عظمت اللہ وکیل نے ۱۹۳۲ء میں نام واپس لیا ہے، تو انھیں بیشک تانگے میں لے کر استعفیٰ دلوانے سکریٹری میونسپل کمیٹی کی کوٹھی تک گیا تھا اور تانگے کا کرایہ ساڑھے سات آنے دیا تھا۔ واپسی پر عظمت اللہ صاحب کچہری چلے گئے۔ سکریٹری کی کوٹھی کچہری سے زیادہ دور نہیں تھی، میں پیدل گھر آگیا۔

۳ میں اپنے الکشن میں حصہ نہیں لیتا تھا، مگر الکشن کے بعد جمعہ کے جمعہ ہیلتھ افسر اور صفائی کے عملے کو بلا کر علاقے کا گشت لازماً لگاتا تھا۔ میرے علاقے سے زیادہ شہر کے کسی علاقے میں صفائی نہ رہتی تھی۔

۴ شہر کی گلیوں کو سیمنٹ سے پختہ کرنے کا ریزولیوشن مجھ سے کافی پہلے پاس ہو چکا تھا، لیکن امیر ممبر میرے غریب علاقے کی گلیاں پختہ ہونے کی نوبت نہ آنے دیتے تھے۔ میرا برتاؤ انجینیئر اور انجینیئر کے عملے کے ساتھ ایسا رہا کہ

۱۹۲۴ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان میرے علاقے کی گلیاں پختہ ہو گئیں۔ صرف چند گلیاں باقی تھیں۔ میں نے انجینیئر صاحب سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے، مجھے ۱۹۳۰ء میں ممبری کے لیے کھڑا ہونا چاہیے یا نہیں؟ انجینیئر صاحب نے کہا: آپ قطعی منتخب ہونگے، ضرور کھڑے ہوں۔ میں نے کہا: کیسے منتخب ہونگا، الکشن سر پر ہے اور فلاں محلے کی گلیاں کچی پڑی ہیں۔ انجینیئر صاحب نے فوراً بابو محمد الدین اوورسیر کو طلب کیا اور پوچھا: آج کل کہاں کام کر رہے ہو؟ اوورسیر صاحب نے ایک امیر ممبر کا نام بتایا کہ ان کے علاقے میں کام ہو رہا ہے۔ انجینیئر صاحب نے حکم دیا کہ پہلے واحدی صاحب کے علاقے کی تکمیل کرادو۔

ممبروں کا معمول تھا کہ اکثر تیسرے پہر ٹاؤن ہال آتے تھے اور ممبرز روم میں آرام کرسیوں پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ جاتے تھے اور ممبرز روم کے چپراسی سے کہتے تھے کہ اس افسر کو سلام بولو۔ افسر حاضر ہوتا تھا۔ میں کلرک کے پاس بھی خود پہنچتا تھا۔ اس لیے میرے کاموں میں عملہ دلچسپی لیتا تھا۔

۵ میں کمیٹی کا ایسا حاضر باش ممبر تھا کہ میری کرسی پر دوسرا ممبر نہیں بیٹھتا تھا کہ واحدی یقیناً آئیگا

۶ میں نے جان بوجھ کر کمیٹی میں کوئی غلط کام نہیں کیا۔

۷ میں کمیٹی کے ہندو مسلمان ممبروں میں بھی ہر دلعزیز تھا اور کمیٹی کے افسروں اور عملے میں بھی ہر دلعزیز۔ میری بے زری نے مجھے کبھی سبک نہیں کرایا۔

۸ میں ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر کی کوٹھیوں کے طواف نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود ڈپٹی کمشنر اور چیف کمشنر میری بابت اچھی رائے رکھتے تھے۔

۹ جیسا کہ اوپر لکھ آیا ہوں، مفتی کفایت اللہ صاحب الکشنوں میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۳۰ء کے الکشن میں انھوں نے میری خدمات کی تعریف فرمائی۔ ان کی تحریر بشکلِ پوسٹر شائع ہوئی۔

۱۰ میں دو علاقوں کا کام کرتا تھا۔ ایک اپنے علاقے کا اور ایک مسٹر آصف علی کے علاقے کا۔

میں یہ باتیں اس لیے نہیں لکھ رہا کہ مجھے ممبری مل جائے۔ قبر میں پیر لٹکائے ہوئے بوڑھے اور فالج زدہ شخص کو ممبری وممبری سے کیا لینا ہے۔ یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ پڑھنے والے ان سے سبق سیکھیں کہ ممبری یوں بھی کی جا سکتی ہے۔

میں نے ممبری کو ہمیشہ عارضی چیز سمجھا۔ کبھی اس سے دل نہیں لگایا۔ پھر بھی جو نفس لے کر میں کمیٹی میں داخل ہوا تھا، وہ نفس لے کر میں کمیٹی سے نہیں نکلا۔ کچھ نہ کچھ اقتدار مجھے حاصل رہا اور اقتدار کا استعمال میں ویسا نہیں کر سکا، جس کا محمد رسول اللہ والذین معہ نے نمونہ چھوڑا ہے۔

میری عمر بھر کی دو ہی قابلِ ذکر باتیں ہیں۔ اوّل قلم کاری، دوم میونسپل کمیٹی کی ممبری۔ ان دونوں پر "افسانۂ حیات" کو نامکمل چھوڑنے کا اعلان کر دینے کے باوجود لکھ دیا گیا۔ لہٰذا "میرا افسانہ" مکمل سمجھنا چاہیے۔ قابلِ ذکر اور کچھ نہیں ہے۔ جتنا لکھ دیا ہے، اسے لکھنا بھی غیر ضروری تھا۔ صرف ملاقاتیوں کی مزید تفصیل رہی جاتی ہے۔ یہ بڑھاؤں، تو پچاس ساٹھ صفحے بڑھا سکتا ہوں۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان کے ہندو مسلمان اردو نویسوں اور مسلمان سیاسی اور دینی رہنماؤں میں ایک دو ہی ایسے نکلیں گے جنھوں نے دلّی کی سرزمین پر قدم رکھا ہو اور مجھ سے نہ ملے ہوں۔ مگر اب تو مضمون "میونسپل کمیٹی کی ممبری" بھی حکیم محمد سعید صاحب "ستارۂ امتیاز" کے اصرار نے لکھوا دیا ہے۔ ملاقاتیوں کے اذکار میری کتابوں "ناقابلِ فراموش لوگ" اور "مقالات، انشائیے اور شخصیتیں" میں کافی ہیں۔

میں نے الحمد اللہ میونسپل کمیٹی کی ممبری میں بھی اللہ کو فراموش نہیں کیا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کے پاس کوئی شخص مجھ سے کچھ سفارش کرانے جاتا تھا، تو خواجہ صاحب اسے جواب دے دیتے تھے کہ تمھارا

کام صحیح ہے، تو واحدی بغیر سفارش کے کریگا، ورنہ سفارش کا اس پر اثر نہیں ہوگا۔ اپنے حالات آپ لکھنے میں یہ بڑی خرابی ہے کہ طوطے کی طرح انسان کو اپنے منھ سے اپنے تئیں "میاں مٹھو" کہنا پڑتا ہے۔ کچھ نہ کچھ خود نمائی ضرور کرنی پڑتی ہے۔

واحدی

یکم رجب المرجب ۱۳۸۹ھ

۱۴ ستمبر ۱۹۶۹ء

15 اگست

خوشیوں کا دن ـــــ [illegible]

آج کے دن ہم یاد کرتے ہیں:

— مہاتما گاندھی کی [illegible] آزادی کی [illegible]

— بھارت کے لاکھوں کروڑوں ہم وطنوں کی قربانیاں اور مصائب۔

— آزادی کے بعد [illegible] اقتصادی ترقی کی [illegible]

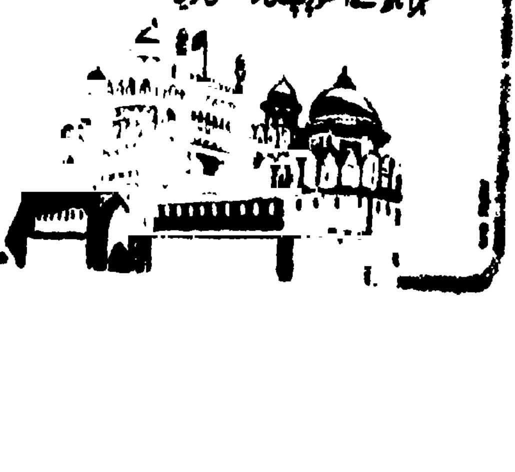
آج ہم عہد کرتے ہیں:

— ہم [illegible] کریں گے

— ہم اپنے 5 لاکھ 76 ہزار گاؤں [illegible] صحت، تعلیم اور سڑکوں کی [illegible] کریں گے

— ہم [illegible] سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر آگے بڑھیں گے۔

آزادی کی اس اکتیسویں سالگرہ پر آیئے ہم عہد کریں کہ ہم مہاتما گاندھی کے سپنوں کا بھارت تعمیر کریں گے ـــــ آیئے ہم ہر آنکھ سے آنسو پونچھنے کی کوشش کریں۔



ادائیگی کے وقت ہی ٹیکس کی کٹوتی

آجرین متوجہ ہوں!

مندرجۂ ذیل مقامات میں سے کسی پر تنخواہ دیتے وقت:

احمدآباد	دہلی
بنگلور	حیدرآباد
بمبئی	کانپور
کلکتہ	مدراس

براہ کرم درج ذیل میں اپنے ٹی۔ڈی۔ایس نمبر کا حوالہ دینا نہ بھولیں:

× ادائیگی کے وقت ہی تنخواہوں سے کاٹے گئے ٹیکس کی رقم سرکاری کھاتے میں جمع کرنے کے چالان (فارم نمبر آئی ٹی این ایس ۱۹۱)۔

× تنخواہوں کے سالانہ گوشوارے (فارم نمبر ۲۴)۔

چالان کو تنخواہوں کے سالانہ گوشوارے کے ساتھ منسلک کرنے کے لیے ٹی۔ڈی۔ایس نمبر بہت ضروری ہے۔

ٹی۔ڈی۔ایس نمبر مستقل اکاؤنٹ نمبر سے مختلف ہوتا ہے اور چالان میں دونوں کا اندراج ضروری ہے۔

اگر آپ کو ٹی۔ڈی۔ایس نمبر ابھی تک نہیں ملا ہے تو اپنے تنخواہوں کے ٹی۔ڈی۔ایس شعبہ کے سربراہ انکم ٹیکس افسر سے ملیں اور ٹی۔ڈی۔ایس نمبر حاصل کریں۔

جاری کردہ: ڈائریکٹر آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلی کیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۱

davp 78/139

مطبوعات علمی مجلس

۱۔ تذکرۂ گلشن ہند، از حیدر بخش حیدری (مرتبہ پروفیسر مختار الدین) ۵/-

۲۔ کلیاتِ میر (میر کے مکمل چھ دیوان غزلیات) ظلِ عباس عباسی ۲۵/-

۳۔ کلیاتِ مصحفی (دیوانِ اول) مرتبہ نثار احمد فاروقی ۹/۷۵

۴۔ کلیاتِ مصحفی (دیوانِ دوم) مرتبہ نثار احمد فاروقی ۷/۷۵

۵۔ تذکرۂ مقالات الشعرا، از قیام الدین حیرت (مرتبہ نثار احمد فاروقی) ۵/-

۶۔ تذکرۂ بہارِ بےخزاں، از احمد حسین سحر لکھنوی (مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد) ۵/-

۷۔ ہندستانی انگریزی لغت، مؤلفہ ڈنکن فوربس (بذریعہ فوٹو آفسیٹ) ۵۰/-

۸۔ عیارِ غالب، مرتبہ مالک رام (غالب سے متعلق مشاہیر کے ۲۴ مضامین کا مجموعہ) ۷/-

۹۔ گلِ رعنا، از غالب، مرتبہ مالک رام (غالب کا اولین انتخاب اردو و فارسی) ۱۰/۵۰

ملنے کا پتا

تحریر

علمی مجلس دلی کا تماہی رسالہ

۴۶

مرتب : مالک رام

جلد ۱۲ | اکتوبر/دسمبر ۱۹۷۸ء | شمارہ ۴

چندہ سالانہ — ہندستان : پندرہ روپے — فی شمارہ
غیر ممالک : تین پونڈ (انگریزی) ۸ ڈالر (امریکی) — پانچ روپے

پرنٹر و پبلشر ظل عباس عباسی نے جمال پرنٹنگ پریس دلی میں چھپوا کر علمی مجلس، ۴۲۹۹ ؛ چھتہ نواب صاحب، فراشخانہ، دلی ۶ سے شائع کیا۔

هٰذا فِراقُ بَینِی وَبَینَکُم

بعض اوقات انسان عجیب کشمکش میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ حالات اس کے مقتضی ہوتے ہیں کہ وہ کسی امر میں فیصلہ کن اقدام کرے۔ فیصلہ ایک ہی ہوتا ہے اور اس سے مفر نہیں ہوتا۔ لیکن دل ہے کہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس فیصلے کی مخالفت کرتا ہے۔ آج میں بھی اسی دوراہے پر کھڑا ہوں۔

"تحریر" آج سے بارہ برس قبل ۱۹۶۷ء کے شروع میں جاری کیا گیا تھا۔ اس کی داستان میں نے سب سے پہلے شمارے میں تفصیل سے بیان کی تھی۔ میں اس راہ کی مشکلات سے ناواقف نہیں تھا، اسی لیے میں نے علمی مجلس کے اپنے احباب سے بار بار کہا کہ یہ پرچہ جاری نہیں کرنا چاہیے لیکن میرے رفقائے کار ہا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ انھوں نے میری ایک نہ سنی اور پرچہ جاری ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ مجھے معلوم تھا، یہ سراسر گھاٹے کا سودا تھا مشکل سے چھ شمارے شائع ہوئے تھے کہ گیارہ میں سے نو اصحاب نے رائے دی کہ تحریر بند کر دیا جائے، ہم اتنا خرچ برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ یہ ۱۹۶۸ء کے وسط کی بات ہے۔ کاشکے میں نے بھی اکثریت سے اتفاق کر لیا ہوتا۔ لیکن چونکہ پہلے بھی میرا نام مرتب کی حیثیت سے چھپتا رہا تھا، مجھے اس میں شرم محسوس ہوئی کہ اب اسے بز

کردیا جائے۔ اس کے علاوہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک بعید سی یہ توقع بھی تھی کہ ملک میں اتنی یونیورسٹیاں ہیں، جہاں دانشوروں کی کمی نہیں، اگر ہم پرچے کا معیار بلند سے بلند تر کریںگے، تو کوئی وجہ نہیں کہ دیر سویر یہ خود کفیل نہ ہو جائے۔ افسوس کہ یہ امید آج تک پوری نہیں ہوئی اور اس دس برس میں جو خسارہ ہوا ہے، اب اس کا ذکر بھی صرف شماتتِ ہمسایہ کو دعوت دینا ہے، اس سے فائدہ تو کیا ہوگا!

اسے میری ذہنی عیاشی کہیے، یا بات کی پچ، میں "تحریر" کو جاری رکھنے پر تلا ہوا تھا اس لیے کہ میرے نزدیک یہ واقعی مفید کام تھا۔ اردو میں ایک نہیں، متعدد علمی اور تحقیقی رسالوں کی ضرورت ہے۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ اردو والے اس ایک پرچے کو بھی مالی پہلو سے بیفکر نہ کر سکے۔ خیر،

ما شکوہ ازاں زلفِ پریشان چہ نویسیم
ایں قصہ دراز ست، بیا راں چہ نویسیم

بہرحال اتنے برس پرچہ کشتم پشتم چلتا رہا، اور میری پریشانیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ رہی سہی کسر میری علالت نے پوری کر دی۔ اگست ۱۹۷۴ء کے شروع میں مجھے دل کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ میں مہینوں بستر پر پڑا رہا۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا، تو ڈاکٹروں نے نقل و حرکت اور کام کاج پر ایسی جانگزا پابندیاں لگا دیں کہ اللہ تیری پناہ! لیکن اس کے باوجود "تحریر" باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور ہم نے بفضلہ کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔ لیکن رفتہ رفتہ رنج جسمانی کمزوری نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔ کام کی رفتار کم ہوتی گئی۔ دن میں کام کرنے کا وقت کم ہونے لگا۔ بار ہا خیال آیا "تحریر" بند کر دوں، اس سے کچھ ذہنی اور جسمانی سکون ملے گا۔ لیکن پھر کسی نہ کسی طرح میں اس خواہش کا مقابلہ کرتا، اور یہ ارادہ ترک کر دیتا۔

گذشتہ بارہ برس میں ہم نے کم و بیش سات ہزار صفحات کا مواد پیش کیا ہے۔ اس دوران میں ہم نے دس خاص نمبر شائع کیے: غالب نمبر (دو)، جگر بریلوی، جوش ملسیانی، ابتدائی

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب، احمد اکبر آبادی، رشید احمد صدیقی، مہنا فتح آبادی، ملّا واحدی دہلوی، ... اس کے علاوہ بعض عام شماروں میں کچھ ایسے مضمون بھی شامل ہیں جو پوری پوری کتاب کے بدل ہیں۔ کیفیت وکمیت دونوں لحاظ سے یہ اتنا سرمایہ ہے کہ اس پر کوئی ادارہ بھی فخر کر سکتا ہے۔ لیکن ہم اس کا فخر کے طور پر نہیں تحدیث نعمت کے لیے ذکر کر رہے ہیں۔ ایک علمی پرچے میں یہی کچھ ہونا چاہیے تھا اور یہی ہم نے پیش کیا۔ پس فخر کس بات کا!

اردو والوں کو لازماً تحقیقی پرچے شائع کرنا پڑینگے: آج نہیں، تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہم نے اپنی بساط بھر اس راہ کے کچھ کانٹے دور کرنے کی خدمت سر انجام دی ہے جس سے بعد کے آنے والوں کی کسی نہ کسی درجے میں ضرور رہنمائی ہو گی۔

یہ طویل تمہید غالباً غیر ضروری تھی۔ بہرحال مقصود یہ کہنا تھا کہ "تحریر" کا آخری شمارہ ہے۔ ہم اسی کے ساتھ اسے بند کر رہے ہیں۔

تا دسترسم بود، زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ صد پارہ ندارم

بعض احباب کی طرف "تحریر" کا چندہ بقایا ہے۔ یہ ان پر قرض ہے اور یہ ان کا فرض ہے کہ اسے ادا کریں۔ لیکن اگر وہ حسب الارقم جلد بھجوا دیں، تو ان کا احسانمند رہونگا۔ والسلام

مالک رام

حل المطالب
(شرحِ دیوانِ غالب)

[سیّد محمد مرتضیٰ بیان و یزدانی میرٹھی (۱۸۵۰ء - ۱۹۰۰) انیسویں صدی کے ایک باکمال شاعر گزرے ہیں۔ ان کے والد کا نام سیّد گوہر علی (ف: ۸ مارچ ۱۸۹۳ء) تھا۔ بیان مذہباً اثنا عشری شیعی تھے۔ سلسلۂ نسب حضرت امام رضا سے ملتا ہے۔ ان کی پیدائش اپنے نانا سیّد عمر دراز علی کے مکان پر ہوئی تھی، جو اس وقت جھانسی (بندیل کھنڈ) میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر مامور تھے۔ بعد کو انھوں نے میرٹھ میں نشو و نما پائی اور زندگی کا بڑا حصہ اسی شہر میں گزارا اسی لیے میرٹھی کہلائے۱؎۔

بیان صحیح معنوں میں وہبی اور وجدانی شاعر تھے۔ انھیں شعر گوئی اور نثر نگاری کے علاوہ اور کسی چیز سے ذہنی لگاؤ نہیں تھا صحافت سے بھی گہری دلچسپی تھی انھوں نے سب سے پہلے "جلوۂ طور" کی ادارت کی، پھر ۱۸۸۱ء میں اپنا ذاتی ہفت روزہ "طوطیِ ہند" نکالا۔ اس کے بعد ۱۰ جون ۱۸۸۷ء کو ماہنامہ "لسان الملک" جاری کیا جس کا شمار اس زمانے کے معیاری رسائل میں ہوتا تھا۔ ۲۰ صفحات کا یہ ماہنامہ ۲۲×۸/۲۰ کے سائز پر بڑے اہتمام سے مطبع حدیقۃ العلوم، میرٹھ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں بیان کی اردو اور فارسی غزلوں اور دیگر منظومات کے علاوہ ان کے بیشتر شاگردوں کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ بیان جہاں ایک بلند پایہ شاعر تھے، وہیں موثر نثر نگار بھی تھے

۱؎ مفصل حالات کے لیے راقم کا مضمون "بیان میرٹھی" (مشمولہ ماہی "تحریر" شمارہ ۳۲) ملاحظہ کیجیے

ان کی نثر نگاری کے کامیاب نمونے لسان الملک کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ وہ زمانہ ہے جب ادبی حلقوں میں مشکلات کلام غالب کا بڑا چرچا تھا اور اہل علم حضرات اس کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف تھے۔ چنانچہ بیان نے بھی لسان الملک کے دسمبر ۱۸۹۵ء کے شمارے سے "حل المطالب" کے عنوان سے دیوان غالب کی شرح کا سلسلہ شروع کیا۔ شرح کی ابتدا سے پہلے بیان کے یہ الفاظ دیکھیے:

> حق تو یہ ہے کہ مرزا ہے مرحوم اپنے زمانے میں یکتائے عصر تھے۔ ہندوستان میں مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد ایسا نازک خیال کوئی پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے اردو غزل کو شہوانی لذات کا کھلونا نہیں بنایا، بلکہ عشق و عاشقی کے مضامین کو حکیمانہ پوشاک پہنا کر ارباب نظر کے سامنے صدر مجلس فصاحت پر لا بٹھایا۔ دلّی کی زبان، پھر اس میں تازہ معنی کی جان! اس پر کرشمہ ہائے حسن بیان!
>
> اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم
>
> البتہ مضامین میں ان کے باریک خیالات نے شاہدوں کے گھنگر والے بالوں کی طرح ایک الجھاؤ پیدا کیا، لیکن وہ زلفوں کی الجھن، معشوقہ تقریر کا حسن دوبالا، ترکان کاشغری اور خوبان چین کسی کے عارض پُر نور کی طرح اور بڑھاتی رہی۔ البتہ ہر کس و ناکس کی یہ مجال نہ ہوئی کہ اپنی انگلیوں سے مضامین باریک کی گتھیاں کھول سکے، بلکہ اچھے اچھے موشگاف عاجز آگئے۔ دریں ولا ایک مدت سے ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلات کلام غالب کی دھوم مچی ہے اور بیشتر مغروین اور منتظمین اشعار کے معنی پوچھتے پھرتے ہیں۔ خود ہم کو اپنے عزیز وقت صرف کرنے کا اکثر نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ نیز دیگر اہل دعویٰ کے بتلائے ہوئے معانی غیر واقع کا لحاظ کر کے ہم تک

ں المطالب

پہنچلے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ ہم لسان الملک میں تھوڑی سی جگہ بقدرِ امکان مصلحت شرحِ اشعارِ غالب کی نذر کیا کریں، تاکہ اہلِ شوق اور ہم دونوں دقت سے چھوٹیں اور کاغذ کی روشن تحریر ہمیشہ کے لیے جستجو کو مشکلات کی تاریکی میں چراغِ ہدایت دکھاتی رہے۔

سرمایۂ ما جملہ نصیبِ دگراں است
چوں غرّۂ شوال کہ عیدِ رمضان است

یہ افسوس کہ یہ سلسلہ ۱۳ غزلوں سے آگے نہ بڑھ سکا؛ ۱۲ مارچ ۱۹۰۰ء کو بیان کا انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح دیوانِ غالب ایک عالمانہ شرح سے محروم رہ گیا۔ اگر یہ کام مکمل ہو جاتا، تو شاید نقشِ ثانی کی حیثیت رکھتا۔ شرح کی ان اقساط کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہیں دی۔ اسی لیے اسے لسان الملک کے پرچوں سے یکجا کر کے شائقینِ ادب کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ افسوس کہ تلاشِ بسیار کے باوجود تین شمارے حاصل نہ ہو سکے جن میں مندرجہ ذیل اشعار کی شرح تھی:

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پَرافشاں نکلا (غزل ۷، شعر ۲)

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا، ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا (غزل ۱۰، شعر ۳، ۴)

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا (غزل ۱۲، شعر ۱)

یہاں ایک امر کی طرف اشارہ کرنا ضرور ہے۔ یہاں تک جن اشعار کو لے کر شرح کی ہے ان میں سے چند ایسے ہیں جن میں دیوان غالب (مرتبہ مالک رام) اور اِس دور کے ممتاز نسخوں کے بالمقابل لفظی اختلاف پایا جاتا ہے۔ دیکھیے!

حل المطالب	دیوان غالب (مرتبہ مالک رام)
تھا خواب میں خیال کو مجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا (غزل ۳/ شعر ۲)	تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا (غزل ۴/ شعر ۲)	عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا
دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہ تھی آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا (غزل ۵/ شعر ۲)	دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا (غزل ۷/ شعر ۲)	تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا (غزل ۷/ شعر ۵)	جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ تن کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (غزل ۷/ شعر ۷)	یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے سے بھی راضی کہ کبھی
گوشِ منّت کشِ گلبانگِ تسلّی نہ ہوا (غزل ۹۱ شعر ۵)

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منّت کشِ گلبانگ تسلّی نہ ہوا

(ڈاکٹر) محمد شرف الدین ساحل۔ ناگپور

حل المطالب

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن، ہر پیکرِ تصویر کا

حضرت کا دیوان وہ تنک مزاج معشوق ہے، جس کی چوٹی کا پھول یہ ہے۔ نغمہ سنج بلبلیں اس پر چہچہہ کرتی ہیں اور کسی کی آواز گلدستۂ قبول تک نہیں پہنچتی۔ اب کے کلکِ مشکل پسند کا نقش نہیں، کرسی پر ایک نازک مزاج بادشاہ کمالِ کبر و نخوت سے گوشۂ ابرو کج کیے ہوئے تاج مرصّع ترچھا رکھے ہوئے، ناز و تمکین کے ساتھ خاموش بیٹھا ہے:

اے عندلیبِ نالاں! دم درکش و گلو بگیری
گوشِ گل است نازک، تابِ سخن ندارد

حضرت بیان نے عالمِ رؤیا میں ایک روحانی اجازت بمشکل حاصل کی ہے اس لیے اس قدر لب کشائی کی دلبری کرتے ہیں اور منتظران سخن کی سیری:

از بسکہ بہر دام فتادیم در رمیدیم
در دست کسے نیست کہ مشتے پر ما نیست

دیوان کا دیباچہ، حمدِ الٰہی کا بیان ہے۔ اور نقّاشِ قدرت کی کمالِ صنعت گری کا ذکر ہے کہتے ہیں تصویر بول اٹھی، مصوّر کی معجز نگاری یہی ہے کہ نقش کا حسن خود اس کی شہادت ادا کرے چہ جائیکہ نوبت بفریاد پہنچے۔

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا" معشوق، کو ستمگر کہتے ہیں۔ ستم کا مآل عاشقانِ دل دادہ کی فریاد خوانی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ شوخیِ تحریر نے ذاتِ نقش پر وہ ستم کیا ہے کہ وہ باوجود

خاموشی، فریاد کرتا ہے۔ اور اس کی کیا دلیل ہے؟ دلیل یہ ہے کہ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا" مرزا صاحب فارسی نژاد سلجوقی ترک تھے۔ فارسی محاورات دل میں بسے ہوئے ہیں، وہی لب سے ٹپکتے ہیں۔ ایران کا دستور تھا کہ فریادی لوگ کاغذ کا لباس پہن کر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے تھے، تاکہ کمالِ مظلومیت کا کاغذی ثبوت دیں۔ اس لیے جو تصویریں کاغذ پر کھینچی جاتی ہیں اور قلم کی نقاشی سے صورت پذیر ہوتی ہیں، ان کا کاغذی پیرہن ہونا ظاہر ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ مصورِ حقیقی کی تعریف کسی دوسرے سے کیا ہو سکتی ہے، خود نقش اس کی ثنا بلکہ اس کے حسن و خوبی سے بےچین ہو کر فریاد کرتا ہے۔ بس اس سے بڑھ کر نقاش کی کمالِ صنعت کیا ہو سکتی ہے اور حمد میں اس سے افزوں شاعر کیا کہہ سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ صوّرکم فاحسن صُوَرکم۔ آیۂ قرآنی ہے "یعنی صورت بنائی تمھاری ہو کیا اچھی صورتیں تمھاری" مرزا صاحب کا غالباً اسی طرف اشارہ ہے۔

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

مرزا صاحب کو ذاتِ معشوق کا اپنی طرف کھینچ لینا منظور ہے لیکن وہ ع
کھینچتے ہیں جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

اجتماعِ ضدین ہو تو کیونکر ہو۔ اس لیے حضرت بھولے بھالے معشوق کو ڈانٹ بتاتے ہیں اور بڑی کڑی دھمکی دیتے ہیں کہ ہمارا جذبِ دل اپنی والیوں پر آگیا تو کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار سمجھے [illegible] یہ سن کر وہ شوخ مزاج مسکرا دیا۔ آپ ٹھہرے سلجوقی ترک، جھٹ بگڑ بیٹھے اور کہنے لگے: جذبۂ بے اختیار ... الخ۔ یعنی آپ کی کیا حقیقت ہے، دل کی کشش وہ چلتی پوان ہے کہ جمادات پر اثر کرے۔ کسی شائقِ شہادت نے ذرا زور دیا تھا، اس پر تلوار اپنی طرف کھینچی۔ پھر کیا تھا جذبِ صادق اور سچا عاشق بیچارے کا دم سینہ سے باہر نکل آیا۔ شمشیر کے اندرونی حصے کو سینہ فرض کیا ہے اور بیرونی جرم کو دم، جسے دھار کہتے ہیں۔

یا شاعر کا عام خطاب ہے کہ شوق کے جذبۂ بے اختیار کا ایسا پُر زور اثر ہے کہ وہ سنگ و آہن میں تاثیر کرتا ہے۔ چنانچہ سچے عاشق کی طلبِ شہادت سے خلافِ عادت یہ امر ظاہر ہوا کہ وہ تلوار تک نہ پہنچ سکا، تو کششِ شوق اُدم شمشیر کو سینۂ شمشیر سے باہر کھینچ لائی۔ یہی مقصود شائقِ شہادت تھا۔ پس نہ چاہیے کہ کوئی معشوق عشاق سے گردن کشی کرے، اور طلبِ وصال سے دور کھینچے۔

ماحصل : عشقبازوں میں کرامات نہ ہو کیا معنی!
جس کو دل چاہے، ملاقات نہ ہو کیا معنی!

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا، لانا ہے جوئے شیر کا

(کاو کاو: کھودنا، کریدنا (کدو کاوش کرنا) سخت جانی: مشکل سے مرنے کو کہتے ہیں)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ شامِ فراق کی کٹھن تنہائی کا تردّد اور اس کی کاوشیں کیا پوچھتا ہے نہ پوچھ اس لیے کہ احاطۂ تقریر و تحریر سے باہر ہے۔ اس رات کی تنہائی ایک مار ڈالنے والی چیز ہے، لیکن عاشق بیچارہ مرجاتا تو اس کالی بلا سے پیچھا چھوٹتا۔ یہ تو وہ مشکل ہے کہ پانچ سو برس قید رکھوں اور مرنے نہ دوں۔ وہ سخت جان جس کو ایسی مصیبتوں میں موت نہیں شامِ جدائی کو اگر صبح تک لے جائے۔ یعنی رات گذر جائے اور صبح نظر آئے تو گویا اس نے ایسی جانفشانیاں کیں اور ایسی محنتیں اٹھائیں، جو پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنے میں بنا بہ حال ہوتی ہیں۔ اس میں لطفِ سخن یہ ہے کہ کالی رات کو پہاڑ سے تشبیہ دی ہے اس کی اوقات گذاری کو کوہکنی ٹھہرایا ہے۔ صبح کو، اس لیے کہ سفید ہوتی ہے۔ دودھ کی نہر سے تشبیہ دی ہے۔ یہ مراد بھی اس سے پیدا ہو سکتی ہے کہ فرہاد جوئے شیر پورے طور سے نہ لا سکا اور اس نے اثنائے راہ میں جان دی۔ اس طرح سے مسلسل شامِ فراق کا صبح تک پہنچنا برائے نام ہے اور بس۔

ماحصل : شامِ فرقت کس بلا کی رات ہے
ایک میں ہوں اور خدا کی ذات ہے

آگہی، دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدّعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

(آگہی: جاننا، علم حاصل کرنا۔ دام: جال۔ شنیدن: سننا۔ مدّعا: مطلب۔ عنقا: ایک جانور کا نام ہے۔ بعض اگلے محقق کہتے ہیں کہ دیارِ مغرب میں یہ جانور پرانے سیاحوں کی نظر سے گذرا ہے۔ بعض کہتے ہیں اہلیں، فرضی اسم ہے۔ عنق عربی میں گردن کو کہتے ہیں۔ قدیم تحقیقات نے اس کو لمبی گردن کا جانور سمجھا ہے، اس لیے عنق سے منسوب کیا اور عنقا نام رکھ دیا۔ جدید محقق اس گمنام طائر کو چین کے جنگلوں میں ثابت کرتے ہیں، اور ہُما بھی جو مشہور ایشیائی فرخندہ فال پرندہ ہے، اسی کو کہتے ہیں۔ بہرحال فارسی اردو کے محاورات میں کمیاب شئے پر اس نام کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جیسے حافظ ؒ "عنقا شکار کس نشود دام باز چین" نسیم۔ عنقا نام جانور کا)

مرزا صاحب کے اشعار کے معانی کا ادراک بھول بھلیاں کی سیر ہے۔ ہر ایک مصرع ایک گورکھ دھندا ہی کا چھلا نظر آتا ہے۔ الفاظ ہتیلی پر دھرے ہیں اور رحج افلاج بیان آفرینش۔ معنی پر دسترس نہیں۔ آسانی پر درخواستیں گزریں۔ مشکلات کی شکایتیں ہوئیں۔ ناچار مرزا صاحب کو دِقّت پسندی کا اعتراف کیے بغیر نہ بنی۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح نایاب عنقا کسی کے جال میں نہیں آسکتا، اسی طرح آگہی وہ سننے کا جال جس سے طائرانِ معنی کا شکار کرتی ہے، جتنا چاہے پھیلائے، بچھائے مگر میری تقریر کی دنیا کا مدّعا نامِ عنقا ہے، وہ کسی رنگ سے کسی ڈھنگ سے، کسی کا پھندا نہیں کھا سکتا ہے، کسی کے ہاتھ نہیں آسکتا۔

ماحصل: گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

بسکہ ہوں، غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِپا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(اسیری: قید۔ آتش زیرِ پا: آگ پاؤں کے تلے جسے اردو میں تلووں سے لگی ہوئی کہتے ہیں۔ موئے آتش دیدہ: آگ پر رکھا ہوا بال۔ حلقہ: کڑی)

وحشت کی بیقراریوں کا بیان اور بیابانِ جنوں کی گرم روی کا ذکر ہے۔ دیوانوں کے لیے مقیّد رہنا مزوری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ قید کی روک ٹوک میرے لیے سدِّ راہ نہیں ہو سکتی۔

کیوں؟ اس لیے کہ تابستانِ جنوں میں گرم ریتی پر میرے تلووں سے ایسی لگی ہے کہ اس کی حرارت سے زنجیر کے حلقے آگ پر رکھے ہوئے بال کی طرح جل بھن جاتے ہیں اور میرے جنون انگیز قدم کو روک نہیں سکتے۔ آگ پر کوئی شخص قدم نہیں رکھ سکتا اور جب پاؤں ٹھہرتا ہی نہیں تو اس سے زیادہ اور کیا تیز روی ہو سکتی ہے۔

ماحصل: مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں

(۲) جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ! غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(جراحت: زخم؛ الماس: ہیرا؛ ارمغان: تحفہ)

مصائبِ الفت کا بیان ہے۔ بدنصیبی سے اہلِ دنیا کی ایذارسانی کا ذکر ہے۔ عالمِ عشق میں کسی دوست، کسی آشنا سے آرام نہ پہنچنے کا اظہار مدِ نظر ہے۔ فرماتے ہیں کہ جس کو میں غمخوار جانتا تھا، اور جو لوگ میری ہمدردی کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بدقسمتی سے آزار دہندہ نکلے۔ دوستوں کے لیے تحفہ تحائف لانے کی پرانی رسم ہے۔ ہدیہ اور تحفہ وہ دوست لاتے ہیں، جن سے کچھ خصوصیت ہوتی ہے اور وہ خالص دوست شمار کیے جاتے ہیں۔ مرزا صاحب اپنے وفادار یاروں کا یوں رونا روتے ہیں کہ وہ تحفہ میں جراحت، ارمغان میں کلیجہ چھیدنے والا ہیرا، ہدیہ میں داغِ جگر لے کر آئے ہیں۔ زہرخند کے طور پر فرماتے ہیں کہ مبارکباد دیجیے، میرے غمخوار تشریف لائے ہیں۔ زمانے کے خاص دوستوں کی اس دل آزاری پر دشمنوں کی دشمنی کا قیاس کر لینا چاہیے۔

ماحصل: دوستوں سے اس قدر پہنچی ہیں ایذائیں مجھے
دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

(۳) جز قیس، اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

(جز: سوا؛ قیس: مجنوں کا نام ہے جو عرب کے قبیلۂ عامر سے تھا؛ صحرا: جنگل؛ بروئے کار:

(کام کے لیے سامنے آنا (ظاہر ہونا) ؛ بے تنگی : تنگی کے ساتھ ؛ حسود : حسد کرنے والا)
صحرا نوردانِ محبت کی بیکسی، غریبی، تنہائی کا تذکرہ ہے۔ کہتے ہیں کہ اس امرِ دشوار کے انصرام کے لیے ہمت باندھ کر نکلا تو ایک مجنوں نکلا لیکن ذوقِ محبت کی نعمت سے جو عام حاسد کی ہوا چلتی ہے اس نے مجنوں کی مصیبتوں میں کسی کو شریک نہ ہونے دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بد نصیب کے لیے فلکِ کج رفتار نے وسعتِ صحرا کو چشمِ حسود کی تنگی سے بدل دیا۔ حسد کی آنکھ دوسرے کو نہیں دیکھ سکتی۔ کسی نے دستگیری نہ کی، بیچارہ سنسان بیابانِ وحشت میں تنِ تنہا مر کھپ گیا۔ یا مرزا صاحب اپنی کربت و غربت کا حال لکھتے ہیں کہ میری تنہا روی اور دشت نوردی کے کٹھن مصائب میں کسی نے دادِ ہمدمی نہ دی۔ ایک بیچارہ قیس بڑے کام آیا باقی سناٹا ہے۔ اکیلا چلا کیا کرتا۔ جنوں کی دشوار یاں آسان نہ ہوئیں اور اس کی ہمقدمی سے زنجیرِ وحشت کے عقدہ نہ کھلے۔ گویا جنگل کا دائرہ حسد کی آنکھ کا حلقہ تھا جس میں کوئی اور ہم چشم دکھائی نہ دیا۔

ماحصل: جنوں میں کوئی ساتھ کب دے گیا
کہ سایہ بھی یاں لوٹنے لے گیا
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی : پریشانی، بکھرنا ؛ سویدا : دل پر ایک سیاہ نقطہ ہے، جیسے آنکھ میں سیاہ تل، سویدا دل کا میرِ مجلس ہے، جس طرح آنکھ کا خانہ سامان تل ہے ؛ سرمایہ : سامان ؛ دود : دھواں)
اس شعر کے معنی میں خیال کا انتشار اگرچہ کئی جانب میل کرتا ہے، لیکن میرے نزدیک زیادہ قریب الفہم دو مطلب ہو سکتے ہیں، جن میں سے ایک نہ ایک مرزا صاحب کا مقصود ضرور ہے۔ اول یہ کہ سویدا کو دل کا داغ تجویز کیا ہے۔ لیکن چونکہ سودائے عشق نے اپنے خطرناک اثر سے دل کے بے سر و سامان سویدا کی حالت معرضِ ابتری میں ڈال دی تھی، اس لیے بگڑی بنانے کے لیے سر و سامانِ سوختگی کی ضرورت تھی۔ سو شکر ہے گرمیِ سودائے محبت نے جو دل کے داغِ سویدا سے دھواں پیدا کیا، وہی سویدا کی درستی کا سرمایہ بن گیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شئی اپنے

سر و سامان کے بدون ناقص و غیر درست کہلاتی ہے۔ دھوئیں کو آشفتگی لازم ہے اور داغ کو دھواں۔ داغ کون ہے ہویدا؟ اس لیے جتنی آشفتگی بڑھی اسی قدر نقشِ سویدا کے لیے سیاہی تیار ہوتی گئی اور اس کا نقشِ سویدا درست ہو گیا۔

دوم یہ ہے۔ سویدا کا صورت پذیر ہونا سوزِ عشق کی بدولت ہوا یعنی سینہ کے داغ سے جو پریشان دھواں اٹھتا تھا، وہ دل پر جمتے جمتے نقش آرائے سویدا ہوا۔ آشفتگی باعثِ خرابی ہونی چاہیے لیکن اہلِ عشق کے لیے سوزِ جنوں نے آشفتگی کو سبب درستی بنا دیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان امور سے ثابت ہوا کہ داغدار دل یا جگر سے دُودِ فریاد کا نمودار ہونا کچھ تعجب کی بات نہیں۔ لھٰذا اس سوائے تیرہ بختی وسینہ سوزی، داغِ عشق سے اور کیا امید رکھی جائے! ع

می تراود ز لبم آنچہ درون دلِ من است

ماحصل شمع کہتی ہے مرے سر سے دھواں اٹھتا ہے
تو نے سینہ کیں دل پہ سوز میں آہیں کیوں کیا

تھا خواب میں، خیال کو مجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی، نہ زیاں تھا، نہ سود تھا

(خواب: سونا اور سوتے میں چیزوں کا معاینہ کرنا۔ خیال: سوچنا، گمان کرنا (خواب میں جو وہمی صورتیں نظر آتی ہیں)، انھیں بھی خیال کہتے ہیں، طبیبوں کے نزدیک خیال ایک قوت کا نام ہے، جو حسِ مشترک سے حاصل کی ہوئی صورتوں کو محفوظ رکھتی ہے گویا حسِ مشترک اشیاء کی صورتوں کا مہتمم خزانہ ہے اور اس کا صندوقچہ خیال ہے۔ زیاں: ٹوٹا۔ سود: فائدہ)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بازارِ ہستی میں کسی مسافر کے لیے کوئی پونجی بہم نہیں پہنچ سکتی، یہ جیسا تہی دست آیا ہے ویسا ہی خالی ہاتھ جائیگا۔ چنانچہ جتنے معاملے مجھ کو پیش آئے وہ خیال کا سیلاب خواب کے عالم میں میرے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ہر ایک معاملے کے لیے نفع و نقصان کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن دنیا کے معاملات، صورتِ خیال کی طرح بے اصل و بے بنیاد ہیں۔ صورتِ خیال کا وجود خواب تک ہے، اور خواب کا وجود غفلتِ چشم

تک۔ جب آنکھ کھل جاتی ہے، نہ خواب رہتا ہے، نہ خیال۔ آنکھ کا کھلنا اصطلاح میں متنبہ ہونے کو کہتے ہیں، یعنی جب آدمی دنیا کی بے ثباتی سے واقف ہوتا ہے اور اس کی چشم غفلت سے پردے اٹھ جاتے ہیں، تو کائنات کل بے وجود ہونا اور سرمایۂ ہستی کا بے سود ہونا اس کو صاف صاف نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بازار کے معاملات کا نفع و نقصان فانی ہے، اور جو چیز تھوڑی دیر رہ کر نابود ہو جائے، اس کا عدم وجود برابر ہے، اس لیے نہ زیاں زیاں ہے، نہ سود سود۔ اور یہاں کی اجناس بے بود و بے سود۔

ماحصل: اے تہی دست رفتہ در بازار
ترسمت بر نیاوری دستار

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ "رفت، گیا اور "بود" تھا

(مکتب: لکھنے پڑھنے کی جگہ، سبق: سبق، ہنوز: اب تک، رفت: گیا، بود: تھا)

دفترِ عشق کے طومار کا بیان ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبت کا طول طویل دفتر کبھی اختتام کو نہیں پہنچتا۔ ایک میں ہی اس مدرسہ کا متعلم ہوں، لیکن باوجودے کہ نسخۂ حیات قریب الختم ہے، مگر ہنوز تعلیم کی وہی ابتدائی حالت ہے۔ صفوۃ المصادر پڑھنے والے اطفالِ مکتب کی طرح رفت و بود تک پہنچا ہوں پھر اس فن کی تکمیل کس طرح ہو سکتی ہے اور محبت کی نیرنگِ عشق کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔ یا مرزا صاحب کی مراد یہ ہے کہ عشق و محبت کا ماحصل کچھ بھی نہیں۔ منتہی طالبعلم ہمیشہ مبتدی رہتے ہیں، تمام عمر کی تحصیل سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ کفِ افسوس ملتے ہیں کہ ورق گردانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مجھ کو دیکھو کہ میری زندگی آخر ہونے آئی ہے۔ مگر آج تک عشق کا محنت نامہ ہاتھ سے نہیں چھوڑا، برابر سبق لیتا رہتا ہوں، لیکن رفت و بود کے سوا دوسرا سبق یاد نہیں۔ جو شے ہاتھ سے جا چکی، اس سے کیا حصول اتھا اس وقت سے پہلے تھے، اس سے کیا فائدہ؟ غرض عشق کے مدرسہ میں کسی درس خوان کی اصلاحِ حال ناممکن ہے، اور گذشتہ را صلوٰۃ۔

ماحصل: اگر صد گنج علم از بر بخوانی
چو آشفتی، الف با تا ندانی

دِکھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں، ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

(کفن: مردے کا لباس، عیوب: عیب کی جمع ہے، برہنگی: ننگا ہونا، لباس: کپڑے، ننگ: عار، وجود: ہستی۔ ہونا)

مرزا صاحب کہتے ہیں کہ میری ہستی سے وجود کو داغ لگ گیا ہے۔ میں پیدا ہو کر خواہ کسی لباس کو کسی وضع کو اختیار کرتا، لیکن میری عیب دار ہستی کے عیوب پوشیدہ نہ ہوتے کیونکہ میرا وجود ہی ننگِ وجود تھا اس لیے میرا معدوم ہونا میری پردہ پوشی کا باعث ہوا ورنہ کسی اور صورت سے ممکن نہ تھا۔

ماحصل: ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

(تیشہ: بسولہ، کوہکن: پہاڑ کھودنے والا (فرہاد کا لقب ہے)؛ سرگشتہ: سر پھرا ہوا اور دُکھ والا؛ خمار: نشہ کا اتار (خمر سے مشتق ہے یعنی وہ کیفیت جو شراب سے حاصل ہو)، رسوم: رسم کی جمع ہے (ریت کے معنی)، قیود: قید کی جمع ہے (قید - پابندی)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں کوہستانِ عشق کا وہ آشنا و رہرو ہوں کہ مجھے موت کے لیے جو انتہائے عشق کی دلیل ہے کسی حیلے یا بہانے کی ضرورت نہیں۔ یہ جان چرانے والے گرفتاروں کا کام ہے۔ جب پھنس گئے تو مرنے کی رسم کو آلاتِ مرگ سے ادا کیا۔ میرا مسلکِ روحی ایسے سخت جانوں کو لذتِ عشق پر مرنے والا تسلیم نہیں کرتی۔ جیسا کہ کوہکن یعنی فرہاد نے تیشہ کھایا اور مدتوں پنجرا ڈھوئے، تب کہیں بڑی مشکل سے جان دینے کی نوبت پہنچی اور اس میں بھی تیشہ سے مدد لینی پڑی۔ کمالِ عشق کے معنی یہ تھے کہ معشوق کا جلوہ دیکھتے ہی کسی اعانت بغیر مر جاتا۔ نقدِ جان کرشمۂ حسن کی نذر کر جاتا اور یہ کس کام

کالم ۵

ہجرِ جاناں میں گئی جان بڑی مشکل سے
میری مشکل ہوئی آسان بڑی مشکل سے

ماحصل: پختہ کاراں جنوں را کے بپا زنجیر ہاست
حضرت بیان فرماتے ہیں: ہمت قطرۂ شبنم ہے عرق ریزِ جبیں
کہ بیک پر تو خورشید فنا ہو جانا

(۴) کہتے ہو "نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا"
دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

اس شعر میں شرح طلب کوئی بات نہیں ہے، فقط اتنا ہی مقصود ہے کہ معشوق کو دل واپس کرنا منظور نہیں ہے۔ لیکن وہ اس رمز کو دوسری صورت میں ادا کرتا ہے یعنی کہیں پڑا پا جائیگا تو تمہارا دل نہ دیا جائیگا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دل تو پہلے ہی غنتہ بر کر چکے ہو، وہ آپ سے دور کہاں ہے کہ کہیں پڑا پا لیجیے۔ آپ دینا نہیں چاہتے۔ خیر نہ دیجیے۔

ماحصل: آں شوخ چناں ربود از من
گوئی کہ دلم نبود از من

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

عاشق کو دردِ معشوق جان سے زیادہ پیارا ہوتا ہے کیونکہ محبت کے میٹھے درد میں درد مند آشنا ہے۔ طبیب یا ناصح جو اس درد کو کھونا چاہتے ہیں، عاشقانِ درد مند کو بیگانہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس واسطے درد کا بے دوا ہونا ان کے درد کی دوا ہے۔

ماحصل: دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا

دوستدارِ دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم!
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

معشوق دشمن کا دوست رکھنے والا ہے۔ اس لیے دل کی آہ و زاری پر اعتماد نہیں ہو سکتا کیونکہ کسی آہ نے معشوق کے دل سے دشمن کی دوستی نہ نکالی اور دونوں میں کسی نالہ نے جدائی نہ ڈالی۔ یا، معنی یہ ہیں کہ معشوق ہمارا دشمن جانی ہے کیوں کہ اس کی بے اعتنائیوں اور بے پروائیوں سے ایک روز جان جاتی ہے اور دل اسے دوست رکھتا ہے۔ اس لیے میں اس بغلی گھونسے پر بوجہ نفاق اعتماد نہیں رکھتا کیونکہ وہ کبھی دل سے آہ نہیں کرتا کہ اثر ہو۔ وہ کبھی دل سے نالہ نہیں کھینچتا کہ رسا ہو۔ لہٰذا ایسا دل قابلِ اعتماد نہیں ہے

ماحصل: یار ناپایدار دوست مدار
دوستی را نشاید ایں غدار

سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

معشوق جان کر انجان بنے ہیں۔ گویا بیوقوفی کے پردے میں عقلمندی کی ہے اور دانستہ عشاق سے بےخبری کرتے ہیں۔ گویا بیخودی کے لباس میں ہشیاری ہے۔ لہٰذا حسن کا تغافل، آشفتگانِ محبت سے غفلت نہیں ہے، بلکہ وہ عاشقوں کی جرأت و ہمت کو آزماتے ہیں کیوں کہ اگر معشوق متوجہ ہوا تو جھوٹے سچے عاشق سبھی جان فدا کرنے کو تیار ہیں۔ اور جس کو سچا عشق ہے، اس کی شاہراہِ محبت میں معشوق کی بےخبری سدِ راہ نہیں ہوتی کیونکہ مدہوشی کوئی وسوسہ نہیں آنے دیتی۔ اور جس کے دل میں معشوق کی طرف سے علاوہ محبت کے کوئی اور خیال پیدا ہوا وہ سچا عاشق نہیں ہے

ماحصل: ترک کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

فقط وابستہ دل کا خون ہونا اور راہِ محبت میں کھویا جانا بیان کیا ہے یعنی جس طرح غنچہ کثرتِ سُرخی سے پُر خون دکھائی دیتا ہے اور جس طرح نشو و نما سے بہار سے پہلے کسی ڈال میں کسی کلی کا پتا نہ تھا اسی طرح ہمارا دل پُرخون گم تھا۔ آج غنچوں کو دیکھ کر دل کا سارا رنگ ڈھنگ نظر آگیا کیونکہ دلِ آوارہ کے سوا کون گم ہو سکتا ہے اور دلِ پُرحسرت کے سوا کسی اور شئ کا خون ہونا بھی معلوم ہوا نہ ہو، جسے غنچہ کہتے ہیں، یہ ہی ہمارا دل ہے۔

ماحصل: مرے ہاتک لہو ہے دل میرا
غنچۂ آرزو ہے دل میرا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن، اس قدر یعنی
ہم نے بار ہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

فقط مراد یہ ہے کہ یہ وحشی دل ہمارے پاس نہیں ٹھہرتا۔ ہاتھوں سے نکل نکل جاتا ہے۔ اگر بمشکل بہلا پھسلا کر لائے بھی، تو پھر چل دیا۔ ہم ڈھونڈتے رہ گئے۔ اور وہ تمہارے پاس جا پہنچا۔ القصہ ہم نے ہمیشہ ڈھونڈا اور کبھی نہ پایا اور تم نے کبھی نہ ڈھونڈا اور ہمیشہ پایا۔

ماحصل: آں شوخ چناں ربود از من
گوئی کہ دلم نبود از من

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا!

اپنا لذّت گیرِ محبت ہونا اور ناصح کا بیہودہ و بےحس ہونا ثابت کرتے ہیں، اور ضمناً ناصح کی نصیحتِ جگر خراش کی ایذا رسانی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مراد یہ ہوئی کہ عاشق کے لیے نصیحت زخم پر نمک افشانی ہے۔ بھلا مجروحانِ محبت کو تو اس میں بھی ایک مزا آتا ہے کیونکہ عشق از روئے فطرت آزار پسند ہے لیکن ناصح کو اپنی بیہودہ بکواس کا کوئی مزا نہیں ملا لہٰذا آیندہ خاموش رہنا چاہیے۔

(۵) دل مرا، سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

(سوزِ نہاں: اندر کی لگی آگ ، بے محابا بے تکلف، سراسر، بلا لحاظ، بے مروتی سے، آتشِ خاموش: وہ آگ جس میں لپٹ نہ ہو ، وہ آگ جو بھڑکی نہ ہو، وہ آگ جو چپکے چپکے جلے)

محبت کی آگ دل میں لگی تھی، لیکن ضبط و ضبع اور احساسِ رسوائی نے بھڑکنے نہ دی۔ اس لیے اس آگ کی طرح جو چپکے چپکے جلتی ہے، دل جل بھن کر خاک سیاہ ہو گیا۔ "خاموش" اور "گویا" متناسب شاعری ہے۔

دل میں شوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

اسی محبت کی آگ کا انجام بیان کرتے ہیں کہ شوقِ وصل جو عاشق کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے، یادِ یار جو کسی آن جدا ہو نہیں سکتی، یہ دونوں خانہ دل کے ساتھ اثاث البیت خیال کیے جاتے ہیں، مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ محبت کا انجام اور اس کی جانہ سوزی کی نہایت یہ ہے کہ جس شے نے آگ لگائی ہے، وہ بھی جل گئی۔ یہ بہت لطیف بات ہے کہ جب کہ آگ کسی شے میں لگاتے ہیں تو وہ شے جل جاتی ہے اور اس کے ساتھ وہ آگ بھی راکھ ہو جاتی ہے مثلاً ایک چنگاری کسی لکڑی میں رکھ کر جلائیں تو چنگاری بھی لکڑی کے ساتھ نیست و نابود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یادِ یار نے شوقِ وصل پیدا کیا، اور شوقِ وصل نے آگ لگائی، لہٰذا گھر مع سامان جل گیا کیونکہ کوئی بجھانے والا نہ ہوا۔ دیدار ہوتا تو یاد ٹھنڈی پڑتی۔ وصال ہوتا تو شوق منطفی ہو جاتا۔ جس گھر میں آگ بجھانے کی کوئی ترکیب بن نہ پڑے، وہاں تاوقتیکہ کوئی چیز جلنے والی رہے گی، آگ گل نہ ہو گی۔ اگر بنظرِ تصوف دیکھیے تو یہ عارف کے لیے فنا کا مقام ہے۔ مرزا صاحب صوفی نہ تھے، اس لیے ہم ان کے کلام کو تصوف میں ڈال کر مصطلحاتِ تصوّف کا اظہار اور اپنے مبلغِ علم کا جتانا ضروری نہیں سمجھتے، ورنہ ہر شعر کے معنی میں دریا بہا سکتے ہیں لیکن بحث سے خارج گفتگو یا دور از کار احتمالات، محلِ فصاحت الفاظ اور مستعمل معنی لغات لکھ لکھ کر کاغذ کا منھ سیاہ کرنا اور ناظرین کا وقتِ عزیز کھونا نامناسب اور خود نمائی

سمجھتے ہیں۔

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

خودیت کا بیان ہے۔ فنا والفنا کا مقام ہے۔ عارف کثرتِ مجاہدات سے آپ کو فنا کرتا ہے، جس کی نسبت ارشاد ہوا ہے۔ موتوا قبل ان تموتوا۔ شیخ ترجمہ کرتے ہیں "خاک شو پیش از آں کہ خاک شوی" وجود کے بعد عدم ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں یہ مرتبہ تو مجھ کو پہلے ہی حاصل ہو چکا تھا کیونکہ عنقا وہ طائر ہے جس کا آشیانہ صحرائے عدم میں شاخِ نیستی پر ہے اور ہماری آہِ آتشیں کی لُو سے اس کے بال و پر اکثر جل جل گئے ہیں۔ اب کے ہمارے نالوں سے عنقا کے پر و بال پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اب ہم بیابانِ عدم میں جہاں عنقا کا نشیمن تھا نہیں ہیں۔ گویا ہمارا طائرِ دل بوستانِ غیب الغیب میں چھپا رہا ہے اور وجودِ فانی کے مٹا دینے کے بعد ہم کو بقائے دوام حاصل ہوئی ہے۔ مرزا صاحب نے شاعری کو تصوف کے رنگ میں ڈال کر شعر کو بلند کیا ہے۔ ورنہ حضرت کا سارا جمع خرچ زبانی تھا۔

ماحصل:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

عرضِ کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں!
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

سوزِ محبت اور آتشِ عشق نے میرے سراپا میں ایسی آگ بھر دی ہے کہ میری ذات کا تو کیا ذکر میرے خیالات ایسے آتشناک ہیں کہ خیالِ صحرا سے صحرا میں آگ لگ گئی۔ خدانخواستہ اگر زیادہ وحشت اچھلتی اور میں خود جانبِ صحرا نکل جاتا، تو خدا جانے کہاں کہاں آگ لگتی اور کیا کیا ہوتا۔

ماحصل:

نالہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
آگ لگ جائیگی کہیں نہ کہیں

اری موسی! کہیں نہ پائی چمپا بہن!
پپیہاری بولیو باگ میں

غرض چمپا کا بھائی رات بھر اس طرح چمپا کی تلاش میں پھرتا رہتا ہے۔ صبح ہوتے دلّی دروازہ کھلتا ہے۔ وہ گھبرایا ہوا اپنی موسی کے پاس پہنچتا ہے۔ تو وہ بے اختیار بول اٹھتی ہے کہ کوٹھے پر چڑھ کر دیکھ لے چمپا تو ایک مٹھی راکھ ہو گئی۔ کوٹھے سے چمپا کی جلی ہوئی چتا صاف نظر آتی ہے:

چڑھ کوٹھے پہ رے لالا! دیکھ لے!
ارے لالا! چمپا کی ہے گئی مٹھی راکھ!
پپیہاری بولیو باگ میں!

یہ گیت المیہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ گیت کا آخری بند ہی گیت کا منتہا ہے۔ گیت کا حسن اس بات میں ہے کہ رات بھر چمپا کی ساس چمپا کے غم میں بین کرتی رہتی ہے کہ چمپا باغوں میں جھولا جھول رہی ہے، چمپا تالوں کی سیر کر رہی ہے، اور چمپا کا بھائی سچ مچ باغوں اور تالوں میں چمپا کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن جب صبح ہوتی ہے اور دلّی دروازہ کھلتا ہے تو یہ راز بھی کھل جاتا ہے۔ آخر پپیہے کے مدھر بول بھی چمپا کے غم میں ڈوب کر رہ جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے بھی گیت کا آخری بند ہی گیت کی جان ہے۔ یہ گیت کا اختتامیہ ہی نہیں گیت کا منتہا بھی ہے۔ نیز یہ بند ایک اور لطیف پہلو پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ پورے گیت میں امید و بیم کی حالت، جس کے پس منظر میں گیت ابھرتا ہے۔ اور بظاہر اس تعطل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن جب گیت اس مقام پر پہنچتا ہے کہ "ارے لالا! چمپا کی ہے گئی مٹھی راکھ"، تو یہ تعطل پوری شدت سے ابھرتا ہے اور اتنی ہی شدت سے چمپا کے غم میں ڈوب جاتا ہے۔

ساون کے اس ملہار میں قدیم دلّی کی جھلک ملتی ہے، جب دلّی شہر پناہ کے اندر بستی تھی، اور رات کو شہر پناہ کے تمام دروازے بند ہو جاتے تھے۔ "دلّی دروا جو رے لالا کھلے" سے معلوم ہوتا ہے کہ دلّی دروازہ رات کو بند ہو جانے کے بعد صبح کے وقت ہی کھلتا تھا۔ اپنے میکے میں آئی ہوئی لڑکیاں ساون کی رم جھم میں جب اس گیت کو لہک لہک کر گاتی ہیں، تو سماں بندھ جاتا ہے۔ اس گیت کے پردے میں بہنیں اپنے بھائیوں سے

موت کی دھمکی دے گے تو زحمت اختیار کرلیگا اور بلاوجہ کوئی تپ اور زحمت گوارا نہ کریگا۔ اس لیے ایسی فتنہ انگیز صحبتوں سے جس کا نتیجہ نقصانِ جان و مال ہے، دل کی افسردگی ہی اچھی معلوم ہوتی ہے اور اہلِ ملاقات کا پُر مکر و زُور تپاک بھلا نہیں لگتا۔

ماحصل: بھاگ اِن بردہ فروشوں سے، کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں، جو یوسف سا برادر پائیں

(۶) شوق، ہر رنگ، رقیبِ سر و ساماں نکلا
قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

(شوق: دل کی خواہش، تڑپ، چاہنا، رقیب: نگہبان اور کسی کرنے والا اصطلاح میں مخالف اور دشمن کو کہتے ہیں کیونکہ جو شخص کسی کے حالات کی نگہبانی کریگا وہ اس کی خواہشوں کا سدِ راہ ہوگا اور یہی سببِ خصومت ہے۔ حقیقت و مجاز میں ایک مناسبت بالمعنی پیدا کرتی ہے۔ مرزا صاحب نے شعر میں اصطلاحی معنی لیے ہیں))

فرماتے ہیں کہ شوق کسی ساز و سامان کو اہلِ شوق تک اور کسی مشتاق کو ساز و سامان تک نہیں پہنچنے دیتا، جیسا کہ رقیب کسی کا اپنا معشوق تک اور معشوق کا جانا کسی غیر تک کبھی گوارا نہیں کرتا۔ اس میں ایک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی کسی کے احوال کی نگہبانی کرتا ہے، اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص ہر صدمے اور ہر بُری چیز سے محفوظ رہے مثلاً اگر ہم کہیں کہ زید کے لیے غذا کی حفاظت کرو، تو مراد یہ ہوگی کہ کوئی زہریا زہریلی چیز نہ کھا جائے کہ اس کو ضرر پہنچے، نہ یہ کہ اس کا دانا پانی بند کر دیا جائے۔ بنا بریں چونکہ سر و ساماں کی طرف متوجہ ہونا کمالِ عشق کو نقصان دیتا ہے اور عاشقِ کامل کو داغ لگاتا ہے، اس لیے شوقِ صادق ہر طرح سے سر و سامان کا مخالف اور رقیب ہے، اور عاشق تک نہیں پہنچنے دیتا۔ قیس مشہور عاشق تھا، اس کا حال دیکھیے کہ وہ عالمِ تصور میں ننگ دھڑنگ پیدا ہوا۔ یہ اشارہ ہے کہ قیس کی تصویر بھی برہنہ و عریاں کھینچی جاتی ہے، یعنی شوق کی خانہ خرابیاں عالمِ اجسام سے عالمِ تصویر تک پہنچتی ہیں۔ مرزا صاحب کے بیان میں ثابت ہوا کہ اربابِ نام و ننگ کو کافرِ عشق اور رقیبِ شوق سے احتراز ضروری، ورنہ

نوبت بایں جا نخواہد رسید۔

ماحصل ایک مدت چاہے جناب کے اک مدت گلشن نابالی کی (؟)
عرصہ ہوا ہے گھر سے نکلے عشق نے خانہ خرابی کی

بوے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

فرماتے ہیں بوے گل کے اجزا جب ہوا میں مل کر چہار سو پھیلتے ہیں، اسی کا نام انتشار ہے۔ رہا نالۂ دل، دل کی دردناک آواز کا نام ہے۔ آواز کی اشاعت منحصر ہے ہوا کی وساطت پر۔ اور ہوا کا محیط ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا نالۂ دل کا چہار سو منتشر ہونا لازم ہے۔ دودِ چراغ محفل کا رنگ ہے، اس کے اجزاء بھی ہوا کی حرکت سے ٹوٹ کر ہر طرف مائل ہوتے ہیں۔ اس کو بھی دوسرے لفظوں میں پریشانی کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ عاشق اس کی محفل سے پریشان ہو کر نکلا ہے، تو یہ کوئی نئی بات نہیں، وہاں تو غیر ذی روح اشیاء بھی پراگندہ ہو کر نکلتی ہیں، جن پر عشق کی پریشانی کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ چہ جائے کہ انسان جو ہر ایک حالت کا ادراک کر سکتا ہے، کیوں کر پریشان نہ ہو۔

ماحصل: نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

دلِ حسرت زدہ، تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں نکلا

(حسرت زدہ: حسرت کا مارا ہوا، وہ شخص جس کی کوئی حسرت نہ نکلی ہو۔ مائدہ: دستر خوان)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے دلِ مایوس کی بساط پر اور درد کی حسرتیں چنی ہوئی تھیں۔ وہ لذتِ درد کا دستر خوان تھا۔ لیکن چونکہ وہ ماحصل حسرتوں کا مارا ہوا تھا اس لیے لب و دنداں کے سوا کوئی اس سے کامیاب نہ ہوا۔ قاعدہ ہے کہ جب آدمی کو کسی شئے کی حسرت ہوتی ہے تو اسے دیکھ کر منھ میں پانی بھر آتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ درد کی لذت بھی دلِ حرماں نصیب سے پوری پوری حاصل نہ ہوئی اور یہ مزا کافی طور پر میسر نہ ہوا کہ دل و جگر کو بھی کیفیت ملتی۔ حسرت نے لب و

و دنداں سے لذّت درد کو کبھی آگے نہ بڑھنے دیا۔ یہاں بھی ہونٹ چاٹ کر رہ گئی۔

ماحصل: نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا
وار اک اور بھی لگانا تھا

ہے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میری ہمت دشوار پسند نے دنیا کی ہر ایک شئی کو پکڑا اور چھوڑ دیا کیونکہ دشوار پسندی ہر ایک شئی کو سہل سمجھتی رہی اور آگے بڑھتی رہی۔ گویا ہر ایک شئی کو فنا کرتی رہی اور دست طلب سے گم کرتی رہی کیونکہ بموجب حدیث شریف "موتوا قبل ان تموتوا" اس نے آخر کار مرگ کو پسند کیا جو مشکلترین سوانح عالم تھا۔ ہمت دشوار پسند اس سے بھی خوش ہوئی کیونکہ وہ دشوار پسند تھی اور یہاں سہولت نکلی۔
دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہمت دشوار پسند نے کائنات ہستی کو ترک کیا اور ملک و مال و جاہ و جلال دنیا پر لات مار کر سبق فقر و فنا پڑھانا شروع کیا لیکن اس کی دشوار پسندی کے نزدیک سرمایۂ ہستی کا ترک کرنا اور خودی یا خرابات دنیوی ایسی ناچیز شئی کو فنا کر دینا کوئی بڑی بات نہ نکلی۔ دنیا میں فنا سے بڑھ کر کوئی دشواری نہ تھی۔ مگر اس نے اس کو بھی خفیف سمجھا۔ کہیے ایسی ہمت دشوار پسند کو کہاں لے جائیے۔ سخت مشکل ہے۔

ماحصل: ترک دنیا میں سوچ کیا ناصح!
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب!
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا۔ وہ طوفاں نکلا

اس شعر کے معنی صاف ہیں۔ اس میں کوئی شرح طلب بات نہیں ہے۔

(۷) دھمکی میں مر گیا، جو نہ باب نبرد تھا
عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

(باب = لائق، قابل۔ نبرد = لڑائی۔ نبرد پیشہ = لڑاکا، جھگڑالو، جنگجو۔ طلبگار = ڈھونڈنے والا)

معنی یہ ہیں کہ جو لوگ عشق کے حریف ہوئے یعنی عشق کی طرف بڑھے اور عشق کی لن ترانیاں ہیں، وہ دل کے ایسے بودے نکلے کہ میدانِ امتحان میں اس جنگجو کی ایک ہی ڈانٹ میں جاں بحق ہو گئے جیسے فرہاد و قیس وغیرہ۔ یہ لوگ دعویٰ عشق میں ناقص تھے۔ کامل ہیں، تو ہم ہیں کہ اس خونخوار کے ساتھ میدانِ محبت میں آج تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ قدمِ شجاعت معرکے کے پیچھے نہیں۔ سر پر ہزاروں زخم اٹھائے۔ سیکڑوں تلواریں کھائیں اور منھ نہ پھیرا۔

ماحصل: سروں پہ وار لیے، اُف نہ کی شہیدوں نے
یہ کاسہ وہ نہیں جن سے صدا نکلتی ہے

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر ہی مرا رنگ زرد تھا

فرماتے ہیں کہ مرگ کی مشکلات کا کیا ذکر ہے۔ میری زندگی بھی راحت و آرام سے نہ گذری کیوں کہ موت کے دھڑکے سے جینا وبالِ جان رہا۔ جوہرِ روح کو رنگ فرض کیا ہے، اور رنگ کے اُڑ جانے کی حالت مرگ تسلیم کی ہے، جب تک رنگ جما رہتا ہے، سرخی نمودار رہتی ہے جب رنگ اُڑ جاتا ہے، تو زردی چھا جاتی ہے۔ اس لیے کہتے ہیں، مجھے ہائے زندگی میں اگر برگِ خزاں کی طرح ہاتھ ملنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا جو کیفیت بعدِ فنا روح کی ہوتی ہے، وہی زندگی بھر رہی اور جینا مرنا برابر رہا۔

ماحصل: تمہارے عاشقانِ لب کے کیوں کر دن گذرتے ہیں
کنارِ آبِ حیواں ہیں، نہ جیتے ہیں، نہ مرتے ہیں

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ میں جیتی مستی کا وہ درخت ہوں کہ جس میں کھٹکا لگا ہوا ہے، باغباں پھلدار درختوں میں اس لیے کھٹکا لگا دیتے ہیں کہ جانور نقصان نہ پہنچا ملیں، جب کوئی طائر آ بیٹھتا ہے، تو کھٹکا ہلا دیتے ہیں، وہ اُڑ جاتا ہے۔ آپ کو درخت فرض کیا ہے، اور دھڑکتے دل کو کھٹکا، رنگ کو طائر، نقصان کو موت۔ معنی: نقصان کے خوف سے دل کا کھٹکا بجتا رہا، اس لیے رنگ کا طائر کبھی نہ بیٹھنے پایا اور بیٹھا تو فوراً اڑ گیا۔ میری حیات پر کبھی بہار کا رنگ نہ جما، ہمیشہ خزاں کی طرح زردی عارضِ حال رہی۔

ماحصل: تختۂ گلہائے گلزار دنیا کچھ نہیں
یہ چمن دھوکے کی ٹٹی کے سوا کچھ نہیں

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

(تالیف، جمع کرنا، محبت کرنا، مائل کرنا۔ نسخہ، دوا کا نسخہ لکھا ہوا۔ وفا، پورا کرنا۔ مجموعہ: جمع کیا ہوا (بہت سی چیزیں ایک جگہ کی ہوئیں) - خیال، دھیان۔ فرد فرد، الگ الگ، ایک ایک)
مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وفا ایک ایسا نقش ہال عنقا تھا کہ جس کا وجود نام کے سوا اور نہیں پایا جاتا۔ میں نے چاہا کہ دنیا میں ہر ایک قوم اور ہر ایک گروہ کے وفاتر دیکھوں اور ان سے مضمون وفا انتخاب کروں، لیکن کہیں حرف وفا کا پتا نہ لگا۔ اس واسطے میرا مجموعۂ خیال پریشان رہا کہ کہاں جاؤں اور کدھر ڈھونڈوں، کیا تحقیق کروں۔ اور ہر ایک کام کے انجام دینے کے لیے خیال کا فراہم ہونا شرط ہے۔ خیال جب ہی فراہم ہو سکتا ہے کہ تلاش و تردد باقی نہ رہے۔ اور یہ میسر نہ ہوا کیوں کہ کہیں معنی وفا کا نشان نہ ملا۔ لہٰذا وفا کے نسخوں کی تالیف نہ کر سکا اور مضمون کی نایابی سے تالیف میں ناکامی ہوئی۔

ماحصل: یا وفا خود نہ بود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ قسمت نے ایسا پلٹا کھایا، زمانہ میں ایسا انقلاب ہوا کہ عیش نے طپش کی صورت پکڑلی۔ عشرت عسرت سے بدل گئی۔ دل کے گلدستہ میں جہاں رنگا رنگ کے پھول بہار دکھا رہے تھے، داغوں کا لالہ زار پھولا ہوا ہے۔ جب مسرت اور شادمانی کا رنگ اڑ گیا، تو حسرت اور ارمان کے خون نے جوش کیا اور ایسا جوش کیا کہ دریائے خون کا ایک کنارہ دل اور ایک کنارہ جگر نظر آتا ہے۔ یہ وہی مقام ہے کہ جہاں کی گرد جلوۂ گل تھی، یا جہاں جلوۂ گل گرد تھا۔ یعنی جہاں عیش کی رنگ رلیاں مچی ہوئی تھیں، وہاں عیش

کی خون خرابی دکھائی دیتی ہے۔

ماحصل: محفلِ عیشِ طرب گنجِ شہیداں بن گئی
ہائے، خونِ آرزو کا خوں بہا کچھ بھی نہیں
جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہِ عشق کی
دل بھی اگر گیا، تو وہی دل کا درد تھا

(کشمکش: تردد، کھینچا تانی)

کوئی اشکال نہیں ہے، صاف ظاہر ہے۔ مراد یہ ہے کہ عشق و محبّت کی بنیادِ فساد دل ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس کافر کا زلفوں کی بدولت کالا منہ ہوا۔ اب سارے جھگڑے اور خرخشے مٹ گئے۔ مگر توبہ، ہم ایسے خوش نصیب کاہے کو تھے کہ پھر بھی چین سے رہتے اور حضرتِ دل بھی ایسے بھلے مانس نہ تھے کہ ہم کو تنہا چھوڑ جاتے۔ آپ تو رخصت ہوئے مگر اپنا درد چھوڑ گئے۔ دادا گیا، پوتا آیا، کنبہ جوں کا توں۔ بقائے درد کی دو صورتیں ہیں: دل سے رفیق کا جدا ہونا باعثِ درد ہے، یا دردِ معشوق ہنوز باقی ہے۔ دل نہ جاتا تو محبت نہ ہوتی۔ یہ نہ ہوتی تو درد نہ ہوتا۔

ماحصل: یہ پارہ پارہ کلیجہ، یہ چاک چاک لباس
رفو ہوا دلِ کافر خراب کر کے مجھے
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال، بیاباں نورد تھا

ملا کی دوڑ مسیت، چارہ ساز ظاہری جسمانی وحشت کا علاج کر سکے۔ ہاتھ میں ہتھکڑی، پیر میں بیڑی ڈال کر زنداں میں بند کر دیا، تو وحشت جاتی رہی۔ ذرا غور تو ہو لو۔ یاد دل کا خیال تو وہی بیاباں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ جب جانے کوئی اسے روک لے

ماحصل: نشتر چہ زنی رگِ جنوں را
آگاہ نئی تپ درون را

یہ لاشِ بے کفن، اسدؔ خستہ تن کی ہے
حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھا!

آمین ثم آمین بجاہِ محمد وآلہ الطاہرین

(۸) شمارِ سُبحہ، مرغوبِ بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

(شمار: گنتی ÷ سبحہ: تسبیح ÷ مرغوب: بھایا ہوا ÷ مشکل پسند: کٹھن کاموں سے خوش ہونے والا. دقتوں میں خوشی سے پڑنے والا، مشکلات سے نہ گھبرانے والا ÷ بیک کف بُردن: ایک ہاتھ سے لے جانا۔ ایک دفعہ لے جانا ایک جھپٹا مار کر لے جانا ÷ صد: سو)

تسبیح کی دانہ شماری اس مشکل پسند معشوق نے اس لیے پسند کی ہے کہ اس میں ایک ایک ہاتھ سے سو سو دل کے اڑا لے جانے کا طریقہ نظر آتا ہے۔ ورنہ اس زنار بند بُتِ کافر کو تسبیح سے کیا تعلق!

ماحصل: جانتی ہے نگہ نازنہ تھکا نا دل کا
لیسے طرار سے مشکل ہے بچانا دل کا

بہ فیضِ بیدلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

(نومیدی: ناامیدی ÷ جاوید: ہمیشہ ÷ کشائش: کھولنا ÷ عقدہ: گرہ)

امیدوں نے ہزاروں بلاؤں میں ڈال رکھا تھا اور وہ دل سے پیدا ہوتی تھیں۔ لیکن شکر کا مقام ہے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ جب دل نہ رہا، تو گویا امیدوں کی کھیتی برباد ہو گئی۔ چہار طرف مایوسی کی گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ امید کی صورت کہیں نظر نہیں آتی۔ کوشش مصیبتوں میں ڈالتی ہے، اور کوشش امید تک ہے۔ مایوس ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی کا نام آرام ہے۔ حقیقت میں اگر دیکھو، تو مایوسی کا جنگل طے کرنا ایک بڑا کٹھن کام تھا۔ لیکن بیدلی نے اسے بالکل آسان کر دیا، تو وہ عقدۂ مشکل جس کا نام مایوسی تھا، حل ہو گیا۔

دوسرے معنی: سب سے مشکل تر عقدۂ مایوسی تھا۔ لیکن ہمارے کشائش کار نے جہاں

عقدۂ مشکل پسند کیا اور یہی عقدہ سبب عقدہ کشائی ہوا کیوں کہ مقصود راحت و آرام تھا اور بوجہ ترکِ سعی کے ہمیشہ نا امیدی سے حاصل ہوا۔ عربی مثل ہے "الیاس احدی الراحتین" ہندی میں بھی کہتے ہیں "آسا مرے نراسا جیے"۔

ماحصل   شفیع ہر دہ ہزار ست رونق بازپسیں
شبے کہ بر سرِ امیدوار می گزرد

ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(ہوا : خواہش ۔ سیرِ گل : پھولوں کی سیر ۔ بے مہری : محبت کا نہ ہونا ۔ نامہربانی، بیدردی ۔ بخوں غلطیدن : خون میں لوٹنا ۔ بسمل : حلق بریدہ، بسم اللہ کہہ کر جس کا گلا کاٹا گیا ہو (کوئی خاص لفظ اس وقت مختصر کر دیا جاتا ہے جب کہ کثرتِ استعمال سے عام میں اس کی پوری پوری شہرت اور شناسائی ہو چکی ہو۔ بسمل اصل میں دم بسم اللہ تھا۔ کیونکہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرنا اسلام کی ہدایت ہے۔ کثرتِ استعمال سے دم بسمل رہا۔ پھر دم کو بھی بعض لوگوں نے بے دم کر دیا اور یہ بھی ہے، دم رہتا، تو بسمل کیوں ہوتا۔ نرا بسمل رہ گیا۔ ظرف سے اکثر مظروف مراد لی جاتی ہے اس لیے بسمل ذبیحے کو کہنے لگے ہیں)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق کو باغ کی گلگشت اور پھولوں کی سیر کچھ تفریحِ طبع کی غرض سے پسند نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا ظالم ہے کہ اس کی بے مہری اور ظلم کا رنگ سیرِ گل کی خواہش سے آئینہ کی طرح صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کہ اس کو پھولوں کی سیر مدِّ نظر نہیں ہے، بلکہ وہ گلوں کے رنگ کو خونِ بسمل اور چاکِ گل کو زخمِ بسمل سمجھ کر سیرِ لالہ و گل کو جاتا ہے۔ جب ڈالیاں ہوا سے ہلتی اور پھولوں کو حرکت ہوگی، تو گویا خون میں تڑپتے ہوئے بسمل نظر آئیں گے۔ اور وہ بے رحم اُن کا تماشہ دیکھیگا

ماحصل: اس گل کو ہے جو لے سر و کار
ہر رنگ میں سا ہے نم نمودار (؟)

(۹)   دہر میں، نقشِ وفا، وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ، شرمندۂ معنی نہ ہوا

(دہر: زمانہ۔ نقش: کھینا۔ تصویر کھینچنا۔ خط کھینچنا۔ صورت بنانا۔ لکیر کھینچنا۔ وفا۔ پورا کرنا۔ نباہ کرنا۔ وجہ: سبب۔ تسلّی: دل کا ٹھہرنا)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا میں جتنے الفاظ وضع کیے گئے، وہ ہمیشہ اپنے معنی دیتے رہے اور ان کا استعمال ان کے معنوں پر ہوتا رہا اور وہ باعثِ تسلّی ہوا۔ مگر وفا کے واضع نے جس معنی کے لیے اس لفظ کو وضع کیا تھا، وہ اس طور پر نہ ہوا۔ یعنی کسی نے کسی کے ساتھ نباہ نہ کیا اور کسی نے کوئی وعدہ نہ پورا کیا۔ اس لیے وفا کا لفظ کہیں صحیح بولا نہ گیا، اور اس لفظ نے کبھی اپنے معنی کا اثر نہ دیکھا۔

ماحصل: با وفا خود نبود در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

سبزۂ خط سے، ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

(سبزہ: روئیدگی۔ خط: مسیں، محاسن۔ کاکل: (سر کے اوپر کے بال لیکن استعمال زلف، گیسو پر ہوتا ہے)۔ زمرّد: پنّا۔ (ایک ہرے رنگ کا جواہر ہے)۔ حریف۔ مقابل۔ دم: سانس۔ افعی: سانپ)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک معشوق کے سبزۂ خط نہ آیا تھا، کاکل افعی کی طرح بل کی لیٹ رہا اور عاشقوں کو زہریلی اداؤں سے ایذا دیتا رہا۔ زمرّد کے اثر سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے اور اس کی نیش زنی کی طاقت بالکل جاتی رہتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ خطِ زمرّدی پیدا ہوا اور زلف کی ایذا رسانی کا وہی عالم رہا! شاید یہ وہ افعی ہے، جس پر زمرّد کا اثر نہیں چلتا۔ مراد یہ ہے کہ خط آنے سے سلطانِ حسن کی سپاہ کمزور ہو جاتی ہے۔ ہمارے معشوق کا بڑھا ہوا حسن خط کے آنے سے بھی نہیں گھٹتا۔ ظاہر ہے کہ صاف چہرہ پر زلف کی اداؤں میں کمی نہیں آتی۔

ماحصل: یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اک شب کمال رہتا ہے

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عشق کی بلاؤں اور وفا کے بکھیڑوں سے چھوٹنا چیتے جی کسی طرح ممکن نہ تھا۔ میں نے تنگ آکر معشوق سے قتل کی فرمائش کی یا موت کی دھمکی دی، لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ افسوس ہے کہ مرگ و زیست کے دونوں عالم برباد ہو گئے اور کہیں آرام نہ پایا۔

ماحصل: تمھارے عاشقان لب کے دن کیونکر گزرتے ہیں
کنارِ آبِ حیواں ہیں، نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

(گزرگاہ: راستہ، آنے جانے کی جگہ۔ خیال- دھیان۔ مے- شراب۔ (مطلق شرابخانہ کے سامان سے ہے، مضاف ہو کر ہر ایک شے پر بولا جا سکتا ہے)۔ ساغر- آب، ساغرِ گلاب، ساغرِ شراب۔ نفس- سانس۔ جادہ- پٹیا۔ سرِ منزل- منزل کا سرا۔ تقویٰ- خدا سے ڈر کر بُرے کام نہ کرنا)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ دین دنیا میں انسان کو کسی کا ہونا چاہیے۔ بہتر تو یہی تھا کہ ہر متنفس یادِ الٰہی سے غافل نہ ہوتا، اور ہر ایک نفس پر ذکرِ الٰہی جاری رہتا، جس طرح پٹیا پر آدمی چلتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے یہ امر میسّر نہ ہوا اور نفس کافر نے ہنگامہ ہائے معاصی کی طرف باگ پھیر دی تو شیشہ و ساغر کا دھیان دل میں آنے جانے لگا۔ یہ بھی کسی قدر باعثِ سرور ہوا اور اس نے زندگی کو بے لطف گزرنے نہ دیا، اگرچہ دین ہاتھ سے نکل گیا، لیکن دنیا کا مزا تو کسی قدر حاصل ہوا۔

ماحصل: یہیں کا ہو کے رہے، یا وہیں کا ہو کے رہے
غرض یہ خاک کا پتلا کہیں کا ہو کے رہے

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے سے بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

(گوش: کان۔ منت- احسان۔ گلبانگ- آواز)

مرزا صاحب معشوق سے خطاب کرتے ہیں کہ اے معشوق! تجھ کو وعدہ وفا کرنے کی عادت نہیں ہے جھوٹ سے انسان کا نارضا مند ہونا ضروری ہے بخلاف میرے کہ میں تیرے جھوٹے وعدے سے ناراضی ہوتا ہوں کیونکہ عاشق صادق مرحلۂ عشق میں تسکین و تسلی کو ننگ سمجھتا ہے۔ تیرا وعدہ اگر سچا ہوتا، تو دل بیقرار تسلی پاتا اور پایۂ اعتبار عشق سے گر جاتا۔ دوسرے معنی یہ ہیں: میں وہ صاحب غیرت ہوں کہ کسی صورت سے کسی کا احسان اٹھانا پسند نہیں کرتا خواہ میری ہی راحت کیوں نہ ہو۔ پس، اگر تو وعدہ وفا کرتا، تو دل تسلی کی آواز کا ممنون ہوتا، اور نفس غیور کو شرمندگی حاصل ہوتی۔ شکر ہے کہ ایسا نہ ہوا۔

ماحصل: درد منت کش دوا نہ ہوا

میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے

ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں، سو وہ بھی نہ ہوا

ہم ایسی خالی قسمت لے کر آئے تھے کہ کبھی اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوئے۔ زمانے نے ہمارے ساتھ دشمنی کی تھی، تو ضروری تھا کہ وہ مضرتیں یا وہ مصیبتیں جو ہم کو مٹا دینے والی ہیں، زمانے کے ہاتھ سے ہم کو تکلیف پہنچاتیں۔ مگر آسمان کو ہمارے ساتھ ایسی ضد تھی کہ گو وہ ہماری موت کی فکر میں تھا، لیکن دنیا سے تنگ آکر ہم نے منھ سے موت مانگی، تو ظالم نے اس سوال کو بھی پورا نہ کیا۔ اور ہم ویسے ہی نیم بسمل تڑپتے رہے۔ افسوس!

ماحصل: وہ بھی ہوگا کوئی، امید بر آئی جس کی

اپنا مطلب تو نہ اس چرخِ کہن سے نکلا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب

ناتوانی سے، حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

(صدمہ: دھکا لگنا، ٹکنا، چوٹ کھانا، مصیبت اٹھانا۔ جنبش، ہلنا۔ حریف، مد مقابل۔ دم، سانس۔ عیسیٰ علیہ السلام: نام ہے اس نبی کا جس کا معجزہ بیمار کو اچھا کرنا اور مردے کو زندہ کرنا تھا۔)

اس شعر کے معنی میں کم فہم آدمی دھوکا کھا جائیگا کیونکہ مسیح کا تعلق مردے جلانے سے زیادہ تر

مشہور ہے۔ پس جب غالب مردہ تھا، تو مردے کا مرنا چہ معنی دارد! ایک جنبشِ لب سے مراد اگر قُم ہے جو مردے کے لیے زیادہ تر موزوں ہے، اور صدمہ بے روح ناممکن کیونکہ حس وادراک متعلق بروح ہے، تو جنبشِ لب سے صدمہ پہنچنا کیسا! لہٰذا میرے نزدیک مرزا صاحب نے آپ کو مردہ نہیں کہا، بلکہ بیمار ٹھہرایا ہے۔ اب معنی میں کوئی دقت نہیں۔ مراد یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مجھے اچھا کرنے آئے تھے۔ اس وقت گو میں زندہ تھا لیکن ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ حضرت مسیح کے لب ہلاتے ہی دم نکل گیا، اور میں ان کے دمِ اعجاز کا حریف نہ ہوا۔ مدِّ مقابل کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ طرفِ ثانی کے سامنے ڈٹا رہے۔ میں ان کی اور باتوں کو کیوں کر جھیلتا، اور ان کے مقابلے میں کیا مقاومت کرتا! پہلے ہی حملہ میں دم فنا ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ بیمارِ عشق حضرت مسیح سے اچھا نہ ہو سکا، بلکہ اس بیچارے کا الٹا کام تمام ہو گیا۔

ماحصل: مریضِ عشق پر رحمت خدا کی
مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی

(۱۰) ستایشگر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

(ستایشگر: تعریف کرنے والا ٭ زاہد۔ خدا کے خوف سے دنیا کی لذّتوں کو ترک کرنے والا ٭ باغِ رضواں۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی کا باغ یا وہ باغ جس کا رضوان نام اک دربان ہے، ٭ گلدستہ۔ پھولوں کا گچھا، جس کو مالی نے باندھا ہو ٭ طاقِ نسیاں۔ وہ طاق جہاں کوئی چیز رکھ کر بھول گئے ہوں)

مرزا صاحب فرماتے ہیں اور بڑی دُوں کی لیتے ہیں۔ یعنی زاہد ترکِ لذّات میں عاشقوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ دیکھیے جنّت کی نعمتیں دیکھ دیکھ کر حضرتِ زاہد کیسے بہشت کے بھاٹ بنے ہوئے ہیں۔ جنّت کی بہار کا گلدستہ یدِ قدرت نے بنا کر ہم کو بھی دیا تھا، لیکن عشق کی نعمت لے کر ہم ایسے بے پروا ہوئے کہ وہ گلدستہ کہیں طاق میں رکھ کر بھول گئے۔ اور یاد نہیں آتا کہ جنّت کیا چیز تھی اور کہاں جاتی رہی۔ ایک حضرت زاہد ہیں کہ دن رات وہی فکر ہے۔

ماحصل: نہیں کچھ اشتہا باقی، بہت غم کھا کے آیا ہوں
کہوں گا اہلِ جنّت سے کہ نعمت اپنی رہنے دو

بیاں کیا کیجے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا

(بیداد۔ ستم * کاوش۔ کھودنا، کسی کو رنج دینا، کسی کو دکھ دینا، کسی سے حسد رکھنا * مژگاں۔ پلکیں (مژہ کی جمع ہے) * تسبیح۔ سمرن * مرجان۔ مونگا)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مژگاں کی کاوشوں کا بیان کرنا قوتِ لسانی سے باہر ہے۔ ان چبھتی ہوئی نوکوں نے سارا سینہ لہولہان کر دیا ہے۔ خون کا جو قطرہ نکلتا ہے، وہ دانۂ تسبیحِ مرجاں کی طرح ہی ذکر کرتا ہے۔ (خون کے قطرہ کو مرجان کے دانے سے سرخی کے سبب سے تشبیہ دی ہے)
مراد یہ ہے کہ آنکھ سے جو کاوشِ مژگان کے سبب اشکِ خون جاری ہوا اس کا ہر تار ایک تسبیح ہے جس پر مژگان کی بیشمار جفاؤں کا شمار ہوتا ہے۔ اشک نہیں تھمتے اس لیے کاوشِ مژگان کا ختم ہونا چہ معنی!

ماحصل: اٹھائیں آپ نے پلکیں، کلیجے ہو گئے چھلنی
یہ کیا چشمِ خماریں تھی، یہ کیا اندازِ مژگاں تھا

کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوہ نے
کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

(آئینہ خانہ۔ شیش محل یا آئینہ کا گھر * آئینہ۔ آئینہ * پرتو۔ جھلک * شبنمستان۔ شبنم کی جگہ جہاں بہت اوس پڑی ہوئی ہو * شبنم۔ رات کی تری و درختوں پر رات کو جو اوس پڑتی ہے اسے شبنم کہتے ہیں * ستاں کلمۂ نسبت ہے جیسے گلستان وغیرہ)
معشوق سے خطاب ہے کہ تیرے جلوہ کی گرماگرمی نے آئینہ کا وہ حال کیا جو خورشید کے لو سے شبنم کا رنگ ہوتا ہے۔ انتہائے فروغِ حسن کی تعریف ہے کہ پارہ آگ سے نہیں ٹھہرتا۔ آئینہ قلعی چڑھائی جاتی ہے جس سے چہرہ کا عکس رک کر صورت پذیر ہوتا ہے، اور جب آفتاب طلوع ہوتا ہے شبنم اڑ جاتی ہے مراد یہ ہے کہ فروغِ حسنِ معشوق سے آئینہ پانی پانی ہو گیا اور قلعی کھل گئی۔

ماحصل: فروغِ حسن سے کھل گئی سیماب کی قلعی
تری ہمتا کداری پر غرض آئینہ حیراں تھا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

(تعمیر - بنانا ٭ مضمر - پوشیدہ ٭ ہیولیٰ - قبول کرنے والی چیز، صورت کا محل ٭ برقِ خرمن - ڈھیر جلانے والی بجلی ٭ خونِ گرم - جوشِ محبت ٭ دہقاں - کسان)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میری آبادی میں بربادی پوشیدہ ہے۔ اس طرح جب کسی کام کرنے کی گرمجوشی میرے رگ و پے میں پیدا ہوتی ہے، اس سے میری کاربراری کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ گویا اک دہقان کی سرگرمی خرمن اندازی کے لیے اس قدر مضرت پیدا کرتی ہے کہ اسی سے خرمن کے حق میں برق کا سامان پہنچتا ہے۔ بدیں وجہ کامیابی کا سرمایہ جل جاتا ہے اور کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ انتہائے شومیِ طالع کا بیان ہے کہ جو کام میں کرتا ہوں وہ کام میری ہی ناکامی کا باعث ہوتا ہے۔

ماحصل: ایسی بگڑی ہوئی قسمت ہے کہ میں نام اپنا
لکھتا کاغذ پہ ہوں تو حرف بگڑ جاتے ہیں۔

اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

(ویرانی - اجاڑ ٭ تماشا کر - دیکھو۔ یہ لفظ تماشا اصل میں مشی سے نکلا ہے، مشی عربی میں چلنے کو کہتے ہیں۔ فارسی والوں نے دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے) ٭ مدار - پھر پھر کر وہیں آنا)

کثرتِ ویرانی کا بیان ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ بدنصیبی، مفلسی یا جوشِ جنوں ظہور پذیر ہوا میں آگیا اور میرا گھر ایسا اجڑ گیا اور ویرانہ ہو گیا کہ اس میں ہر طرف جنگلوں کی طرح سبزہ اُگا ہے اور ایسی کثرت ہے کہ میرے دربان کی تنخواہ گھاس کھودنے سے نکلتی ہے۔ اس سے تہی دستی کا بھی رنگ ملا ہے۔ مرزا صاحب دربان کی تنخواہ نہیں دے سکتے لیکن اعلیٰ تنخواہ ضروری ہے۔ اس لیے خانہ اس قدر ویران ہے، گھاس کھودنا اور بیچنا اس کی روزی کا باعث ہے۔ جہاں کثرتِ ویرانی کا اظہار ہے، وہاں کثرتِ مفلسی کا بھی ذکر ہے۔ واقعی دلّی کے ان مکانوں پر جن کے مکیں ان کو تنہا چھوڑ گئے ہیں، یہی شعر پھبتا ہے۔

ماحصل: کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں، میں بے زباں، گورِ غریباں کا

(خموشی۔ چپ رہنا۔ خوں گشتہ۔ جن کا خون ہو چکا ہو۔ چراغِ مردہ۔ بجھا ہوا چراغ۔ گورِ غریباں۔ قبرستان)
انتہائی یاس و حرماں کا ذکر ہے۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہجومِ ناامیدی سے مہرِ سکوت لگی ہوئی ہے۔ کیونکہ امید کا باب بالکل مسدود ہے، اس لیے کسی سے بولنے کی ضرورت نہیں۔ پس خموشی بیان کرتے ہیں اس شخص کی کسی سے آرزو نکل نہ سکی۔ کسی سے کاربرآری کی امید نہیں۔ اس لیے بات کرنا بھی غیر ضروری ہے۔ تو وہ سینہ جس میں شہیدِ آرزوئیں مدفون ہیں، میرا گورِ غریباں ہے۔ میں ان پر مایوس، خاموشی اور بے زبانی کے سبب سے بجھے ہوئے چراغ کا قائم مقام ہوں۔

ماحصل: وہ بھی ہوگا کوئی امید بر آئی جس کی
اپنا مطلب تو نہ اس چرخِ کہن سے نکلا

بغل میں غیر کی، آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

(تبسم۔ مسکرانا)
مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس آکر معشوق کا خندہ پیشانی ہونا ہماری خوبیٔ قسمت کے خلاف ہے۔ آج یہ خواب میں آنا اور بے وجہ مسکرانا اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارے لیے ایذادہی کا کوئی سامان پورا پورا تیار ہو چکا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ کسی رقیب کی بغل میں آرام فرما رہے ہیں، اور ہمارے اوپر بطور تمسخر و طعنہ زنی ہنسی آ رہی ہے۔ منظور یہ ہے کہ ہمیں خواب میں بھی آرام نہ آئے۔

ماحصل: تو در رقیبوں سے وفا کرتے ہیں
میرے کہنے پہ ہنسا کرتے ہیں

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

(ہنوز۔ اب تک ۔ پرتو۔ جھلک ۔ افسردہ۔ ٹھٹھرا ہوا ۔ حجرہ۔ کوٹھڑی ۔ زنداں ۔ قیدخانہ)

طولِ فراق کا رونا ہے۔ یعنی وصال کی صورت دیکھے ہوئے برسوں ہوئے اور فراق کا عالم پیشِ نظر ہے۔ ایسی طولانی جدائی سے معشوق اور اس کی یاد کا نقش جو جما ہے مٹ جاتا۔ مگر میری حسن وفاداری نے اس کی پوری پوری نگہبانی کی اور اس کو صفحۂ دل سے محو و سہو نہ ہونے دیا۔ اب اس کی ایسی مثال ہے کہ قید خانہ کا وہ حجرہ کہ جس میں حضرت یوسف قید تھے اور اس سے چھوٹے ہوئے مدتیں ہوئیں، گویا میرا دل ہے یعنی جس طرح اس حجرہ کو دیکھ کر لوگوں کو حضرت یوسف کا خیال پیدا ہوتا ہے اس طرح میرے دل میں معشوق کا خیال آتا ہے۔

ماحصل؛ تم مجھے بھول گئے ہو صاحب!
ہم تمھیں یاد کیا کرتے ہیں

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا!
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

(سرشک ۔ آنسو ۔ آلودہ ۔ بھرا ہوا)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ معشوق ایسا سنگدل ہے کہ وہ کسی کے دکھ درد پر نہیں پسیجتا، چہ جائے کہ کسی کی حالت زار دیکھ کر اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکے۔ کیونکہ رونا دلیلِ رحم ہے اور رحمدلی سے معشوقوں کو کیا تعلق! اس لیے ثابت ہوا کہ وہ ایسے حوادث اور ایسی قیامتیں ہونگی، جو انسان کے وہم و خیال سے باہر ہیں، ورنہ اس کی پلک تک آنسو نہ آتا اور وہ کسی پر رحم نہ کھاتا۔ لہو کا پانی ہونا انتہائی مصیبت پر بولا جاتا ہے۔ سرشک اور پانی سے مناسبتِ شعری ہے۔ اس شعر کی روح یہ ہے کہ معشوق کو آبدیدہ دیکھ کر کوئی نادان رحمدلی کے گمان سے خوش نہ ہو اور سراب مہر و وفا کا دھوکا نہ کھائے۔

ماحصل؛ ستم کرے ہے لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

نظر میں ہے ہماری، جادہ راہ فنا، غالب!
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

(جادہ۔ پگڈنڈیا؛ شیرازہ۔ کتاب سینے کا ڈورہ؛ اجزاء جمع ہے جزو کی۔)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ جس طرح کتاب کے جزو شیرازہ سے باندھے جاتے ہیں، اسی طرح ہستی کے پریشان دفتر کو قدرت کے صحیفے بندتے عدم سے وابستہ کیا۔ ایک عرب کی مثل ہے۔ الوجود بین العدمین، یعنی ہستی دو نیستیوں کے درمیان ہے۔ اول عدم، دوسرے فنا۔ پس جس ہستی کے پیچھے دو نیستیاں پڑی ہوں، اس کی کیا کامیابی ہے۔ اور اس پر بھروسہ کرنا کیسی نادانی کی بات ہے! مرزا صاحب کہتے ہیں کہ ہم ان انجام بینوں میں ہیں، جو ہر ایک امر کی عاقبت اور انتہائے نتیجہ کو پیش نظر رکھتے ہیں اور دنیائے بے ثبات کا فریب نہیں کھاتے۔

ماحصل: ترک دنیا میں سوچ کیا ناسخ!
کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے، ذوق کم میرا
(۱۱) حباب موجۂ رفتار ہے، نقش قدم میرا

(یک بیاباں۔ ایک جنگل؛ ماندگی۔ رہ جانا، بے بسی، بیماری، قافلے سے پچھڑ جانا؛ ذوق۔ لذت؛ حباب۔ بلبلہ؛ موجہ۔ لہر)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرا روپ وحشت ہزار ہا بیاباں کی خاک چھاننا چاہتا ہے۔ اگر میں واماندگی سے ایک ہی بیاباں میں رہ گیا، تو میری صحرا نوردی کا ذوق شوق کم نہ ہوگا۔ کیوں؟ اس لیے کہ جس طرح موج کی ٹھوکر سے بلبلے ٹوٹ جاتے ہیں، اسی طرح میری تیز رفتاری سے میرے نقش قدم مٹ جاتے ہیں اور حال یہ کہ نقش قدم ٹھہرنے نہیں پاتا، تو میرا پائے وحشت کیوں کر ٹھہر سکتا ہے۔ پس اگر ناتوانی ایک ہی جنگل میں میری رفتار جنوں کا دور کرے، تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرا ارادہ اور عشق و جنون کی اولوالعزمیاں گھٹ گئیں۔ مراد یہ ہے کہ صحرائے جنوں میں میری تیز روی سے میرے پاؤں کا نشان ٹھہر نہیں سکتا۔

پس ایسا تیز رفتار واماندگی سے پست ہمت کیوں کر ہو سکتا ہے! اگرچہ وفورِ دیوانگی کی ضعف بیماری سے میں ایک ہی بیاباں میں پڑا پھرتا ہوں، لیکن عشق کے دیوانوں سے اب بھی گھٹا ہوا نہیں ہوں

ماحصل: چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوریٔ منزل

محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

(بیدماغی۔ طبیعت کا الجھنا، کسی شے سے دماغ کا پریشان ہونا۔)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ کثرتِ حوادث اور انقلابِ روزگار سے طبیعت ایسا پلٹا کھا گئی ہے کہ کسی سامانِ تفریح سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ پہلے سیرِ باغ و راغ اٹھا کرتی تھی چمنستانوں میں بہاریں لوٹتے تھے، بوستانوں میں عیش و عشرت کے جلسے رہتے تھے، مگر زمانے کا رنگ ایسا بدلا کہ وہ ہم نہ رہے، وہ دل و دماغ نہ رہا۔ اب تو یہ کیفیت ہے کہ عیش و طرب کے نام سے بھی بخار چڑھتا ہے۔ اگر چمن کے پھولوں کی خوشبو بھی آجاتی ہے، تو طبیعت پریشان ہو جاتی ہے۔

ماحصل: کس کا گیسو، کس کی کاکل، کس کا طرّہ، کس کی زلف
سب بلائیں ہو گئیں، جب دل پریشاں ہو گیا

(۱۲) ۔ بقدرِ ظرف ہے، ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے، تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

(ظرف۔ پیٹ، برتن۔ ساقی۔ پلانے والا، شراب پلانے والا۔ خمار۔ نشہ کی گھمیر۔ خمیازہ۔ انگڑائی۔ ساحل۔ کنارہ)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ، اگر مطلوب کی دولت وسیع ہے، لیکن میری طلب بھی اوچھی نہیں ہے اے ساقی! اے مبدءِ فیاض! اے سرچشمۂ فیض! اگر تو شراب کا دریا ہے، تو میں ساحل کی آغوش ہوں۔ انگڑائیاں اور جمہائیاں انسان کو اس وقت آتی ہیں، جب کسی شے کی طلب

ہوتی ہے۔ حقہ کش، افیمی، شرابی جو اپنا مقصود نہیں پاتے، تو اُن سے ایسی حرکات سرزد ہوتی ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ جس طرح دریا کو ساحل اپنے ظرف میں کھپا لیتا ہے اس واسطے ساقی جس قدر شراب دیگا میں اسے پچا لونگا اور چھلک نہ جاؤنگا۔ اصلی مراد یہ ہے کہ میں وہ کم ظرف نہیں ہوں کہ زیادہ نعمتوں سے پھول جاؤں اور بہک کر ساقی سے انحراف کروں۔

ماحصل: وہ ہیں کم ظرف جو ہیں پی کے بہکنے والے
ہم کہاں صورت شاغر ہیں چھلکنے والے

(۱۳) محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

(محرم۔ راز دار۔ بھیدی۔ نوا۔ راگ۔ حجاب۔ پردہ۔ ساز۔ باجا)

مراد یہ ہے کہ خدا کا ظہور ہر ایک ذرہ سے ہوتا ہے اور ہر ذرہ حسنِ حقیقی پر ایک پردہ ہے لیکن وہ چھپانے والا پردہ نہیں ہے، بلکہ باجے کا سا پردہ ہے۔ جس طرح راگ، باجے کے پردہ سے پیدا ہوتا ہے، اسی طرح حجاب کے پردوں سے حقیقت کا حسن جھلکتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تو وہ آنکھ نہیں رکھتا کہ پردہ کے پیچھے سے جھلکتا ہوا حسن دکھائی دے۔ لہٰذا ظہور حق پر کوئی الزام نہیں آسکتا۔ جو کچھ ہے تیری ہی کوتاہی نظر ہے۔

ماحصل: پردۂ غفلت مری آنکھوں سے اُٹھ جاتا نہیں
سامنے وہ مہروش ہے اور نظر آتا نہیں

رنگِ شکستہ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

(رنگِ شکستہ۔ ٹوٹا ہوا رنگ، یعنی اڑا ہوا رنگ، چہرہ فق، زردی رخ۔ شگفتن۔ کھلنا پھولوں کا)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ عاشق کا اڑا ہوا رنگ، معشوق کے دیکھنے کے لیے نظارہ کے بہار کی صبح کا وقت ہے یعنی ناز و ادا کے پھول اسی وقت کھلتے ہیں کیونکہ جب معشوق عاشق کو اپنے غم میں گھلا ہوا زرد رُو دیکھے گا، تو حسن اپنی خوبی پر نازاں ہوگا اور معشوق طرح طرح کے ناز اور رنگ برنگ ادائیں عاشق کے سامنے دکھائیگا جس سے اس کی

عشق دوچنداں ہو جائیگا۔

ما حصل: اسیر عشق بہت حیلہ ساز کرتے ہیں
نیاز معدوں سے کیا کیا یہ ناز کرتے ہیں

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ افسوس ہے میں تیری لمبی لمبی پلکوں کا دکھ دیکھتا ہوں۔ اس سے تجھ کو میرا دکھ درد دیکھنا لازم تھا مگر اس کے بالعکس تو محفل میں رقیب رو سیاہ پر، جو میرا دشمن ہے، تیز تیز نظریں ڈال رہا ہے، جس سے کمالِ محبت اور پیار پایا جاتا ہے۔ یہ ہمارا حق تھا۔ حق مستحق کو ملنا چاہیے۔ تیرے مزاج میں اُلٹی بات یہ ہے کہ ہمارا حق دشمن کو دیتا ہے جو غیر مستحق ہے۔

ما حصل: جانباز، مومن اس نے دیا غیر کو خطاب
ہم جان سے بھی گذرے، پہ نام اور کا ہوا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

(صرفہ۔ فائدہ۔ بچت۔ ضبط۔ روکنا۔ طعمہ۔ کھاجا، خوراک، کھانے کی چیز۔ لقمہ۔ نفس۔ آہ۔ جاں گداز۔ جان کی گھلانے والی چیز)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میں جو ضبطِ آہ کیے بیٹھا ہوں، اس میں میرا کچھ فائدہ ہے۔ ورنہ میں تو غمِ عشق کی بدولت ایسا ناتوان اور لقمہ ہوں کہ اگر ایک مرتبہ آہ کھینچوں تو میرا دم فنا ہو جائے۔

ما حصل: دیکھ لینے کو ترے سانس لگا رکھا ہے
ورنہ بیمارِ غمِ ہجر میں کیا رکھا ہے

ہیں بس کہ جوشِ بادہ سے شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

اس شعر میں کوئی غزلیت نہیں ہے، فقط موسم کی مستی اور بزم عشرت کی اچھل کود کا بیان ہے۔ کیوں کہ بازی گر ہنگام بازی اپنے سر کو بار بار جنبش کرتا ہے۔ اس لیے گوشۂ بساط کو سر بازیگر سے تشبیہ دی ہے کیونکہ شراب کے شیشے ہر گوشہ پر جوشِ مستی سے ہلا کرتے ہیں۔ دورِ نشاط کے باب میں انتہائی مبالغہ ہے یعنی عالم میں ایسی خوشی بھری ہوئی ہے کہ جمادات پر اس کا اثر نمایاں ہے۔ اگر اس سے غرض یہ رکھیں کہ شیشے فرش کے تلے ہیں یا اوپر، تو جس بازی میں بازیگر اطفال تماشائی کے سروں کو چادر کے تلے بٹھا کر جنبش دیتا ہے، تو اچھلتے ہوئے گوشۂ بساط کو اِن سروں کی تشبیہ ہوگی۔

ماحصل: پھول کھلیں، جب بلبل چہکے
دل بھی اچھلیں، رہ رہ کے

کاوش کا دل کرے ہے تقاضہ کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض، اس گرہِ نیم باز کا

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے دل کا سودا ہنوز کم نہیں ہوا اور غم کی خلش اب تک نہیں مٹی جیسے کہ ابتدائے عشق میں دل کو کاوشِ غم سے مزا آتا تھا اگرچہ اب ہاتھ اور ناخن کثرتِ استعمال سے بیکار ہو گئے، لیکن دل کی لذتِ شوق ابھی تک (ہنوز) کام میں ہے۔ اور ناخنِ جنون سے کہہ رہی ہے کہ اپنی کوشش میں کمی نہ کر اور میری کاوش کا قرض جلد ادا کر۔ مراد یہ ہے کہ جس طرح ادائے قرض انسان پر واجب ہوتا ہے اسی طرح تقاضائے جنونِ محبت نے کاوشِ دل کو ناخنِ گرہ کشا پر واجب سمجھ رکھا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا دیوانگی ہوگی!

ماحصل: پینے میں مزا ہے نہ تو کھانے میں مزا ہے
جو حضرتِ کھجلی کے کھجانے میں مزا ہے

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ!
سینہ کہ تھا دفینہ گہرہائے راز کا

(تاراج۔ لٹا ہوا۔ کاوش۔ کھودنا۔ دفینہ۔ گڑا ہوا خزانہ)

مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ میرے سینے میں کیسے کیسے قدسی خیالات اور علوم کے خزانے پوشیدہ تھے، لیکن افسوس ہے کہ غمِ ہجر نے سب محو کر دیے اور دل و جگر کو کھود کھود کر جو کچھ جہاں دفن تھے سب نکال لیے۔ یہ ایک سامنے کی بات ہے کہ کسی چیز کا مداحیٔ غم، کسی اور شے کو یاد نہیں رہنے دیتا۔ گویا عشق و عاشقی کے برے انجاموں کا ذکر ہے۔

ماحصل؛ اگر صد بابِ علم از بر بخوانی
چو آشفتی، الف با تا ے ندانی۔

احمد الشائب

تلخیص: غلام مرسلین

ادب کیا ہے

(۱)

ادب کے بارے میں جب کبھی غور کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ عربی زبان میں لفظ "ادب" کب وجود میں آیا، اور پھر مختلف ادوار میں یہ لفظ کن معانی میں مستعمل ہوتا رہا، تا آنکہ یہ موجودہ اصطلاحی معنی میں بولا جانے لگا۔

اس سوال کا جواب پانے کے لیے ہمارا ذہن جاہلی ادب کی طرف منتقل ہوتا ہے کیونکہ وہی عربی زبان کا قدیم ترین ادب ہے جو آج ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن اس میں ہمیں یہ لفظ نہیں ملتا۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید جاہلی عرب اس لفظ سے واقف نہیں تھے۔ مگر محض اس بنیاد پر ہم جاہلی زمانے میں اس لفظ کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے کیونکہ جاہلی ادب کا کثیر حصہ ضائع ہو گیا ہے، اور جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، اس کی صورت بھی یہ ہوئی کہ عرصہ دراز تک اس کی روایت محض زبانی ہوتی رہی۔ اور اس اثنا میں بہت سے دینی، سیاسی اور سماجی حوادث و انقلابات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے اس میں کئی نقائص پیدا ہو گئے۔ لہٰذا اس کی صحت پر پوری طرح یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مستشرقین موجودہ جاہلی ادب کے اکثر حصے کو "منحول" اور "جعلی" قرار دیتے ہیں؛ اور اس بارے میں بعض مشرقی علماء بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ جن کے سرخیل ڈاکٹر طٰہٰ حسین ہیں۔

یہی بات عربی لغت کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے کیونکہ عربی لغات کی تدوین کا کام بہت

بعد میں شروع ہوا۔ اس سے قبل ان کا استعمال زبانی ہوتا رہا۔ پس، یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ جاہلی زمانے میں جتنے الفاظ مستعمل تھے، وہ سب کے سب عربی لغت کی کتابوں میں محفوظ ہو گئے ہیں اس موقعے پر افسوس کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ آج تک عربی لغت کی کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں ہو سکی، جس میں تمام الفاظ کے بارے میں یہ بتایا جاتا کہ یہ کب وجود میں آئے اور تاریخ کے مختلف ادوار میں یہ کس کس معنی میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ اگر کوئی ایسی کتاب لکھی جاتی، تو لغت اور علم و ادب کے لیے وہ ان کتابوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ مفید ثابت ہوتی، جن میں الفاظ کو معمولی ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ بہر حال محض اس بنا پر کہ لفظ "ادب" ان کتبِ لغت و ادب میں موجود نہیں ہے، جو جاہلی عربوں کی طرف منسوب ہے، یہ فیصلہ قطعیت کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ لوگ لفظ "ادب" سے بالکل نا آشنا تھے۔

لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ لفظ قرآن کریم میں بھی موجود نہیں ہے، حالانکہ یہ بہت فصیح اور سبک لفظ ہے اور اس کا جو مفہوم ہے، اس کا ذکر قرآن کی متعدد آیتوں میں آیا ہے۔ مگر دوسرے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، اور "ادب" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ جاہلی ادب و لغت کے بارے میں تو شک کیا جاسکتا ہے، لیکن قرآن کریم کی صحت میں کسی قسم کوئی شک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ لفظ قریش کے علاوہ کسی اور قبیلے کی زبان کا ہو اور چونکہ قرآن کریم لغتِ قریش میں نازل ہوا ہے اس لیے اس میں یہ لفظ وارد نہیں ہوا۔ لیکن یہ بات بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی کیونکہ قرآن کریم لغتِ قریش کے تمام الفاظ پر بھی حاوی نہیں ہے۔ پس اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کریم میں تو لفظ "ادب" یقیناً موجود نہیں ہے، البتہ جاہلی ادب و لغت میں اس کا وجود مشکوک ہے، جس کی تشریح اوپر کی جاچکی ہے۔

اب اس کے بعد حدیث کو لیجیے، تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض اقوال جو رسول اللہ اور آپؐ کے صحابہ کی طرف منسوب ہیں، ان میں یہ لفظ موجود ہے۔ مثلاً ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:[1]
أَدَّبَنِي رَبِّي فَأَحْسَنَ تَأْدِيبِي (ترجمہ: میرے رب نے ادب سکھایا، بہت اچھا ادب سکھایا)۔ لیکن بعض علماء کو اس قسم کے اقوال کی صحت میں تردد ہے کیونکہ اس کی صحت کی تحقیق کا کوئی ذریعہ

[1] کنز العمال، الکتاب الفضائل ۱۷: ۲

انہیں ہے۔

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ لفظ "ادب" کی قدیم تاریخ علمی طور پر معلوم نہیں ہے۔ جب تک کوئی حتمی دلیل نہ ملے، ہم اس بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہی اصول علماء و مورخین کے درمیان مسلمہ ہے۔

پھر بھی اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اگر ہم اس مسئلے میں کچھ غور و فکر کریں۔ اولاً گمان غالب ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے۔ اس کی دو وجہیں بہت نمایاں ہیں:

(اولاً) ایسے دوسرے الفاظ موجود ہیں، جو مادّہ میں لفظ ادب کے ساتھ شریک اور معنی میں اس کے قریب ہیں مثلاً بدأ، أبد اور دأب۔ یہ تینوں لفظ اور لفظ "ادب" سب معنی میں مشترک ہیں کیونکہ ان سب کے معنی میں کسی چیز سے تعلق اور اتصال کا مفہوم داخل ہے۔ اس صورت میں یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ تینوں الفاظ تو موجود ہوں اور لفظ "ادب" موجود نہ ہو، حالانکہ اس لفظ میں کوئی ثقل بھی نہیں ہے اور اس کا جو مفہوم ہے وہ جاہلی عربوں کی زندگی میں پوری طرح رائج بھی تھا۔

(ثانیاً) یہ امر مسلّم ہے کہ سریانی اور عبرانی وغیرہ دوسری سامی زبانوں میں سے کسی میں بھی اس لفظ کا وجود نہیں، حالانکہ ان کو عربی زبان کی بہنیں، بلکہ اس کی اصل سمجھا جاتا ہے۔
پس راجح یہی ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے، دخیل نہیں ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ عربی اور دیگر سامی زبانوں میں سومری زبان سے آیا ہے، سومری لوگ قدیم ایام میں جنوبی عراق (یعنی بابل) میں آباد تھے۔ جب سامی قوموں کا وہاں تسلط ہوا تو انھوں نے سومری زبان سے یہ لفظ لے کر اپنی زبان میں شامل کر لیا۔ سومری میں اس لفظ کے معنی انسان کے تھے۔ دیگر سامی زبانوں میں آکر پہلے یہ لفظ آدبْ سے بدل کر ادم ہوا، پھر آدم ہوگیا۔ لیکن عربی میں یہ لفظ اپنی اصل سومری حیثیت میں برقرار رہا کیونکہ عرب صحرا میں سب دنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ بعد کو وہ اس لفظ کو ان شریفانہ اخلاق کے لیے استعمال کرنے لگے، جو انسانیت یا آدمیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ لیکن یہ محض ایک مفروضہ ہے جس کا ذکر ہم نے یہاں کر دیا ہے، یہ کوئی علمی تحقیق نہیں ہے۔

پھر اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھیے کہ رسول اللہؐ کی احادیث اور صحابہؓ کرام کے آثار میں ایسی مثالیں ہیں، جن میں یہ لفظ متعدد معانی میں اور مختلف نوعیت کے ساتھ وارد ہے۔ ان میں ایک تو وہی قول ہے، جو اوپر نقل ہوا یعنی "اَدَّبَنِی رَبِّی فَاَحْسَنَ تَاْدِیْبِی"[1] اس میں "تادیب" اور اس کا فعل "اَدَّبَ" آیا ہے، جو متعدی ہے اور جس کے معنی سکھانے کے ہیں۔ ایک دوسرا قول آنحضرتؐ سے اس طرح منقول ہے[1]: "اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ مَاْدُبَةُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ فَتَعَلَّمُوْا مِنْ مَاْدُبَتِهٖ" (یہ قرآن اس زمین میں اللہ کا دستر خوان ہے۔ پس، تم اس کے دستر خوان سے سیکھو) اس میں "مَاْدُبَۃ" کا لفظ آیا ہے، جو اسم ظرف ہے اور اس کا مادّہ بھی "ادب" ہی ہے۔ یہاں تشبیہ کے طور پر اس کا استعمال ہوا ہے کیونکہ قرآن کریم جس کی طرف اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دعوت دیتا ہے ایسے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت پر مشتمل ہے، جو تزکیۂ باطن سے متعلق ہیں۔ ایک اور قول حضرت علیؓ سے منسوب ہے[2]: "اَمَّا اِخْوَانُنَا بَنُوْ اُمَیَّةَ فَقَادَةٌ اَذَبَةٌ" (بہرحال ہمارے بھائی بنو امیہ تو ایسے قائد ہیں جو کھانے کی دعوت دینے والے ہیں) اس میں "اَدَبَة" کا لفظ آیا ہے جو آدِب کی جمع ہے اور اس کے معنی ہیں کھانے کی دعوت دینے والا۔ بعض علماء کے نزدیک یہی اس لفظ کے اصلی لغوی معنی ہیں۔

اس قسم کے اقوال اس کثرت سے ملتے ہیں کہ ان سے صرفِ نظر ممکن نہیں ہے اور ان کے اندر لفظ "اَدَب" جس طرح مختلف معانی میں مستعمل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ یکایک وجود میں نہیں آگیا، بلکہ عرصے سے موجود تھا پھر بعد میں تھوڑی سی وسعت کے ساتھ انھیں معانی میں بولا جانے لگا، جن میں ابتدائے اسلام میں مستعمل تھا۔ اس سے اس رائے کو ترجیح ملتی ہے کہ یہ لفظ رسول اللہؐ اور صحابۂ کرام کے عہد میں اور زمانۂ جاہلیت میں بھی معروف تھا اور اس سے عمدہ اخلاق اور وہ آثار مراد لیے جاتے تھے، جو عمدہ اخلاق کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

مزید برآں کچھ دوسرے اقوال اور بھی ہیں، جو زمانۂ جاہلیت سے متعلق ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ نعمان بن منذر نے ایک عرب وفد کے ساتھ جو خط کسریٰ کے پاس بھیجا تھا اس میں یہ الفاظ موجود ہیں: "لَھُمْ فَضْلٌ فِیْ اَحْسَابِھِمْ وَاَنْسَابِھِمْ وَعُقُوْلِھِمْ

۱- سنن دارمی، کتاب فضائل القرآن ۲- النہایہ فی غریب الحدیث والاثر لابن الاثیر

وانا بھم (یعنی ان میں فضیلت حاصل ہے، حسب و نسب میں اور عقل میں اور آداب میں)۔ اسی طرح علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے جو گفتگو کی تھی اس میں یہ الفاظ ملتے ہیں: ہم الی الفضل منسوب، وبالشرف والسودد موصوف، وبالرأی الفاضل والادب نافذ معروف (وہ سب فضل سے منسوب شرف اور سیادت سے متصف اور صائب رائے اور نافذ ادب کے حامل ہیں)

بہرحال ہم اس قسم کی روایتوں پر کوئی عمارت قائم کرنا نہیں چاہتے، نہ کوئی قطعی فیصلہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ یہ بہت قدیم روایتیں ہیں ان کے بارے میں جعل یا غلط انتساب کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ان سے کم از کم ایک بات تو پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں نے یہ روایتیں وضع کی ہونگی ان کی رائے جاہلی عربوں کے بارے میں کیا تھی، اور وہ ان کی اجتماعی، ادبی اور سیاسی زندگی کے متعلق کیا تصور رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "ادب" کے معنی میں جو تہذیبی پہلو ہے، وہ اسلام سے قبل معروف تھا۔ پھر جب اس لفظ کے معنی ایام جاہلیت میں معروف تھے، تو کیا ان معنی کے ادا کرنے کے لیے یہ لفظ معروف نہ رہا ہوگا؟ اس سوال کا جواب اثبات میں دینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

(۲)

اموی دور میں یہ لفظ صحیح اور معتبر تاریخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب اس کا استعمال عام ہو جاتا ہے: اس سے متعدد الفاظ مشتق ہوتے ہیں، اس کے معانی ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں، اور یہ تعلیم و تربیت کے ایک منفرد وسیلے کے لیے بطور اصطلاح استعمال ہونے لگتا ہے۔ اور اس سے ممتاز اساتذہ کے لیے ایک پیشہ وجود میں آجاتا ہے، جو اعلیٰ طبقے کے لوگوں اور خلفاء و امراء کی اولاد کی تعلیم و تربیت میں مشغول نظر آتے ہیں۔ یہ اساتذہ مؤدبین کہلاتے تھے۔ مثال کے طور پر ابو معبد الجہنی اور عامر الشعبی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی اولاد کو تعلیم دیتے تھے۔ صالح بن کیسان خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بیٹوں کے مؤدب تھے اور جعد بن درہم آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کے مؤدب تھے۔

یہ تمام باتیں اس زمانے کی تحریروں سے پوری طرح ثابت ہیں چنانچہ زیاد نے اپنے مشہور

۱۔ العقد الفرید ۲۔ ایضاً

خطبۂ بصرہ میں یہ الفاظ کہے تھے۔ فادعوا اللّٰہ بالصلاح لائمتکم فانہم ساستکم والمؤدبون لکم ...... [ما دام اللّٰہ لہ فانکم بخیر ھذا الادب او تستقیموا] (پس تم لوگ اپنے اماموں کی صلاح کے لیے دعا کرو کیونکہ وہی تمہارے سردار اور تمہارے لیے بہترین مؤدب ہیں...... خبردار میں تمہیں اس ادب کے علاوہ دوسرا ادب سکھاؤں گا تاکہ تم راہ راست پر رہ سکو)

ظاہر ہے کہ ان جملوں میں لفظ "ادب" اپنے تہذیبی و اصلاحی معنی میں مستعمل ہوا ہے جس کا تعلق عمدہ اخلاق اور نیک برتاؤ سے ہے۔ اسی طرح عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مؤدب سے کہا تھا[2]: علّمہم الشعر، یمجدوا وینجدوا۔ (تم ان کو شعر سکھاؤ کہ وہ بزرگ ہو جائیں، اور بہادر بن جائیں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عبدالملک کے نزدیک مزید تادیب سے تعلیم و تربیت اور تہذیب و اصلاح مراد تھی۔ اسی طرح اس زمانے کی اور بہت سی عبارتوں میں اور اشعار میں بھی یہ لفظ پایا جاتا ہے۔

یہ مؤدبین نوجوانوں کو شعر و علم الانساب، ایام و اخبار اور امثال کی تعلیم دیا کرتے تھے تاکہ ان کی معلومات میں اضافہ ہو۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کے وسط سے اس لفظ کے تہذیبی معنی محدود ہو گئے اور یہ دو الگ الگ معنوں میں بولا جانے لگا۔ ایک تو وہی اخلاقی و تہذیبی معنی جس کا مدعا تھا حلم و کرم اور صدق و شجاعت جیسے فضائل کے لیے نفس کی تربیت، تاکہ وہ اخلاقِ فاضلہ کا اکتساب کر سکے۔ چنانچہ عبداللہ بن المقفع نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغیر والادب الکبیر" اسی لیے رکھا تھا کہ اس میں اس نے ایسے اصول و قوانین بیان کیے تھے جن کے اختیار کرنے سے قاری ادیب یعنی مؤدب، خوش اخلاق اور نیک سیرت بن سکتا تھا۔

دوسرے، تعلیمی معنی جس سے مراد تھا، شعر و نثر کی تعلیم دینا، انساب و اخبار اور امثال وغیرہ سے متعلق روایتیں بیان کرنا، تاکہ عقل کے نور، ذوق کی صفائی اور نفس کی ثقافت و عرفان میں اضافہ ہو۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ علوم و معارف جن سے ادبی ثقافت رونما ہوتی ہے، ان دیگر علوم سے جدا تھے، جن پر اس وقت مسلمانوں کی دینی ثقافت قائم تھی، یعنی قرآن کریم، حدیثِ نبوی، تفسیر و فقہ اور فتاویٰ وغیرہ جن کی طرف صحابہ اور تابعین نے خاص طور پر توجہ مبذول کر رکھی تھی۔

۱- البیان والتبیین، للجاحظ ۲/۱۰۱

۲- العقد الفرید لابن عبد ربہ

اس زمانے سے ادیب یا مؤدب اور شاعر و کاتب میں امتیاز کیا جانے لگا۔ جو شخص ادب کے مطالعہ اور اس کی تعلیم میں زیادہ مشغول رہتا، اسے ادیب کہا جاتا۔ اور جو شعر گوئی میں زیادہ منہمک ہوتا، اسے شاعر کا لقب ملتا۔ اور جو نثر زیادہ لکھتا وہ کاتب کے نام سے پکارا جاتا۔ اور اکثر ایک ہی شخص ان تینوں القاب یا ان میں سے دو کا حامل ہوتا تھا۔

پھر اس وقت سے یعنی پہلی صدی ہجری سے لے کر آج تک لفظ "ادب" انھیں دونوں مذکورہ معانی میں استعمال ہوتا رہا ہے، کبھی ان میں تھوڑی سی وسعت پیدا ہو جاتی اور کبھی تنگی، لیکن زیادہ اہم اور معروف یہی دونوں معانی رہے ہیں۔ چنانچہ یہ قول عام طور پر مشہور رہا ہے کہ ادب دو ہوتے ہیں: ایک، ادب النفس اور دوسرے ادب الدرس۔

اس کے بعد دوسری صدی ہجری کے وسط میں نحو و صرف اور لغت جیسے علوم وجود میں آئے، تو وہ سب بھی ادب کے تعلیمی معنی میں داخل ہو گئے۔ اس طرح اس میں وسعت پیدا ہو گئی اب اس لفظ سے انساب و اخبار کے ساتھ ساتھ نحو و صرف اور نقد و بیان وغیرہ بھی مراد لیا جانے لگا۔ لیکن یہ صورت حال زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہی کیونکہ عباسی تمدن میں علوم میں ایسا استحکام اور اجتماعی ہیئت و ثقافت میں اتنا تغیر و تنوع رونما ہوا کہ تیسری صدی کے آخر تک لفظ ادب مندرجۂ ذیل چار معانی میں استعمال ہونے لگا:

(۱) پہلے تو وہی خاص معنی رہے، جس میں شعر و نثر کے ساتھ اخبار و انساب بھی شامل تھے اور یہ تقریباً وہی معنی ہیں، جو پہلی صدی میں اس لفظ سے مراد تھے۔ اب صرف فنی نقد اور ادبی نقد کا اس میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ تیسری صدی میں ایسی متعدد ادبی کتابیں لکھی گئیں، جن پر یہی خاص معنی صادق آتے ہیں۔ جیسے جاحظ کی "البیان والتبیین"، ابن قتیبہ کی "الشعر والشعراء"، مبرد کی "الکامل" اور الجمحی کی "طبقات الشعراء" وغیرہ۔

(۲) دوسرے عام معنی، جس میں تمام انسانی علوم، علمی آثار اور مختلف قسم کے فنون لطیفہ اور فنون ریاضیہ وغیرہ سب آجاتے تھے۔ چنانچہ عباسی وزیر حسن بن سہل سے ایک روایت منقول ہے، جس میں اس نے ادب کی دس قسمیں بیان کی ہیں اور ان کے اندر شعر و نسب اور ایام و اخبار کے ساتھ ساتھ عود، شطرنج، طب، ہندسہ، شہسواری، اور قصہ گوئی سب کو

شامل کر لیا ہے۔ اسی طرح جاحظ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ متقدمین کے نزدیک نجوم، ہندسہ، مساحت، طب، کیمیا اور موسیقی وغیرہ بھی سب اصول آداب میں شامل تھے۔

(۳) تیسرے وہ ادبی علوم جنھوں نے مستقل حیثیت حاصل کر لی تھی اور ان کا شمار خالص فنی ادب میں نہیں ہوتا تھا اگرچہ ادبی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اور ادب کی تخلیق و تنقید کے لیے وہ ضروری اور لازمی تھے مثلاً لغت، نحو، نسب اور نقد و اخبار وغیرہ۔ یہی علوم عربی ثقافت کے مظہر تھے۔ اسی کے ساتھ دینی ثقافت بھی تھی، جس میں مختلف قسم کے علوم اور عمیق بحثیں شامل تھیں جیسے تفسیر قرآن، علوم حدیث، فقہ و اصول فقہ اور علم کلام وغیرہ۔ نیز ایک فلسفیانہ ثقافت بھی تھی، جو اصلاً یونانی، ایرانی اور ہندی وغیرہ دوسری قوموں سے حاصل کی گئی تھی۔

(۴) چوتھے ادب النفس اور اس معنی میں بھی وسعت آگئی تھی۔ چنانچہ اخلاق فاضلہ کے ساتھ اس میں ایسے قوانین بھی شامل ہو گئے تھے، جو کسی صنعت و حرفت میں مہارت پیدا کرنے اور کسی منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں عصری ضرورت کے لحاظ سے کچھ کتابیں بھی تالیف کی گئیں۔ مثلاً امام ابو یوسف کی "ادب القاضی"، ابن قتیبہ کی "ادب القراۃ"، سرخسی کی "ادب النفس"، ماوردی کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری کی "آداب البحث والمناظرہ" وغیرہ۔

چوتھی صدی آئی تو علوم لغویہ بالکل مستقل ہو کر ادب کے خاص معنی سے خارج ہو گئے اور اس میں فنی نثر و شعر کے ساتھ صرف نقد باقی رہ گیا۔ مگر نقد میں بھی ایسی سرگرمی پیدا ہو گئی کہ صاف نظر آتا تھا کہ کوئی دن جاتا ہے کہ یہ فن بھی مستقل حیثیت حاصل کر لیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جلد ہی نقد بھی ایک دوسرا ادبی فن یا علم تسلیم کر لیا گیا۔ پھر اس کے نتیجے میں بلاغت کا ظہور ہوا، جو بعد میں معانی، بیان اور بدیع تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

نقد کی اہم کتابیں چوتھی صدی میں لکھی گئیں۔ ان میں ابو ہلال عسکری کی "کتاب الصناعتین" بہت مشہور ہے جس میں مؤلف نے نثر اور شعر دونوں کے فنی محاسن اور ادبی تنقید و بلاغت کے مسائل بیان کیے ہیں۔ اسی کے قریب اس کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی ہے،

اسی ضمن میں ابن عبد ربہ کی "العقد الفرید" بھی آتی ہے۔ اس چوتھی صدی میں بحتری اور ابو تمام کے حامیوں کے درمیان سخت اختلافات رونما ہوئے۔ اور اس کے بعد متنبی اور اس کے حریفوں کے درمیان بھی شدید نزاع پیدا ہوا جس سے نقد کو بڑی ترقی حاصل ہوئی چنانچہ آمدی نے "الموازنۃ بین الطائیین" اور جرجانی نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" تصنیف کی۔ ان دونوں کتابوں کے ساتھ ساتھ اصفہانی کی "الاغانی" کا ظہور ہوا اور بعض دوسرے رسائل بھی لکھے گئے، جن کی وجہ سے ایک طرف تو نقد کے مستقل فن ہونے کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف بلاغت کے لیے رستہ ہموار ہوا۔ چنانچہ پانچویں صدی کے آتے آتے بلاغت کے زبردست عالم عبد القاہر جرجانی کی دو کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغۃ" وجود میں آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کے خاص معنی سے نقد و بلاغت نکل گئے اور صرف اعلیٰ درجے کی نثر اور شعر باقی رہ گیا۔ بعد کو بھی جب کوئی علم پختہ ہوگیا، تو اس نے فنی ادب سے الگ مستقل علم کی حیثیت اختیار کر لی۔

جہاں تک ادب کے عام معنی کا تعلق ہے، اس کی وسعت اس دور میں بھی باقی رہی اور بجز عقلی علوم اور بنیادی فلسفہ کے علاوہ تمام علمی اور عقلی آثار بھی اس میں شامل ہے۔ چنانچہ "رسائل اخوان الصفا" جو چوتھی صدی کی تصنیف ہے، اس کے ساتویں رسالے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الآداب کے اقسام میں کتابت، قرأت، لغت، نحو، حساب، شعر، کیمیا، صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، سیرت و اخبار وغیرہ سے متعلق سارے علوم شامل تھے۔

پانچویں صدی کے اختتام تک تمام اہم ادبی علوم مستقل حیثیت اختیار کر چکے تھے اور ادب صرف اعلیٰ نثر اور شعر کے اندر محصور ہو کے رہ گیا تھا۔ اب اس لفظ کے معنی میں ایک دوسری قسم کی تجدید شروع ہوئی:

اوّل یہ کہ اس لفظ کے عام معنی کا دائرہ تنگ ہونے لگا، یہاں تک کہ اس میں صرف لغوی علوم باقی رہ گئے، اور تمام دوسرے علوم و فنون اور صنعت و حرفت اس سے خارج ہو گئے۔

دوسرے، اس کے خاص معنی سے ادبی علوم بھی نکل گئے جو دوسری صدی میں پیدا ہو کر اس میں

داخل ہو گئے تھے۔ اب اس کے وہی معنی رہ گئے جس میں آج اس کا استعمال ہو رہا ہے یعنی صرف فنی نثر اور شعر۔ تیسرے یہ کہ اب بہت سے علماء نے ان ادبی علوم کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول کی، جن کے لیے وہ کبھی کبھی ادب کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ ان ادبی علوم کی تعداد کے بارے میں ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور یہ آج تک موجود ہے۔ مثال کے طور پر زمخشری نے ان کی تعداد بارہ بتائی ہے۔ اس کے بعد سکاکی اور یاقوت، پھر شریف جرجانی وغیرہ نے اپنی تصنیفات میں ان کا ذکر کیا۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ ابن خلدون تک پہنچا، تو اس نے بھی ادب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں "علوم اللسان العربی" کے عنوان سے ایک فصل قائم کی ہے اور اس میں نحو، لغت اور بیان کے ساتھ ادب کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اگر وہ اس میں تمام لسانی علوم کو شامل کر لیتا، یا "ادب" کا عنوان قائم کر کے اس کے تحت ان علوم کو بیان کرتا، جیسا کہ متقدمین نے کیا ہے تو معاملہ آسان ہوتا اور وہ اس مشکل میں نہ پڑتا جس کا ادراک علم الادب کے بیان کے وقت، خود اس کو بھی ہوا۔ چنانچہ علم الادب کے بیان میں وہ کہتا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے مثلاً علم طب کا موضوع جسم انسانی اور اس کے عوارض وغیرہ ہیں۔ اسی طرح علم نحو کا موضوع الفاظ اور ان کے لوازم ہیں، لیکن علم الادب کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس کا کوئی موضوع نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف عرب کے اسلوب میں شعر گوئی اور نثر نویسی میں مہارت حاصل کرنا ہے۔ یہ عجیب بات ابن خلدون کو اس لیے لکھنا پڑی اور اس مشکل میں وہ اس وجہ سے پڑا کہ اس نے ادب کو بھی ان علوم لسانیہ میں ایک علم سمجھ لیا، حالانکہ یہ ایک کلامی فن ہے، جس کی تحصیل و تکمیل میں یہ علوم معاون اور مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ پس ادب کو بھی اُن نظری علوم پر جن کے کچھ اصول و قوانین ہوتے ہیں، قیاس کرنا اس کو اس کی فطرت سے الگ کر دینے کے مترادف ہے۔ اس کے علاوہ حقیقت یہ ہے کہ اس کلامی اور ادبی فن کا بھی ایک خاص موضوع ہے، اور وہ ہے، فطرت اور انسان۔ یعنی فطرت اس طرح سے جیسا کہ انسان اپنے نفس میں اس کا داخلی ادراک کرتا ہے پھر اس کے متعلق اپنے خیالات و جذبات کی عکاسی کرتا ہے، یا خارجی

مشاہدات و حوادث کو دیکھ کر ان کی تشریح کرتا ہے۔
اس کے بعد ابن خلدون ادب کی تعریف اس طرح کرتا ہے "الادب ھو حفظ اشعار العرب واخبارھا، والاخذ من کل فن بطرف" (عربوں کے اشعار و اخبار کو حفظ کرنا اور ہر فن کے متعلق تھوڑی تھوڑی واقفیت حاصل کرنا ادب ہے) سوال یہ ہے کہ یہ تعریف جو ابن خلدون نے کی ہے، کیا واقعی یہ ادب کی تعریف ہو سکتی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس تعریف کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ محض ادبی صلاحیت پیدا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔

(۳)

تو پھر ادب کیا ہے؟
لسان العرب اور لغت کی دوسری کتابوں میں اس لفظ کے جو معنی درج ہیں اور جو حدیث اس سے قبل گزر چکی ہے یعنی "إن ھذا القرآن مأدبۃ اللّٰہ فی الارض الخ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدما اس لفظ کا مادہ "الأدب" سمجھتے تھے جس کے معنی کھانے کی دعوت دینے کے ہیں پھر چونکہ ادب بھی فضائل و محاسن کی دعوت دیتا ہے، اس مناسبت سے اس کے لیے یہی لفظ اختیار کر لیا گیا ہے۔ لیکن پروفیسر نلینو اس کو "الدأب" بمعنی عادت سے مشتق مانتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پہلے دأب کی جمع آدآب بنی پھر تعلیل و تبدیل کے بعد آداب ہو گئی، جیسے بئر کی جمع آبار اور رئم کی جمع آرام۔ پھر اس کے بعد آداب کا استعمال ایک زمانے تک اس کثرت سے ہوا کہ اہل عرب اس کا اصل (واحد) بھول گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا واحد أدب ہے، جس طرح آثار کا واحد "اثر" اور آلام کا واحد "الم" ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ لفظ اپنے اصلی معنی یعنی عادت سے منتقل ہو کر دوسرے مختلف معانی میں استعمال ہونے لگا
اسی طرح بعض علما کا خیال ہے کہ یہ اصلاً سومری زبان کا ہے، جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے
بہرحال یہ سب خیالات محض مفروضے ہیں، اور میرے نزدیک قول راجح یہ ہے کہ یہ لفظ عربی الاصل ہے اور ایام جاہلیت میں بھی یہ موجود تھا۔
بہرحال جہاں تک اس لفظ کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے تو سب سے پہلے تو یہ بات

ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس لفظ کے جو اخلاقی و تہذیبی معنی ہیں، وہ یہاں مراد نہیں۔ بلکہ وہ تو کبھی کبھی اس کے اصلی فنی معنی سے متعارض تک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ فنی معنی میں تو ہجویات و خمریات وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں، جو تہذیب و اخلاق کے منافی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ادب کی ایسی تعریف جو منطقی معیار سے بالکل صحیح اور پوری طرح جامع و مانع ہو، بہت مشکل ہے۔ یہی حال اس قسم کی اور بہت سی اصطلاحات کا ہے، جن کے معانی بعض لوگوں کے ذہن میں واضح نہیں ہوتے مثلاً جمال، خیال، شعر وغیرہ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حسی اور معنوی اشیاء میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ حسی اشیاء کو انسان اپنے حواسِ ظاہری سے محسوس کرتا ہے اس لیے ان کی تعریف آسان ہوتی ہے۔ لیکن معنوی اشیاء کا تعلق اس کی طبیعت اور مزاج سے ہوتا ہے، اس لیے اس کے معنی مبہم ہوتے ہیں۔ اس ابہام سے بچنے کے لیے بعض لوگ ان کی عام تعریف کر دیتے ہیں، تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ جزوی معنی آجائیں۔ مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ابہام اور زیادہ ہو جاتا ہے، اور قاری کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا معنی مراد لیا جائے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی اصطلاح جب کوئی مؤلف استعمال کرے، تو جو معنی اس نے خود اس سے مراد لیا ہو، اس کو بیان کر دے اور اسی کے ساتھ یہ بھی جتلا دے کہ اس کے دوسرے معانی بھی ہوتے ہیں۔

لفظ ادب کے جو مختلف معانی مختلف زمانوں میں علماء نے کیے ہیں، اور ابن خلدون نے بھی اس کی جو تعریف کی ہے، ان کا ذکر ہوا۔ دیکھا ہوگا کہ عام طور پر اس لفظ کے متعلق جو اقوال ملتے ہیں، وہ محض اس کے اوصاف ہوتے ہیں۔ دیکھیں کہ اس سلسلے میں یورپین مصنفین کی کیا رائے ہے:

ایمرسن کہتا ہے کہ ادب بہترین افکار کا دفتر ہے۔ یہ تعریف ادب کے عام معنی پر صادق آتی ہے اور اس میں تمام علمی و عقلی آثار شامل ہو جاتے ہیں کیونکہ ہندسہ، طبیعیات وغیرہ علوم کے اندر بھی بہترین افکار ہوتے ہیں، لیکن ان کو بحتری وغیرہ کی شاعری، اور جاحظ وغیرہ کی نثر کے مثل کوئی نہیں قرار دیتا۔

[illegible] ... انغمہ ور ... کہ افکار کو کہتے ہیں، جو عمدہ اور دلچسپ

اسلوب میں پیش کیے جائیں۔ ادب کی یہ تعریف بھی اسی طرح کی ہے جیسی کہ ایمرسن نے بیان کی ہے۔ البتہ اس میں جمالیاتی پہلو کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اگرچہ وہ بھی بہت واضح نہیں ہے۔

پروفیسر سانت بیو نے ادیب کے جو اوصاف بیان کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ادب وہ حسین اور دقیق کلام ہے جس میں ادبی حقائق اور انسانی جذبات کا اظہار کیا گیا ہو۔ لیکن اس تعریف سے ادب کا دائرہ بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے تحت صرف اعلیٰ ادب آتا ہے اور اوسط درجے کا ادب اس سے خارج ہو جاتا ہے۔

ادب کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے علمی طریقہ یہ ہے کہ ہم ادبی اور غیر ادبی دونوں قسم کی تحریروں کا موازنہ کر کے یہ پتا لگائیں کہ ادبی تحریریں کونسی امتیازی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور پھر انھیں خصوصیات سے اپنے مقصد تک پہنچیں۔

سوال یہ ہے کہ ہم کس تحریر کو ادب کہتے ہیں؛ ظاہر ہے کہ ہر مطبوعہ تحریر ادب نہیں مثلاً روزمرہ کا عام اخبار ادب نہیں کہلاتا۔ کیونکہ ہم ایک مرتبہ اخبار کو پڑھ کر اسے ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں، لیکن اس کے برخلاف کسی ادبی تحریر کو ہم بار بار پڑھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ادب کی پہلی خصوصیت خلود اور دوام ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ کسی ادبی تحریر میں خلود کی صفت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کیا اس وجہ سے کہ اس میں جو مواد ہوتا ہے، وہ ہمیشہ نفع بخش ہوتا ہے؛ اگر ایسا ہے تو طبیعیات اور کیمیا وغیرہ علوم کی کتابوں میں بھی تو مفید مواد ہوتا ہے، لیکن ہم ان کو ادب میں نہیں گنتے۔ حقیقت یہ ہے کہ علمی کتابیں ایک دوسرے کا بدل ہو سکتی ہیں، لیکن ادبی تحریریں ایک دوسرے کی قائم مقام نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً کسی علمی کتاب میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان کو کسی دوسری کتاب میں بہتر طریقے سے بیان کر دیا جائے تو لوگ پہلی کتاب کو چھوڑ کر دوسری کو اختیار کریں گے۔ لیکن کوئی عمدہ قصیدہ یا قصہ خواہ وہ کتنا ہی قدیم ہو، اور اس کے بعد کتنے ہی بہتر قصیدے اور قصے لکھے گئے ہوں، وہ کبھی متروک نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی دوسرا قصیدہ یا قصہ اس کا بدل ہو سکتا ہے۔ علمی اور ادبی تحریروں میں

یہی فرق ہے کہ علمی کتاب میں جو حقائق بیان ہوتے ہیں، وہ دائمی ہو سکتے ہیں، لیکن وہ کتاب بذاتِ خود دائمی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بالعکس ادبی کتاب بذاتِ خود دائمی ہوتی ہے۔

اس توضیح کے بعد بھی یہ سوال ہنوز جواب طلب ہے کہ کسی ادبی تحریر کو بذاتِ خود دوام و خلود کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اعلیٰ ادب میں مصنف کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ علمی کتابوں سے بھی مصنف کی عقل و فہم کا کچھ اندازہ ہو جاتا ہے، لیکن ادبی تصنیف میں مصنف کی شخصیت بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ سمجھنے کے لیے مثلاً ہم ایک علمی مقالہ لیں، جس میں دائمی حقائق کا بیان ہے اور ایک اعلیٰ درجہ کا قصیدہ لیں، جو دائمی حقائق سے خالی ہے، پھر دونوں کا موازنہ کر کے پتا لگائیں کہ وہ کونسی خصوصیت ہے، جو قصیدے میں تو پائی جاتی ہے لیکن مقالے میں موجود نہیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ قصیدے میں جذبہ پایا جاتا ہے، اور مقالہ جذبے سے عاری ہے، اور اس کی بنیاد عقل پر ہے۔ درحقیقت یہی جذبہ ہے جو کسی تحریر یا کلام کو دوام عطا کر کے اسے ادبی صفت سے متصف کر دیتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ جذبہ کسی کلام کو دوام کیسے عطا کرتا ہے؟ اس کا جواب عجیب ہے، وہ یہ کہ جذبہ جلد زائل ہو جاتا ہے اور اس کی یہی زوال پذیری ادب کو دوام و خلود بخشتی ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ کسی علمی کتاب کے پڑھنے سے ہمیں جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ زائل نہیں ہوتا، بلکہ باقی رہتا ہے۔ لہٰذا ہم کو اسے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن مثال کے طور پر اگر میں معرّی کا مرثیہ پڑھتا ہوں، تو میرے دل میں غم کا ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر میں وہ زائل ہو جاتا ہے۔ اب وہی جذبہ پیدا کرنے کے لیے مجھے پھر اسے پڑھنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کسی دوسرے شاعر کا کوئی دوسرا مرثیہ وہ جذبہ نہیں پیدا کر سکتا کیونکہ ہر شاعر کے کلام کا ایک خاص رنگ و آہنگ ہوتا ہے، جو دوسرے کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ اس بات کو ایک حسی مثال سے یوں سمجھنا چاہیے کہ سنگترہ کا شربت پینے سے ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے، پھر کچھ دیر میں وہ لذت

زائل ہو جاتی ہے۔ اب پھر وہی لذت حاصل کرنے کے لیے سنگترہ ہی کا شربت ہونا چاہیے لیمو وغیرہ کسی دوسرے پھل کے شربت سے وہ لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔ غرض اس طرح جذبہ ادبی کلام کو خلود اور دوام عطا کرتا ہے۔ وہ کلام کتنا ہی قدیم ہو جائے اس کو بار بار پڑھنے کی ضرورت باقی رہیگی۔ اور جو ادب جتنا زیادہ اعلیٰ ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ پڑھا جائیگا۔ یہی حال قرآن کریم کا ہے۔

پس جذبہ ایک طرف تو ادب کو خلود بخشتا ہے، دوسری طرف ادیب کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ لیکن عقل کسی تحریر کو اس قسم کا دوام عطا نہیں کر سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ انسانی جذبات مثلاً نفرت، محبت اور شجاعت وغیرہ جس طرح ابتدا میں نمایاں تھے اسی طرح آج بھی ہیں اگرچہ ان کے محرکات و مظاہر وغیرہ بدل گئے ہیں اور بدلتے رہینگے، لیکن نفسی جذبات باقی ہیں اور ہمیشہ باقی رہینگے۔ اسی وجہ سے ہم آج بھی جاہلی شاعری کو پڑھتے ہیں کیونکہ اس میں ہم اپنے بنیادی جذبات موجود پاتے ہیں۔ لیکن ایام جاہلیت میں عقل نے ہیئت یا طبیعیات کے متعلق جو معلومات ہم پہنچائی تھیں، آج ہم ان کا انکار کرتے ہیں، بلکہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں کیونکہ اب عقل بہت آگے بڑھ گئی ہے اور اس نے قدیم افکار و نظریات کو باطل قرار دے دیا ہے۔ لیکن کوئی جذبہ خواہ کتنا ہی قدیم ہو جائے، وہ بدستور باقی رہیگا۔

رہا جذبے کا ادیب کی شخصیت سے تعلق، تو یہ حقیقت ہے کہ علمی تحریر کی بہ نسبت ادبی تحریر سے ادیب کی شخصیت بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علمی حقائق کا جذبہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ہر انسان انھیں یکساں طور پر سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ مسئلہ کہ "خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان سب سے چھوٹا فاصلہ ہوتا ہے"، ایک علمی حقیقت ہے، اس کو ہر انسان ایک ہی طرح سمجھتا ہے اور اس میں اس کے مزاج اور طبیعت کا کوئی اثر شامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح اگر کسی شہر کا جغرافیہ بیان کیا جائے، تو اس بیان سے شہر کا تعارف تو ہو جائیگا، لیکن بیان کرنے والے کی شخصیت نمایاں نہیں ہوگی۔ علمی مسائل کو سمجھنے میں انسانوں کے درمیان جو فرق ہوتا ہے، وہ درحقیقت کمیت میں ہوتا ہے، کیفیت

میں نہیں ہوتا۔ بعض اشخاص کی معلومات دوسروں کی بہ نسبت زیادہ عمیق اور زیادہ وسیع ہوتی ہیں۔ لیکن اگر دو شخص قوتِ فہم میں برابر ہوں، تو ان کے علم کی کیفیت میں بھی زیادہ فرق نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ علمی مسائل کی زبان بھی عموماً دقیق ہوتی ہے، اس لیے اس میں مصنّف کی شخصیت اور جذبہ کی جھلک نہیں آتی۔

اس کے برعکس تجربات و مشاہدات کے اثر سے جو جذبات پیدا ہوتے ہیں، وہ ہر انسان میں یکساں نہیں ہوتے۔ یہاں تک کہ دو انسان بھی ایسے نہیں ملینگے، جو کسی ایک چیز سے بالکل ایک ہی طرح متاثر ہوں۔ یا تو دونوں کا تاثر مختلف قسم کا ہوگا، یا تاثر کی شدت میں کمی بیشی ہوگی۔ مثلاً ایک شخص اہرام کو دیکھتا ہے، تو اس کے دل میں ان کے بنانے والوں کی عظمت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا شخص دیکھتا ہے، تو اس کے دل میں ناراضی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ ان فرعونوں نے ملک کی ساری دولت اس طرح برباد کی، اور اہلِ ملک کو مشقت میں ڈالا۔ اسی طرح بڑھاپا آنے پر جو بال سفید ہونے لگتے ہیں، ان کو دیکھ کر فرزدق ایک شعر میں کہتا ہے کہ سیاہ بالوں کے درمیان سفید بال ایسے حسین معلوم ہوتے ہیں، جیسے سیاہ رات میں ستارے چمک رہے ہوں۔ لیکن اسی کے متعلق شریف رضی ایک شعر میں کہتا ہے کہ یہ زمانے کی تلوار ہے، جو سر پر لٹک رہی ہے۔

پس ادب میں صرف حقائق ہی نہیں ہوتے، بلکہ ان کے ساتھ ادیب کے جذبات و تاثرات بھی اس میں شامل ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کے مطالعے سے ہمیں ادیب کے مزاج اور طبیعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے اور جب یہ بات واضح ہوگئی کہ ادبی آثار میں ادیب کی شخصیت منعکس ہوتی ہے، تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ادب درحقیقت ادیب کی شخصیت سے عبارت ہے۔

اسی بنا پر پروفیسر میتھیو آرنلڈ نے شعر کے بارے میں کہا ہے کہ وہ زندگی کی تنقید ہے۔ شعر کی یہ تعریف اگرچہ دقیق ہے، لیکن ہے بالکل صحیح کیونکہ شاعر اپنی زندگی کے ذاتی تجربات اور مشاہدات کو اپنے جذبات و تاثرات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اسی لیے جو شخص اس کے کلام کو پڑھتا ہے اس کے دل میں بھی اسی قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ غور کیا جائے

تو یہ تعریف صرف شعر ہی کی نہیں ہے، بلکہ تمام ادب کی یہی تعریف ہے کیونکہ ہر ادیب پہلے زندگی کو سمجھتا ہے، پھر اس کی تفسیر اس طرح کرتا ہے کہ اس کے جذبات اس میں جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ادب لازمی طور پر انسانی زندگی کا سب سے زیادہ سچا اور صحیح بیان ہوتا ہے

(۴)

ممکن ہے، کوئی شخص کہے کہ ادب کی یہ تعریف تو بہت محدود ہے کیونکہ اس میں تمام ادبی آثار شامل نہیں ہو سکتے۔ اس میں صرف اعلیٰ درجے کا منظوم کلام اور افسانہ وغیرہ ہی شامل ہو سکتے ہیں، جنھیں اہل مغرب BELLES LETTRES کہتے ہیں۔ اور جو تحریریں جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتیں، وہ سب ادب کے دائرے سے خارج ہو جائینگی، مثلاً اس تعریف کے لحاظ سے تاریخ کو ادب نہیں کہا جائیگا، حالانکہ بعض علماء کے نزدیک تاریخ بھی ادب میں شامل ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو خصوصیت کسی تحریر کو ادبی صفت سے متصف کرتی ہے وہ اس تحریر کی بنیادی غرض بھی ہو۔ اگر کسی کلام کا بنیادی مقصد کچھ اور ہو۔ لیکن ثانوی اور ضمنی حیثیت سے وہ جذبات کو بھی برانگیختہ کرے، تو اسے بھی ادب ہی کہا جائیگا چنانچہ تاریخ کی جو کتاب محض خشک واقعات کا مجموعہ ہوگی، اسے یقیناً ادب کے دائرے سے خارج سمجھا جائیگا لیکن جس کتاب میں تاریخی واقعات کے ساتھ فہم و استدلال، واقعات کے باہمی ارتباط و تسلسل اور ان کے محرکات کو پیش کیا گیا ہو اسے ادب میں شامل کر لیا جائیگا اور اس کو تاریخی ادب کہا جائیگا کیونکہ وہ علم اور فن دونوں کی جامع اور واقعات و جذبات دونوں کی حامل ہے۔

اسی معیار پر دوسری تخلیقات کو بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی تخلیق منطق و فلسفہ کی طرح خالص علمی اور عقلی ہے، تو وہ ادب کے دائرے سے خارج ہے۔ اور اگر اس میں حقائق کے اظہار کے لیے جذبے سے بھی کام لیا گیا ہے، جیسے نقد اور قانون، تو وہ ادب کے میدان میں داخل سمجھی جائیگی۔ اس طرح تمام تخلیقات اور تحریریں تین قسموں میں منقسم ہو جاتی

ہیں: (۱) اگر کسی تحریر کا اولیں مقصد جذبات کو ابھارنا ہے، تو وہ اعلیٰ درجہ کا ادب ہے جیسے Belles Lettres کہا جاتا ہے؛ (۲) اور اگر اس کا بنیادی مقصد علمی حقائق کو پیش کر کے محض عقل کو فائدہ پہنچانا ہے، تو اسے علم اور سائنس کہا جائیگا؛ (۳) لیکن اگر اس کا بنیادی مقصد تو کچھ اور ہو مگر اس سے جذبات میں بھی تحریک پیدا ہوتی ہو، تو ایسی تحریروں کو بھی ادبی تخلیقات ہی میں شامل کر لیا جائیگا، لیکن فنی اعتبار سے ان کے درجات مختلف ہونگے۔ جس تحریر میں شعور و وجدان اور جذبہ و تاثر کا جتنا زیادہ دخل ہوگا، اتنا ہی وہ اعلیٰ ادب سے قریب ہوگی اور ان چیزوں کی جس قدر اس میں کمی ہوگی اسی قدر وہ اعلیٰ ادب سے دور ہوگی۔

مذکورہ بالا تشریح سے وہ جوہری فرق بھی واضح ہو جاتا ہے، جو علم اور ادب کے درمیان ہے اور جس کی بنیاد پر تمام تخلیقات و آثار کی دو قسمیں قرار پائی ہیں۔ ایک علمی، دوسری ادبی۔ یہ صحیح ہے کہ بعض تحریریں علم اور ادب دونوں کی جامع ہوتی ہیں، مثلاً تاریخ و تنقید وغیرہ۔ لیکن یہاں ہماری غرض خالص علم اور خالص ادب سے ہے۔ اور یہ فرق دونوں کے درمیان اس بنا پر ہے کہ دونوں کی فطرت اور حقیقت کے درمیان تضاد پایا جاتا ہے۔ علمی تخلیق میں حقائق کے جزئیات کا احاطہ اور ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے، جیسا کہ نباتیات کا عالم پودوں اور پھولوں کی تشریح کرتا ہے۔ لیکن ادبی تخلیق میں اشیا کا مشاہدہ اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ ان کا جذبات سے کیا تعلق ہے۔

صرف علما ہی نے فطرت کی تشریح نہیں کی ہے، بلکہ شعرا و ادبا نے بھی اس کے اسرار و رموز بیان کیے ہیں، مثلاً ایک شاعر کہتا ہے: "گلاب کے شگفتہ پھول شاخوں کی مسندوں پر آمنے سامنے بیٹھے اپنے خالق کی حمد و ستائش میں مشغول ہیں، وہ باغ کے اندر دیگر پھولوں سے ممتاز ہو کر ایک جلوس میں کانٹوں کے ہتھیار سے مسلح ہیں۔ باد نسیم ان کے رخساروں کو بوسہ دیتی ہے، جس طرح لب حسیناؤں کے رخساروں سے ہمکنار ہوتے ہیں۔" اس سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ عالم اور ادیب دونوں کس طرح الگ الگ انداز سے اشیا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ عالم تو ان کا موازنہ کر کے حقائق و نظریات پیش کرتا ہے، اور

ادب وہ معانی و مطالب بیان کرتا ہے جن کا تعلق شعور اور وجدان اور جذبہ و احساس سے ہے۔ پہلی تعبیر کو علم اور دوسری کو ادب کہا جاتا ہے۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ علم و ادب کے درمیان قطعی غیریت اور منافات ہے، دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ بیشک کچھ ایسی علمی کتابیں ہیں جن کے اندر ادبیت بھی ہے، اس لیے کہ ان میں شعور و وجدان کو وسیلے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح کچھ ایسی ادبی تحریریں بھی ہیں، جن کی بنیاد عقلی اور علمی حقائق پر قائم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ عقل اور شعور دونوں کے تعاون سے ادبی آثار ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ادب کے لیے ضروری ہے کہ عقل و فکر اور شعور و وجدان، دونوں کے درمیان توازن برقرار رکھے اور ان میں سے ہر ایک کو مناسب مقدار میں فراہم کرے۔ نہ عقل اس قدر غالب ہو کر شعور کو فنا کر دے اور نہ جذبہ کا اتنا زیادہ غلبہ ہو کہ فکر بالکل سطحی ہو کر رہ جائے۔

غرض یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ادب میں جذبہ کی اہمیت اور قدر و قیمت کتنی ہی زیادہ سہی بہر حال یہ اس کا تنہا امتیاز نہیں ہوتا، بلکہ اس میں جذبہ کے ساتھ کوئی حقیقت بھی ضرور ہوتی ہے جس کے سہارے جذبہ قائم ہوتا ہے اور وہی حقیقت جذبہ کی قوت و بقا کی ضامن ہوتی ہے۔ ادب اور خالص موسیقی میں یہی فرق ہے کہ موسیقی میں حقائق و افکار نہیں ہوتے۔ وہ محض راگوں اور سُروں کا نام ہے، اور وہ براہِ راست جذبات کو ابھارتی ہے، لیکن ادب بغیر افکار کی مدد کے جذبات میں تحریک نہیں پیدا کر سکتا۔ فکر ہی ادب کا ڈھانچا ہوتا ہے، اسی کے ستون پر ادب کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ میں صرف خالص موسیقی ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ بغیر فکر کی وساطت کے براہِ راست جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، یہاں تک کہ نقاشی اور مصوّری بھی فکر کے محتاج ہیں۔ یہ دونوں بھی جو مناظر و مظاہر کو حسی صورت میں پیش کرتے ہیں، ان کے اندر کچھ افکار ہوتے ہیں، اس طرح وہ جذبات کو حرکت دیتے ہیں۔ نقاشی اور مصوّری کی طرح ادب بھی مناظر، اعمال اور صفات وغیرہ کو ہمارے سامنے مجسّم کر کے پیش کرتا ہے، یہاں تک کہ اس میں بھی ہم اسی طرح تمام رنگ و روغن، طول و عرض اور افکار و معانی کو دیکھ لیتے ہیں، جس طرح

کسی نقش یا تصویر میں دیکھتے ہیں۔ اس طرح ادب بھی جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔
پس، ادب کا دوسرا ضروری عنصر فکر ہے۔ اور یہ عنصر بعض ادبی فنون مثلاً تاریخ و تنقید کے لیے بنیادی غرض کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ ان دونوں کا اصلی مقصد جذبات کی تحریک سے زیادہ فکر و معنی کو حق و انصاف اور گہرائی و گیرائی کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ البتہ خالص اور اعلیٰ ادب کے اندر "فکر" جذبہ کے لیے وسیلے اور سہارے کا کام کرتا ہے کیونکہ بغیر فکر و معنی کے جذبہ کو قوت اور دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔

جذبہ اور فکر کے علاوہ ادب میں ایک تیسرا جزو بھی ہوتا ہے، جو خیال کہلاتا ہے۔ یہ بھی ادب کا ایک اہم عنصر ہے۔ قوت تخیل ہی کی بدولت ادیب طرح طرح کی تشبیہات و استعارات ایجاد کرتا ہے۔ اور پھر ان کے ذریعہ فکر و معنی کو حسی طور پر مجسم صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔

اس سلسلے میں عبارت کے اسلوب کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا جسے بعض ناقدین صورت یا شکل کہتے ہیں کیونکہ باقی تینوں عناصر کی آمیزش سے جو مادّہ بنتا ہے، اس کی صورت عبارت ہی میں نمودار ہوتی ہے۔ جذبہ، فکر اور خیال کے اظہار کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے مناسب الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ الفاظ درحقیقت معانی کا لباس ہوتے ہیں اور بسا اوقات جذبات کی تحریک میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ عبارت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ اگر فکر و معنی اوسط درجہ کا بھی ہو لیکن اس کے اظہار کی عبارت عمدہ اور دلکش ہو، تو معنی کا حسن و جمال بہت بڑھ جاتا ہے، اور اس کی تاثیر میں کافی زور پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہ بات مسلّم ہے کہ ادب ہو یا کوئی اور فن لطیف، اس میں اسلوب تعبیر اور طرزِ ادا ہی سے عبقریت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور طرزِ ادا کی فنی قدر و قیمت کو ایک ماہر ناقد ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ فنی مہارت اتفاقی یا اکتسابی نہیں ہوتی، بلکہ وہبی اور ذوقِ سلیم کا نتیجہ ہوتی ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ ادب مندرجۂ ذیل چار عناصر سے مرکب ہوتا ہے:

(۱) جذبہ: یہ سب سے اہم اور طاقتور عنصر ہے۔ لیکن مختلف ادبی تخلیقات و آثار

میں اس کی مقدار اور حیثیت مختلف ہوتی ہے کسی میں یہ کم ہوتا ہے، کسی میں زیادہ، کسی میں یہ غایت و غرض کی حیثیت رکھتا ہے، اور کسی میں محض وسیلے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

(۲) خیال : اس کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، بلکہ اکثر اوقات اس کے بغیر جذبات میں تحریک مشکل ہی سے ہوتی ہے۔

(۳) فکر : یہ عنصر خالص موسیقی کے علاوہ تمام فنون میں اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ محاضرات و مقالات جیسے فنون میں تو یہ صرف ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن تاریخ و تنقید میں تو اصل مقصود ہی یہ ہوتا ہے۔ (اسی کو معانی بھی کہتے ہیں)۔

(۴) صورت یا شکل : یہ عنصر اگرچہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتا لیکن ادائے معانی اور اظہارِ حقائق کے لیے یہ لازمی وسیلہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ان میں سے کوئی عنصر بھی بذاتِ خود تنہا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ادبی تاثیر پیدا کرنے میں باقی عناصر سے مدد لیتا ہے اور یہ سب آپس میں اس درجہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہ لامحالہ ایک کی قوت و ضعف کا اثر دوسرے اجزا پر بھی پڑتا ہے۔ پس ادب کے لیے یہ عناصر ایسے ہی ہیں، جیسے جسمِ انسانی کے مختلف اعضا کہ اگر ایک عضو بیمار ہو جائے، تو دوسرے اعضا بھی مضمحل ہو جاتے ہیں۔

اس طویل تمہید کے بعد ہم ادب کی تعریف کر سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادب وہ کلام ہے جو عقل اور شعور کی سچی تصویر کھینچ دے۔ اور شاید ادب کی تعریف کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ آدمی ادب کو سمجھ لے اور اسے پہچان لے۔

مالک رام

وفیات

صدّیقی حیدر آبادی، خواجہ عبدالعلی

ان کے خاندان کا مسقط الرّاس جزیرۃ العرب تھا، اور وہ صدیق اکبر حضرت ابوبکرؓ کی نسل سے تھے۔ ان کے جدّ اعلیٰ شیخ بہرام صدیقی غالباً بارھویں صدی ہجری میں واردِ ہندستان ہوئے۔ دلّی میں رکتے ہوئے، وہ حیدر آباد دکن پہنچے، جہاں سے آگے بڑھ کر انھوں نے نلگنڈہ میں رختِ سفر کھول دیا۔ خواجہ عبدالعلی کے دادا غلام حسین صدیقی تک خاندان نلگنڈہ ہی میں مقیم رہا۔ سب سے پہلے ان کے والد محمد میراں صدّیقی بسلسلۂ ملازمت حیدر آباد آئے، وہ یہاں سررشتۂ مالگزاری میں پیشکار تھے۔ اسی ملازمت کے دوران میں ان کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد ان کے پس ماندگان نے حیدر آباد ہی کو اپنا وطن بنا لیا۔

خواجہ عبدالعلی ۲۷ جنوری ۱۹۰۴ء (۲۰ ذی القعدہ ۱۳۲۲ھ) حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے؛ ان کے علاوہ صرف چار بیٹیاں تھیں۔ ظاہر ہے کہ پرورش بڑے لاڈ چاؤ اور ناز و نعم سے ہوئی۔ لیکن چرخِ ناہنجار یہ نہ دیکھ سکا، اور ان کے والد دوشنبہ ۲۲ جولائی ۱۸ (۱۳ شوال

مآخذ: مکاتیب جناب میر احمد علی الہام واحدی، حیدر آباد؛ ہفت روزہ "محور" حیدر آباد (۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء)

۱۳۳۴ھ) کو رحلت کر گئے، جب یہ بمشکل ساڑھے چودہ برس کے تھے۔ اس ناگہانی حادثے کا ان پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ جذبات نے شعر کی شکل اختیار کر لی اور انھوں نے والد کی وفات پر قطعۂ تاریخ کہا:

مہِ شوال کی تیرہ تھی اور تھا روزِ دوشنبہ میرے جب والدِ ماجد نے بحکمِ حق سے رحلت کی
بصد اندوہ صدیقی! دو تاریخیں کہیں میں نے "غم سوزِ جگر" ہجری، "غم بیچارگاں" فصلی
(۱۳۳۴ھ)

انھیں اپنے مرشد پیر بخاری شاہ صاحب نقشبندی کی درگاہ، بخاری گلشن سعید آباد (حیدر آباد) میں دفن کیا گیا۔

والد کی وفات کے وقت عبد العلی سٹی ہائی اسکول، حیدر آباد کے ساتویں درجے کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ اس سے پہلے تپ محرقہ میں بھی مبتلا رہ چکے تھے۔ والد کی وفات نے تعلیم کا سلسلہ بالکل منقطع کر نا ہی تھا۔ بیوہ ماں، چار بہنیں، آمدنی کے تمام ذرائع مسدود، ایسے میں بھلا مزید تعلیم کا کیا سوال تھا! اس وقت حکومت نظام کا یہ قاعدہ تھا کہ اگر کسی ملازم سرکاری کا ملازمت کے دوران میں انتقال ہو جاتا، تو حتی الوسع اس کے وارث کی فوری ملازمت کا انتظام کر دیا جاتا، تاکہ پسماندگان کی بسرِ اوقات کا وسیلہ بنا رہے۔ اگر وارث نابالغ ہوتا، جب بھی اس کا تقرر ہو جاتا، اس کی جگہ کوئی منصرم فرائضِ منصبی سر انجام دیتا، دو تہائی تنخواہ منصرم کو ملتی، ایک تہائی اصلی ملازم (اسم) کو۔ بالغ ہو جانے پر اس کا مستقل تقرر عمل میں آتا۔ محمد میراں اپنی وفات کے وقت تحصیل کھڑکہ میں پیشکار تھے۔ اسی قاعدے کے مطابق عبد العلی صاحب کو بھی ۱۹۱۸ء میں محکمۂ مال (صرفِ خاص) میں کلرکی مل گئی جس سے گھر کے اخراجات کا کچھ انتظام ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء تک ایک منصرم ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ اس کے بعد اپنی دیانت داری اور کارکردگی کی بدولت عبد العلی ترقی کرتے گئے۔ اول گرداور اور پھر منتظمِ پیشی ضلع مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء-۱۹۴۵ء میں محکمۂ مال سے دیوانی بلدہ میں تبادلہ ہو گیا، اور یہاں صدر محاسبی میں ایک سال آڈیٹر کے عہدے پر کام کیا۔ لیکن چونکہ یہ کام ان کے مزاج کے موافق نہ تھا، اس لیے کوشش کر کے

منتظم خزانہ کی جگہ حاصل کرلی۔ ۱۹۴۸ء میں اسی جگہ پر تھے کہ جب پولیس ایکشن کے نتیجے میں ریاست جمہوریۂ ہند میں ضم ہوگئی۔ نئے انتظام میں صدیقی صاحب کو قبل از وقت وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش کردیا گیا، سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ طبیعت قناعت پسند پائی تھی، اس کے بعد کہیں دوبارہ نوکری نہیں کی، اور اسی قلیل آمدنی میں صبر شکر سے بقیہ عمر گزار دی۔

جیسا کہ کہہ چکا ہوں، ان کی تعلیم نامکمل رہ گئی تھی، لیکن اس کی تلافی انھوں نے بعد کو ذاتی محنت اور مطالعے سے کرلی۔ چنانچہ فارسی بہت اچھی جانتے تھے؛ ۱۹۳۴ء میں پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا۔ اسی امتحان کی خاطر عربی بھی پڑھی اور اس میں بھی خاصی استعداد پیدا کرلی۔ ملازمت کے دوران میں بقدرِ ضرورت کچھ انگریزی بھی حاصل کرلی تھی۔
۱۹۲۸ء میں انھوں نے اپنی والدۂ ماجدہ کی خواہش کے مطابق نکاح کیا۔ یہ خاتون (احمد النساء عرف بیگم پاشاہ) مولوی داؤد علی صاحب زمیندار قصبہ ہتنورا (ضلع میدک، ریاست حیدرآباد) کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے بطن سے تین بچے پیدا ہوئے۔ پہلے دونوں (ایک لڑکا اور ایک لڑکی) صغر سنی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ تیسرے کی ولادت کے سترہ دن بعد یکم اگست ۱۹۳۴ء کو خود یہ بیگم بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ اللہ کی شان، سترہ دن کی معصوم جان یہ لڑکا (طٰہٰ نام ہے) زندہ رہا اور بفضلہٖ آج بھی موجود ہے۔ یہ بیگم بھی قبرستان بخاری گلشن، سعید آباد (حیدرآباد) میں آسودۂ خوابِ ابدی ہیں۔ طٰہٰ ماشاء اللہ شعر بھی کہتے ہیں اور مقامی حلقوں میں خاصے معروف ہیں۔

دو سال بعد ۱۹۳۶ء میں انھوں نے دوسرا نکاح مولوی محبوب علی جاگیردار کوٹلہ عالیجاہ (حیدرآباد) کی صاحبزادی آمنہ بیگم سے کیا۔ ان سے ایک لڑکی طیبہ صدیقہ اور ایک لڑکا عبدالقیوم عتیق صدیقی موجود ہیں اور وہ خود بھی بفضلہٖ حیات ہیں۔ عتیق بھی شاعر ہیں اور اپنا مقام رکھتے ہیں۔

صدیقی صاحب کی طبیعت شروع سے دین اور تصوف کی طرف مائل تھی۔ گھر کی فضا بھی اسی رجحان کی ممد و معاون تھی۔ ان کے والد محمد میراں مرحوم نہایت متقی اور

پرہیزگار بزرگ تھے۔ وہ حضرت پیر بخاری شاہ نقشبندی کے مرید تھے۔ اسی ماحول میں عبدالعلی صدّیقی مرحوم کی بھی نشو و نما ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے حضرت ابوالحسنات سیّد عبداللہ شاہ صاحب کے ہاتھ پر سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کرلی۔ تمام طرقِ تصوف میں صرف یہ سلسلہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ پر منتج ہوتا ہے جو صدّیقی صاحب کے جدِّ اعلیٰ تھے۔

شاعری انھوں نے بہت کم عمری میں شروع کردی تھی۔ شروع میں غزل سے مزاولت رہی۔ مولانا عبدالوہاب عاصم (ف: ۲ محرم ۱۳۶۸ھ/۴ نومبر ۱۹۴۸ء) سے مشورہ رہا۔ اس طرح ان کا سلسلہ آتش لکھنوی سے ملتا ہے۔ اپنی وفات سے قبل استاد نے انھیں اپنا جانشین مقرر کردیا تھا اور عاصم کے شاگردوں نے بھی ان کی یہ حیثیت تسلیم کرلی تھی۔ عاصم بھی صوفی صافی بزرگ تھے، لیکن حضرت سیّد عبداللہ شاہ کی مریدی نے گویا سونے میں سہاگے کا کام کیا اور وہ فنا فی الشیخ کی منزل سے گزر کر فنا فی الرّسول کی راہ پر گامزن ہوگئے۔ اسی میں ایک دن اپنا غزلیات کا دیوان نذرِ آتش کردیا اور اس کے بعد اپنی تمام صلاحیتیں حمد و نعت اور منقبت کے لیے وقف کردیں۔ ایک مجموعہ "فاران" کے عنوان سے چھپ چکا ہے۔ (حیدرآباد: ۱۹۷۷ء)۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی حمد و نعت میں انقطاع الی اللہ اور عشقِ حضرت رسالت مآب ؐ کی شدّت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے والہانہ محبّت دیکھ کر ان کے مرشد انھیں "شاعرِ دربارِ رسالت" کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دوسرے عاشقِ رسول ؐ مولانا شیخن احمد کامل شطّاری (ف: ۲۸ نومبر ۱۹۷۶ء) نے انھیں "حسّانِ دکن" کا لقب دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۷۷ء میں ادارۂ قدیر ادب، حیدرآباد نے ایک خاص تقریب میں انھیں "وصّافِ رسول" کی سند پیش کی۔ غرض ان کے اوصافِ حمیدہ اور اخلاقِ عالیہ کے باعث سب لوگ ان کے معترف اور مدّاح تھے۔

صحت ہمیشہ ٹھیک رہی۔ ۳۱ جنوری ۱۹۷۸ء کی شب میں بھی معمولات سے فارغ ہوکر بستر پر گئے، تو بالکل چاق و چوبند تھے۔ تھوڑی دیر بعد پورے جسم میں

رونقِ بزمِ شاعری بسمل
سن کے اشعار ہوتے تھے سب شاد

موسیقی تھمت لفظ پر قربان
شعر پڑھتے تو ملتی داد پہ داد

شاعری میں زبانِ داغ کا لطف
ان کے شعروں میں تھا عجیب سواد

"سرفروشی کی آرزو" والا
ان کا وہ شعر ہے سبھی کو یاد

فکر نو ان کی تھی رسا خود ہی
پھر ملا ان کو شاد سا استاد

سونے میں ہو گیا سہاگا یہ
تھوڑے عرصے میں خود ہوئے استاد

جس سے ملتے، خلوص سے ملتے
تھا کسی سے نہ بغض کچھ، نہ عناد

سال دو سال تک علیل رہے
عمر تھی ان کی ہشت بر ہشتاد

میرے بھائی تو رشتے میں تھے ہی
اور اس پر مزید "ہم استاد"

سالِ رحلت کی تھی عطا کو فکر
لبِ ہاتف سے یہ ہوا ارشاد

حرفِ اول الم کا لے کے کہو
"چپ ہوا بلبلِ ریاضِ شاد"
۱۳۹۰ھ ، ۱۹۷۰ء

شدید لکھنوی، سجّاد حسین، سیّد

لکھنؤ کے دو عظیم الشّان خاندانوں کے نام لیوا تھے۔ میر انیس کی اولاد میں تین بیٹے (میر خورشید علی نفیس، میر عسکری رئیس، میر محمد سلیس) اور تین بیٹیاں تھیں۔ منجھلی بیٹی حسینی مرزا عشق اور حسن مرزا تعشق کے بھائی احمد مرزا صابر سے منسوب تھیں۔ ان کی اولاد میں پانچ بیٹے (سیّد مصطفیٰ مرزا عرف پیارے صاحب رشید، سیّد باقر مرزا حمید، سیّد عابد مرزا سعید، سیّد مہدی مرزا مجید، اور سیّد صادق مرزا مجید (عرف کلّن صاحب) ہوئے۔ ان میں سیّد محمد مصطفیٰ مرزا پیارے صاحب رشید نے بہت شہرت حاصل کی۔ ان کا نکاح میر انیس کے منجھلے صاحبزادے میر عسکری رئیس کی بڑی صاحبزادی مہدی بیگم سے ہوا۔ ان کے صرف پانچ بیٹیاں ہوئیں۔ سب سے بڑی (بتول بیگم) جو محمد جلیس (پسر میر محمد سلیس بن میر انیس) سے منسوب تھیں، یہ لاولد تھیں۔ منجھلی (عسکری بیگم) سیّد فرزند حسین فردوس (تلمیذ میر نفیس) سے بیاہی گئیں۔ تیسری کے بیٹے احمد آغا سلیم تھے (جن کے بیٹے حسین آغا ہیں) چھوٹی دونوں بیٹیاں بھی لاولد ہیں۔

ماخذ : سیدہ طاہرہ واثقہ ... ۱۹۷۰ء

محمد اسلم سیفی

اردو کا کون طالب علم محمد اسمٰعیل میرٹھی کے نام سے ناواقف ہوگا۔ وہ غالب کے شاگرد تھے۔ انھوں نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور اس زبان کی ترقی و ترویج میں جو مساعی مشکور صرف کی ہیں، ان سے ہماری تاریخ کے صفحات مزیّن اور دیدہ و دل کی آنکھیں روشن ہیں، ان کا یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو میرٹھ میں انتقال ہوا۔

اس خاندان کے جدّ اعلیٰ قاضی حمید الدین خجندی ۱۵۲۶ء میں وسط ایشیا کے شہر خجند[1] سے بابر کے ساتھ ہندستان آئے۔ یہاں انھوں نے قصبہ سیکری (ضلع مظفّر نگر) میں سکونت اختیار کی۔ بابر نے انھیں یک ہزاری منصب دے کر سیکری کا چودھری مقرر کر دیا۔ قاضی حمید الدین کے صاحبزادے مولانا احمد نے سیکری کی سکونت ترک کر دی اور نقل مکان کر کے قصبہ لاوڑ (ضلع میرٹھ) چلے آئے۔ اس کے بعد ایک زمانے تک یہ خاندان لاوڑ ہی میں سکونت پذیر رہا۔ ۱۴ جولائی ۱۸۳۸ء کو ان کے ایک بزرگ شیخ پیر بخش لاوڑ سے شہر میرٹھ منتقل ہو گئے۔ یہی صاحب مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کے والد بزرگوار تھے۔[2]

بعمر ۱۸ برس ۱۸۶۲ء میں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کا نکاح شیخ محبوب بخش ساکن لاوڑ (ضلع میرٹھ) کی دختر نیک اختر نعیم النسا سے ہوا۔ ان سے پانچ اولادیں ہوئیں: تین بیٹے محمد محمود سیفی اور محمد حامد اور محمد اسلم سیفی، اور دو بیٹیاں قیوم النسا اور امۃ اللہ العلےٰ۔ محمد اسلم ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ یہ اپنے خاندانی مکان محلہ مشائخان اندرکوٹ (حال محلہ اسمٰعیل نگر) میں ۷ اگست ۱۸۸۰ء بروز ہفتہ پیدا ہوئے۔

ماخذ: حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ؛ اسمٰعیل نیشنل ڈگری کالج میگزین (۱۹۷۶-۷۷) میرٹھ؛ حیاتِ اسمٰعیل مرتبہ محمد اسلم سیفی؛ سرفراز عالم صاحب، میرٹھ۔

۱۔ خجند اس زمانے میں ترکستان کا حصہ تھا۔ آج کل یہ سوویت روس کی جمہوریہ ازبکستان کے مشہور شہروں میں سے ہے۔

۲۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی کے حالات کے لیے دیکھیے، تلامذۂ غالب (مالک رام): ۴۳ سے ۴۷

مولانا محمد اسمٰعیل نے اپنی ملازمت کے دوران میں ۱۸۸۷ء سے ۱۸۹۹ء تک بارہ برس آگرہ نارمل اسکول میں مدرّسی کی تھی۔ چنانچہ محمد اسلم کی تعلیم کا آغاز بھی یہیں ہوا، اور انھوں نے دسویں کا امتحان بھی آگرے ہی میں پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے ۱۸۹۵ء میں ایم اے او کالج، علی گڑھ میں چلے گئے۔ چار سال بعد ۱۹۰۰ء کے آغاز میں بی۔ اے کا امتحان دینے والے تھے کہ یکم دسمبر ۱۸۹۹ء کو ان کی والدہ کی رحلت کا جانکاہ حادثہ پیش آیا۔ اس واقعے نے گھر بھر کا نظام درہم برہم کر دیا۔ خود مولانا محمد اسمٰعیل کا دل ایسا اُچاٹ ہوا کہ وہ آگرے سے اپنے وطن میرٹھ چلے آئے۔ اس پر محمد اسلم نے اپنے والد کی تنہائی سے ڈر کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی، اور ان کے پاس میرٹھ میں رہنے لگے۔ یوں تعلیم کی تکمیل نہ ہو سکی۔

اب سوال کسب معاش اور آیندہ زندگی کے لیے ایک مستقل لائحۂ عمل بنانے کا تھا۔ محمد اسلم کا رجحان تجارت کی طرف تھا۔ والد کے مشورے سے انھوں نے دلّی میں اسلم اینڈ کمپنی کے نام سے ایک تجارتی فرم قائم کی، اور انگلستان سے کپڑا اور سوتی تاگا درآمد کرنے لگے۔ یہ کاروبار بفضلہ بہت نفع بخش ثابت ہوا، اور انھوں نے اس میں خوب کمایا۔ چندے بعد وہ ولایت سے گراموفون مشینیں اور ریکارڈ بھی منگوانے لگے۔ اس کام میں ان کے حقیقی بھانجے احسان الحق[۱] ان کے شریک تھے۔ ہز ماسٹرز وائس کمپنی کی فرمایش پر انھوں نے چند ہندستانی موسیقاروں اور گلوکاروں کے گانوں کے ریکارڈ بھی تیار کروائے تھے۔ بعد کو انھوں نے یہ کام کلیتہً بلا شرکت غیرے اپنے بھانجے کے حوالے کر دیا، اور اپنی تمام توجہ کپڑے اور تاگے کی تجارت پر مرکوز کر دی۔

---

۱ احسان الحق بسلسلۂ تجارت اکثر یورپ جاتے رہتے تھے۔ وہاں ان کی انگلستان میں ایک لڑکی سے شناسائی ہو گئی۔ دونوں نے آپس میں شادی کا فیصلہ کیا۔ شرط یہ تھی کہ احسان الحق عیسائیت قبول کر لیں۔ اور یہی ہوا۔ اس سے پہلے وہ اپنا نام A. Haq لکھتے تھے۔ عیسائی ہو جانے کے بعد انھوں نے اسے Alexander Haq الگزینڈر ہیگ کر لیا۔ ان کی بیٹی انگلستان میں موجود ہے۔ بمبئی میں ان کی جائداد "ہیگ بلڈنگ" کے نام سے ان کے مقرر کردہ منتظم کے قبضے میں ہے۔

تجربے سے انھوں نے محسوس کیا کہ انگلستان کا سفر کاروبار کے فروغ کے لیے ضروری ہے اس پر والد کی اجازت سے وہ ۱۹۰۴ء میں بحری جہاز سے ولایت گئے۔ ان کی غیر حاضری کے زمانے میں دلّی کے دفتر کی دیکھ بھال خود مولانا محمد اسمٰعیل نے کی تھی۔ انگلستان سے وہ یورپ گئے اور جرمنی، فرانس وغیرہ مختلف ممالک کی سیر کرتے ہوئے چھ مہینے بعد دلی واپس آئے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس سفر سے انھیں بہت فائدہ ہوا، بیرونی ممالک کے تاجروں سے ان کے ذاتی تعلقات قائم ہو گئے، جس سے ان کے کاروبار میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی۔

۱۹۱۶ء میں انھوں نے ملکی سیاست میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اس سال حکومت نے مختلف شہروں میں لوکل باڈیز قائم کی تھیں اور ان کے انتخاب ہوئے تھے۔ محمد اسلم بھی میرٹھ میونسپل بورڈ کے رکن چنے گئے۔ اس کے بعد مسلسل ۳۶ سال (یعنی ۱۹۵۲ء تک) وہ بورڈ کے رکن رہے۔ اس دوران میں ۱۸ برس صدر (چیرمین) بھی منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ وہ صوبائی کونسل کے انتخاب میں بھی کھڑے ہوئے اور اس میں بھی کامیاب ۱۹۲۵ء یا ۱۹۲۶ء میں انھیں حکومت کی طرف سے "خان بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ (خطاب انھوں نے ۱۹۴۶ء میں حکومت کو واپس کر دیا تھا)۔ یہ ۱۹۲۵ء-۱۹۲۶ء کا زمانہ ان کے دنیوی اعزاز و اکرام اور جاہ و منزلت کے پہلو سے نقطۂ عروج تصور کیا جا سکتا ہے، وہ صوبائی کونسل کے رکن تھے، میونسپل بورڈ کے رکن اور اس کے صدر تھے، شہر کے آنریری (اعزازی) مجسٹریٹ تھے، مال و منال کی کمی نہیں تھی اور وہ ان کا عمائدِ قوم میں شمار ہوتا تھا۔

مولانا اسمٰعیل نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنی پوری توجہ تعلیمی مسائل پر مبذول کر دی تھی۔ اردو تعلیم کے لیے انھوں نے ایک تدریجی نصاب قیامِ آگرہ کے زمانے میں مرتّب کیا تھا۔ یہ کتابیں مدتوں یوپی کے مدارس کے ابتدائی درجوں میں پڑھائی جاتی رہیں اور اہل نظر کی رائے یہ ہے کہ اردو پڑھانے کے لیے ان سے بہتر نصاب آج تک نہیں لکھا گیا۔ لڑکیوں کی تعلیم سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی کیونکہ مسلمان گھرانوں میں اس پہلو سے

بالعموم غفلت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں انھوں نے تعلیم نسواں کے سلسلہ میں ایک عملی اقدام کیا۔ اس سال انھوں نے اپنے مکان کے ایک حصے میں "مدرسۃ بنات المسلمین" قائم کر دیا۔ ۱۹۱۶ء میں جب نئے آئین کے تحت میونسپل بورڈ کی تشکیل ہوئی تو اس میں مدرسے کا تنظم و نسق بھی بورڈ نے اپنے ذمّے لے لیا۔ اس کے انتظام کے لیے کمیٹی بنائی گئی، جس کے صدر محمد اسلم صاحب بنائے گئے۔

مولانا محمد اسمٰعیل کی یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو وفات ہو گئی، تو محمد اسلم صاحب اپنے والد کی یادگار کے طور پر اس مدرسے میں اور زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ ۱۹۰ء آخیر تک اس کے فروغ و ترقی کے خواہشمند رہے۔ ۱۹۲۵ء میں اسکول کی سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹری ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں یہ ہائی اسکول کے درجے تک پہنچ گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا، اور پاکستان وجود میں آیا۔ اسلم صاحب کے تینوں بیٹے اور بیٹیاں اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ان لوگوں کا اصرار تھا کہ والدین بھی ان کے ساتھ جائیں۔ لیکن محمد اسلم صاحب نے اپنے والد کی یادگار اس مدرسے کو سینے سے لگائے رکھا، اور پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ یہ انھیں کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۵۲ء میں اس میں انٹر کے درجوں کا اضافہ ہوا، اور ۱۹۶۲ء میں اس نے ڈگری کالج کا درجہ حاصل کر لیا۔

محمد اسلم صاحب کی پہلی شادی میرٹھ کے قدیم زاہدی خاندان میں ہوئی۔ ان کے خسر کا نام ریاض الدین تھا، اور بیوی کا جمیلہ خاتون۔ اس بیگم سے ان کے دو بیٹیاں ہوئیں، جو کمسنی میں فوت ہو گئیں۔ پھر بیوی نے بھی رحلت کی۔ اس کے بعد ان کے دوسری شادی اپنے ہم محلہ دار وطن سید مظفر علی بیرسٹر مرحوم کی صاحبزادی محترم النسا بیگم سے ہوئی۔ ان بیگم سے ان کے پانچ بچے زندہ رہے: تین لڑکے (محمد مسلم سیفی، اسلام احمد سیفی، اکرام احمد سیفی) اور دو لڑکیاں (سلیمہ خاتون، عالیہ خاتون)۔ دونوں بڑے بیٹوں کا والدین کی زندگی ہی میں انتقال ہو گیا۔ سب سے چھوٹے اکرام احمد سیفی عرف غوثی میاں آج کل لندن میں سکونت پذیر ہیں، انھوں نے انگریزی جنسیت اختیار کر لی ہے۔ سلیمہ خاتون پاکستان میں ہیں اور عالیہ خاتون سڈنی (آسٹریلیا) میں۔

علم وادب اور اردو زبان سے محبت انھیں اپنے والد سے ورثے میں ملی تھی۔ بعض لوگ سیفی ان کا تخلص خیال کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بزرگوں میں ایک صاحب عبداللہ سیفی گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے نام میں سیفی کے جزو کا اضافہ انھیں کی نسبت سے کیا تھا۔ ان کا تصنیفی کارنامہ اپنے والد کی کلیات کی ترتیب وتدوین ہے، جس کے شروع میں انھوں نے ڈیڑھ سو صفحات میں حیاتِ اسمٰعیل اور ان کے کلام پر تبصرے کا اضافہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں پورے اہتمام کے ساتھ دلّی میں چھپ کر شائع ہوئی۔

کبر سنی کے ساتھ صحت خراب رہنے لگی تھی۔ رہی سہی کسر دو بیٹوں اور دو دامادوں کی جوانمرگی نے پوری کر دی۔ اپنے ڈھنڈار مکان میں یکّہ وتنہا رہتے تھے۔ بیوی کا بھی یکم دسمبر ۱۹۷۱ء کو انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن بظاہر کوئی عارضہ بھی نہیں تھا۔ ۴/۵ فروری ۱۹۷۸ء کی درمیانی شب میں کسی وقت غالباً حرکتِ قلب بند ہو جانے سے موت ہو گئی۔ اگلی صبح (۵ فروری) آدمی نے انھیں بستر میں بیجان پایا۔ اسی دن سہ پہر کے وقت جنازہ اٹھا اور ان کے جسدِ خاکی کو دلّی ہی میں ان کے والد مولانا محمد اسمٰعیل کے مقبرے (آستانۂ اسمٰعیل) کے احاطے میں والد کی پائینتی (اور اپنی بیوی مرحومہ کے پہلو میں) سپردِ خاک کر دیا گیا۔ گویا ۹۸ سال کی عمر پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر

ان کا خاندان اصل میں مراد آباد کا تھا۔ ان کے مورثِ اعلیٰ نواب عظمت اللہ خان عہدِ عالمگیری میں مراد آباد کے صوبیدار تھے۔ محمد احسن فاروقی کے دادا نواب عبدالمجید خان ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد بجرمِ بغاوت گرفتار ہوئے اور پھانسی کے تختے پر شہادت پا گئے۔ چونکہ ان کی صاحبزادی راجہ کاظم حسین خان تعلقدار ریاست بلہرہ

ماٰخذ: ڈان (انگریزی روزنامہ، کراچی) ۲۷ فروری ۱۹۷۸ء؛ جنگ (اردو روزنامہ کراچی) ۱۰ مارچ و ۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء؛ نادم سیتاپوری، کراچی۔

(ضلع بارہ بنکی) سے منسوب تھیں، اس لیے اس حادثۂ فاجعہ کے بعد یہ خاندان بلہرہ منتقل ہوگیا۔ چنانچہ محمد احسن فاروقی ۱۵ نومبر ۱۹۱۳ء کو بلہرا ہاؤس (قیصر باغ) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ بلہرہ اور محمود آباد دونوں جگہ کے حکمرانوں میں قرابت قریبہ تھی۔ فاروقی صاحب کا بچپن بھی اسی ماحول میں بڑے آرام و آسائش سے بسر ہوا۔

فاروقی کا تعلیم کا پورا دور بھی لکھنؤ میں گزرا۔ دسویں کی سند مشن اسکول سے لی۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں ایم۔اے (انگریزی و فلسفہ) کے امتحان لکھنؤ یونیورسٹی سے پاس کیے۔ پروفیسر احمد علی ان کے استاد تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد اپنی یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے مدرس (لیکچرر) مقرر ہو گئے۔ تدریس کے دوران ہی میں انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) کی سند حاصل کی۔ وہ اس موضوع میں پی ایچ ڈی کرنے والے غالباً پہلے مسلمان طالب علم تھے۔

۱۹۵۵ء میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے۔ سب سے پہلے کراچی یونیورسٹی میں انگریزی پڑھانے کی جگہ ملی۔ لیکن جلد ہی یہاں سے الگ ہو گئے، اور سندھ یونیورسٹی میں چلے گئے۔ یہاں بھی انگریزی پڑھاتے رہے۔ جب یہاں بھی نہ نبھ سکی، تو استعفیٰ داخل کر دیا۔ اس کے بعد بہت دن پریشان حال رہے۔ خوش قسمتی سے چند سے بعد اسلامیہ کالج، سکھر میں صدر شعبۂ انگریزی مقرر ہو گئے۔ سب سے آخر ۱۹۷۳ء میں صدرِ شعبۂ انگریزی اور ڈین فیکلٹی آف آرٹ کی حیثیت سے بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ میں تقرر ہوا۔ اسی عہدے پر تھے، جب انتقال ہوا ہے۔

عجیب طبیعت پائی تھی۔ وہ بات کو پیچ دے کر بیان کرنا یا چھپانا جانتے ہی نہیں تھے۔ مصلحت، جو بسا اوقات ریاکاری کا دوسرا نام ہے، ان کو چھو کر نہیں گئی تھی۔ دیانتداری سے کسی مسئلے کے بارے میں جو رائے ہوتی، لگی لپٹی رکھے بغیر برملا اور پورے وثوق سے کہہ دیتے۔ اس کے نتائج جو بھی ہوں، انھیں اس سے سروکار نہیں تھا۔ مثلاً کراچی میں ایک خاصے بڑے آدمی نے خودکشی کر لی۔ تعزیت کرنے والوں میں جہاں شہر کے بیسیوں عمائد اور مرحوم کے رشتے دار اور عقیدتمند موجود تھے، وہیں فاروقی صاحب

بھی تھے۔ اتنے میں نمازِ جنازہ کے لیے صفیں تیار ہونے لگیں۔ فاروقی صاحب نے کہا کہ خودکشی اسلام میں حرام ہے، ایسے شخص کی نمازِ جنازہ نہیں ہو سکتی اور یہ کہہ کر وہاں سے چل دیے۔ حاضرین پر اس کا کیا اثر ہوگا، اس کی انھوں نے کوئی پروا نہیں کی اور اپنے اصول اور عقیدے کے مطابق نمازِ جنازہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ یہی باعث ہے کہ دل و دماغ کی تمام صلاحیتوں کے باوجود ساری عمر پریشان رہے، اور انھیں کسی جگہ مستقل ملازمت میسر نہ آ سکی۔ آج کل جب تملق، چاپلوسی، درباری ملازمت کے اجزائے ضروری ہیں، فاروقی صاحب کی آزادہ روی کیسے برداشت کی جا سکتی تھی! بیشک، صاحبِ علم طبقہ اور ان کے شاگرد ان پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے! روزگار اور اس میں ترقی اور مادی وسائل کی فراہمی تو ان لوگوں کے ہاتھ میں نہیں تھی، اسی لیے وہ کراچی اور سکھر میں زیادہ دن نہ رہ سکے۔ یہ داستان طویل بھی ہے اور بہت افسوسناک اور المناک بھی۔

وہ سرما کی لمبی تعطیلات میں کوئٹے سے کراچی آئے ہوئے تھے۔ ۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو واپسی طے تھی۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ امریکا کی کسی یونیورسٹی کا وفد کوئٹہ آنے والا ہے" جس کے استقبال کے لیے انھیں بھی ۲۷ فروری وہاں پہنچ جانا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے ۳ مارچ کی جگہ ۲۵ فروری شب کی گاڑی سے جانے کا انتظام کر لیا۔ جانے سے پہلے اپنے ملنے والوں سے یہی کہتے رہے کہ "کوئٹہ جانے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اب میں کام کرنا نہیں چاہتا"۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی زندگی کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ جس سے ظاہر بین نگاہیں یہی خیال کرتی تھیں کہ فاروقی صاحب اس سن میں بھی اتنے ہی چاق و چوبند ہیں، جیسے آج سے ۳۰ سال قبل تھے، حال آں کہ یہ سب محض ان کی قوتِ ایمانی کا کرشمہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ طویل کشمکش اور مادی راحتوں کے فقدان اور مسلسل کثرتِ کار سے ان کا جسم تھک کر چور ہو چکا تھا۔ انھیں اگر کچھ سکون و عافیت کا ماحول ملتا، تو وہ کیا نہیں کر سکتے تھے! سچ ہے:

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا   فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

ہفتہ ۲۵ فروری ۱۹۷۸ء رات کی گاڑی سے وہ کوئٹہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۶ فروری سہ پہر میں گاڑی منزلِ مقصود پر پہنچنا تھی۔ دورانِ سفر ہی میں دوبارہ دورہ پڑا۔ کوئٹہ پہنچ کر گھر میں داخل ہوئے ہی تھے کہ تیسرا شدید تر حملہ ہوا۔ فوراً سول اسپتال پہنچائے گئے، جہاں ڈاکٹروں نے دیکھ کر کہا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی کے پاس جا چکے ہیں۔

لاش ریل سے پیر کے دن (۲۷ فروری) کراچی آئی۔ ظہر کے بعد نمازِ جنازہ رضویہ کالونی کے امام باڑہ میں ہوئی؛ قبرستان "خراسان" میں دفن ہوئے۔ اِنّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ سلمان الحق حقی نے تاریخِ وفات کہی:

ہمنشیں! پوچھ وہ غمِ احسن فاروقی کا — چل بسا اور بھی اک یارِ گرامی اپنا
نکتہ پرداز و نواساز و ادیب و نقّاد — "خالق شامِ اودھ، ناقدِ نامی اپنا"
۱۳۹۸ھ

ان کی شادی نواب وزیر اودھ شجاع الدولہ کے برادرِ نسبتی سالار جنگ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ بیگم فاروقی بفضلہ بقیدِ حیات ہیں۔ ان سے دو بیٹے (رضا احسن اور جعفر احسن) اور دو بیٹیاں (صفیہ اور عطیہ) یادگار ہیں۔ بڑے بیٹے رضا احسن، پالی ٹیکنک کالج، کراچی کے پرنسپل ہیں۔

انھیں لکھنے کا شوق کالج کے زمانے ہی میں پیدا ہوا۔ انگریزی ادب کے وسیع مطالعے کے باعث آغاز ہی سے تنقید، اور وہ بھی ناول اور افسانے کی، ان کا خاص موضوع رہا۔ انھوں نے لکھنے کا پہلا تجربہ ماہنامہ ساقی، دلی سے کیا۔ ان کی سب سے پہلی تحریر "ناول کیا ہے؟" انھیں ایام میں شائع ہوئی اور بےحد مقبول ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے خود افسانہ نویسی اور ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ ان کا ناول "شامِ اودھ" بہت کامیاب تصنیف ہے؛ اس کا درجہ رسوا کے "امراؤ جان ادا" سے کسی طرح کم نہیں۔ دوسرا ناول "سنگم" بھی بہت اہم ہے۔ انھوں نے ایک ناول پانچ حصّوں میں مکمل کیا تھا۔ اس کے تین حصّے: "فرصتِ کشمکش زندگی"، اور "سنگِ گراں" اور "آبلۂ دل کا" چھپ چکے ہیں؛ بقیہ دو ناشر کے پاس ہیں۔ ان کے دو اور ناول "دل کے آئینہ میں" اور "یوم پاکستان" ان کی زندگی میں نہ چھپ سکے۔

"یومِ پاکستان" اب شائع ہوگیا ہے، دوسرا بھی عنقریب منظرِ عام پر آ جائیگا۔ مولوی عبدالحق مرحوم (ف: اگست ۱۹۶۱ء) کی فرمائش پر انھوں نے "انگریزی ادب کی تاریخ" لکھی تھی، اس کا مسودہ انجمن ترقی اردو (پاکستان)، کراچی کے پاس موجود ہے۔ اسی طرح انھوں نے دو جلدوں میں "تاریخ ادبیاتِ یورپ" بھی قلمبند کی تھی، یہ بھی ہنوز تشنۂ اشاعت ہے۔ وہ اردو کے علاوہ کہ ان کی مادری زبان تھی، فارسی اور عربی بھی خوب جانتے تھے۔ یورپی زبانوں میں انگریزی تو خیر، ان کا اوڑھنا بچھونا ہی تھی، جرمن اور فرانسیسی میں بھی انھیں پوری مہارت تھی اور ان کے ادب کا مطالعہ وہ اصلی زبان ہی میں کرتے تھے۔ مزید براں وہ کام چلانے کی حد تک لاطینی اور یونانی بھی جانتے تھے۔ اتنی استعداد کے بعد بھلا ادبیاتِ یورپ پر ان سے بہتر لکھنے والا اہلِ اردو کون میسر آ سکتا تھا! ضرورت ہے کہ ان کا تمام سرمایہ جمع کر کے شائع کر دیا جائے۔

رضا، آلِ رضا، سیّد

ابھی تک کسی نے تاریخی پہلو سے اس امر کا مفصّل جائزہ نہیں لیا کہ ہندستان میں شیعیت کو کیونکر فروغ حاصل ہوا! بہرحال، اس کا یقین ہے کہ جب بھی اس مسئلے کا جائزہ لیا جائیگا، اس میں ہمایوں کے شیر شاہ سوری سے قنوج کے میدان میں شکست کھا کر ۱۵۴۰ء میں ایران جانے کو نقطۂ آغاز قرار دینا پڑیگا۔ ہمایوں ایران میں تقریباً پندرہ برس شاہ طہماسپ کے دربار میں پڑا رہا۔ جب تک شیر شاہ زندہ تھا، اسے واپس آنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ مئی ۱۵۴۵ء میں شیر شاہ راہیِ ملکِ عدم ہوا، اس کے جانشین اس کا پاسنگ بھی نہیں تھے۔ ہمایوں جو ایران میں گھات لگائے بیٹھا تھا، اس نے خیال کیا کہ اب موقع ہے کہ میں اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے لوں۔ شاہ طہماسپ نے کچھ فوج ساتھ کر دی، اس کے علاوہ بعض

ماخذ: شعرستان (تذکرہ شعرائے پاکستان)، تذکرہ شعرائے جدید (عبدالوحید)، روزنامہ جنگ کراچی (۲ مارچ ۱۹۷۸ء نیز ۱۷ مارچ ۱۹۷۸ء)، روزنامہ ڈان کراچی (انگریزی) (۲ مارچ، کتب: شمشیر اصنون رضو ی، کراچی۔

بہت سے ایرانی امرا بھی بطیب خاطر اس کے ساتھ ہو لیے، جو قسمت آزمائی کی خاطر ہندستان آنے کو تیار تھے۔ سرہند کے میدان میں رن پڑا، عادل شاہ سوری کو شکست فاش ہوئی، اور ہمایوں دوبارہ ہندستان کے سیاہ و سپید کا مالک بن گیا۔ ہمایوں کے ساتھ آنے والے بیشتر لوگ شیعی تھے اور انھیں سے یہاں شیعیت پھیلی۔

ہمایوں کے ساتھ جو لوگ اپنی خواہش اور رغبت سے ہندستان آئے، ان میں سیّد محمود رضوی نیشاپوری بھی تھے۔ یہی سیّد آل رضا کے وہ مورثِ اعلیٰ تھے، جو ایران سے ہندستان آئے۔ یہاں انھیں جاگیر عطا ہوئی، اور وہ موہان (ضلع اناؤ) میں بس گئے۔ مدتوں سپہگری اور کشاورزی خاندان کا پیشہ رہا۔

سیّد محمود رضوی کے اخلاف میں سیّد سرفراز علی ہوئے ہیں۔ وہ آخری شاہِ اودھ واجد علی شاہ کے زمانے میں مقرّبِ بارگاہ تھے۔ واجد علی شاہ کے اعتزال کے بعد بھی وہ لکھنؤ ہی میں مقیم رہے اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ ۳۰ جون ۱۸۵۷ء کو چنہٹ کے مقام پر انگریزوں اور دیسی فوجوں کے درمیان جو خونریز مڈبھیڑ ہوئی تھی، اور جس میں انگریزوں کو پسپا ہونا پڑا تھا، سیّد سرفراز علی اس میں موجود تھے۔ بعد کو جب سر کولن کیمبل تقریباً ایک لاکھ کا جمِ غفیر لے کر پندرہ ہزار کی دیسی سپاہ پر پل پڑا، تو لکھنؤ کو ہتھیار ڈال دینے کے سوا چارہ نہ رہا۔ سیّد سرفراز علی گرفتار ہوئے، ان کی جائداد ضبط ہوئی اور انگریزوں کے خیر خواہ زمینداروں میں تقسیم کر دی گئی۔ یہی سرفراز علی ہمارے سیّد آل رضا کے پردادا تھے۔

سیّد آل رضا ۱۰ جون ۱۸۹۶ء[1] کو اپنے ننھیال نیوتنی (ضلع اناؤ) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد رضا پیشے کے لحاظ سے وکیل تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جب اودھ چیف کورٹ کی تشکیل ہوئی ہے، تو اس میں پانچ جج مقرّر ہوئے تھے۔ سیّد محمد رضا بھی

---

[1] اگرچہ خود انھوں نے لکھا ہے، سنتا ہوں کہ جون ۱۸۹۵ء ... میں پیدا ہوا تھا (شعرستان: ۱۵۶) لیکن تحقیق سے معلوم ہوا کہ انھوں نے غلط سنا تھا۔ یہاں ٹھیک تاریخ دی گئی ہے۔

ہوکر گھر پر آ گئے۔ لیکن یہ عمر اور ایسی شدید چوٹیں اور اتنی لمبی بیماری ــــــ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اسی میں ۳ جولائی ۱۹۷۸ء سہ پہر میں ساڑھے چار بجے جاں بحق ہوئے۔ جنازہ اگلے دن ۴ جولائی ۱۹۷۸ء صبح کے وقت اٹھا اور انھیں کربلائے تالکٹورہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ اِنّا للہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

شدید نے اپنی زندگی میں دو نکاح کیے۔ پہلی بیوی احمد حسین صاحب آرٹ ماسٹر اسکول بلرام پور (ضلع گونڈہ) کی دختر بتو بیگم تھیں۔ ان کے بطن سے دو بیٹیاں ہوئیں، جو کمسنی میں انتقال کر گئیں اور اس کے بعد بیگم بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دوسرا نکاح ماسٹر سید عباس علی ساکن محلہ حیدر گنج، قدیم لکھنؤ کی صاحبزادی چھوٹی بیگم سے ہوا۔ ان سے بھی دو بچے ہوئے لیکن دونوں ایام زچگی ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ اختلاف مزاج کے باعث بعد کو اس بیگم سے علاحدگی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی حقیقی ہمشیرہ کامنی بیگم اور بھانجے سید سبط حسن نقوی کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ انتقال بھی انھیں کے مکان پر ہوا۔ لاولد فوت ہوئے۔

شدید مرحوم کے سات مرثیے "ریاض شدید" کے تین حصوں (لکھنؤ: ۱۹۶۷ء) میں شامل ہیں۔ ان کا بہت سا کلام غیر مطبوعہ سید سبط حسن نقوی کے پاس موجود ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ محفوظ کر دیا جائے۔ انھوں نے کسی زمانے میں اپنے نانا پیارے صاحب رشید کے مرثیوں کی ایک جلد بھی "بوستان رشید" کے نام سے مرتب کی تھی؛ یہ چھپ چکی ہے۔

اخگر، وصی احمد

ضلع بارہ بنکی (یوپی) کے قصبے محمود آباد کے ایک کھاتے پیتے خاندان کے فرد تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت رسول کریم صلعم کے مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاری پر منتہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ان کے جد اعلیٰ محمد یوسف انصاری (حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے پروتے) محمد بن قاسم کے ساتھ ۷۱۲ء میں ہندستان آئے۔ اور خاندان مدتوں سندھ میں مقیم رہا۔ مدتوں بعد ان کی نسل میں حسام الدین (عرف شیخ بڑے) وہاں سے ہجرت کر کے محمود آباد (یوپی) آ گئے۔

ماخذ: قومی آواز ۶ اگست ۱۹۷۰ء؛ جناب ڈاکٹر افضال احمد ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، لکھنؤ (پسر اخگر مرحوم) بہ عنوان: مقالہ بر سندیلہ ابجد عمری غنی احمد (مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)

نہیں، بلکہ میرا دم نکل رہا ہے۔ میرے ہاتھ میں قرآن مجید دے دو۔ چنانچہ نہ دوا کھائی نہ پانی پیا۔ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں قرآن، لبوں پر کلمہ، چند لمحوں میں پورے اطمینان کے ساتھ خالق حقیقی سے جا ملے۔ (۲ مارچ ۱۹۷۸ء کے اوّلیں وقت) انا للہ وانا الیہ راجعون

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید، تبسّم بر لبِ اوست

نمازِ جنازہ ۲ مارچ کو ظہر کے بعد رضوی امامباڑہ میں ہوئی اور انھیں علی باغ کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ رئیس امروہوی نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

سیّد آل رضا پر، اے رئیس! ہوگیا عہدِ کہن کا اختتام
وہ سلف کی عظمتوں کا ترجماں شاعرِ بے مثل و پاکیزہ کلام
مجمعِ اوصاف اس کی ذاتِ پاک اعتبارِ اہلِ دانش اس کا نام
خلد میں پہنچا، تو ہاتف نے کہا: "سیّد آلِ رضا عالی مقام"
(۱۳۹۸)

سیّد آل رضا نے شاعری کا آغاز اپنے قیام پرتاپ گڑھ کے زمانے میں کیا۔ شروع میں گاہے ماہے ایک آدھ شعر کہہ لیتے اور ڈال دیتے۔ رفتہ رفتہ جب احباب کو معلوم ہوا تو انھوں نے باقاعدہ غزل کہنے پر اصرار کیا۔ اس پر انھوں نے مخصوص سیّد انور حسین آرزو لکھنوی (ف: ۱۷ اپریل ۱۹۵۱ء) کا تلمذ اختیار کیا اور رفتہ رفتہ غزل گو شعرا میں اپنے لب و لہجہ اور طرزِ بیان کے باعث امتیازی حیثیت اختیار کرلی۔ ان کا پہلا مختصر مجموعۂ کلام "نوائے رضا" نظامی پریس، لکھنؤ سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا! دوسرا "غزلِ معلّٰی" ۱۹۵۹ء میں کراچی سے۔ اس کے بعد غزل گوئی تقریباً ترک ہی ہوگئی اور زیادہ توجہ مرثیے پر رہی۔

ان کے مرثیے کی طرف میلان کا واقعہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ خود کہتے ہیں کہ محرّم ۱۹۲۱ء کی چاندرات سے بے فصل کی برسات شروع ہوگئی، اس پر بیساختہ یہ شعر ہوگیا:

کتنا پانی ہے جو بے وقت برس جاتا ہے
اور کبھی قافلہ پیاسوں کا ترس جاتا ہے

مطلع ہی سے موضوع متعین ہو گیا تھا۔ اسی کیفیت میں انھوں نے پر شعوری، پھر غیر شعوری طور پر مرثیہ مکمل کر لیا۔ یہی مرثیہ انھوں نے نیوتنی کی ایک مجلس میں پڑھا، پھر اسی کو لکھنؤ میں ناظم صاحب کے امام باڑے میں ایک مجمع کثیر کے سامنے پیش کیا۔ یہ پہلا ہی مرثیہ بہت کامیاب رہا۔ اس کی شہرت دور دور پہنچی، اور یہ متعدد مقامات کی مجلسوں میں پڑھا گیا۔

اس کے بعد انھوں نے کئی مرثیے کہے۔ ان میں سے بعض چھپ چکے ہیں اور بعض ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ "شہادت سے پہلے" اور "شہادت کے بعد" دو مرثیے نظامی پریس، لکھنؤ سے ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئے۔ پاکستان میں تین مرثیے شائع ہوئے (لاہور ۱۹۷۰ء، دو مرثیے؛ کراچی ۱۹۷۲ء، ایک مرثیہ)۔ ان کے مرثیوں میں واقعاتِ کربلا سے زیادہ انسانیت کی عظمت اور اسلامی اقدار کی برتری پر زور دیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے مرثیوں کے ذریعے سے زندگی اور عمل کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح انھوں نے مرثیے کو نیا رخ دیا ہے، اور پھر کس زبان میں کہ اس کی رعنائی اور توانائی پر ذوقِ سماعت اور حسنِ فصاحت و بلاغت سو سو مرتبہ قربان ہو جائے۔ ان کے سب مرثیے اس قابل ہیں کہ شائع کر دیے جائیں۔ مرثیوں کے علاوہ نظمیں، رباعیاں، سلام بھی خاصی تعداد میں ہیں؛ یہ بھی محفوظ کر دینا چاہییں۔ یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ غزل ہو یا مرثیہ، سید آل رضا اس دور کے منفرد سخنور تھے۔

شائق لکھنوی، سید یوسف حسین

میر انیس کے نام سے کون اردو جاننے والا واقف نہیں۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے میر خورشید علی نفیس (ف: مارچ ۱۹۰۱ء) کے نواسے میر علی محمد عارف (ف: اکتوبر ۱۹۱۶ء)

ماخذ: میر علی احمد دانش (پسر میر محمد ہادی لائق) لکھنؤ؛ دیباچہ معاملات سخن از سید یوسف حسین شائق لکھنوی و ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی (لاہور: ۱۹۷۰ء)

وفیات

بھی اپنے عہد کے مشہور مرثیہ گو تھے۔ عارف نے اپنی زندگی میں چار نکاح کیے، پہلے تین میر نفیس کی زندگی میں ہوئے، بلکہ یہ تینوں خود نفیس مرحوم ہی نے کیے تھے، چوتھا ان کی وفات کے بعد خود عارف نے کیا۔ پہلی بیوی میر انیس کے بھانجے میر محمد رضا المتخلص بہ رضا کی بیٹی تھیں۔ ان سے ایک بچہ ہوا، جو ایامِ شیرخوارگی میں فوت ہو گیا اور اسی کے بعد وہ خود بھی چل بسیں۔ دوسرا نکاح اندر سبھا کے مصنف امانت لکھنوی (ف: جنوری ۱۸۵۹ء) کی پوتی اور سید حسن لطافت (ف: مئی ۱۹۳۰ء) کی دخترِ نیک اختر سے ہوا۔ ان کے بطن سے دو لڑکے ہوئے، دونوں کمسنی میں داغِ مفارقت دے گئے اور دوسرے کی زچگی کے دوران میں وہ خود بھی رحلت کر گئیں۔ اس کے بعد میر نفیس نے ان کا تیسرا نکاح میر فضل عباس کاظمی کی بڑی صاحبزادی مریم سے منعقد کیا۔ ان سے دو بیٹے، سید ظفر حسین فائق عرف بابو صاحب (ف: ۲۱ شعبان ۱۳۶۴ھ/ یکم اگست ۱۹۴۴ء) اور میر محمد ہادی لائق (ف: ۸ مئی ۱۹۷۷ء) اور ایک بیٹی بیبا بیگم ہوئیں۔ اس بیگم کی وفات میر نفیس کی رحلت کے بعد ہوئی۔ اب عارف نے چوتھا نکاح حکیم میرزا محمد جواد کی دختر (اور حکیم محمد علی عرف حکیم منے آغا فاضل کی ہمشیر) تقیہ بیگم سے کیا۔ ان سے چار بچے ہوئے، تین لڑکیاں (چھوٹو بیگم، ثریا بیگم، عالیہ بیگم) اور ایک لڑکا (یوسف حسین)۔ یہی یوسف حسین شائق لکھنوی کی حیثیت سے مشہور ہوئے؛[1] ان کا ۱۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال ہوا۔

سید یوسف حسین اپنے خاندانی مکان یعنی محلسرائے انیس، لکھنؤ میں ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد عارف کے قائم کردہ مدرسۂ علویہ میں مولوی سید محمد رضا سے پائی۔ یہ مدرسہ بھی اسی محلسرائے کے ایک حصے میں تھا، جس میں خاندان کی سکونت تھی۔ جس خاندان کے وہ چشم و چراغ تھے، اور اس وقت کے لکھنؤ کا جو ماحول تھا، اس میں شعر گوئی گویا لازمۂ حیات تھی۔ چنانچہ یوسف حسین نے جونہی ہوش سنبھالا، شعر کہنے لگے۔ شائق تخلص اختیار کیا اور اپنے بڑے علاتی بھائی بابو صاحب فائق سے مشورہ کرنے لگے۔

انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے کی سند لی تھی۔ اس کے بعد مہاراجا محمد امیر احمد خاں

[1] ان کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے، تحریر (۱۱: ۴: ۸۰-۸۴)

مرحوم زف: اکتوبر ۱۹۴۲ء والیِ محمود آباد نے انھیں اپنے کتابخانے کا مہتمم مقرر کردیا۔ مہاراجا مرحوم، ان کے والد میر علی محمد عارف کے شاگرد بھی تھے۔ محمود آباد سے ایک ماہنامہ "رہبر" بھی مہاراجا کی سرپرستی میں نکلتا تھا، شائق اس کے بھی مدیر بنا دیے گئے تھے۔

تقسیمِ ملک کے بعد وہ پاکستان چلے گئے اور کراچی میں مقیم ہو گئے۔ وہاں اولاً کچھ دن حبیب بنک میں ملازم رہے۔ پھر عمر زیادہ ہو جانے پر اس سے سبکدوشی حاصل کرلی۔

قیامِ پاکستان کے دوران میں انھوں نے سید صفدر حسین، لاہور کے تعاون سے اولاً "تجلیاتِ انیس" کے عنوان سے انیس کے سلاموں کا مجموعہ شائع کیا۔ اس کے بعد اپنے والد عارف مرحوم کے ۱۶ مرثیے "معارفِ سخن" کے نام سے مرتب کیے۔ افسوس کہ انھیں اس مجموعے کا مطبوعہ نسخہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ کتاب ان کی وفات کے چند دن بعد شائع ہوئی۔ اس کے شروع میں عارف کے حالات ان کے بڑے بھائی میر محمد ہادی لائق مرحوم کے قلم سے ہیں، اور مقدمہ ڈاکٹر سید صفدر حسین کا ہے۔

وہ انیس کے مراثی کو بھی تصحیح و ترتیب کے پورے اہتمام سے از سرِ نو شائع کرنا چاہتے تھے۔ چھ جلدوں کا منصوبہ تھا۔ چونکہ آخری ایام میں آنکھوں میں پانی اتر آنے سے بینائی بہت کمزور ہو گئی تھی، اس لیے یہ کام بہت آہستہ آہستہ ہوا۔ بہر حال یہ بہت حد تک مکمل ہو چکا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ یہ تمام ذخیرہ ڈاکٹر صفدر حسین کے سپرد کر گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے خاندان کے متعدد مرثیہ گویوں کے کلام (خصوصاً میر انیس) کو متعارف کرانے میں قابلِ قدر کام کیا ہے۔

ان کی شادی شبِ جمعہ ۲۲ ستمبر ۱۹۳۸ء میں مفتی گنج، لکھنؤ کے سید نقی حسین نقی رضوی کی دختر سیدہ بیگم سے ہوئی تھی۔ ان سے دو بیٹیاں اور ایک بیٹا ہوئے۔ بیٹا مدت ہوئی فوت ہو گیا تھا۔ دونوں بیٹیاں زندہ ہیں۔ بڑی زبیدہ شادی شدہ اور اپنے گھر بار والی ہے؛ چھوٹی شاہدہ ناکتخدا ہے۔

کبرسنی کے ساتھ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ اسی میں بظاہر کسی مرض کے بغیر بعمر ۷۸ سال

۱۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو اپنے مکان میں (مارٹن ناظم آباد، کراچی) وقت اخیر آگیا۔ جنت البقیع قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

سحر عشق آبادی، بھگوان چندر بھٹناگر

قوم کے بھٹناگر کائستھ اور میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ عشق آباد، میرٹھ ہی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اپنی نسبت عشق آبادی لکھتے تھے۔ ان کا اپنا ایک شعر ہے:

لوگ کہتے ہیں اب جسے میرٹھ ہاں، وہی تھا، وہی ہے عشق آباد

ان کے والد منشی نند لال بھٹناگر میرٹھ شہر کے دفتر میں ملازم تھے۔ دورانِ ملازمت میں انھوں نے میرٹھ کے محلّہ نوگزہ میں اپنا ذاتی مکان خرید لیا تھا۔ بھگوان چندر سحر پانچ بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ ایک بھائی ان سے بڑے تھے جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو چھوٹے بھائی زندہ ہیں۔ چوتھے ہریش چندر اہر عشق آبادی شاعر بھی تھے؛ یہ بھی رحلت کر گئے۔ تین بہنیں حیات ہیں۔ سب سے چھوٹی بہن چندر کرن بھٹناگر اپنے خاندان کے ساتھ میرٹھ میں مقیم ہیں۔ یہ وہاں میونسپل بورڈ کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھیں؛ ۱۹۷۷ء میں پنشن پر ریٹائر ہوئیں۔

بھگوان چندر مارچ ۱۹۰۲ء میں میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ لکھنؤ بھیج دیے گئے۔ وہاں ان کے پھوپھا بابو ترہینی سہائے امین آباد ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ نویں تک انھوں نے یہاں تعلیم حاصل کی لیکن انھیں پڑھنے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی، اپنا بیشتر وقت سیر سپاٹے میں صرف کرتے تھے۔ ترہینی سہائے نے ان کے والد کو جب حالات سے آگاہ کیا، تو انھوں نے بیٹے کو میرٹھ واپس بلا لیا۔ یہاں انھوں نے نانک چند ہائی اسکول سے دسویں (میٹرک کولیشن) کی سند لی۔

مآخذ: ماسٹر ثروت حسین ثروت میرٹھی؛ مسز چندر کرن بھٹناگر میرٹھ بوساطت سید محمد طارق میرٹھی؛ دلّی اسٹر ایس۔ این بھٹناگر وکیل بوساطت حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ (بھٹناگر صاحب سحر مرحوم کے ہم جماعت رہے ہیں)؛ ماہنامہ شانِ ہند دلّی (ستمبر ۱۹۷۰ء)

کسب معاش کا مرحلہ آیا، تو انھوں نے کتابت کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کا اس زمانے کے اچھے خوشنویسوں میں شمار ہوتا تھا اور وہ میرٹھ کے دو چوٹی کے ناشروں کے وہاں کتابت کا کام کرتے تھے۔ کسی زمانے میں میرٹھ سے دو رسالے نکلتے تھے، ستارہ اور سیوک۔ سحر ان دونوں کے ایڈیٹر بھی رہے۔

۱۹۲۵ء کے قریب وہ دلی منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی بنیادی طور پر مختلف پرچوں میں کتابت ہی ذریعۂ روزگار رہی، لیکن اس کے علاوہ انھوں نے بعض رسالوں کے مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا، مثلاً پھول، نرالی دنیا وغیرہ۔ اس کے علاوہ چندے دلّی نارمل اسکول میں معلم اردو کے طور پر بھی کام کیا۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء-۱۹۶۳ء میں کتابت کا پیشہ ترک کر دیا۔ اس کے بعد مختلف رسالوں میں کام کرتے رہے اور وہاں سے جو کچھ مل جاتا، اسی پر زندگی کا مدار رہا۔ ۱۹۷۷ء میں حکومت کی طرف سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ یہ آخر تک ملتا رہا، اور یہی ان کی بسر اوقات کا ذریعہ تھا۔ شاید ۱۹۷۷ء میں اس میں اضافہ ہوا اور یہ پونے دو سو ہو گیا تھا۔

لکھ چکا ہوں کہ ان کی ابتدائی تعلیم امین آباد ہائی اسکول، لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ اس زمانے میں مشہور یہ زمانہ شاعر مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی یہاں فارسی کے مدرس تھے۔ سحر کے دل میں وہیں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے شروع میں قمر تخلص اختیار کیا۔ ابتدائی زمانے میں چندے عزیز سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لی۔ عزیز کی استادی کا ذکر ایک رباعی میں بھی کیا ہے:

جس نے نہ "صحیفۂ ولا" دیکھا ہو   کیا جانے کہ کہتے ہیں قصیدہ کس کو
کھنچ سکتی ہے کس طرح غزل کی تصویر   تم "گلکدہ" پڑھ کر یہ معما سمجھو

("صحیفۂ ولا" اور "گلکدہ" عزیز کے مجموعے ہیں: "صحیفہ ولا" قصائد کا، "گلکدہ" غزلیات کا۔)

اسی دور میں لکھنؤ کے اور اساتذۂ عصر سے بھی دوستانہ تعلقات قائم ہوئے۔ لیکن نہ ابھی شاعری میں پختگی آئی تھی، نہ اس شاگردی استادی کے تعلق ہی میں، کہ وہ میرٹھ واپس چلے گئے۔ یہاں ان کا تعلق جناب ثروت حسینی ثروت میرٹھی سے ہوا۔ دونوں ہم عمر کا زیادہ

تفاوت نہیں تھا۔ سحر مشکل سے پندرہ سولہ برس کے تھے، اور ثروت شاید دو ایک برس ان سے بڑے ہوں۔ دونوں میں جو رشتۂ اخلاص اوّل دن قائم ہوا، اس میں زندگی بھر کمی نہیں آئی۔ ان ایام میں ثروت صاحب (یوپی کے) منشی کامل اور پنجاب کے منشی فاضل کے امتحانوں کی تیاری کر رہے تھے۔ ان میں ایک پرچہ عروض سے متعلق بھی تھا۔ سحر نے ان سے لے کر یہ کتابیں پڑھیں اور پھر دونوں نے آپسی بحث مباحثے سے اس فن سے ماہرانہ واقفیت پیدا کر لی۔ اس کے بعد سحر نے عروض کو اپنا مخصوص موضوع مطالعہ بنا لیا اور طویل محنت اور غور و فکر سے اس فن میں خود درجۂ اجتہاد حاصل کر لیا۔ اسی لیے لوگ انھیں علّامہ اور علّام کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

میرٹھ کے قیام کے زمانے میں بھی وہ شعر کہتے اور اس میں ثروت صاحب ہی سے دوستانہ مشورہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ثروت صاحب نے میرے نام اپنے ایک خط میں لکھا ہے:

> میرے بہت سے شاگرد بھی ہوئے اور دوست بھی بنے۔ لیکن ان (یعنی سحر۔ م ․ ر) جیسا لائق، ہونہار، قابل شاگرد نہ کوئی ہو سکا اور نہ مخلص دوست۔

سحر نے اپنے مجموعۂ کلام "گلبانگ" کے دیباچے میں (بعنوان حقیقت) اپنی شاعری اور اپنے مسلکِ شاعری کے بارے میں یہ لکھا ہے:

> کلام کے متعلق واقعہ یہ ہے کہ میرا مسجود خود اشارہ کرتا ہے اور میں لکھنے لگتا ہوں۔ اس لیے نہ میں کسی خطا کا مرتکب ہوں، نہ اوصاف کا ضامن ... ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے۔ اس لیے میں کسی کی تقلید نہیں کر سکتا۔ بظاہر لکھنؤ کی زبان کا مدّاح ہوں۔ لیکن عشق آباد کی آب و ہوا سے کافی متاثر ہوں۔ ابتدا میں قلم سے خود بخود جو اشعار نکل جاتے تھے، انھیں لسان الہند مرزا عزیز لکھنوی کو دکھاتا تھا۔ وہ بڑے عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔ مجذوب کی بڑ میں قلم لگا کر سنوارتے تھے، اس

لیے ہیں ان کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اور مشوروں کے لیے حضرت صفی لکھنوی
محترم سحبان العصر میرٹھی، خواجہ عشرت لکھنوی، برادرِ معظم حضرت اثر
لکھنوی کا ممنون ہوں۔

اس اقتباس میں "سحبان العصر میرٹھی" سے جناب ثروت حسین ہی کی ذات مراد ہے۔ ان سے متعلق اپنی نظم "عشق آباد" میں بھی لکھا ہے:

کاشش، سحبانِ عصر ثروت ہی رہیں زینت فزائے عشق آباد

ان کا ایک مختصر مجموعہ کلام "گلبانگ" ان کے ایک شاگرد نند لال پروانہ کا مرتب کردہ شائع ہو چکا ہے (دلی: ۱۹۶۵ء)۔ یقیناً ابھی بہت کلام غیر شائع شدہ موجود ہوگا۔ لیکن ہے یہ کہ انھیں شعر سے زیادہ نثر سے شغف تھا، چونکہ عروض سے خاص دلچسپی تھی، اس لیے وہ کبھی کبھی قصداً زحافات کی شاعری سے گریز نہیں کرتے تھے، تاکہ پڑھنے والے ان کا کلام خارج از بحر خیال کر کے اعتراض کریں، جس سے مباحثہ شروع ہو جائے اور وہ آج کل کے برخود غلط شاعروں اور نقادوں کی قلعی کھول سکیں۔ مثلاً ایک مرتبہ ان کے اس شعر پر خاصی چپقلش رہی تھی:

مجھ سے تمھیں عشق غلط، میں نے دیا دل ناحق
تم سے جدائی کا مجھے کیوں نہ رہے دل سے قلق

بالآخر میدان ان کے ہاتھ رہا اور معترضوں کو ہتھیار ڈال دینا پڑا۔

افسوس کہ ان کی بیشتر تصنیفات زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہو سکیں۔ ایک تالیف "نقد التاریخ" مختلف واقعات کی تاریخوں پر مشتمل ہے۔ وہ تخرجہ و تعمیہ ناپسند کرتے تھے، ہمیشہ ایک مصرعے کی مکمل تاریخ کو ترجیح دیتے تھے۔ دوسری کتاب "عیوبِ فصاحت" ہے، اس میں متروکات کو مدلل طور پر ثابت کیا ہے۔ لیکن سب سے اہم کتاب "سحر العروض" ہے۔ یہ ان کا خاص میدان تھا اور اس وقت تک جو کچھ اس موضوع پر لکھا گیا ہے، وہ ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس مشکل فن کو ایسی عمدگی سے پیش کیا ہے کہ تمام گتھیاں سلجھ گئی ہیں۔ اس کتاب اور ان کے دیوانِ دوم کے مسودے ان کے شاگرد زار علامی کی تحویل میں ہیں

انھیں چاہیے کہ انھیں شائع کرکے استاد کی روح کو خوش کردیں۔ بقیہ مسودات مرحوم کے پسماندگان کے پاس ہیں۔ ان کے نثری مضامین کی بھی خاصی تعداد مختلف رسائل میں منتشر پڑی ہے۔ ان کا جمع کردینا بھی علم کی خدمت ہوگی۔

عرفِ عام میں مذہب کا جو تصور ہے، اس سے انھیں اتفاق نہیں تھا اور کسی مذہبی کتاب پر بھی مکمل یقین نہیں تھا۔ البتہ موحّد ضرور تھے۔ ان کے مزاج میں قلندری تھی اور وہ اظہارِ رائے میں بیباک اور کسی لگی لپٹی رکھنے کے روادار نہیں تھے۔ چنانچہ کبھی کبھی مضمون بھی "زندہ قلندر" کے فرضی نام سے لکھتے رہے۔

ن کی شادی محلہ چیلی واڑہ (نزد دہلی دروازہ) میرٹھ میں ہوئی تھی۔ ان کی بیوی کا نام بملا تھا۔ اس خاتون کے والدین بچپن میں انتقال کر گئے تھے، اور انھیں ان کے لاولد خالو منشی شنکر لال ایمن نے پالا پوسا تھا۔ ۱۷-۱۸ برس کی عمر میں شادی ہوئی اور سات آٹھ سال بعد تقریباً ۲۵ برس کی عمر میں وہ فوت ہوگئیں۔ اولاد میں صرف دو لڑکیاں زندہ رہیں: چھوی اور شردھا۔ چھوی کی شادی عبدالعظیم صاحب سے ہوئی تھی۔ وہ دو بچے اپنی یادگار چھوڑ کر ۷ اگست ۱۹۷۵ء کو انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ ان کی وفات پر انھوں نے "اشکِ خونیں" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی، جس میں تاریخ کا بند ہے:

ہے واسطہ اے بیٹی! میری الفت کا
تو عرش پہ جا، برہم کی جیوتی میں سما
بیٹے کی طرح نازوں سے جس کو پالا
تھی گھات میں جب چھوی کو لے بھاگی قضا
(۱۹۷۵)

دوسری بیٹی شردھا بھی شادی شدہ اور اپنے خاندان کے ساتھ خوش و خرم دہلی میں مقیم ہے۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ کمزور ہوگئے اور اکثر بیمار رہنے لگے تھے۔ وہ اپنی چھوٹی بیٹی شردھا کے مکان پر تھے۔ جب دوا دوش سے کوئی فائدہ نہ ہوا، تو انھیں یقین ہوگیا کہ اب میں بچنے کا نہیں۔ ہندوؤں میں بیٹی کے پاس مرنا بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ اس پر وہ اپنے دولت

بیسم سیلمیٰ ظفر ادیب صاحب کے مکان پر اٹھ گئے۔ وہیں ۲۱ مارچ ۱۹۷۸ء صبح کے پانچ بجے اس عالمِ فانی کو خیر باد کہی۔ اسی دن ارتحالِ الٰہی، اور جسدِ خاکی کو نگم بودھ گھاٹ کے شمشان میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

تاج بھوپالی، سیّد محمد علی

ان کا متوسط ال حال خاندان سرونج (بھوپال) کا رہنے والا تھا، اور وہاں یہ لوگ پیرزادہ کے نام سے معروف تھے۔ چنانچہ سرونج میں آج تک "پیرزادہ پورہ" محلّہ موجود ہے، جہاں ان کے خاندان کی کسی زمانے میں سکونت تھی۔ لیکن محمد علی خود بھوپال میں گلی ہالن والی (عقب محلہ سرائے سکندر قلی خان) کے مکان موسومہ کیبٹ والا میں ۱۴ جولائی ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئے سرونج سے نقلِ مکان سب سے پہلے محمد علی کے دادا سیّد سخاوت علی نے کیا۔ وہ ریاست کی سوار فوج میں ملازم ہو گئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاج کے والد سیّد رمضان علی پیادہ فوج (سلطانیہ انفنٹری) میں حولدار تھے۔ والدہ کا نام صغریٰ تھا، اور وہ سرونج کی تھیں۔

سیّد رمضان علی شعر کہتے تھے، اس میں خاص طور پر "چار بیت" سے مزاولت تھی، اور اس میں ان کی اچھی شہرت تھی۔ افسوس کہ ان کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ حافظہ اتنا قوی تھا کہ اپنا پورا کلام ازبر تھا۔ اس لیے کبھی اسے قلمبند کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب ان کی موت کے ساتھ ضائع ہو گیا۔ اسی یادداشت اور حافظے کا کرشمہ تھا کہ انھیں داستانِ امیر حمزہ اور طلسم ہوشربا کے صفحے کے صفحے زبانی سنا دینے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ بھوپال کے صاحبِ دل بزرگ اور دارالعلوم الٰہیہ کے بانی مولوی عبدالخالق نے ان سے کہا: "سیّد! تو یہ جھوٹی کتابیں حفظ کر چکا ہے، اب قرآن کیوں نہیں حفظ کر لیتا؟" سیّد رمضان علی پر مولوی عبدالخالق مرحوم کی بات کا ایسا اثر ہوا کہ اس کے بعد انھوں نے تھوڑی مدّت میں قرآن حفظ کر لیا۔

فوج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انھوں نے ناکیداری اختیار کر لی تھی۔ گٹھیا کے مریض

مآخذ: مکتوبات جناب محمد نعمان خان، بھوپال

تھے۔ کبر سنی اور ذرائع معاش کی قلت کے باعث آخری ایام بہت تنگی ترشی میں بسر ہوئے۔ اسی حالت میں ۸ ۱۹۲۸/۱۹۲۹ء میں رحلت کی۔ محمد علی اس وقت ۱۲-۱۳ برس کے اور مکتب (مسجد لستر ان بانو بھوپال) میں تیسرے درجے کے طالب علم تھے۔ والد کی وفات نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور وہ کسب معاش کے لیے ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے سب سے پہلی نوکری سلامیہ ہوٹل (بھوپال) میں کی۔ اسی زمانے میں اردو ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابتدا افسانہ نگاری سے کی۔ ان کا پہلا افسانہ غالباً ماہنامہ خیام لاہور میں ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا لیکن بھوپال کی شعری فضا اور ذاتی محرومیوں نے جلد انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کر دیا۔ اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کا ملک بھر میں غلغلہ تھا اور بھوپال میں بھی اس کا فعّال مرکز تھا۔ جان نثار اختر (ف: اگست ۱۹۷۶ء) ان دنوں حمیدیہ کالج بھوپال میں صدر شعبۂ اردو و فارسی تھے۔ وہی مقامی انجمن ترقی پسند مصنّفین، کے صدر بھی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں اس انجمن کے اہتمام میں کل ہند کانفرنس کر ڈالی جس کا افتتاح مولانا سیّد سلیمان ندوی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۵۳ء) نے کیا تھا۔ مختلف اجلاس کرشن چندر (ف: مارچ ۱۹۷۷ء)، پنڈت سندر لال اور جوش ملیح آبادی کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ اس کانفرنس کے انتظام میں تاج نے بھی بہت سرگرمی سے حصّہ لیا۔ قدرتاً ترقی پسند تحریک کا ان کی شاعری پر بھی بھرپور اثر پڑا۔

انھوں نے شروع میں اپنے کلام پر مستاد احمد سہا مجددی (ف: دسمبر ۱۹۴۷ء) سے اصلاح لی۔ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ کیونکہ وہ ان کے شعروں میں اتنا ردو بدل کر دیتے تھے کہ اس سے ان کا اپنا مفہوم ہی عنت ربود ہو جاتا تھا۔ اس پر تاج نے انھیں چھوڑ کر عبد الحمید شاد کا دامن تھاما۔ لیکن شاد کا اسلوب اصلاح بھی سہا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس لیے جلد ہی تاج ان سے بھی کنارہ کش ہو گئے۔ اس کے بعد عمر بھر کسی سے اصلاح نہیں لی۔

۱۹۵۲ء میں عادل رشید (ف: جنوری ۱۹۷۲ء) نے انھیں فلمی گیت لکھنے کے لیے بمبئی آنے کی دعوت دی۔ یہ بمبئی پہنچے۔ وہاں "جلتے دیپ" فلم کے گیت لکھے، جو کامیاب تصوّر

لیے گئے۔ لیکن بمبئی کا مشینی اور سراسر مادّی ماحول انھیں پسند نہیں آیا، چنانچہ بھوپال واپس چلے گئے۔ لیکن اصلی مسئلہ یہ نہیں تھا کہ رہیں کہاں، بلکہ یہ کہ کھائیں کیا! بھوپال آئے، تو بسر اوقات کے لیے اب کے احمد ہوٹل میں ہیڈ منیجری کی ملازمت قبول کرلی۔ احمد ہوٹل کا بھوپال کی ادبی زندگی میں بہت نمایاں مقام ہے۔ یہ شہر بھر کے ادیبوں اور شاعروں کا مقبول ہوٹل تھا۔ یہاں روزانہ ان کی نشست رہتی؛ وقتاً فوقتاً ادبی جلسے اور شعری ہنگامے بھی ہوتے۔ اس چہل پہل کے لیے تاج بھی کچھ کم ذمّہ دار نہیں تھے۔ یہاں کے بیشتر آنے والے ان کے دوست تھے اور وہ خود بھی ان کی ادبی اور غیرادبی سرگرمیوں میں برابر کے شریک رہتے۔

تاج، احمد ہوٹل کے کام سے مطمئن تھے، لیکن فلکِ ناہنجار کو ان کی یہ تھوڑی سی فراغت بھی پسند نہ آئی۔ ہوٹل کے مالک حاجی عبدالصمد نے ہوٹل کی عمارت فروخت کردی، وہ چاہتے تھے کہ عمارت ایک بڑی تجارتی کمپنی کو کرایے پر اٹھادی جائے۔ تاج اس سے متفق نہیں تھے۔ اس اندیشے سے کہ مبادا حاجی صاحب موصوف سے کوئی بدمزگی پیدا ہوجائے، انھوں نے ہوٹل کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

ہوٹل احمد کی ملازمت چھوڑنے کے بعد انھوں نے ایک مقامی کالج کے کینٹین کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن یہاں ان کے پاؤں جم نہ سکے۔ اتنے میں فلم ہدایتکار ایس ام ساگر نے انھیں بمبئی آنے اور بعض فلموں کے لیے گیت لکھنے کی پیشکش کی۔ اس سلسلے میں ان کا ۱۹۵۲ء کا تجربہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں تھا، لیکن مرتا کیا نہ کرتا، طوعاً و کرہاً انھوں نے پھر بمبئی کی راہ لی۔ ساگر ان کے پرانے دوست تھے، اور ان کی فلم "سرحدی لٹیرا" کے گانے بھی انھیں نے لکھے تھے۔ اب کے انھوں نے بمبئی میں "آنسو بن گئے پھول" کے گیت لکھے۔ لیکن اس کے بعد پھر وہی مشکل درپیش آئی، جو ۱۹۵۲ء میں ان کی واپسی کا باعث ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ بھوپال واپس آ گئے۔

اس کے بعد پریشان حالی کا دور شروع ہوا۔ بمبئی جانے سے قبل ہی ۱۹۶۴ء میں ان کی چہیتی بیوی انھیں داغِ مفارقت دے گئی تھیں۔ بمبئی میں تھے کہ ان کی غیرحاضری میں سب سے

بڑی لڑکی بھی جنت سدھاریں۔ دراصل ان کی بیٹی سے دل برداشتگی کے لیے یہ اموات بھی کچھ کم ذمہ دار نہیں تھیں۔ انھوں نے کئی جگہ نوکری کی کوشش کی، بالآخر ۱۹۷۰ میں تو اپنے خرچ سے ایک ہوٹل بھی کھولا (اس کا نام انڈیا گیٹ تھا) لیکن وہ ہر جگہ ناکام رہے۔

مسلسل ناکامیوں اور معاشی پریشانیوں نے انھیں بہت کمزور اور نڈھال کر دیا۔ اسی زمانے میں مدھیہ پردیش حکومت نے ان کا ڈیڑھ سو ماہانہ ادبی وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کا مشاعروں پر بھی بہت کچھ دار و مدار تھا۔ وہاں سے جو کچھ مل جاتا صبر و شکر سے اسی پر گزر بسر کر لیتے۔ دوست احباب بھی خیال رکھتے تھے۔ تاہم حالت بہت تسلی بخش نہیں تھی۔ ۱۹۷۶ میں ایک مشاعرے کے سفر کے دوران میں موٹر کار کے ایک حادثے نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جان تو بچ گئی لیکن جو کچھ پونجی پاس تھی (اور جس سے وہ اپنا دوسرا مجموعہ کلام چھپوانا چاہتے تھے) علاج معالجے میں ختم ہو گئی۔

مارچ ۱۹۷۸ میں ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بخار کے باوجود وہ مشاعرے میں شرکت کے لیے اندور گئے۔ بھوپال میں ایک دوست کی اچانک موت کے باعث فوراً واپس آنا پڑا۔ اس سے طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ ۷ اپریل ۱۹۷۸ کی شام انھیں علاج کے لیے حمیدیہ اسپتال بھوپال میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں معلوم ہوا کہ قلب کا عارضہ بھی ہے۔ ۹ اپریل کی صبح ذرا ہوش آیا، تو آخری شعر کہا:

جو دوسروں کے لیے ہمدمِ سخن ہوتا   اگر شراب نہ پیتا، تو آدمی ہوتا

۱۱ اپریل کو ڈاکٹروں نے کہا کہ انھیں سرسام کی شکایت بھی ہو گئی ہے۔ موت کا کیا علاج! پوری کوشش کے باوجود کوئی افاقہ نہ ہوا۔ چہار شنبہ ۱۲ اپریل ۱۹۷۸ مغرب سے کچھ پہلے ساڑھے پانچ بجے جاں بحق ہو گئے۔ جنازہ اگلے دن (۱۳ اپریل) ظہر کے بعد اٹھا اور انھیں سیفیہ کالج کے متصل قبرستان "بڑے باغ" میں دفن کر دیا گیا۔ مقصود عرفان نے قطعۂ تاریخ وفات کہا:

توڑ کر جامِ زندگی اپنا   چھوڑ کر میکدے کا راج چلا
زلفِ لیلائے شعر و فن کا اسیر   شاعرِ خوش بیان تاج چلا
(۱۹۷۸)

تاج نے حاجی عبدالصمد کی صاحبزادی عزیزہ بیگم سے شادی کی تھی۔ حاجی صاحب موصوف نواب
بھوپال مرحوم کے وہاں صرف خاص میں ملازم تھے۔ عزیزہ بیگم کا عارضۂ ذات الجنب سے
۱۹۷۴ء میں انتقال ہوا۔ بھوپال ٹاکیز کے مقابل کے قبرستان (بڑے باغ) میں مدفون ہیں
اس بیگم سے ان کے چھ اولادیں ہوئیں، پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا وجاہت علی۔ بڑی بیٹی
تاجور اختر شادی شدہ تھی، اس کا انتقال ہوگیا۔ باقی سب بچے بفضلہ زندہ سلامت ہیں۔
تاج مرحوم کی رند منشی کا لکھ ہی چکا ہوں۔ وہ گھر کی ذمہ داریوں سے بے نیاز تھے، بلکہ ان سے
عہدہ برآ ہونے کے لائق ہی نہیں تھے۔ لہٰذا ان بچوں کی دیکھ بھال پہلے ان کے بھائی
مقصود اختر نے کی اور پھر بہن صابرہ بیگم نے۔
انتخابِ کلام "قیمۂ گل" کے عنوان سے ۱۹۶۰ء میں بھوپال سے شائع ہوا تھا۔ ہنوز بہت
کلام غیر مطبوعہ موجود ہے۔ ان کا کلام پختہ شعور کا آئینہ دار اور عصری مسائل کا مظہر ہے
لیکن کہیں زبان و بیان میں ژولیدگی یا ابہامی نظر نہیں آتی۔ ان کے احباب کو چاہیے کہ پورا
کلام جمع کر کے شائع کر دیں۔

نیر ناگپوری، محمد یٰسین

ان کا مسقط الرأس ضلع اعظم گڑھ کا قصبہ مبارکپور تھا، جہاں سے ان کے جدِّ اعلیٰ حاجی
عبداللہ بن احمد ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد نقلِ مکان کر کے ناگپور میں جا بسے تھے۔
وہ اپنے زہد و اتقا کے لیے ممتاز تھے۔ انھوں نے حضرت اسمٰعیل شہید کے خلیفہ
مولانا کرامت علی جونپوری کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کے تین بیٹے ہوئے: محمد ابراہیم،
محمد طیب، محمد طاہر۔ تینوں انیسویں صدی کے آخری دہے میں طاعون کی نذر ہو گئے۔
محمد طاہر کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ محمد طیب نے ایک بیٹی حلیمہ اپنی یادگار چھوڑی۔ محمد
ابراہیم کے وفات کے وقت دو بیٹیاں (سائرہ اور طاہرہ) اور ایک بیٹا محمد حسیب اللہ تھا۔
یہی محمد حسیب اللہ، محمد یٰسین نیر کے والد تھے۔

ماخذ: مکتوبات محمد شرف الدین ساحل۔ ناگپور

محمد حبیب اللہ بھی اپنے دادا کی طرح نیکی اور شرافت کا پتلا تھے۔ ہر کوئی ان کا اکرام و احترام کرتا۔ پارچہ بافی ذریعۂ معاش تھی۔ ۱۱ اکتوبر ۱۹۴۹ء (۱۷ ذی الحجہ ۱۳۶۸ھ) بعارضۂ قلب وفات پائی۔ اپنے پیچھے چار بیٹے (زین العابدین عابد، محمد یٰسین منیرؔ، عبدالکلام، محمد معین الدین) اور چار بیٹیاں چھوڑیں۔

محمد یٰسین ۱۶ مارچ ۱۹۳۰ء کو ناگپور میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول، مذہبی طنطنے کے باعث انگریزی اور مغربی علوم کی تحصیل کے خلاف تھا۔ اسی لیے جب محمد یٰسین سنِ شعور کو پہنچے تو محلے کے ایک بزرگ حاجی الٰہی بخش (پیش امام جامع مسجد، مومن پورہ، ناگپور) کے ذاتی مکتب میں بٹھا دیے گئے۔ یہاں قرآن مجید ناظرہ اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد مدرسۂ اسلامیہ میں داخلہ لے لیا جہاں مولانا ارشد القادری ان کے استاد تھے۔ ان سے بھی فارسی اور عربی پڑھتے رہے۔ ابھی تعلیم کی تکمیل نہیں کر سکے تھے کہ والد نے اپنے کاروبار میں شریک کر لیا اور وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

والد کی زندگی بھر ان کے ساتھ کام کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد سارا کاروبار ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ پوری تندہی اور دیانتداری سے نہ صرف اس کی ساکھ قائم رکھی بلکہ اسے فروغ بخشا۔ بھائیوں کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور انھیں ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ لیکن افسوس کہ خانگی اختلافات کے باعث آخری حصۂ عمر بہت بے اطمینانی اور پریشانی میں بسر ہوا۔ انھوں نے یہ اختلافات دور کرنے اور خاندان کا اتفاق قائم رکھنے کی جان توڑ کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ یہی ناکامی دراصل جان لیوا ثابت ہوئی۔

۴ مارچ ۱۹۷۸ء کو فالج کا حملہ ہوا۔ ساتھ ہی فشارِ دم کے شکار ہو گئے۔ اسپتال میں علاج ہوا اور تین ہفتے بعد گھر آ گئے۔ روبصحت تھے کہ ۱۹ اپریل (۱۹۷۸ء) کو یک لخت پھر دورۂ خون بہت بڑھ گیا جس سے دماغ کی نس پھٹ گئی اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ دوبارہ اسپتال میں داخل کیا گیا، لیکن اب کے علاج معالجے سے کسی طرح کا فائدہ نہیں ہوا۔ اسی میں ۲۴ اپریل ۱۹۷۸ء کو دن کے دس بجے طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ اسی دن بعد نمازِ مغرب مسلم قبرستان، مومن پورہ، ناگپور میں تدفین عمل میں آئی۔ شاطر حکیمی نے قطعۂ تاریخ وفات

کہا:

آہ برلبِ برادر و مادر — زن و فرزند وقفِ سوز و گداز
جانبِ خلد ہو گیا رخصت — شاعرِ پاکباز، خوش آواز
سونی سونی ہے بزمِ شعر و سخن — "حسرتا نیرِ ہنر پرواز"
(۱۴۰۹)

ان کی عمر محض ۱۸ برس کی تھی، جب ۱۹۴۴ء میں ان کی شادی اپنے رشتے کے چچا، میلاد خوان و مرثیہ خوان عبدالستار صاحب کی بیٹی رابعہ بیگم سے کر دی گئی۔ وفات کے وقت ان کی دس اولادیں (سات بیٹیاں اور تین بیٹے) زندہ و سلامت موجود تھیں۔

ان کے گھر میں شاعری ان کے بڑے بھائی محمد زین العابدین عابد کے ذریعے سے آئی، جو ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی مرحوم (ف: مئی ۱۹۶۹ء) کے شاگرد تھے۔ انھیں کی دیکھا دیکھی ۱۹۵۲ء سے محمد یسین بھی شعر کہنے لگے۔ اس میں مشورہ عبدالمجید رواں جونپوری (ولادت: ۱۹۰۶ء) تلمیذ شفیق جونپوری مرحوم سے لیا، لیکن کلام کی اشاعت کی طرف سے بہت بے نیاز تھے۔ کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے نعیم الدین اختر بی۔ ایس سی: مدرس، اقرا ہائی اسکول، مومن پورہ، ناگپور) کلام جمع کر کے شائع کرنے کا انتظام کر رہے ہیں۔

ماہر القادری، منظور حسین

یو پی کے ضلع بلند شہر میں علی گڑھ سے تقریباً ۴۰ کیلو میٹر دور ڈبائی ریلوے اسٹیشن کے قریب شیوخ کی ایک پرانی بستی کسیر کلاں ہے۔ یہ لوگ اپنا سلسلۂ نسب خواجہ عبید اللہ احرار سمرقندی سے ملاتے ہیں۔ منظور حسین ماہر القادری اسی خاندان کے نام لیوا تھے۔ ان کے والد شیخ محمد معشوق علی اس قصبے کے سر برآوردہ لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ خاندان کا پیشہ

ماخذ: ماہر القادری مرحوم کے خود نوشت حالات (مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۷۰ء)؛ حیدرآباد کے شاعر (انتخابِ کلام)، از خواجہ حمید الدین شاہد (حیدرآباد: ۱۹۵۸ء)؛ روزنامہ ڈان (انگریزی)، کراچی: ۱۳ مئی ۱۹۷۸ء؛ مسرور حسین (برادر ماہر القادری)، کراچی؛ محمود فاروقی، مرتب ماہنامہ فاران، کراچی؛ روزنامہ (اردو) جنگ، کراچی: ۱۵ مئی ۱۹۷۸ء۔

اور مشغلہ عام طور پر صرف زمینداری اور کاشتکاری تک محدود رہا۔ اس روایت کے خلاف شیخ محمد معشوق علی نے معقول تعلیم بھی پائی۔ وہ کسیر کلاں کے پہلے ادیب اور انگریزی داں تھے۔ سکانوؔ کے برانچ ڈاکخانے میں پوسٹ ماسٹر بھی رہے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ظریفؔ تخلص تھا۔ لیکن کسی سے کبھی مشورہ نہیں کیا۔ ظریف تخلص کے باوجود کلام میں مزاح یا غیر سنجیدگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ شروع میں غزل بھی کہتے رہے، لیکن بعد کو صرف حمد و نعت اور منقبت سے تعلق رکھا۔ افسوس، ان کا کلام محفوظ نہیں رہا۔ انھوں نے اپنے ذاتی اور خاندانی حالات میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک میلاد نامہ بھی تالیف کیا تھا۔ نہ صرف یہ دونوں کتابیں شائع نہیں ہوئیں، بلکہ ان کے مسودے بھی ضائع ہو گئے۔

منظور حسین کسیر کلاں ہی میں (ہفتۂ اول) محرم ۱۳۲۴ھ[۱] (مطابق ۲۵ فروری تا ۳ مارچ ۱۹۰۶ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام منظور حسین تاریخی تھا جس سے بحساب جمل (۱۳۲۴) برآمد ہوتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ ان سے کچھ اردو اور گلستاں اور کریما اور آمد نامہ تک فارسی پڑھی۔ اس کے بعد کسیر کلاں کے پرائمری مدرسے میں دوسری جماعت تک پڑھتے رہے۔ پھر گھیر مڈل اسکول، ڈبائی میں داخلہ لے لیا۔ بعد کو یہ اسکول ترقی کر کے ہائی اسکول بن گیا تھا۔ وہیں سے ۱۹۲۴ء میں الٰہ آباد بورڈ کے میٹرک کولیشن امتحان میں بیٹھے، لیکن ریاضی کے پرچے میں فیل ہو گئے۔ اس پر وہ علی گڑھ بھیج دیے گئے، جہاں سے ۱۹۲۶ء میں دسویں کی سند حاصل کی۔ اس دوران میں (ستمبر ۱۹۲۴ء میں) والد کا انتقال ہو چکا تھا، اور گھر کے حالات اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سازگار نہیں رہے تھے، اس لیے یہ سلسلہ آگے جاری نہ رہ سکا۔ البتہ اس کے بعد گھر ہی پر نجی انتظام کے تحت عربی اور فارسی کی تحصیل جاری رکھی۔

مولانا عبد القدیر بدایونی (ت ۲۱ شوال ۱۳۷۹ھ/ ۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء) اس زمانے کے مشہور عالم اور واعظ تھے۔ انھوں نے کچھ پیری مریدی کا سلسلہ بھی کر رکھا تھا۔ وہ وعظ کے

---

[۱] یہ تاریخ خود ماہر القادری مرحوم کی تحریر سے ماخوذ ہے، ان کے بھائی مسرور حسین نے ۸ جمادی الآخرہ ۱۳۲۴ھ لکھی ہے۔ مقدم الذکر تاریخ مرجح ہے

لیے کسیر کلاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک مرتبہ جب آئے تو قصبے کے بعض اور لوگوں کے ساتھ پندرہ سالہ منظور حسین نے بھی سلسلۂ قادریہ میں ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی (بعد کو اسے فسخ کر دیا تھا)۔ اسی واقعے کی یادگار ان کے نام کے ساتھ "قادری" کے لاحقے کا مستقل اضافہ تھا۔

۱۹۲۸ء کے شروع میں ماہر صاحب دلّی چلے آئے۔ یہاں انھوں نے اولاً مدرسۂ فتحپوری ہائی اسکول پھاٹک حبش خان میں چند مہینے مدرسی کی، یہ چھوٹی جماعتوں کو انگریزی اور اردو پڑھاتے تھے۔ اسی سال مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سہ روزہ الجمعیۃ کی ایڈیٹری چھوڑی۔ مولانا عبدالقدیر بدایونی ان ایام میں دلّی آئے، تو ان کے ذریعے ماہر صاحب کا مولانا مودودی سے تعارف ہوا۔ مودودی صاحب انھیں مولانا احمد سعید، ناظم جمعیۃ العلمائے ہند کی خدمت میں لے گئے۔ مولانا احمد سعید نے ان سے امتحاناً ایک سیاسی موضوع پر شذرہ لکھنے کو کہا، جو انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے قلمبند کر دیا۔ مولانا نے اس پر صاد کر دیا اور ماہر صاحب الجمعیۃ کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ وہ اس میں خبروں کی تلخیص و ترتیب کا کام کرتے رہے۔ لیکن یہ کام زیادہ دن نہیں چلا۔

مولانا عبدالقدیر کا حیدرآباد (دکن) بھی جانا آنا تھا اور وہ وہاں کے اعلیٰ حلقوں میں خاصے متعارف تھے۔ ۱۹۲۸ء میں جب وہ حیدرآباد جا رہے تھے، تو انھوں نے ان سے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس پر یہ الجمعیۃ کی نوکری چھوڑ کر ان کے ساتھ حیدرآباد پہنچ گئے۔

حیدرآباد میں مولوی عبدالقدیر کی وساطت سے ماہر القادری کی یمین السلطنت مہاراجا سرکشن پرشاد (م: مئی ۱۹۴۰ء) مدار المہام دکن کے ہاں باریابی ہوئی۔ مہاراجا مرحوم کی سخن پروری اور شعرا نوازی شہرۂ آفاق ہے۔ انھوں نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا اور ہائی کورٹ میں ملازمت دلوا دی۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ریاست حیدرآباد (دکن) میں ملازمت کے لیے مقامی باشندہ (ملکی) ہونے کی شرط تھی۔ لوگوں نے جھوٹ سچ کہ کر ملکی ہونے کی اسناد حاصل کیں اور ملازمت لے لی۔ ماہر نے جھوٹ بولنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہاراجا بہادر نے حضور نظام کی بارگاہ میں معروضہ پیش کیا اور ان کی عطا ارض پر

خاص فرمانِ شاہی کے ذریعے یہ قیدِ ملکی سے مستثنیٰ قرار دیے گئے۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہاں بھی یہ گئے، وہاں کا ماحول ان کے مخالف رہا اور یہ ترقی نہ کر سکے۔ ۱۹۳۲ء تک وہ حکومتِ نظام کے متعدد دفتروں میں ملازم رہے۔ نظامِ سابق مرحوم میر عثمان علی خان (ف : فروری ۱۹۶۷ء) کے چھوٹے شاہزادے معظم جاہ بہادر شجیع کے دربار میں بھی بار مل گیا تھا، لیکن جلد ہی انھوں نے تعلق منقطع کر دیا۔ غرض مہاراجا بہادر کے مستقل وظیفے، ملازمت کی تنخواہ اور ادھر ادھر کی فتوحات سے اچھے خرچ کے لیے کافی آمدنی ہو جاتی تھی۔

۱۹۳۲ء میں انھوں نے حیدرآباد سے باہر قسمت آزمائی کی کوشش کی۔ مدینہ بجنور میں ان کا کلام ایک مدت سے چھپ رہا تھا۔ اس میں اشتہار شائع ہوا کہ عنقریب "مدینہ" روزنامے میں تبدیل ہونے والا ہے، اس کے لیے نائب مدیروں کی ضرورت ہے۔ اس پر ماہر صاحب نے بھی اپنی درخواست بھیج دی۔ دو ہفتے بعد تقرری کا خط آگیا، اور یوں یہ وسط دسمبر ۱۹۳۲ء میں "مدینہ" (روزنامہ) کے ادارۂ تحریر میں شامل ہو گئے۔ نیز وہیں سے بچوں کے لیے ایک ماہنامہ "غنچہ" بھی نکلتا تھا، اس کے بھی ایڈیٹر مقرر ہو گئے۔ اسی سال انھوں نے مولانا حامد القدیر کی معیت میں عراق کا سفر بھی کیا۔

لیکن کہاں حیدرآباد کی گہما گہمی اور چہل پہل، اور کہاں بجنور کی "سنسان" بستی! جلد پہلے سے دل اچاٹ ہو گیا۔ اتفاق سے چھ مہینے بعد مدینہ (روزنامہ) بند ہو گیا اور وہ واپس حیدرآباد چلے گئے۔ اس کے بعد آٹھ برس متواتر (۱۹۴۱ء تک) قیامِ حیدرآباد ہی میں رہا۔ اور وہ حکومت کے مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔

اس دوران میں ایک حادثہ پیش آیا: ہوا یہ کہ روزنامہ "صبحِ دکن"، حیدرآباد کے ایک خاص نمبر میں ان کی نظم بعنوان "سلطانِ کائنات سے خطاب" شائع ہوئی۔ اس نظم میں دو شعر تھے:

ابھی جہاں میں بڑا انقلاب ہونا ہے ابھی نہیں ہوئی بیدار جراتِ فاروق

تمام دہر کا سلطاں بنا کے بھیجا ہے
خدا نے تجھ کو سلیماں بنا کے بھیجا ہے

حضور نظام میر عثمان علی خاں مرحوم کو یہ شعر پسند نہیں آئے۔ نازک مزاج شاہاں تاب سخن ندارد۔ چنانچہ عتاب کا فرمان شاہی صادر ہوا۔ جس میں ماہر کی ملازمت سے برطرفی اور ممالک محروسہ سے اخراج کا حکم تھا۔ ماہر کے سرپرستوں نے بیچ بچاؤ کیا، جس پر چند دن کے بعد ان کی کنگ کوٹھی میں طلبی ہوئی۔ معافی ہوئی اور دوسرا فرمان صادر ہوا، جس کا ایک جملہ یہ تھا مااز لغزش ماہر القادری درگذر کردیم چراکہ دراُو خبثِ باطن نمی بینیم۔ اسی موقع کے لیے کسی نے کہا ہے: رسیدہ بود بلائے، ولے بخیر گذشت۔

اب بحیثیت غزلگو و نظم نگار وہ ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی جانے لگے تھے۔ ۱۹۴۱ء میں وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی گئے۔ یہاں بعض دوستوں کی فرمائش پر انھوں نے مشہور فلم ڈائرکٹر محبوب کی فلم "تقدیر" کے لیے گیت لکھے۔ یہ بہت مقبول ہوئے۔ اس کے بعد انھوں نے "بھولی"، "زبان"، "زینت" فلموں کے گیت بھی لکھے کسی کے لیے پورے، کسی کے لیے صرف چند، اور اس زمانے میں یہ بہت کامیاب اور بہت نفع کا کاروبار تھا۔ لیکن ماہر القادری کی تعلیم و تربیت کی اساس اور میلانِ طبع مذہبی تھا۔ فلمی ماحول جیسا کچھ ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بمبئی کی یہ فضا بھلا کب انھیں راس آسکتی تھی! اس لیے جلد ہی یہ اس سے الگ ہو گئے۔ وہ ۱۹۴۳ء میں دلّی آگئے تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے انتقال کے بعد حیدرآباد میں ان کا دل کیسے لگ سکتا تھا!

جب ملک آزاد ہوا ہے، تو وہ اپنے وطن کیسر کلاں میں تھے؛ یہیں سے وہ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ وہ ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے علّامہ خلیل عرب مرحوم سے عربی ادب پڑھا۔ دو سال تک باقاعدگی سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور اس طرح انھوں نے عربی کی تکمیل کی۔

اپریل ۱۹۴۹ء میں انھوں نے اپنا ذاتی ماہنامہ "فاران" جاری کیا، جس کے وہ اپنی وفات تک مدیر رہے (یہ اب ان کے برادرِ خرد مسرور حسین کی ادارت میں نکل رہا ہے) "فاران" کا پاکستان کے اچھے رسالوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ اپنے اداریے (نقشِ اول) اور تبصرے (ہماری نظر میں) کے لیے خاص طور پر ممتاز تھا؛ "نقشِ اول" میں وہ ہمیشہ کسی دینی یا عصری

مسئلے پر بحث کرتے، اور تبصرے کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ ہمیشہ خود کتاب کو پڑھ کر اس کے حسن و قبح پر بے لاگ رائے لکھتے۔

رفتہ رفتہ انھوں نے پاکستان کے علمی اور ادبی (بلکہ دینی) حلقوں میں ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ پاکستان کے باہر بھی جہاں جہاں اردو داں پاکستانی باشندے جا کر بس گئے ہیں، وہاں سے انھیں دعوت نامے موصول ہوتے رہتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں انھیں جنوبی افریقہ کے پاکستانی ادارے "انجمن شانزدہ سالہ جشن قرآن"، ڈربن (جنوبی افریقہ) نے دعوت دی۔ ڈربن اور کینیا دونوں جگہوں کے دورے سے فارغ ہو کر وہ یورپ گئے پہلے روما (اطالیہ) اور میڈرڈ، قرطبہ (اسپین) کی سیر کی۔ وہاں سے انگلستان پہنچے۔ یہاں مانچسٹر، برمنگھم بریڈ فورڈ وغیرہ شہروں میں گئے، جہاں پاکستانی خاصی تعداد میں آباد ہیں۔ واپسی میں پیرس، جنیوا، استنبول، بیروت، دمشق ہوتے ہوئے، حرم کعبہ میں عمرہ ادا کیا، اور چار مہینے کی غیر حاضری کے بعد ۲۸ جولائی ۱۹۶۹ء کو واپس کراچی پہنچے۔ حج انھوں نے ۱۹۵۴ء میں کیا تھا، جس کی یادگار ان کا سفر نامہ "کاروانِ حجاز" شائع ہو چکا ہے: (کراچی: ۱۹۵۵ء)

ان کا آخری سفر بھی ایک مشاعرے کے سلسلے میں تھا۔ جدّہ (سعودی عرب) سفارت خانۂ پاکستان نے مئی ۱۹۷۸ء میں ایک مشاعرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے انھوں نے پاکستان سے چھ شاعروں اور ایک شاعرہ کو دعوت دی۔ (یہ تھے ماہر القادری کے علاوہ ابوالاثر حفیظ جالندھری، احسان دانش، جمیل الدین عالی، سرور بارہ بنکوی، اقبال عظیم اور وحیدہ نسیم)۔ مشاعرہ ۱۱-۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کی شب میں ہوا۔ ماہر ۹ مئی کو ہوائی جہاز سے جدّہ پہنچے۔ ۱۰ مئی کی صبح وہ مکے گئے اور وہاں حرم کعبہ میں عمرہ ادا کیا؛ سہ پہر میں واپس جدّے آ گئے۔ مئی کی دھوپ اور گرمی کی شدّت، اور وہ بھی حجاز کی، طبیعت خراب ہونا ہی تھی۔ رات میں نیند نہ آئی۔ اگلے دن شب میں مشاعرہ تھا۔ دن بھر آرام کرنے سے طبیعت کچھ بحال ہو گئی تھی۔ مشاعرے کے پہلے دور میں انھوں نے صرف ایک غزل سنائی آدھی رات کے بعد کوئی دو ڈھائی بجے دوسری نشست میں دو غزلیں اور ایک نظم پیش کی

ان کے بعد احسان دانش نے غزل پڑھی۔ احسان کی غزل میں ایک شعر تھا:

قبر کے جو کتبے خالی ہیں انھیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر لگا دی جائے

ماہر پر اس شعر کا بہت اثر ہوا، اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ سب سے آخر میں ابو الاثر حفیظ جالندھری نے اپنا کلام پیش کیا۔ انھوں نے وہ غزل سنائی جس کا مطلع ہے:

یہ اور دور ہے اب اور کچھ نہ فرمائے
مگر حفیظ کو یہ بات کون سمجھائے!

اسی غزل میں کا ایک شعر ہے:

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذاب الیم
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہمسایے

جب حفیظ نے یہ شعر پڑھا، تو شاعرانہ شوخی سے انگلی سے ماہر القادری کی طرف اشارہ کیا۔ ماہر ان کے شعر ختم کرتے ہی، فوراً مائیک پر پہنچے اور حاضرین سے کہا: "حضرات! حفیظ صاحب غلط جگہ پر پہنچ گئے" بات ہنسی مذاق اور تالیوں میں ختم ہو گئی حفیظ کی غزل ہی پر مشاعرہ کا اختتام ہونا تھا۔ لیکن ماہر پر ان کے اپنی جگہ پہنچتے ہی (گویا ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کے اولیں وقت) آناً فاناً دل کا شدید دورہ پڑا۔ سامعین میں دو پاکستانی ڈاکٹر بھی موجود تھے۔ وہ لپک کر اسٹیج پر پہنچے۔ لیکن دیکھا، تو روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ یوں مشاعرہ اس المیہ پر ختم ہوا۔ اسی دن بعد نمازِ عصر لاش مکہ معظمہ گئی، جہاں نمازِ جنازہ مسجد الحرام میں ادا ہوئی، اور انھیں سعودی حکومت کی اجازت سے نمازِ مغرب سے کچھ بعد مکہ کے مشہور قبرستان جنت المعلّٰی کے احاطہ مدرسۂ صولتیہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہِ راجِعُون۔ سید ضیاء الحسن موسوی نے "ماہر القادری انتقال کرد،" (۱۳۹۸) کے جملے سے ہجری تاریخ نکالی۔ انھیں کی کہی ہوئی دوسری عیسوی تاریخ

یہ ہے:

اے ماہرالقادری کہاں ہو — یہ قبر ہے یا کہ ہے مصلّٰی!
مجلس کی صدا ہے بہر تاریخ — "منظور ہے جنت المعلّٰی" ۱۹۷۸ء

کراچی کارپوریشن نے شہر کے ناظم آباد علاقے کی ایک سڑک کا نام ان کے نام پر رکھ دیا ہے مرحوم ناظم آباد ہی میں رہتے تھے، انھوں نے یہاں اپنا ذاتی مکان تعمیر کر لیا تھا۔

ماہر کی عمر ۲۰ برس کی تھی، جب ان کی شادی منشی خیر اللہ خان لودی کی صاحبزادی بلقیس جہاں بیگم سے ہوئی۔ منشی خیر اللہ کاشتکار خاندان کے فرد تھے، اگرچہ ان کا اپنا ذریعۂ معاش ملازمت تھی، وہ بہت دن تک تحصیل انوپ شہر میں پٹواری رہے۔ ماہر القادری لاولد فوت ہوئے۔ ان کی بیگم نے ۱۹۷۰ء میں رحلت کی، وہ کراچی کے قبرستان پاپوش نگر میں مدفون ہیں۔

وفات تک ان کی ۲۷ کتابیں چھپ چکی تھیں۔ انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ کسی زمانے میں انھوں نے ناول اور افسانے بھی لکھے، چنانچہ ان کتابوں میں چھ افسانوں کے مجموعے اور تین ناول ہیں۔ مذہب سے شغف اور دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ بچوں کے لیے سیرت کی کتاب آخری رسول (۱۹۳۶ء) اور نعت کے دو مجموعے "ظہورِ قدسی" (۱۹۳۷ء) اور "ذکرِ جمیل" (۱۹۴۴ء) ان سے یادگار ہیں۔ انھوں نے سیرت پر ایک اور کتاب ناول کے انداز میں "دُرِّ یتیم" بھی لکھی تھی۔ "کاروانِ حجاز" میں اپنے حج کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ ان کے غزلیات اور منظومات کے چار مجموعے شائع ہوئے: محسوساتِ ماہر (۱۹۴۱ء)، نغماتِ ماہر (۱۹۴۲ء)، جذباتِ ماہر (۱۹۴۴ء)، فردوس (۱۹۵۵ء) یقیناً بہت سا کلام ابھی غیر مطبوعہ ہوگا۔

کلام پختہ اور فنی پہلو سے بے عیب ہے۔

یوسف حیدرآبادی، یوسف حسین خان، حکیم

پٹھانوں کے قبیلے ابوزئی کے فرد تھے۔ ان کے بزرگ افغانستان سے آئے اور میرٹھ

ماخذ: میر احمد علی الہام واحدی، حیدرآباد؛ نئے رسالے، حیدرآباد ۲۱؍ مئی ۱۹۷۸ء؛ حکیم سیف الدین احمد، میرٹھ

دیوبی) میں بس گئے۔ ان کے والد حامد حسین خان کا میرٹھ کے ممتاز لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ میرٹھ کلکٹری میں چیف ریڈر کے معزز عہدے سے ریٹائر رہے تھے۔ حامد حسین خاں ان کے سسرال کے لوگوں کا حیدرآباد (دکن) سے پرانا تعلق تھا۔ ان کے سالے مقصود علی خان، نظام ہفتم میر عثمان علی خان مرحوم (ت: فروری ۱۹۶۷ء) کے طبیب خاص تھے، حکومتِ نظام کی طرف سے انھیں حکیم مقصود جنگ بہادر کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔ اسی تعلق کے باعث خود حامد حسین خان اور ان کے خاندان کے لوگ بھی اکثر حیدرآباد جاتے آتے رہتے تھے اور مقصود جنگ بہادر ہی کے وہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ جب حامد حسین خاں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ تو وہ بھی مستقلاً حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء کے پولیس ایکشن کے زمانے میں وہ حیدرآباد ہی میں تھے۔ اس کے بعد وہ اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ وہیں ۱۹۶۹ء میں ان کا کراچی میں انتقال ہوا۔ ہندستان میں صرف حکیم یوسف حسین خان رہے، باقی پورا خاندان ہجرت کر گیا تھا۔

یوسف حسین خان ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ سنِ شعور کو پہنچے تو محلّہ حسینی علَم (حیدرآباد) کے ابتدائی اسکول میں بھیج دیے گئے۔ یہاں مشکل سے دو سال (۱۹۱۷ء تا ۱۹۱۹ء) گزرے تھے کہ انھیں قادیان (ضلع گورداسپور، پنجاب) کے عربی مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ وہ ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک چار برس یہاں رہے۔ اس کے بعد اپنے آبائی وطن میرٹھ کے فیض عام ہائی اسکول میں چلے آئے، جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۹ء میں دسویں کی سند حاصل کی۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ زندگی میں کیا پیشہ اختیار کریں گے، تاکہ آیندہ کی تعلیم اسی نہج پر ہو۔ اس میں ان کے ماموں نواب مقصود جنگ بہادر کا مشورہ غالب رہا اور فیصلہ ہوا کہ وہ طبابت کو اپنا ذریعۂ معاش بنائیں۔ چنانچہ آیورویدک و یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ دہلی میں داخل ہو گئے؛ ۱۹۳۴ء میں یہاں سے طب و جرّاحی کی سندِ فراغت طلائی تمغے کے ساتھ حاصل کی۔ پھر مزید دو سال وہیں سے جرّاحی میں اعلیٰ تعلیم پائی۔

طبّیہ کالج کی تعلیم کے دوران ہی میں انھوں نے فارسی اور عربی اور انگریزی کی تحصیل و

تکمیل پر بھی خاص توجہ کی اور ان زبانوں میں پوری مہارت مہیا کر لی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ فرانسیسی اور ہسپانوی سے بھی بقدرِ ضرورت واقف تھے۔

۱۹۳۰ء میں وہ حکومت نظام کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اولاً یونانی اسپتال سرکارِ عالی محلہ کاچی گوڑہ (حیدرآباد) میں بحیثیت مددگار طبیب تقرر ہوا۔ دو سال بعد (۱۹۴۰ء) نظامیہ اسپتال میں ریذیڈنٹ میڈیکل افسر مقرر ہوئے، وہ اس عہدے پر ۹ برس (۱۹۵۰ء تک) رہے۔ اسی دوران میں نظامیہ طبی کالج، حیدرآباد میں فزیالوجی پڑھانے کی ذمہ داری بھی انھیں کے سپرد تھی۔ ۱۹۵۰ء میں تبادلہ ہوا اور انھیں ناظر طبیب بنا کر گلبرگہ بھیج دیا گیا۔ وہاں سے ۱۹۵۷ء میں واپسی ہوئی اور اب وہ سکندرآباد اسپتال کے انچارج بن کر آئے۔ لیکن جلد ہی ترقی ہوئی اور جڑی بوٹیوں کے شعبے کے سپرڈنٹ مقرر ہو گئے۔ تین سال بعد (۲ اپریل ۱۹۵۹ء کو) نظامیہ طبی کالج کے پرنسپل کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، جہاں سات سال تک ہزارہا طلبا کی رہنمائی کرنے کے بعد ۶ اگست ۱۹۶۷ء کو وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اپنی ملازمت کے دوران میں وہ متعدد سرکاری اور غیر سرکاری طبی اداروں سے وابستہ رہے۔ ان کی دلچسپی کے موضوع گوناگوں تھے۔ مثلاً طالب علمی کے زمانے میں مردانہ کھیلوں سے خاص شغف رہا۔ وہ ہاکی اور ٹینس اور بلیرڈ کے ممتاز کھلاڑی تھے۔ فوٹوگرافی کا اتنا شوق تھا کہ انھوں نے متعدد نمائشوں میں حصہ لیا، اور انعام حاصل کیے۔ باغبانی اور اس میں بھی گلابوں سے بدرجۂ عشق دلچسپی تھی۔ ان کے خانہ باغ میں مختلف اقسام کے گلاب کے پودے آج بھی دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔

لیکن وہ کسی حال میں اور کہیں بھی رہے ہوں، ان کا بنیادی شوق مطالعۂ کتب رہا۔ پچاس برس کی عمر تھی کہ یکایک انھوں نے شعر گوئی کا آغاز کیا، اور ان کا کلام حیدرآباد اور باہر کے رسائل و جرائد میں شائع ہونے لگا۔ وہ نظم، غزل، رباعی، قطعہ سب اصنافِ سخن پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں قدیم و جدید کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔ جہاں زبان اور اس کا رکھ رکھاؤ قدیم اور کلاسیکی تعلیم کا غماز ہے، وہیں اندازِ فکر اور اسلوبِ بیان

انھیں شعرائے جدید کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "خواب زلیخا" کے عنوان سے ان کی زندگی میں شائع ہوا تھا (حیدرآباد ۱۹۶۷ء) دوسرا مجموعہ جس میں غزلیات وغیرہ ہیں "مصرِ کا بازار" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ اس کے علاوہ ان کے کاغذات میں دو ناولوں اور دو ڈراموں کے مسودے بھی ملے ہیں

انھیں سگرٹ نوشی کی عادت نوجوانی سے تھی۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ اس میں بے اعتدالی پیدا ہوتی گئی، اور بالآخر یہ ۲۴ گھنٹے کی لت بن گئی جس سے پھیپھڑے بری طرح متاثر ہوئے اور تنفس کا عارضہ لاحق ہو گیا، جس نے راتوں کی نیند حرام کر دی۔ اب دوسری پیچیدگیوں نے گھیرا، اور قلب بھی ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ زندگی کے آخری تین برس تو وہ بالکل بستر سے لگے رہے۔ اسی حالت میں بدھ کے دن ۱۰ مئی ۱۹۷۸ء ظہر کے بعد دو بجے رحلت کی۔ اسی دن مغرب کے بعد تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور انھیں تکیۂ مغل فقیر، شمشیر گنج، علی آباد (حیدرآباد) میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

۱۹۴۷ء میں ان کی شادی خواجہ نذیر احمد مہتمم آبکاری کی صاحبزادی کشور سے ہوئی تھی۔ (یہ۔ رشتے میں ڈپٹی نذیر احمد مترجم قرآن کی نواسی ہوتی ہیں) اولاد میں ماشاء اللہ دو بیٹے (ارحم ادریس اور افہم جنید) اور دو بیٹیاں (زمزم آرا اور چشم عنبرینہ) موجود ہیں۔

خلیل الرحمن اعظمی

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض پڑھے لکھے لوگ، خاص طور پر علماء کے طبقے میں سے اپنے نام کے ساتھ "اصلاحی" کا لاحقہ رکھتے ہیں۔ یہ بالکل "علیگ" اور "آکسن" قسم کی چیز ہے۔ یعنی جس طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اصحاب اپنی اس نسبت کا اظہار لفظ "علیگ" سے اور آکسفورڈ کے "آکسن" سے کرتے ہیں۔ اسی طرح مدرسۃ الاصلاح،

ماخذ: مکتوبات عبدالرحمان پرواز اصلاحی (بمبئی)؛ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ از مولانا حبیب الرحمن قاسمی (بنارس ۱۹۷۷ء)؛ علی گڑھ میگزین؛ انتخاب شعرائے علی گڑھ (۱۹۷۰ء)؛ قومی آواز روزنامہ لکھنؤ ۳ جون ۱۹۷۸ء؛ رفتار رہا و خلیل (شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا خبرنامہ) ۱ جون ۱۹۷۸ء؛ ہماری زبان (ہفتہ وار) خلیل الرحمن اعظمی نمبر: ۸-۱۵ اگست ۱۹۷۸ء؛ دیباچہ نیا عہد نامہ (علی گڑھ: ۱۹۶۵ء)

سرائے میر کے فاضل اپنی مادر علمی پر فخر و امتنان کا اعلان "اصلاحی" کے لاحقے سے کرتے ہیں قصبہ سرائے میر یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں ہے۔ اس مدرسے کے بانی مولانا محمد شفیع خان سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے، جو سرائے میر سے شمال مشرق میں تقریباً چھ کیلومیٹر کی دوری پر ایک مختصر گاؤں ہے۔

مولانا محمد شفیع خان نسلاً پٹھانوں کے قبیلہ یوسف زئی سے تھے۔ لودھی حکومت کے زمانے میں جونپور شرقی، سلطنت دلی کا سب سے بڑا حریف تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف وقتاً فوقتاً فوجی اقدام کرتے رہتے تھے۔ کبھی ایک کا پلڑا بھاری رہتا، کبھی دوسرے کا۔ بالآخر سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ - ۱۴۸۹) نے فیصلہ کیا کہ اپنی قوم کے پٹھانوں کو افغانستان سے لاکر ہندستان میں بسانا چاہیے تاکہ ان کی مدد سے جونپور کا سدِّ باب کیا جاسکے۔ اس حکمت عملی کے تحت اس نے افغانستان کے علاقہ رُدہ کے مختلف قبائل کو یہاں بلایا اور انھیں جاگیروں اور عہدوں سے مالا مال کردیا۔ جب اس کی طاقت مضبوط ہوگئی، تو اس نے خود پیشقدمی کی اور حسین شاہ شرقی کو شکست دے کر جونپور کو بھی سلطنت دلی میں شامل کرلیا۔ اس زمانے میں جو افغان ہندستان آئے، انھیں میں یوسف زئی قبیلے کے ایک فوجی سردار سالار خان بھی تھے۔ انھیں جونپور کے نواح میں جاگیر ملی۔ سیدھا سلطان پور اور اس کے اردگرد کے مواضع بھی انھیں کی جاگیر میں تھے۔

سالار خان سپاہی تھے۔ لہٰذا سپہگری کا پیشہ ان کی اولاد میں بھی کئی نسل تک رہا۔ بےفکری اور خوشحالی کا دور دورہ تھا اور اس پہلو سے ان لوگوں کے کئی افسانے آج تک اس نواح میں مشہور ہیں۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ خاندان میں علمی روایت کب آئی، لیکن گمان غالب ہے کہ رفتہ رفتہ ماحول کے اثر سے فارسی کی تعلیم اور دینیات کے مطالعے سے شغف پیدا ہوا ہوگا۔ خاندان میں سب سے پہلے جس شخص کی علمی حیثیت سے شہرت ہوئی، وہ حافظ قادر بخش خان کی ذات ہے، یہ سالار خان سے دسویں پشت میں تھے۔ انھوں نے اردو فارسی کی تکمیل کی، اور قرآن مجید حفظ کیا۔ وہ تقویٰ، طہارت، اتباعِ سنّت

میں اپنے اقران و اماثل میں ممتاز تھے۔ خاندان میں سب سے پہلے وہی گھر سے باہر گئے۔ وہ دانا پور (پٹنہ) چلے گئے۔ کسب حلال کی خاطر وہاں ایک مدرسے میں پڑھاتے، اور اپنی آمدنی کا بڑا حصہ غربا و مساکین میں تقسیم کر دیتے۔

مولانا محمد شفیع خاں بانی مدرسۃ الاصلاح انھیں حافظ قادر بخش خاں کے بھتیجے تھے، یہ ان کے منجھلے بھائی کریم بخش خاں کے بیٹے تھے۔ ان کا تاریخی نام "ابوالبرکات محمد شفیع خاں" ہے جس سے عیسوی میں سنہ ولادت ۱۸۶۶ء (مطابق ۱۲۸۳ھ) برآمد ہوتا ہے چونکہ والد کریم بخش خاں کا ان کی صغر سنی میں انتقال ہو گیا، اس لیے ان کی پرورش اور نگہداشت ان کے بڑے چچا قادر بخش خاں اور چھوٹے چچا حافظ فضل کریم خاں نے کی۔ سات برس کے تھے، جب حافظ قادر بخش خاں انھیں اپنے ساتھ دانا پور (پٹنہ) لے گئے۔ قرآن حفظ کرایا اور اردو فارسی کی تعلیم خود دی۔ اس کے بعد ناریل گھاٹ، دانا پور کے مشہور مدرسۂ اہل حدیث میں داخل کرا دیا۔ یہاں انھوں نے عربی ادب اور منقولات و معقولات کی تکمیل کی۔ وہ ۱۸۸۹ء (۱۳۰۶ھ) میں فارغ التحصیل ہوئے۔ اس کے بعد تبرکاً حدیث کے کچھ سبق میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی (ف: اکتوبر ۱۹۰۲ء) سے بھی پڑھے پھر عمر بھر کے لیے درس و تدریس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہے۔

طریقت میں وہ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے مرید تھے، اور ان کی وفات کے بعد حضرت سید احمد شہید بریلوی کے سلسلے کے ایک بزرگ سید محمد امین نصیر آبادی سے سلسلۂ ارادت قائم کر لیا تھا۔ سید صاحب موصوف نے انھیں اپنا خلیفہ مجاز قرار دے دیا تھا۔

ملک و ملت میں جو غلط مسرفانہ رسمیں اور بدعتیں رواج پا گئی ہیں، انھیں دیکھ کر مولانا محمد شفیع خاں کا دل بہت کڑھتا تھا۔ وہ اپنے پند و نصائح سے لوگوں کو متنبہ کرتے رہتے تھے۔ آخر احباب کے صلاح و مشورہ سے منظم مہم چلانے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں "انجمن اصلاح معاشرت" قائم ہوئی اور مولانا محمد شفیع خاں ہی اس کے ناظم مقرر ہوئے بعد کو اس کا نام انجمن اصلاح المسلمین رکھا گیا۔ اس انجمن کے شاندار سالانہ اجلاس مختلف مقامات پر منعقد ہوتے رہے جن میں ملک کے مقتدر اور ممتاز علما شریک

ہوتے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس انجمن نے دینی اور اخلاقی اصلاح اور بدعات کے انسداد میں قابلِ قدر کامیابی حاصل کی۔ یہ انجمن آج تک قائم ہے، اور فعال بھی۔

"انجمن اصلاح المسلمین" کے جلسوں اور تبلیغ کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں میں ایک عام بیداری کی فضا پیدا ہو گئی اور محسوس کیا جانے لگا کہ دینی تعلیم کی ایک درسگاہ قائم ہونا چاہیے اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے ۱۹۰۹ء میں "مدرسۃ الاصلاح" سرائے میر کا سنگِ بنیاد رکھا اس کے لیے پچاس بیگھے زمین موضع کھریواں اور سرائے میر کے بعض مخیّر زمینداروں نے وقف کی تھی۔ اس مدرسے نے بہت ترقی کی۔ بعد کو مولانا شبلی مرحوم (ف: نومبر ۱۹۱۴ء) اس کے سرپرست بن گئے، بلکہ یہاں کا نصاب تعلیم بھی انھیں کا بنایا ہوا ہے مولانا شبلی اپنی زندگی کے آخری دور میں اس کے نظم و نسق میں بہت دلچسپی لیتے رہے تھے۔ مولانا حمید الدین فراہی (مصنف نظام القرآن) ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم نظامیہ حیدرآباد کی پرنسپلی سے مستعفی ہو کر وطن واپس آئے، تو انھوں نے مولانا محمد شفیع خان کی درخواست اور ترغیب پر مدرسۃ الاصلاح کی نظامت قبول کر لی اور اپنی وفات (۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء) تک فی سبیل اللہ یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ ان کے دور میں مدرسے نے بہت ترقی کی اور یہ صحیح معنوں میں علومِ قرآنی کے مطالعے کا ممتاز مرکز بن گیا۔

مولانا محمد شفیع خان کا ۹ اپریل ۱۹۴۵ء کو بعارضۂ فالج انتقال ہوا۔ سید صاسلطان پور ہی میں اپنے خاص باغ میں دفن ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دو شادیاں کیں، اور دونوں اپنے وطن کے قریب کے گاؤں بڑہرا براہیم پور کے مغلوں میں۔ پہلی بیوی مرزا عطاءاللہ بیگ کی صاحبزادی مریم تھیں۔ ان بیگم سے دو بچے زندہ رہے: ایک بیٹی محمودہ خانم اور دوسرے مولانا فیض الرحمن اصلاحی۔ اس بیوی کے رحلت کر جانے کے بعد دوسری شادی مرزا سلیم اللہ بیگ کی دخترِ نیک اختر رابعہ بیگم سے کی۔ ان کے بطن سے چار بیٹے (مولانا عزیز الرحمن اصلاحی، حافظ حبیب الرحمن اصلاحی، مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی، ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی) اور ایک بیٹی صغریٰ بانو ہوئے۔ رابعہ بیگم کی وفات ۱۹۷۰ء میں ہوئی۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ۹ اگست ۱۹۲۷ء کو سیدھا سلطان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد مولانا محمد شفیع خاں کی نگرانی میں گھر پر ہوئی۔ اس زمانے میں انھوں نے قرآن کریم اور اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ان کے گھر کے لوگ مغربی یا انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ خاص طور پر ان کے چچا حافظ عبدالغفار خاں[1] کی دلی خواہش تھی کہ خلیل الرحمن عربی مدارس کی بجائے کالج کی تعلیم حاصل کریں۔ ان کے اپنے کوئی اولاد نہیں تھی، اور وہ خلیل الرحمن کو بہت چاہتے تھے۔ خلیل الرحمن کے بڑے بھائی مولانا عزیز الرحمن کا بھی یہی نظریہ تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ پڑوسی گاؤں "بینا پارہ" کے پرائمری اسکول میں بٹھا دیے گئے۔ یہاں چوتھے درجے تک پڑھا، پھر انھیں سرائے میر کے مڈل اسکول میں داخل کیا گیا۔ یہاں انھوں نے آخری امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ ان کے سب اساتذہ ان کی ذہانت اور محنت معترف تھے، اور ان کے والد مولانا محمد شفیع خاں سے ان کی تعریف کر کے کہتے کہ اس لڑکے کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلوائیے۔ مڈل پاس کرنے کے بعد والد نے انھیں مدرسۃ الاصلاح بھیج دیا تھا۔ جہاں انھوں نے عربی اور فارسی پڑھی۔ ان کے عربی کے استاد مولانا صدرالدین اصلاحی تھے، اور فارسی کے مولانا نورالہدیٰ نور اصلاحی مرحوم۔ جب ہر طرف سے اصرار ہوا اور لوگوں نے مولانا محمد شفیع خاں کو انھیں انگریزی پڑھانے کی ترغیب دی، تو وہ رضامند ہو گئے۔ اس پر خلیل الرحمن نے مدرسۃ الاصلاح کو خیرباد کہہ کے شبلی نیشنل ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں داخلہ لے لیا جہاں سے ۱۹۴۵ء میں دسویں کی سند پائی۔

یہی زمانہ ہے جب ان کے والد مولانا محمد شفیع خاں پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور اسی میں وہ ... رحلت کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ بھائیوں میں اتفاق نہ رہا۔ اس کے باوجود خلیل الرحمن کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیجا گیا۔ کوئی سال بھر تو ان کا خرچ گھر سے آتا رہا لیکن بھائیوں کی نااتفاقی سے یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا۔ کچھ اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہو گئیں غرض یہ مجبور ہو گئے کہ اگر تعلیم جاری رکھنا ہے تو کہیں اور سے اپنے خرچ کا انتظام کریں۔ بلکہ وہ ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ٹیوشن کی، بعض اصحاب نے وظیفے دیے جس سے

---

[1] حافظ عبدالغفار خاں، اکلوتے بیٹے تھے مولانا محمد شفیع خاں کے چھوٹے چچا حافظ فضل کریم خاں کے۔

لشتم پشتم وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی کی ڈیوٹی سوسائٹی (انجمن الغرض) نے بھی ان کی بہت مدد کی تھی۔

غرض یہاں سے انھوں نے ۱۹۴۷ء میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔ اب انھوں نے عارضی طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دلی کے شعبۂ تعمیرات میں ملازمت کر لی تاکہ آیندہ تعلیم کے لیے کچھ روپیہ کما سکیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب آزاد) ملک کے بعد دلی فرقہ وارانہ فسادات کے باعث جہنم زار بنی ہوئی تھی۔ خلیل الرحمن نے عافیت اسی میں دیکھی کہ چندے یہاں سے ٹل جائیں۔ لیکن پھر علی گڑھ رسید یم آسماں پیدا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں ایک دوست کے ساتھ وہ ریل سے علی گڑھ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہمسفر بلوائیوں نے انھیں تاکا اور مسلمان ہونے کی وجہ سے ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اور اپنے نزدیک مردہ خیال کر کے ان کی لاش گاڑی سے نیچے پھینک دی۔ وہ تو کچھ لیا دیا آگے آگیا۔ ریلوے کے ایک ہندو ملازم (ماتھر نام تھا) نے انھیں دیکھا ابھی سانس کی آمد و رفت جاری تھی۔ وہ انھیں ہینڈ گاڑی پر اٹھوا کر دلی لے آئے۔ یہاں علاج ہوا۔ بفضلہ بچ گئے۔ تین مہینے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ چلے گئے، اور بی اے میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد ان کا سیدھا سلطان پور اور اپنے خاندان سے تعلق منقطع ہو گیا۔

اس زمانے میں علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک اپنے پورے شباب پر تھی خلیل الرحمن بھی اس میں شامل ہو گئے، بلکہ وہ مقامی انجمن کے سکریٹری چنے گئے۔ فروری ۱۹۴۹ء میں حکومت ہند نے ڈیفنس آف انڈیا قواعد کے تحت ترقی پسند مصنفین تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اور اس کی مختلف انجمنوں کے کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ اسی میں خلیل الرحمن بھی دھر لیے گئے، اور چار مہینے تک زندانی رہے، بلکہ بی اے کے امتحان میں وہ قید خانے سے خاص اجازت لے کر (پیرول پر) بیٹھے تھے۔ بی اے کے بعد انھوں نے یہیں سے ۱۹۵۱ء میں ایم اے (اردو) کی سند لی۔ اسی دوران میں علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ایم اے کر لینے کے بعد چندے یونیورسٹی گزٹ کے ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔

اب یہ بیکار تھے۔ بہت جگہ ہاتھ پاؤں مارے، کلکتے، مدراس تک کا چکر کاٹ آئے لیکن کہیں پاؤں ٹکانے کی جگہ نہ نکل سکی۔ تھکے ہارے پاؤں توڑ کر ایک دوست کے ہاں بہار کے ایک گاؤں مظفرپور میں پڑے تھے کہ ان کے شفیق استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی (ف: جنوری ۱۹۷۷ء) کا خط ملا کہ علی گڑھ پہنچو۔ ہے یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں مدرّس کی جگہ نکلی تھی، جس کے لیے رشید صدّیقی مرحوم کی نگاہِ انتخاب اپنے اس ہونہار شاگرد پر پڑی۔ قصّہ کوتاہ، خلیل الرحمن علی گڑھ آئے اور ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی میں لیکچرر مقرّر ہو گئے۔ یوں کم از کم مالی مشکلات کا مہیب دور ختم ہوا اور وہ اپنے اصلی مقام پر پہنچ گئے، جس کے لیے وہ گویا پیدا ہوئے تھے۔ اسی دوران میں انھوں نے پروفیسر رشید احمد صدّیقی کی رہنمائی اور نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" لکھا جس پر یونیورسٹی سے انھیں ۱۹۵۷ء میں پی ایچ ڈی کی سند عطا ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں ترقی ہوئی اور وہ ریڈر مقرّر ہو گئے۔

اب ان کا یونیورسٹی کے کامیاب اساتذہ میں شمار ہوتا تھا۔ ادبی حلقوں میں بھی ان کی شہرت روز افزوں تھی۔ غرض تسکین کے تمام اسباب جمع تھے۔ بیشک مادّی پہلو سے اطمینان حاصل ہو گیا تھا لیکن ان کی ذہنی اور جذباتی تنہائی جوں کی توں قائم تھی۔ اپنے خاندان سے تعلّقات ۱۹۴۷ء سے منقطع تھے۔ اور وہ جو انسان چاہتا ہے کہ اپنی مسرّتوں اور کامیابیوں کے جذبات میں کسی کو شریک بنا سکے اس کا فقدان تھا۔ بارے، اس کا کچھ مداوا نومبر ۱۹۵۷ء میں ہو گیا، جب ان کی شادی جہانگیر آباد (ضلع پیلی بھیت) کے حکیم سید محفوظ الدین (ف: ۲۴ دسمبر ۱۹۷۳ء) کی صاحبزادی راشدہ بیگم سے ہو گئی۔ فروری ۱۹۵۹ء میں پہلا بیٹا کامران پیدا ہوا۔ اس کے بعد خدا نے دو اور بیٹے سلمان (ولادت: مئی ۱۹۶۲ء) اور عدنان (ولادت: مئی ۱۹۶۳ء) اور ایک لڑکی ہما فاطمہ (ولادت: ۳ اگست ۱۹۷۳ء) عطا فرمائے۔ سلّمہم اللہ تعالیٰ۔
یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بی اے کی تعلیم کے زمانے سے وہ اپنے گاؤں نہیں گئے تھے۔ وہاں سے بھی کسی بھائی بہن نے پروا نہیں کی، لیکن والدہ ممتا کی ماری تو نہیں

بھول سکتی تھی۔ آخر کار یہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل ۱۹۷۰ء میں وطن گئے، اور ساتھ اپنے بڑے بیٹے کامران کو بھی لیتے گئے۔ والدہ کے انتقال کے بعد بھی شاید ایک ہی بار گاؤں گئے۔

صحت عام طور پر ٹھیک رہی۔ ۱۹۷۴ء میں بیمار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے یرقان تشخیص کیا، کچھ احتیاط اور پرہیز تجویز ہوا، اور علاج ہونے لگا۔ اوائل ۱۹۷۶ء میں انھیں سردی اور برسات کے زمانے میں لکھنؤ کا سفر کرنا پڑا، جس کی تکان نے انھیں اتنا نڈھال کر دیا کہ وہ مستقل طور پر بیمار ہو گئے۔ تشخیص ہوئی کہ خون کا کینسر لاحق ہو گیا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ خون میں دو رنگ کے جسیمے ہیں، سفید اور سرخ۔ جب تک سرخ جسیمے تعداد میں سفید جسیموں سے زیادہ اور ایک خاص تناسب سے رہیں، انسان تندرست رہتا ہے۔ جونہی یہ تناسب بگڑا، وہ بیمار ہو جاتا ہے۔ خون کا کینسر یہ ہے کہ خون میں سرخ جسیمے خود بخود کم ہونے لگتے ہیں، اور سفید جسیموں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ یہی عدم توازن بڑھتے بڑھتے ایک دن مریض کی موت پر منتج ہو جاتا ہے۔ آج تک یہ تحقیق نہیں ہو سکا کہ یہ موذی مرض شروع کیونکر ہوتا ہے، اور علاج تو ہنوز کوئی معلوم ہو ہی نہیں سکا۔ عارضی راحت کی ایک صورت یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد مریض کے جسم میں تازہ خون پہنچایا جائے، جس سے سرخ و سفید جسیموں کا تناسب ٹھیک رہے، اور مرض کے باعث جو سرخ جسیمے کم ہو گئے ہیں، انھیں بحال کیا جا سکے۔ لیکن ایک تو یہ علاج بہت گراں ہے، دوسرے ہر مریض کے مناسب حال خون کی اتنی مقدار مسلسل مہیا کرنا بہت مشکل ہے۔

قصہ کوتاہ، فروری ۱۹۷۶ء میں وہ خون کے کینسر میں مبتلا ہو گئے۔ بوہیمور تھما کے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج میں علاج شروع ہوا۔ کوئی مہینے بھر کے قیام کے بعد مکان واپس آئے۔ اس کے بعد پوری صحت کا ایک دن نصیب نہ ہوا، اندھیرے اُجالے ہی میں بسر ہوئی۔ ۲۹ مئی ۱۹۷۸ء کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ فوراً اسپتال پہنچایا گیا۔ اسی دن شام کو گھر آ گئے، اور موت و حیات کا آخری معرکہ شروع ہوا جس میں یکم جون

۸ ۱۹۷ء دن کے پونے دو بجے جاں بحق ہو گئے۔ اسی دن دس بجے شب یونیورسٹی کے قبرستان میں اعزہ و اصحاب نے آخری منزل تک پہنچا دیا۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
حکیم عزیز قدسی کاکوروی کی کہی ہوئی ہجری میں تاریخ ہے:

چل بسا اُف، وہ سخنور، نقاد　　جس کی ہستی پہ تھی اردو نازاں
سالِ رحلت یہ کہا دل نے عزیزؔ!　　"صدمۂ مرگِ خلیل الرحمٰن" (۱۳۹۸)

اور عیسوی میں تاریخ ہوئی: آہ، رخصت ہوا طلیل (۱۹۷۸)۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اصحابِ حل و عقد نے ان کی وفات کے بعد یکم ستمبر ۱۹۷۸ء سے انھیں پروفیسری کا عہدہ عطا کرنے کا فیصلہ کیا، جو نہ صرف اس یونیورسٹی کے لیے اپنی قسم کا پہلا اقدام ہے بلکہ شاید ملک بھر میں اس کی اور مثال نہ مل سکے۔ ہائے، اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔

انھوں نے بہت کم عمری میں لکھنا شروع کیا تھا جس زمانے میں وہ سرائے میر کے مڈل اسکول کے طالب علم تھے۔ وہاں ان کے گاؤں میں ایک نوجوان فاروق احمد نام کے تھے (وہ ہائی اسکول کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے تھے، جہاں سے انھوں نے ایم اے کی سند لی۔ عین عالمِ شباب میں رحلت ہو گئی) وہ بڑے بیدار مغز اور ذہین شخص تھے۔ انھوں نے گاؤں میں ایک دار المطالعہ قائم کیا۔ یہاں تحریری اور تقریری مقابلے ہوتے۔ ایک قلمی رسالہ بھی "بیداری" کے نام سے جاری کیا۔ انھوں نے اس رسالے کا ایڈیٹر خلیل الرحمٰن کو بنا دیا۔ خلیل الرحمٰن نے لکھنے کی ابتدا ماہنامہ "غنچہ" بجنور سے کی تھی۔ اس میں انھوں نے "انوکھا کھیل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس پر ایڈیٹر "غنچہ" (شاغل ادیب) نے خصوصی انعام دیا۔ فاروق احمد ہی کے زیر اثر خلیل الرحمٰن نے انگریزی کی بعض کتابیں بھی پڑھیں۔ اور ان کے اسی شوق کو دیکھ کر ان کے والد مولانا محمد شفیع خاں ان کے شبلی نیشنل ہائی اسکول، اعظم گڑھ میں داخلہ لینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ ہائی اسکول کے زمانے میں خلیل الرحمٰن نے بچوں کے لیے نظمیں لکھنا شروع کیں، وہ یہ نظمیں محمد شفیع الدین نیّر کے پاس بھیج دیتے اور ان

کی اصلاح کے بعد یہ ماہنامہ "پیامِ تعلیم" میں شائع ہوتی رہیں۔

۱۹۴۶ء میں انھوں نے "نقشِ ناتمام" کے عنوان سے ایک نظم لکھی، اور اسے ممتاز شیریں (ف: مارچ ۱۹۷۳ء) کے پاس بھیج دیا، جو بنگلور سے اپنے شوہر صمد شاہین کے ساتھ دوماہی رسالہ "نیا دور" شائع کرتی تھیں۔ انھوں نے اسے اسی سال "نیا دور" میں شامل کر لیا۔ (شمارہ ۷، ۸ ۱۹۴۶ء) آہستہ آہستہ خلیل الرحمن اعظمی کی شہرت بحیثیت شاعر و نقاد پھیلنے لگی اور بہت جلد انھوں نے علمی حلقوں میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔ ان کے دو شعری مجموعے "کاغذی پیرہن" (دلّی ۱۹۵۵ء) اور "نیا عہد نامہ" (علی گڑھ ۱۹۶۵ء) ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک طویل نظم "آئینہ خانے میں" بھی چھپی (۱۹۵۰ء) کم از کم ایک مجموعے کا کلام ابھی اور موجود ہوگا۔ مستقل تنقیدی تصنیف "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" (علی گڑھ: ۱۹۷۲ء) کے علاوہ تنقیدی مضامین کے تین مجموعے ان سے یادگار ہیں: "فکر و فن" (دلّی: ۱۹۵۶ء) "زاویۂ نگاہ" (گیا: ۱۹۶۶ء) "مضامینِ نو" (علی گڑھ: ۱۹۷۷ء)۔ ان کی تنقیدی بصیرت اور ژرف نگاہی کا مظاہرہ سب سے پہلے ان کے مضمون "مقدمۂ دیوانِ آتش" سے ہوا جو ۱۹۴۸ء میں انھوں نے اپنی بی اے کی طالب علمی کے زمانے میں قلمبند کیا، اور "نگار"، لکھنؤ میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ بعد کو اسے ۱۹۵۹ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے شائع کیا۔ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے چاروں دیوانوں ایک نمائندہ انتخاب بھی کیا تھا، جو ان کے مبسوط مقدمے کے ساتھ "نوائے ظفر" کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بھی ۱۹۷۵ء میں انجمن ہی نے شائع کیا۔

غرض، کیا بحیثیتِ شاعر اور کیا بحیثیتِ نقاد خلیل الرحمن اعظمی کا مقام تاریخِ ادبِ اردو میں بہت بلند ہے۔ افسوس کہ انھیں قدرت نے بہت کم فرصت عطا کی، ورنہ وہ ابھی اپنی دل و دماغ کی صلاحیتوں سے ہماری زبان کے دامن کو مدتوں مالامال کرتے۔ بھلا ۵۱ برس بھی کوئی مرنے کی عمر ہے! کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور!

بسمل عظیم آبادی، شاہ محمد حسن، سیّد

نجیب الطرفین، دادھیالی اور ننھیالی دونوں سلسلے امام چہارم حضرت زین العابدینؑ بن حضرت امام حسینؑ بن حضرت علی کرّم اللہ وجہہ پر منتہی ہوتے ہیں۔ ہندستان میں ان کے جدّ اعلیٰ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سگے چچازاد بھائی (اور ان کے خلیفہ بھی) سیّد جمال الدین تھے۔ بہار میں سب سے پہلے انھیں کے بیٹے حضرت مخدوم شاہ فرید طویلہ بخشؒ گئے جو حضرت مخدوم نور عالم علاء الدین پنڈوہ کے خلیفہ تھے (جن کا مزار محلہ چاندپورہ، بہار شریف میں ہے)۔ بعد کو خاندان نے چاندپورہ کی سکونت ترک کردی اور خسروپور نوادہ (ضلع پٹنہ) میں جا بسا، اور پھر یہاں سے منتقل ہوکر محلّہ لودی کٹرہ، پٹنہ میں آرہا۔

بسمل مرحوم کا ننھیالی سلسلہ بھی کچھ کم ممتاز نہیں۔ ان کے جدّ اعلیٰ مشہد (ایران) سے چلے اور مختلف مقامات میں ٹھہرتے، بالآخر بہار کے قصبہ کاکو (ضلع گیا) میں مقیم ہوگئے۔ ان کی اولاد میں حضرت مخدوم سیّد شاہ حبیب اللہ کاکوی مشہور ولی اللہ گزرے ہیں۔ انھیں کے پرپوتے سیّد شاہ تبارک حسین سجّادہ نشینؒ، مرحوم بسمل عظیم آبادی کے پرنانا تھے۔ بسمل کے حقیقی نانا سیّد شاہ حبیب الرحمٰن مبارک (عرف شاہ مبارک کاکوی) مستقلاً پٹنہ میں رہنے لگے تھے۔ بسمل کے دادا سیّد شاہ حسن خسروپوری[۱] کی شادی، شاہ تبارک حسین کی صاحبزادی کنیز فاطمہ سے ہوئی۔ اور پھر ان کے بیٹے سیّد شاہ آل حسن کی شادی اپنے ماموں سیّد شاہ حبیب الرحمٰن (شاہ مبارک کاکوی) کی بیٹی بی بی جہاتن عرف میمونہ خاتون (ف : ۱۹۴۰ء) سے ہوئی۔ یہی دونوں جناب بسمل مرحوم کے والدین تھے۔

سیّد شاہ آل حسن بیرسٹر تھے۔ انھوں نے بیرسٹری کی سند بعمر ۲۱ سال ۱۸۹۴ء میں پائی تھی۔ ان کا انتقال عین عالم شباب میں یکم جنوری ۱۹۰۲ء کو ہوا، وہ صفی پور میں دفن ہوئے۔

ماخذ: سیّد شاہ مہدی حسن (بھتیجے بسمل مرحوم)، پروفیسر عطا کاکوی، پٹنہ، ماہنامہ آجکل (اردو) نئی دلی ستمبر ۱۹۷۸ء۔

[۱] غالباً یہ قابل ذکر ہے کہ انھیں شاہ تبارک حسین کاکوی کے بھائی سیّد امداد حسین کاکوی کے ایک پرپوتے مشہور مصنّف پروفیسر عطا کاکوی ہیں۔

انھوں نے اپنے پیچھے تین بیٹے اپنی یادگار چھوڑے۔ سب سے بڑے شاہ ولی حسن جو ۱۴ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان سے چھوٹے شاہ نبی حسن (عرف نبّو) جو ۲۸ برس کی عمر میں رحلت کر گئے۔ سب سے چھوٹے یہی سیّد شاہ محمد حسن بسمل (عرف شاہ جھبّو) تھے۔

شاہ محمد حسن ۱۹۰۰ء (۱۳۱۸ھ) میں خسرو پور میں پیدا ہوئے۔ صرف دو سال کے تھے، جب ان کے والد سیّد آل حسن بیرسٹر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس کے بعد تینوں بھائی اپنے نانا سیّد شاہ مبارک کاکوی اور ماموں شاہ محی الدین عرف شاہ کمال کی کفالت میں آ گئے اور ان کی تعلیم و تربیت انھیں کی نگرانی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ حسن امام بیرسٹر نے اپنے بیٹے مہدی حسن کی تعلیم کے لیے ایک معلّم معین الدین ساکن استھانوان) کو مقرر کیا تھا۔ شاہ مبارک کاکوی نے انھیں کو اپنے نواسوں کی تعلیم کے لیے ملازم رکھ لیا۔ بسمل نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی انھیں سے پڑھیں۔ اس کے بعد ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ لیکن ابھی بمشکل آٹھویں درجے میں پہنچے تھے کہ بڑے بھائی سیّد شاہ نبی حسن کا انتقال ہو گیا۔ اب جائداد کی دیکھ بھال کے لیے بسمل کے سوا گھر میں کوئی مرد نہیں رہ گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے خاندانی زمینداری کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بقیہ عمر اسی شغل کی نذر ہو گئی۔ اس کے بعد سکونت بھی زیادہ تر اپنے دیہاتی مکان ہرداس بیگھہ میں رہی، جو پٹنے سے تقریباً بیس کیلو میٹر دور شاہراہ پر واقع ہے۔

ان کی زندگی رئیسانہ تھی۔ شوق بھی اسی طرح کے تھے۔ فنِ موسیقی میں ماہرانہ درک تھا۔ آواز بہت اچھی پائی تھی، گاتے بھی خوب تھے۔ پھولوں کا بہت شوق تھا۔ دور دور سے مختلف قسم کے بیج اور پودے منگوا کر انھیں اپنے باغ کی زینت بنایا تھا۔ یہی حال پھولدار پودوں کا تھا۔ قسم قسم کے پرندے اور جانور پال رکھے تھے۔ ان کا مکان الگ تھا جو ایک چھوٹے موٹے چڑیا گھر سے کم نہیں ہے۔ دو تین اعلیٰ قسم کے گھوڑے ہمیشہ اصطبل میں رہے۔ لذیذ کھانوں کے شیدا تھے۔ دسترخوان وسیع تھا۔ اکیلے کھانا پسند نہیں کرتے تھے۔ غرض زندگی رئیسوں اور جاگیرداروں کی روایت کے تتبع میں مرنجان مرنج اور خوشحال اور خدمتِ خلق میں، داد و دہش سے بسر کی۔

ان کے ادبی ذوق کی تربیت بچپن میں بیت بازی کے معرکوں میں ہوئی۔ عظیم آباد کی فضا سراسر شعر و نغمہ کی تھی۔ ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا اور مشاعروں کی گرم بازاری تھی۔ خود ان کے خاندان میں ممتاز شاعروں کی کمی نہیں تھی۔ ان کے نانا سید شاہ مبارک مرحوم کا تخلص مبارک تھا، اور حقیقی ماموں خان بہادر سید شاہ محی الدین کا تخلص کمال تھا۔ دونوں وحید الہ آبادی (ف: رمضان ۱۳۰۹ھ/اپریل ۱۸۹۲ء) کے شاگرد تھے۔ اور بسمل کی تعلیم و تربیت انھیں حضرات کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ ایسے ماحول میں بسمل کا بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہو جانا بالکل قدرتی بات تھی۔ اس وقت بہار اور پٹنہ میں سید علی محمد شاد (ف: جنوری ۱۹۲۷ء) کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ بسمل نے شعر کہنا شروع کیا، تو شاد کی خدمت میں پہنچے اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔

سیاسی حلقوں میں ایک غزل پر بہت لے دے رہی ہے، جس کا مطلع ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بہت دن اس پر قیاس آرائیاں ہوتی رہیں کہ یہ غزل کس شاعر کی ہے۔ یہ غزل سید شاہ محمد حسن بسمل ہی کی ہے۔

۱۹۲۱ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس کلکتے میں ہوا تھا؛ لالہ لاجپت رائے (ف: نومبر ۱۹۲۸ء) اس کے صدر تھے۔ نوجوان بسمل بھی اپنے بعض دوستوں کے ساتھ اس اجلاس میں شریک ہوئے تھے۔ بسمل شروع سے قوم پرست اور انگریز دشمن تھے، بالعموم کھدر کا استعمال کرتے تھے۔ اس اجلاس کانگریس سے واپسی کے بعد انھوں نے یہ غزل کہی۔ وہ کاغذ جس پر شاد کی ۱۹۲۱ء کی اصلاح اس غزل پر موجود ہے، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ یہ غزل اسی زمانے میں قاضی عبدالغفار مرحوم (ف جنوری ۱۹۵۶ء) کے رسالے "صباح" میں بھی شائع ہوئی تھی۔ بسمل کا پڑھنے کا انداز بھی بڑا دلکش تھا۔ تحت لفظ پڑھتے تھے۔ خانہ داری اور زمینداری کی ذمہ داریاں ان کے کندھوں پر آ پڑیں، تو شعر گوئی کی فرصت کم ملی۔ ان کا سرمایہ

رہے۔

۱۹۲۶ء میں اخگر کا عقدِ نکاح چودھری احمد جان سندیلوی کی دخترِ نیک اختر منعمہ بی بی سے ہوا۔ چودھری احمد جان کے والد چودھری محمد عظیم بن راجا چودھری خصلت حسین تعلقدار سندیلہ تھے۔ چودھری خصلت حسین سندیلوی انیسویں صدی کی مشہور شخصیت ہیں۔ وہ مدتوں انجمن تعلقداران کے سکریٹری رہے۔ دنیا کے ساتھ دین سے بہرۂ وافر پایا تھا۔ حضرت خادم صفی (صفی پوری) سے بیعت تھے اور ان کے خلیفہ تھے۔ مرشد نے ان کے زہد و عبادت اور خدمتِ خلق کے جذبے سے متاثر ہو کر انھیں اسد اللہ خطاب دیا تھا۔ حضرت خادم صفی کا مقبرہ چودھری خصلت علی ہی نے تعمیر کرایا تھا۔ ۲۶ جون ۱۸۹۲ء کو زہر بادے سے انتقال کیا۔ ان کے بیٹے چودھری محمد عظیم نے ۱۹۰۲ء میں رحلت کی اور چودھری احمد جان نے ۱۹۲۰ء میں۔

اخگر کی وفات ناگہانی ہی کہی جا سکتی ہے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۶ء کو وہ اپنے کمرے میں گر گئے، جس کے بعد انھیں کھڑا ہونے اور نقل و حرکت میں تکلیف محسوس ہوتی تھی۔ لا محالہ زیادہ وقت مکان پر گزارتے تھے۔ ۲۲ جون ۱۹۷۸ء کو پیشاب کا عارضہ لاحق ہو گیا، جلد ہی اس نے کینسر کی شکل اختیار کر لی، اور چھبیس دن بعد جمعرات ۱۳ جولائی ۱۹۷۸ء بوقتِ ظہر جاں بحق ہو گئے۔ اسی دن بعدِ مغرب انھیں اپنی مرحومہ بیگم کے پہلو میں عیش باغ، لکھنؤ کے قدیم قطعے میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بہت احباب نے تاریخِ وفات کہی۔ ان کے استاد بھائی پرتو لکھنوی کی عیسوی اور ہجری تاریخیں حسبِ ذیل ہیں۔

بعد آرزو کے دہر سے شاگرد بھی گئے — جو تھے قدیم ان میں سے ایک اک کی قضا
پرتو ہر اک کے رونے کو بس رہ گیا ہے آہ — "اخگر سا پیر بھائی بھی ہیہات! وہ اٹھا"
(۱۹۷۸)

ان وصی احمد بھی گئے — اب ہیں اخگر اہلِ جناں
سالِ غم، پرتوا یہ لکھو — "آہ، خواجہ تاش کہاں!"
(۱۳۹۸ھ)

اخگر کا کلام بے عیب اور فنی پہلو سے کسی اعتراض سے بالا ہے، جو آرزو کے تلامذہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ انھوں نے وکالت کی مصروفیتوں کے باعث بہت کم کہا۔ آج تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ معلوم ہوا ہے کہ ان کے صاحبزادے افضال احمد صاحب اسے "باقیات اخگر" کے عنوان سے مرتب کر رہے ہیں۔

ان میں شامل تھے۔ وہ ۱۹۴۲ء تک اس عہدۂ جلیلہ پر فائز رہے۔ وہاں سے سبکدوش ہوئے، تو وایسرائے نے انھیں کونسل آف اسٹیٹ کا رکن نامزد کر دیا۔ ۴۲ سالہ طویل ملازمت سرکار کے بعد ۱۹۵۱ء میں فارغ ہو کر گھر پہنچے تھے کہ ایک مہینے کے اندر اندر فرشتۂ اجل نے انھیں لے جا کے بارگاہِ ایزدی میں پیش کر دیا۔ اپنے خاندانی امامباڑہ فاطمی میں دفن ہوئے۔

سیّد آل رضا کی ابتدائی تعلیم دستورِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں انھیں سیتاپور کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں بھیج دیا گیا، جہاں سے ۱۹۱۲ء میں دسویں کی سند پائی۔ اس کے بعد چار برس کیننگ کالج، لکھنؤ میں رہے اور ۱۹۱۶ء میں بی اے پاس کیا۔ اگلے دو برس بعض خانگی مسائل میں ملوّث رہنے کے باعث بیکاری میں بسر ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں الٰہ آباد کے کالج سے وکالت کی سند لے کر لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ لیکن سال بھر بعد ۱۹۲۱ء میں پرتاپ گڑھ منتقل ہو گئے۔ ۱۹۲۷ء کے آخر میں دوبارہ لکھنؤ کا قیام اختیار کیا۔ یہاں ان کی وکالت خوب چمکی، ان کا خاصے کامیاب وکلا میں شمار ہوتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں آزادی آئی۔ ان کے دونوں بھائی سیّد کاظم رضا اور سیّد ہاشم رضا پہلے سے پاکستان میں مقیم تھے۔ انھیں کے اصرار پر سیّد آل رضا بھی اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے وہاں چلے گئے اور کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں بھی بہت دن اپنا وکالت کا پیشہ جاری رکھا۔ لیکن عمر کے ساتھ جب قویٰ کمزور ہونے لگے، تو اس سے دست بردار ہو کر عزلت نشینی اختیار کر لی۔

کبر سنی اپنی جگہ، لیکن کوئی خاص تکلیف نہیں تھی۔ یکم مارچ ۱۹۷۸ء سونے کے وقت معمولی کھانسی اور زکام کے علاوہ کوئی شکایت ظاہر نہیں کی۔ جوشاندہ پی کر سونے کی کوشش کی، لیکن نیند نہیں آئی۔ نصف شب کے بعد کھانسی کا دورہ پڑا۔ ابھی اٹھیں اس نے گولیاں دیں اور پانی پلایا، سو گئے۔ پندرہ منٹ بعد دوسرا شدید تر دورہ پڑا۔ بہن پھر دوڑی آئیں۔ گولیاں اور پانی حاضر کیا، تو کہا: اب دوا کا وقت نہیں رہا، یہ کھانسی

بات یہ محسوس ہوئی کہ ان کو قدیم زردشتی تہذیب سے بھی خاصا شغف ہے۔ غالباً اسی لیے انھوں نے اپنا تخلص یسنا اختیار کیا ہے اور اپنے بچوں کے نام بھی اوستائی رکھے ہیں۔ ایک بچے کا نام تو میں بھول گیا؟ بڑے بچے کا نام انھوں نے مہرداد رکھا ہے۔ مرحوم ابراہیم پور داؤد نے جن قدیم زردشتی متون کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے، وہ بھی ان کے مطالعہ میں رہتے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان ایک دلچسپی بھی مشترک نکل آئی۔ میں جدید ایرانی نثر نگاروں میں مرحوم احمد کسروی تبریزی کی علمیت اور دیدہ ریزی کا بڑا قائل ہوں۔ رحیم چاؤش اکبری صاحب کو بھی کسروی کی تحریروں سے خاص شغف ہے۔ ہم لوگوں کے درمیان احمد کسروی کی کتاب "آذری یا زبانِ باستانِ آذربایجان" کے بارے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ کر ڈالا ہے۔ مگر چونکہ بعض مسائل میرے ذہن میں صاف نہیں، اس لیے اب تک اس ترجمے کو کتابی صورت میں نہیں لا سکا ہوں۔ میں انھی الجھے ہوئے مسائل کے بارے میں ان سے گفتگو کرتا رہا، یہاں تک کہ رات کے نو بج گئے۔ ان کی اہلیہ کا اصرار تھا کہ کھانا کھا لیا جائے۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ رحیم چاؤش صاحب ان مسائل پر ایک مفصّل مقالہ فارسی میں لکھ کر مجھے ارسال کر دینگے، اور میں اس کا ترجمہ مذکورہ کتاب میں مقدمہ کے طور پر شامل کر لونگا۔

دسترخوان لگ چکا تھا۔ کھانے پر چاؤش صاحب کی ہمشیرہ، ان کے شوہر، خانم چاؤش اور دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ کسی ایرانی کے گھر پر کھانا کھانے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ دسترخوان پر جو چیزیں موجود تھیں، وہ ہوٹل کے کھانے سے بالکل مختلف تھیں۔ مرغ، گوشت اور لوبیا، سبزی، پلاؤ، سلاد۔ ہر چیز بالکل ہندستانی معلوم ہوتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان کھانے میں سرخ مرچ نہیں تھی، پھر بھی کھانا انتہائی لذیذ تھا اور خانم اس شفقت اور اصرار سے کھلا رہی تھیں کہ میں نے کچھ زیادہ ہی کھا لیا۔ اس مختصر سی تقریب میں خانم اور دونوں بچوں کی محبّت دل پر انمٹ نقوش چھوڑ گئی ہے۔ باہر بارش برابر ہو رہی تھی، اس لیے چاؤش صاحب کے برادرِ نسبتی اپنی کار لے آئے، چاؤش صاحب، ان کا چھوٹا بچہ اور ان کے برادرِ نسبتی ہوٹل تک چھوڑنے آئے اور گلے مل کر بادیدۂ نم رخصت ہوئے جس کا اثر

برج کے میگھ ملہار

کا بوڑھا، منھ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، ڈوکھا بنا، بڈھی گھوڑی لال لگام کے مصداق منھ پر دیسی رومال رکھے، کسی چودہ سال کی دوشیزہ کے جیون رس میں وِس گھولنے پر تل گیا۔ شہنائی کی آواز سن کر نئی نویلی دلھن کے من سے بھی گیت پھوٹ پڑا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب:

گیارہ برس کی میں ہوئی سُن بہنا میری
کوئی پینسٹھ کے بھرتار — کوئی مت پوچھو ری میرے من کی!

یا۔ مایا کے لوبھی باپ نے بڈھے کو بیاہ دی ری!

اور یہ بھی وہ سُہاگن جو سُہاگن ہوتے ہوتے بھی بیواؤں سے بدتر تھی۔ اس کا زبردست ردِ عمل اخلاقی گراوٹ کے روپ میں اُبھرا۔ جوانی نے بوڑھے کھوسٹ کے بڑھاپے سے انتقام لیا۔ اس سے بوڑھے کی "بنس بیل" تو چل گئی اور گھر کا چراغ بھی روشن ہوگیا۔ مگر اس طرح "ورن سنکر" (دوغلی) اولاد پیدا ہوگئی۔ اور ساتھ ہی پاس پڑوس کی فضا میں بد اخلاقی اور بدکرداری کا زہر بھی پھیل گیا۔

یہ تو تھا بڈھا رنڈوا۔ اب جوان رنڈوے کی سُنیے۔ وہ صبح ہی سے "تلک چھاپے" لگا کر، برج کے رسیا کرشن کنھیا کا روپ دھار کر، ہاتھ میں چلم لیے گھر گھر گوپیوں کو چھیڑتا پھرتا ہے۔ دن بھر پنگھٹ کے اور گلیوں کے چکّر کاٹتا ہے۔ کبھی کبھی وہ پنگھٹ پر گوپیوں کے جنگل میں پھنس جاتا ہے، تو اس کی تواضع بھی خوب ہوتی ہے۔ سب پنہارنیں مل کر گاتی ہیں

رنڈوا کتنو ہی تلک لگا لے، سب سُکھ بیاہی کو

اَرے رنڈوے! تو نے گوپیوں کو رِجھانے اور کامنیوں کے من موہنے کے لیے تلک تو لگا لیا، لیکن یہ نہیں سوچا کہ اس طرح اگر تیرا جادو کسی پر چل بھی گیا اور تو نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی دنیا رنگین بنا بھی لی، تو کیا ہوا، رہیگا تو پھر بھی رنڈوے کا رنڈوا۔ اصلی سُکھ تو اپنی بیوی ہی سے ملتا ہے۔ اس تاک جھانک سے کچھ حاصل نہیں۔" رنڈوا یہ گیت سُنتا ہے، تو کھسیانا ہو کر وہاں سے کھسک جاتا ہے:

اسے جوگی! چلتے میں کھیو کاروناگ سمجھ راجا بھرتری! ۱۱-۱۹۰۰
تریا تو بیٹھے رے تیری، باپ کے
ارے جوگی! کنواں میں کیبو تیرو جوگ سمجھ راجا بھرتری!

س گیت میں گانوں کی شاعرہ نے جو نقشا پیش کیا ہے، اُس میں گانو کی زندگی اور اُس کی لخ حقیقتیں اُبھرتی ہیں۔ اُس نے "راجا بھرتری" کے پردے میں گانو کے سماجی ماحول پر کڑی تنقید کی ہے۔

ن لوک گیتوں کو پڑھتے وقت یہ بات نہ بھولیے گا کہ یہ گیت اکثر و بیشتر اَن پڑھ عورتوں کے جذبات و احساسات کا آئینہ ہیں۔ اور یہ گیت ابتدا سے اسی طرح سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں۔

گیت کا عنوان ہے "راجا بھرتری"۔ لیکن اس گیت سے راجا بھرتری کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوگی ہو گیا تھا۔ راجا بھرتری کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ لیکن شاعرہ نے نہ معلوم کیوں اسے نظر انداز کر دیا۔ قیاس چاہتا ہے کہ شاعرہ غالباً اَن پڑھ ہوگی یا اگر پڑھی لکھی ہوگی بھی، تو راجا بھرتری کا پورا قصہ اس تک نہیں پہنچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ شاعرہ نے شعوری طور پر سماجی اصلاح کے لیے گیت کا انداز بدل بھی دیا ہو۔ بہر حال گیت اور گیت کا موضوع ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے میں راجا بھرتری کی زندگی کا وہ اہم واقعہ بیان کرتا ہوں، جس نے اُس کی زندگی کا رُخ بدل کر رکھ دیا، اور وہ راجا سے جوگی بن گیا تھا۔

تقریباً اڑھائی ہزار برس ہوئے، راجا بھرتری بری مالوہ کا راجا تھا۔ اُجین اُس کی راجدھانی تھی۔ اس کے بہت سی رانیاں تھیں۔ لیکن وہ رانی پنگلا پر جان چھڑکتا تھا۔ اور دن رات اسی کے محل میں پڑا رہتا تھا۔ راجا کا چھوٹا بھائی وکرم (بکرماجیت) بہت نیک تھا۔ وہ عورت کی دنیا سے دُور رہتا تھا۔ اس کی نیکنامی اور ہر دلعزیزی نے راجا کی عیاشی پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ ایک روز ایک برہمن نے تحفہ میں راجا کو ایک پھل دیا یہ "امر پھل" تھا۔ راجا نے وہ اپنی محبوب رانی پنگلا کو دے دیا۔ لیکن کچھ دیر بعد راجا بہت حیران ہوا جب اُس نے دیکھا کہ

کوئی بات نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے کسی آشنا سے ملنے کے لیے سُوئے پنگھٹ پر
ہو۔ لوک گیتوں میں "من میت ملن " (پنگھٹ پر) کا بھی ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس
ت میں یہ بات نہیں ہے۔ پنگھٹ کی نائیکا (پنہاری) کا کردار بہت جاندار ہے۔
نی، ذہنی اور اخلاقی جرأت، محنت و مشقت، صحت، خوش مزاجی اور خوش مذاق
حاضر جوابی پنہاری کے کردار کے اہم اجزا ہیں۔
جی برج کی عورتوں کے مذاق کا جواب دینا آسان نہیں۔ اس گیت میں پنہارن کا
ں نہایت شُستہ، ارُفتہ اور برجستہ رہا ہے۔ اس میں کوئی اخلاقی پستی یا گراوٹ کی
، ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تو برج نار کے کردار کا ایک شریں اور اہم پہلو ہے۔ اگرچہ بعض
ں میں یہ مذاق پھکڑپن، فحاشی و عریانی تک پہنچ جاتا ہے۔ تاہم اُس عامیانہ مذاق
، باوجود ہم کسی کردار کو بد اخلاق یا نازیبا نہیں کہہ سکتے۔
مال پنہاری پنگھوٹے سے "ریلن کے بٹیوٗ اسوار" کو راستہ بتاکر، سر پہ گاگر رکھے،
ں مٹکتی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو جاتی ہے اور بقول احمد ندیم قاسمی:

سر پہ گاگر ہے، لچکتی ہے کمر رہ رہ کر
تر کیے دیتا ہے زلفوں کو چھلکتا پانی
ننھی سی دھار وہ گردن پہ تھرک کر ٹپکی
ساری دنیا کو ڈبو دینے کی تُو نے ٹھانی

[بشکریہ شریمتی پربھاوتی۔ حسن پور]

۶۔ برج نار

۔۔رانہ دَور کا رومان جنسی اور شہوانی جذبات سے مملو تھا۔ ہوس پرستی اور سیاہ مستی
ردار کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی جاگیر یا تعلقے میں "راجا" یا "کنور" کہلاتا تھا۔ جب
"نیلی گھوڑی" پر سوار ہو کر شکار کے لیے اپنے محل سے نکلتا، تو گاؤں کے غریب بھولی